

ادارۂ تالیفاتِ اشرفیہ
چوک فوارہ ملتان پاکستان فون: 4540513-4519240

بسلسلہ خطبات حکیم الامت جلد-۲۷

فضائل علم

(جدید ایڈیشن)

حکیم الامت مجدد الملت

حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ

عنوانات

منشی عبد الرحمٰن خاںؒ

تصحیح وتزئین

صوفی محمد اقبال قریشی مدظلہ

تخریج احادیث

مولانا زاہد محمود قاسمی

ادارۂ تالیفاتِ اشرفیہ

چوک فوارہ ملتان پاکستان

(061-4540513-4519240

فضائل علم

تاریخ اشاعت .... صفر المظفر ۱۴۳۱ھ
ناشر .... ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان
طباعت .... سلامت اقبال پریس ملتان

قارئین سے گذارش

ادارہ کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔ الحمد للہ اس کام کیلئے ادارہ میں علماء کی ایک جماعت موجود رہتی ہے۔ پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو برائے مہربانی مطلع فرما کر ممنون فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاکم اللہ

ملنے کے پتے

ادارہ تالیفات اشرفیہ.... چوک فوارہ.... ملتان

ادارہ اسلامیات .... انارکلی .... لاہور — دارالاشاعت .... اُردو بازار .... کراچی
مکتبہ سید احمد شہید ...... اردو بازار ...... لاہور — ادارۃ الانور .... نیوٹاؤن .... کراچی
مکتبہ رحمانیہ ...... اُردو بازار .... لاہور — مکتبہ دارالاخلاص .... قصہ خوانی بازار .... پشاور

ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K — 119-121- HALLIWELL ROAD
(ISLAMIC BOOKS CENTERE — BOLTON BL1 3NE. (U.K.)



عرض ناشر

خطبات حکیم الامت جلد نمبر ۲۷ ''فضائل علم''

جدید اشاعت سے مزین اپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اللہ کے فضل و کرم اور اپنے اکابرین کی دعاؤں کے طفیل کافی عرصہ سے خطبات کی اشاعت کا ادارہ کو شرف حاصل ہو رہا ہے۔

بہت سے بزرگوں کی تمنا تھی کہ ان کی احادیث مبارکہ کی تخریج ہو جائے۔ ادارہ نے زر کثیر خرچ کر کے یہ کام محترم جناب مولانا زاہد محمود صاحب (فاضل جامعہ قاسم العلوم ملتان) سے یہ کام کرایا اور فارسی اشعار اور عربی عبارات کا ترجمہ اور اس کے ساتھ ساتھ تصحیح کا کام حضرت صوفی محمد اقبال قریشی صاحب مدظلہ نے سرانجام دیا۔

اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے آمین

احقر: محمد اسحٰق عفی عنہ

ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ بمطابق جون 2007ء

اجمالی فہرست

وَاَنْزَلَ اللّٰہُ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَعَلَّمَکَ مَالَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ وَکَانَ فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکَ عَظِیْمًا

وَاَنْزَلَ اللّٰہُ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَعَلَّمَکَ مَالَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ وَکَانَ فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکَ عَظِیْمًا

مَایَفْتَحِ اللّٰہُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَۃٍ فَلَا مُمْسِکَ لَھَا وَمَا یُمْسِکْ فَلَا مُرْسِلَ لَہٗ مِنْ بَعْدِہٖ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ○ (سورہ فاطر آیت نمبر ۲)

اِنَّمَا التَّوْبَۃُ عَلَی اللّٰہِ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَھَالَۃٍ ثُمَّ یَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِیْبٍ فَاُولٰٓئِکَ یَتُوْبُ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ وَکَانَ اللّٰہُ عَلِیْمًا حَکِیْمًا.

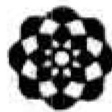
(النساء آیت نمبر ۱۷)

وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا ○ (البقرہ آیت نمبر ۲۶۹)

وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰہَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ

(العنکبوت آیت نمبر ۶۹)

فہرست عنوانات



وعظ مسمی بہ

تعظیم العلم

مع

تقسیم العلم

بمقام دہلی مدرسہ عبدالرب ۱۷ شعبان ۱۳۴۰ھ بروز یکشنبہ ۳ گھنٹہ ۵ منٹ کھڑے ہوکر یہ وعظ ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ۳۵۰ تھی۔ مولانا ظفر احمد تھانوی صاحب نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ. اَمَّابَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَلَکُمْ مَّافِی السَّمٰوٰتِ وَمَافِی الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَیْکُمْ نِعَمَہٗ ظَاھِرَۃً وَّبَاطِنَۃً وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّجَادِلُ فِی اللّٰہِ بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّلَا ھُدًی وَّلَا کِتٰبٍ مُّنِیْرٍ ۝ (سورہ لقمان آیت نمبر ۲۰)

ترجمہ: ''کیا تم نے دیکھا نہیں کہ حق تعالیٰ نے کام میں لگا رکھا ہے تمہارے لیے تمام چیزوں کو جو کچھ کہ آسمانوں میں موجود ہیں اور جو کچھ زمین میں موجود ہیں اور کامل کر دیں تمہارے اوپر اپنی نعمتیں جن میں بعض ظاہری ہیں اور بعض باطنی اور بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں جدال کرتے ہیں۔ بدون علم کے اور بدون ہدایت کے اور بدون روشن کتاب کے۔''

وعظ کا اصل مقصود

یہ ایک آیت ہے سورہ لقمان کی اس میں حق تعالیٰ نے اپنے بعض دلائل توحید ارشاد فرما کر منکرین توحید کی شکایت کی ہے اور ان کا انکار چونکہ بلا دلیل بلکہ خلاف دلیل ہے اس لیے اس کو مجادلہ سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہ حاصل ہے اس آیت کا لیکن میرا مقصود اس وقت مضمون توحید کو بیان کرنا نہیں ہے کیونکہ یہاں کوئی مخاطب توحید کا منکر نہیں بلکہ مجھ کو علم دین کی ضرورت اور اس کے بعض انواع کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے اور یہ مضمون اگرچہ منطوقاً اس آیت کا مدلول نہیں ہے مگر اس سے مفہوم ضرور ہوتا ہے جیسا کہ آئندہ تقریر استدلال سے واضح ہو جائے گا۔ پس یہ آیت توحید پر تو صراحۃً دلالت کرتی ہے اور علم کی ضرورت اور اس کے اقسام پر اشارۃً دلالت کر رہی ہے اور چونکہ اس وقت ایک علمی مقام میں بیان ہو رہا ہے اور میرا معمول ہمیشہ یہ ہے کہ مناسب محل

مضمون بیان کیا کرتا ہوں اس لیے دوسرے مضمون کو جو اشارۃً اس آیت سے مستنبط ہو رہا ہے اختیار کرنے میں ترجیح دی گئی ہے لیکن ربط کے لیے دلیل توحید کو بھی بیان کر دینا مناسب ہے کیونکہ ضرورت علم کی طرف اس آیت کے دوسرے جزو میں اشارہ ہے اور پہلے جزو میں صرف توحید کی دلیل مذکور ہے تو پوری آیت کی تفسیر اسی وقت سمجھ میں آوے گی جبکہ دونوں اجزاء کو بیان کر دیا جائے۔ مگر پہلے جزو کا بیان محض ربط ہی کے لیے ہوگا اور اصل مقصود علم کے متعلق بیان ہے جو کہ دوسرے جزو میں مذکور ہے۔

دلائل توحید

اب سمجھنا چاہیے کہ وہ توحید کی دلیل کیا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّافِی السَّمٰوٰتِ وَمَافِی الْاَرْضِ اس میں خطاب ہے عقلاء کو کیا تم نے دیکھا نہیں کہ حق تعالیٰ نے کام میں لگا رکھا ہے تمہارے لئے تمام چیزوں کو جو کچھ کہ آسمانوں میں موجود ہے اور جو کچھ کہ زمین میں موجود ہیں۔ یہاں سَخَّرَ لَکُمْ کے معنی وہ مراد نہیں ہیں جو اردو محاورہ میں تسخیر کے لفظ سے متبادر ہوتے ہیں اور وہ معنی محل اشکال بھی ہیں۔ لیکن منشاء اس اشکال کا محض خلط محاورہ ہے اور یہ مزلہ (پھسلنے کی جگہ) ہے اہل علم کے لیے۔ بعض علماء بھی محاورات السنہ میں فرق نہیں کرتے اس لیے ان کو قرآن میں اشکالات پیش آ جاتے ہیں لیکن اہل علم کو پھر بھی یہ غلطی واقع ہوتی ہے کیونکہ ان ٘یں اکثر حضرات محاورات ولغات میں فرق جانتے ہیں۔ البتہ ترجمہ دیکھنے والوں کو یہ غلطی زیادہ پیش آتی ہے کیونکہ وہ محض ترجمہ ہی کو دیکھتے ہیں اور لغات عربیہ ومحاورات قرآن سے وہ بالکل ناواقف ہوتے ہیں۔ پس یہ لوگ اکثر قرآن کے محاورات کو اپنی زبان کے محاورات پر قیاس کر کے غلطی میں پڑ جاتے ہیں۔ سو ممکن ہے کہ کسی نے سَخَّرَ لَکُمْ کا ترجمہ کسی جگہ یہ دیکھا ہو "مسخر کر دیا تھا تمہارے لیے" پھر اس کو محاورہ اردو عربی میں خلط ہو گیا اور اس نے تسخیر کے لفظ کو اردو محاورہ پر محمول کیا ہو اور دوسرے معنی کی طرف اس کا ذہن بھی نہ گیا ہو کیونکہ اس کے ذہن میں تسخیر کے وہی معنی بسے ہوئے ہیں جو محاورہ اردو میں مستعمل ہیں اور یہ قاعدہ ہے کہ انسان کے ذہن میں جو بات بسی ہوئی ہوتی ہے اسی طرح اس کا ذہن منتقل ہوتا ہے۔

مسئلہ تصور شیخ

جیسا کہ ایک مرتبہ حضرت استاد رحمۃ اللہ علیہ نے دیوبند میں مجھے مسئلہ تصور شیخ کی تحقیق لکھ کر دی تھی کہ اس کو صاف کر دو کسی نے حضرت سے اس مسئلہ کی بابت سوال کیا تھا جس کے

جواب میں آپ نے وہ تحقیق لکھ کر دی تھی۔ مسئلہ تصور شیخ صوفیاء کا ایک شغل ہے جو زمانہ قدیم میں رائج تھا لیکن اب محققین نے اس شغل سے منع کر دیا ہے کیونکہ اب عقول سے سلامتی رخصت ہوگئی ہے۔ بہت لوگ اس شغل سے غلطی اور گمراہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں باقی اگر کسی سالک کی فہم سلیم ہو تو اب بھی اس کی تعلیم کا مضائقہ نہیں۔ رفع خطرات وحصول یکسوئی کے واسطے یہ شغل بہت نافع ہے۔ غرض میں اس مسئلہ کی نقل لکھ رہا تھا کہ ایک نو وارد طالب علم جواب تک معقول میں منہمک تھے میرے پاس تشریف لائے اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ کیا لکھ رہے ہو میں نے کہا کہ تصور شیخ کا مسئلہ لکھ رہا ہوں۔ تو آپ بے ساختہ فرماتے ہیں کہ شیخ بوعلی سینا کا۔ بس اس غریب کے نزدیک وہی ایک شیخ تھا اور تو سب جلا ہے ہی تھے سو اس کا منشاء یہی تھا کہ معقول پڑھنے کی وجہ سے ان کے ذہن میں شیخ بوعلی سینا ایسا بسا ہوا تھا کہ شیخ کا لفظ سن کر ادھر ہی ذہن منتقل ہوتا تھا۔ دوسری طرف ان کا خیال نہ گیا کہ کوئی اور بھی شیخ ہو سکتا ہے۔

ایک فطری امر

یہ ایک فطری امر ہے کہ جب علوم میں وسعت نہیں ہوتی تو ہر شخص ہر بات کو اپنے علم ہی پر محمول کرتا ہے یعنی جو بات اس کے ذہن میں بسی ہوئی ہے اسی کی طرف انتقال ذہن ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ناقص الفہم لوگوں نے صفات الٰہیہ کو اپنی صفات پر قیاس کیا' قرآن میں حق تعالیٰ کے لیے وجہ و ید و سمع و بصر و رحمت و غضب وغیرہ کا ذکر دیکھ کر بعض لوگ تجسیم کے قائل ہو گئے اس کا منشاء بھی یہی ہے کہ ان کے ذہن میں صفات بشریہ ہی بسی ہوئی ہیں اس لیے ان الفاظ سے تجسیم کی طرف ان کا ذہن منتقل ہو گیا۔

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ   چو ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

''بہتر فرقوں کی جنگ میں تمام کو معذور سمجھو جب ان کو حقیقت کا پتہ نہ چل سکا ڈھکوسلوں کی راہ اختیار کی۔''

اسی طرح ترجمہ دیکھنے والوں نے تسخیر کا لفظ تعویذ گنڈوں ہی میں سنا ہوگا اس کے سوا اور کسی جگہ اس لفظ کو نہ سنا ہوگا۔ پس قرآن میں سَخَّرَ لَکُمْ کا ترجمہ ''مسخر کر دیا تمہارے واسطے'' دیکھ کر ادھر ہی ذہن منتقل ہوا۔ اب وہ اس معنی کو ذہن میں لے کر علماء کے پاس پہنچے اور اپنے نزدیک بڑا اشکال لے کر آئے کیونکہ تسخیر کے معنی ان کے ذہن میں تابع و مطیع و منقاد کرنے کے ہیں۔

اکثر اشکالات کا سبب

اور ظاہر ہے کہ آسمان وزمین کی تمام چیزیں ہماری تابع ومطیع نہیں ہیں اگر ہم کو بارش کی ضرورت ہو اور ہم بادل سے کہیں کہ برس جا تو وہ ہمارے کہنے سے کبھی نہ برسے گا، وعلیٰ ھذا القیاس اگر سمندر میں طوفان آ رہا ہو اور ہم ہوا سے یہ کہیں کہ تھم جا تو وہ ہمارے کہنے سے کبھی نہ تھمے گی جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زمین وآسمان کی تمام چیزیں اس معنی کے اعتبار سے ہماری مسخر نہیں ہیں۔ اب ان کو قرآن پر اشکال ہوا کہ قرآن میں تو یہ فرمایا ہے کہ تمام چیزوں کو تمہارے واسطے مسخر کیا گیا ہے اور حالت یہ ہے کہ بہت سی چیزیں ہماری تابع ومطیع نہیں ہیں۔ سو بات یہ ہے کہ اس شخص نے تسخیر کا لفظ تو قرآن سے لیا اور معنی اردو محاورہ کے موافق کئے۔ اس سے یہ اشکال پیدا ہوا حالانکہ اس کو چاہیے تھا کہ تسخیر جس زبان کا لفظ ہے اسی زبان کے محاورات کے موافق اس کے معنی لیتا تو یہ اشکال نہ پڑتا۔ خوب سمجھ لیجئے کہ اکثر اشکالات کا سبب یہی ہے کہ لوگ حقائق کو تو سمجھتے نہیں محض غلط محاورات سے شبہ میں پڑ جاتے ہیں۔

ضال کے معنی ومفہوم

چنانچہ ایک شخص تھانہ بھون میں میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ مجھے قرآن پر کچھ شبہ ہے جس کو میں بعد میں بیان کروں گا۔ پہلے آپ اس آیت کا ترجمہ کر دیجئے۔ "وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَهَدٰی" میں سمجھ گیا کہ اس کو کسی ترجمہ کے دیکھنے سے اشکال پیش آیا ہے۔ میں نے کہا سنئے اس آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ "اور پایا خدا تعالیٰ نے آپ کو ناواقف پس واقف بنا دیا" یہ ترجمہ سن کر وہ میرے منہ کو تکنے لگے، میں نے کہا فرمائیے وہ کیا اشکال ہے کہنے لگے اب تو کچھ بھی نہیں۔ سو منشاء اشکال کا یہ تھا کہ بعض مترجمین نے اس آیت کے ترجمہ میں یہ لکھ دیا ہے کہ پایا آپ کو گمراہ الخ اور غالباً اس زمانہ میں اردو کا محاورہ گمراہ کے بارے میں فارسی محاورہ کے موافق ہوگا۔ فارسی میں گمراہ ناواقف کو بھی عام ہے۔ یہی محاورہ اس وقت اردو کا بھی ہوگا۔ اس لیے ان حضرات نے ضال کا ترجمہ اس جگہ گمراہ سے کر دیا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اردو محاورہ فارسی کے مطابق اس وقت بھی نہ ہو لیکن مترجم نے فارسی محاورہ کا لحاظ کر کے یہ ترجمہ کیا ہو اور عوام کی گمراہی کا اندیشہ اس لیے نہ ہوا ہو کہ شاہ عبدالقادر صاحب نے لکھا ہے کہ عوام کو ترجمہ قرآن کسی عالم استاد سے سبقاً سبقاً پڑھنا چاہیے تو ان کو اطمینان تھا کہ پڑھاتے ہوئے ہم بتلا دیں گے کہ اس جگہ فارسی محاورہ کے موافق یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے اس لیے انہوں نے آزادانہ یہ لفظ لکھ دیا

لیکن اب اردو کا محاورہ بدل گیا ہے آج کل گمراہ محض ناواقف کو نہیں کہتے بلکہ یہ لفظ اس زمانہ میں مذمت کی جگہ بولا جاتا ہے یعنی جو شخص بعد وضوح (اللہ تعالیٰ کا راستہ واضح ہونے کے بعد) راہ حق کے اس راہ کو چھوڑ دے۔ نیز آج کل عوام ترجمہ قرآن کو علماء سے سبقاً سبقاً پڑھتے بھی نہیں اس لیے ان کو اشکالات پڑتے ہیں کہ انہوں نے گمراہ کا لفظ دیکھا جو کہ فارسی لفظ ہے اور معنی لیے اردو محاورہ کے موافق اس وجہ سے شبہ پیدا ہوا حالانکہ ان کو لازم تھا کہ جو لفظ جس زبان کا ہے اس کے معنی اسی زبان کے محاورہ کے موافق لیتے۔

گمراہ اور تسخیر کے دو معنی

پس سمجھنا چاہیے کہ گمراہ دو میں ہیں ایک وہ جس کو راستہ معلوم ہی نہ ہو اس معنے کے لیے آج کل اردو میں ناواقف کا لفظ مستعمل ہے۔ (استعمال کیا گیا) دوسرے وہ جو بعد بتلانے کے بھی غلط راستہ پر چلے اور عربی میں لفظ ضال بھی ان دونوں معنوں میں مستعمل ہوتا ہے اس آیت میں ضال اور گمراہ سے پہلے معنی مراد ہیں۔ یعنی ناواقف جس پر کچھ اشکال نہیں کیونکہ اب ترجمہ یہ ہوگا کہ پایا خدا نے آپ کو ناواقف پس واقف بنادیا اور ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام علوم حق تعالیٰ ہی کے بتلانے سے حاصل ہوئے' اس میں کیا اشکال ہے اور دوسرے معنی جو ضال اور گمراہ کے ہیں وہ اس آیت میں ممتنع الارادہ ہیں وہ ہرگز مراد نہیں خود سمجھ لو تو جس طرح غلط محاورہ کی وجہ سے اس میں اشکال پڑا تھا اسی طرح یہاں بھی ممکن ہے کہ کسی کو اشکال پیش آیا ہو کیونکہ تسخیر کے معنی ہمارے محاورہ میں یہ ہیں کہ کسی کو ایسا تابع کردیا جائے کہ جو ہم کہہ دیں وہی کرنے لگے جیسا کہ تسخیر کے لیے تعویذ گنڈے لکھوائے جاتے ہیں اور وہاں تسخیر کے یہی معنی مراد ہوتے ہیں کہ دوسرا شخص ہمارا ایسا منقاد (فرمانبردار و اطاعت شعار) و مطیع ہو جائے کہ جو ہم کہیں وہی کرنے لگے۔ سو سمجھنا چاہیے کہ تسخیر کے صرف یہی معنی نہیں ہیں بلکہ عربی میں تسخیر کے ایک اور معنی بھی ہیں یعنی کام میں لگا دینا اور اس آیت میں یہی دوسرے معنی مراد ہیں پہلے معنی مراد نہیں کیونکہ زمین و آسمان کی تمام چیزیں ہماری منقاد و مطیع نہیں ہیں کہ جو ہم کہہ دیں وہی کرنے لگے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک مہمان تمہارے یہاں آوے اور تم اس کی آسائش کے لیے اپنے نوکروں سے کام لو تو وہ نوکر مطیع تو تمہارے ہیں مگر تم نے اس وقت کام میں اس مہمان کے لگا دیا تو تمہارے کہنے سے یہ پانچ چھ گھنٹے جو نوکر اس کے کام میں لگے رہے یہ بھی تسخیر ہے حالانکہ وہ اس کے نوکر نہیں بلکہ تمہارے مطیع ہیں تم نے صرف ان کو اس کے کام میں لگا دیا ہے اور لغت عربیہ کے موافق کسی کو کسی کے کام میں لگا دینا بھی تسخیر کہلاتا ہے۔ اسی

طرح حق تعالیٰ نے آسمان وزمین وغیرہ کو تمہارے واسطے کام میں لگادیا ہے بس یہی تسخیر ہے۔ اگرچہ یہ چیزیں تمہاری مطیع نہیں بلکہ ممکن ہے کہ ان کو خبر بھی نہ ہو کہ ہم انسان کے کام میں لگے ہوئے ہیں اور انسان کو بھی خبر نہ ہو کہ میرے کام میں کون کون لگا ہوا ہے لیکن چونکہ تم کو ان سے منافع حاصل ہورہے ہیں اور راحت پہنچ رہی ہے اور ان سے تمہارے کام چل رہے ہیں اس لیے دوسرے معنی کے اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہے کہ حق تعالیٰ نے تمام چیزوں کو تمہارے لیے مسخر کردیا ہے یعنی تمہارے کام میں لگادیا ہے۔ پس اب سَخَّرَ لَکُمْ (مسخر کیا تمہارے لیے) میں تسخیر کے معنی وہ ہوئے جو شیخ سعدی نے ان شعروں میں بیان کیے ہیں۔

ابروباد ومہ وخورشید وفلک درکارند   تاتو نانے بکف آری وبغفلت نخوری

ہمہ از بہر تو سرگشتہ وفرمانبردار   شرط انصاف نباشد کہ تو فرمانبری

یعنی بادل اور ہوا اور چاند وسورج سب کے سب اپنے اپنے کام میں اس لیے لگے ہوئے ہیں کہ تم کو روٹی مل جاوے اور پیٹ بھر کے تم خدا کی عبادت میں لگو اور غفلت میں عمر نہ گزارو۔ دوسرے شعر میں از بہر تو کے معنی یہ ہیں کہ تمہارے نفع کے لیے اور تمہاری خاطر سے یہ سب مختلف کاموں میں لگائے ہوئے ہیں اور جو کام جس کے سپرد ہے اس کو اچھی طرح ہر اک بجالا رہا ہے۔ بہر تو کہ یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کو تمہارے تابع کردیا گیا ہے۔ پس از بہر تو سرگشتہ وفرمانبردار کے وہی معنی ہیں جو سَخَّرَ لَکُمْ کے ہیں۔ آگے بطور تفریع کے فرماتے ہیں کہ شرط انصاف نباشد کہ تو فرماں بری۔ یعنی جب یہ تمام چیزیں باطاعت احکام الٰہیہ تکوینیہ تیرے کام میں لگی ہوئی ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ تیرے اوپر سب سے بڑی حق تعالیٰ کی نعمتیں ہیں کہ ان سب کو تیرے کام میں لگا رکھا ہے تو یہ بہت ہی بے انصافی ہوگی کہ احکام الٰہیہ تشریعیہ کی فرمانبرداری نہ کرے کیونکہ جس قدر کسی پر منعم (نعمتیں عطا فرمانے والا) کا احسان زیادہ ہوتا ہے اسی قدر اس پر اس منعم کا شکر زیادہ واجب ہوتا ہے اور اگر وہ ناسپاسی کرے گا تو سب سے زیادہ مورد عتاب بھی ہوگا۔ پس انسان بھی اشرف المخلوقات اسی وقت ہے جبکہ وہ احکام الٰہیہ کا اتباع کرے ورنہ بصورت مخالفت جمادات وحیوانات ہی اس سے اچھے ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کے احکام کی مخالفت تو نہیں کرتے۔

شرف انسان کا مبنیٰ

(انحصار) اس تقریر سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ شرف انسان کے لیے لوازم ذات سے نہیں بلکہ مبنیٰ شرف کا اعمال ہیں۔ بعض لوگ غلطی میں مبتلا ہیں کہ شرف کو لوازم ذات سے سمجھتے ہیں گو

افعال کیسے ہی ہوں۔ بعض لوگ فخر کرتے ہیں کہ ہم شیخ ہیں یا سید ہیں اوراس بنا پر وہ اپنے کو دوسری قوموں سے مطلقاً افضل سمجھتے ہیں گو ان شیخ وسید صاحب کے اعمال جلاہوں سے بھی کبھی بدتر ہوں سوخوب سمجھ لینا چاہیے کہ اگر انسان کے اعمال درست نہ ہوں تو وہ جلاہوں سے تو کیا افضل ہوگا وہ تو جانوروں سے بھی بدتر ہوگا۔ "اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ" (یہ لوگ مثل جانوروں کے ہیں بلکہ ان سے بدتر ہیں) بناءشرف اعمال صالحہ وایمان ہے ورنہ۔

الناس من جهته التمثال اکفاء ابوهم .ادم والام حواء

(یعنی صورت کے اعتبار سے سب آدمی یکساں ہیں کیونکہ سب کے سب آدم وحوا علیہما السلام کی اولاد ہیں۔)

شرف نسب پر فخر جائز نہیں

البتہ اگر اعمال درست ہوں تو پھر شرف نسب بھی ایک درجہ میں باعث فضیلت ہوسکتا ہے لیکن اس پر فخر کرنا کسی حال میں جائز نہیں۔ ہاں تحدیث بالنعمۃ (اظہار نعمت) جائز ہے اور اگر انسان ہوکر اعمال خلاف انسانیت کرے تو پھر فخر وشرف کیسا' ہاں اس صورت میں بھی استعداد تو اس کے اندر موجود ہے اگر اپنی استعداد کی طرف عود کرے تو پھر وہ اشرف المخلوقات ہے اور یہی محمل ہے۔اس آیت کا "وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰھُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ" (ہم نے اولاد آدم کو عزت دی اور ہم نے ان کو خشکی اور دریا میں سوار کیا)

ہر انسان کی استعداد

اس آیت میں جو بنی آدم کو عموماً مکرم کہا گیا ہے اس کا یہی مطلب ہے کہ ہر انسان میں استعداد ایسی موجود ہے کہ اگر وہ اس سے کام لے تو پھر ساری مخلوق سے زیادہ مکرم ومحترم ہوسکتا ہے اور اگر اعمال بد ہوئے تو کچھ بھی نہیں۔ بہرحال انسان پر جب نعم الٰہیہ (اللہ تعالیٰ کی نعمتیں) اور مخلوقات سے زیادہ ہیں تو نافرمانی واعمال بد کی صورت میں وہ دوسروں سے زیادہ مورد عتاب ہوگا کیونکہ قاعدہ ہے کہ جس پر نعمتیں زیادہ ہوتی ہیں اس پر شکر بھی زیادہ واجب ہوتا ہے اور ناشکری کی صورت میں اس پر عتاب بھی دوسروں سے زیادہ ہوگا۔ دیکھو رعایا میں سے ایک معمولی آدمی اگر احکام شاہی کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ اس درجہ مورد عتاب (عتاب کے نزول کا سبب) نہیں ہوتا۔ جیسا کہ ایک درباری آدمی خلاف ورزی احکام پر مورد عتاب ہوتا ہے۔

اشرف المخلوقات کا مطلب

الغرض انسان اشرف المخلوقات تو ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمام مخلوق اس کی غلام ہے بلکہ اس کی مثال محض مہمان جیسی ہے کہ سارا سامان اسی کے واسطے ہوتا ہے مگر وہ مالک نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایک آیت میں اس کی طرف اشارہ ہے اور اشارہ کی صورت یہ ہے کہ اس آیت میں ایک قضیہ شرطیہ ہے جس کے مقدم و تالی میں بظاہر ربط نہیں ہے مگر اس مقدمہ کے ملا لینے کے بعد ربط پیدا ہو جاتا ہے تو جس مقدمہ پر آیت کا مربوط ہونا موقوف ہے اس پر بھی آیت کی دلالت لازمی ہے۔ گو بطریق اقتضاہی سہی۔

تفسیر عجیب

وہ آیت یہ ہے: "**وَلَوْ یُؤَاخِذُ اللّٰہُ النَّاسَ بِمَا کَسَبُوْا مَاتَرَکَ عَلٰی ظَھْرِھَا مِنْ دَآبَّۃٍ**" (اور اگر حق تعالیٰ لوگوں سے مواخذہ فرماتے ان سب اعمال پر جو وہ کرتے ہیں تو روئے زمین پر کسی چلنے والے کو نہ چھوڑتے)

اس آیت میں بظاہر مقدم و تالی میں ربط نہیں کیونکہ آدمیوں کے افعال پر مواخذہ کرنے کا نتیجہ ظاہر میں آدمیوں ہی کی ہلاکت ہوسکتی ہے نہ کہ تمام حیوانات کی ہاں اگر یہ فرماتے "**وَلَوْ یُؤَاخِذُ اللّٰہُ الْخلق بِمَا کَسَبُوْا مَاتَرَکَ علیھا مِنْ دَآبَّۃٍ**" (اور اگر اللہ تعالیٰ مخلوق سے مواخذہ فرماتے ان سب اعمال پر جو وہ کرتی ہے تو روئے زمین پر کسی چلنے والے کو نہ چھوڑتے۔)

یا یوں فرماتے: "**وَلَوْ یُؤَاخِذُ اللّٰہُ النَّاسَ بِمَا کَسَبُوْا مَاتَرَکَ علیھا من الانسان**" (اور اگر حق تعالیٰ لوگوں سے مواخذہ فرماتے ان سب اعمال پر جو وہ کرتے ہیں تو روئے زمین پر کسی انسان کو نہ چھوڑتے)

تو اس صورت میں ربط ظاہر تھا لیکن آیت اس طرح وارد نہیں ہوئی وہاں تو مواخذہ اعمال انسان پر تمام حیوانات اور جاندار چیزوں کی ہلاکت کو مرتب کیا گیا ہے اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ آخر اس کی کیا وجہ کہ انسان کے گناہوں سے تمام مخلوق ہلاک ہو۔ ان دونوں مقدموں میں جوڑ کیا ہے مگر تقریر گذشتہ کے ملانے سے اب اس اشکال کا جواب ظاہر ہے اس آیت کے ساتھ وہ مقدمہ ملا لیجئے کہ انسان کے لیے سب کائنات پیدا ہوئے ہیں۔ بس اب ربط پیدا ہو گیا۔ حاصل یہ ہوا کہ انسان تو اس صورت میں اپنے گناہوں کی وجہ سے ہلاک ہوتا اور بقیہ مخلوقات اس لیے ہلاک ہوئیں کہ وہ سب انسان کے لیے پیدا ہوئیں تھیں اور قاعدہ ہے "الشئی اذا خلاعن غایتہ انتفی" (چیز جب غرض وغایت سے خالی ہوتی ہے تو منتفی ہو جاتی ہے)

جب انسان ہی نہ رہا جس کے لیے یہ سب پیدا ہوئے تھے تو اب ان کے باقی رہنے میں کیا فائدہ' اس لیے یہ بھی ہلاک ہو جائیں گے۔

انسان کی مثال

الغرض انسان اس عالم بمنزلہ مہمان کے ہے اور حق تعالیٰ ہماری عادت کے موافق ہمارے ساتھ برتاؤ کرتے ہیں اور معزز مہمان کے بارے میں ہماری عادت یہ ہے کہ مہمان کے آنے سے پہلے سب کام درست کر دیا جاتا ہے اس کی نشست و برخاست کے لیے کمرہ صاف اور درست کر دیتے' بستر وغیرہ انتظام کر دیتے اور تمام ضروریات کو پہلے سے مہیا کر دیتے ہیں جس سے بعض دفعہ ناواقف دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی ہے کہ اس کمرہ کو اس قدر آراستہ و پیراستہ کیوں کیا جا رہا ہے بلکہ ممکن ہے کہ کوئی نادان یہ سامان دیکھ کر یوں سمجھنے لگے کہ شاید مالک کو اس کمرہ ہی سے زیادہ محبت ہے اسی لیے وہ اس کو زیادہ آراستہ رکھنا چاہتا ہے یا اس سامان ہی کو مقصود سمجھا جائے کہ اس کا محفوظ کرنا اور قرینہ سے رکھنا ہی مالک کو منظور ہے مگر حقیقت شناس سمجھتا ہے کہ نہ اس کمرہ سے مالک کو کوئی خاص محبت ہے نہ اس سامان کی حفاظت مقصود ہے بلکہ یہ سب کچھ کسی کی آمد کے لیے انتظام ہے۔ چنانچہ ہفتہ دو ہفتہ کے بعد جب مہمان پہنچ جاتا اور اس تمام سامان میں تصرف کرنے لگتا ہے اس وقت حقیقت شناس کے خیال کی تصدیق ہو جاتی ہے لیکن نادان یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ مہمان تو ایک یا دو ہفتہ کے بعد آیا اور سامان پہلے مکمل ہو چکا' کمرہ بہت پہلے سے آراستہ ہے تو وجود میں یہ سامان اور کمرہ کی آرائش مقدم ہے اور مہمان کی آمد مؤخر ہے اور مقدم مؤخر سے افضل ہوتا ہے اس لئے یہ سامان مہمان کے تابع نہیں۔ غرض یہ بیوقوف تقدیم وجود ہی کو باعث شرف سمجھتا ہے۔ پھر قاعدہ یہ ہے کہ مہمان کے چلے جانے کے بعد بھی سامان کو فوراً منتشر نہیں کیا جاتا اس سے نادان کو سامان کے مقصود ہونے کا اور زیادہ شبہ ہو جاتا ہے کہ تقدیم فی الوجود و تاخیر فی البقاء اس کی علامت ہے کہ یہ سامان مہمان کے واسطے نہیں ورنہ اس کے چلے جانے کے قبل ہی منتشر کر دیا جاتا مگر عاقل کے نزدیک یہ بھی اسی کی علامت ہے کہ یہ سب سامان مہمان ہی کے واسطے تھا کیونکہ مہمان عزیز کے سامنے سامان کو منتشر نہیں کیا کرتے تاکہ اس کو ایک منٹ کے لیے بھی تکلیف نہ ہو' چلتے وقت تک سارا سامان اسی طرح آراستہ رکھا جاتا ہے اس کی رخصت کے بعد توقف سے سامان کو منتشر کیا کرتے ہیں۔ جب آپ کو معلوم ہو گیا کہ ہماری عادت مہمان کے واسطے یہ ہے تو آپ سمجھئے کہ حق تعالیٰ نے بھی ہمارے ساتھ اسی کے موافق برتاؤ کیا ہے۔ چنانچہ سورہ رحم میں اس کی تفصیل موجود ہے کہ تمام کائنات انسان سے پہلے پیدا ہوئی ہے اور دیگر آیات واحادیث سے

یہ معلوم ہے کہ فنا پہلے انسان کا ہوگا اس کے بعد دوسری کائنات فنا ہوں گی۔ اس سے نادان کو یہ غلطی ہوسکتی ہے کہ اگر انسان مقصود ہوتا اور یہ کائنات اس کے لیے پیدا ہوتی تو اس کی طرف توجہ بھی سب سے پہلے ہوتی حالانکہ اس کو سب کے بعد پیدا کیا گیا ہے مگر یہ محض نادانی ہے۔

خلق عالم کا مقصود

کیونکہ قاعدہ یہی ہے کہ غایت ہمیشہ مقدم فی التصور اور مؤخر فی الظہور رہا کرتی ہے تو انسان کا ظہور مؤخر ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ توجہ بھی اس کی طرف بعد میں ہوئی بلکہ اصل مقصود خلق عالم سے انسان کا ظہور تھا لیکن حق تعالیٰ نے انسان کی آسائش کے لیے نیز اس بات کے ظاہر کرنے کے لیے کہ انسان ایک معزز مہمان ہے اس کی تمام ضروریات کو پہلے سے پیدا کر دیا یعنی بسائط کو۔ لیکن بسیط سے مراد یہ نہیں کہ وہ اشیاء بالکل ترکیب سے خالی ہیں فاقد الاجزاء ہیں بلکہ بسیط سے مراد یہ ہے جس میں ترکیب بصنعۃ العباد نہیں ہے۔ چنانچہ جتنی چیزیں انسان کی ضرورت کی تھیں ان کے اصول ہر وقت عالم میں موجود ہیں انسان کا کام صرف یہ رہ گیا ہے کہ وہ ان میں ترکیب و تحلیل کر کے جو کچھ چاہے تیار کرلے' مثلاً درخت پہلے سے موجود ہیں' انسان نے آ کر اس کو کاٹا اور چیرا پھر لکڑی تختے کڑیاں وغیرہ بنالیں' خدا نے گیہوں پیدا کر دیا جس کو پیس کر آٹا بنایا جاتا اور پانی میں ملا کر گوندھا جاتا اور آگ پر رکھ کر روٹی پکائی جاتی ہے۔ اسی طرح جانوروں سے دودھ نکلتا اور اس سے گھی بنایا جاتا اور اس میں مٹھائی وغیرہ ملا کر حلوا تیار کر لیا جاتا ہے۔

انسان کا کام

اسی طرح تمام چیزوں میں غور کر لیجئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ انسان کا کام صرف تحلیل و ترکیب ہے اعدام و ایجاد انسان کا کام نہیں یعنی نہ وہ کسی چیز کو اپنے پاس سے وجود دے سکتا ہے نہ کسی کے وجود کو سلب کر سکتا ہے لیکن بعض لوگ تحلیل و ترکیب ہی کو ایجاد و اعدام سمجھتے ہیں اس لیے اپنے کو موجد کہنے لگے۔ چنانچہ نمرود کو یہی غلطی پیش آئی تھی کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اس نے وجود صانع پر دلیل کا مطالبہ کیا اور ابراہیم علیہ السلام نے اس کو جواب میں ایک کھلی ہوئی دلیل بیان فرمائی کہ ''رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیِ وَیُمِیْتُ'' (کہ میرا رب وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے)

تو نمرود کہنے لگا کہ میں بھی جلاتا اور مارتا ہوں یہ کہہ کر اس نے قید خانہ سے دو قیدیوں کو بلایا جن میں سے ایک واجب القتل تھا اس کو تو رہا کر دیا اور ایک قیدی رہائی کے قابل تھا اس کو قتل کر دیا۔

حالانکہ یہ احیاء واماتت نہ تھا کیونکہ احیاء کے معنی حیات بخشنے کے ہیں۔جس قیدی کو نمرود نے رہا کیا تھا اس کو پہلے سے حیات حاصل تھی' نمرود نے اس کو اپنے گھر سے حیات نہ دی تھی اور اماتت ازہاق روح کا نام ہے اور جس قیدی کو اس نے قتل کیا تھا اس میں نمرود کا فعل صرف اس قدر تھا کہ اس نے اس کی گردن جدا کر دی۔ اب یہ عادۃ اللہ ہے کہ انگلی یا ہاتھ کے جدا کر دینے سے جان نہیں نکلتی اور گردن کے جدا کر دینے سے جان نکل جاتی ہے۔ پس گردن کا جدا کرنا نمرود کا فعل تھا اس کے بعد جان خود بخود عادۃ اللہ کے موافق نکل گئی' انسان کا اس میں کچھ دخل نہ تھا۔ پس نمرود کی یہ حماقت تھی کہ اس نے تفریق اجزاء وعدم تفریق اجزاء کو احیاء واماتت کو سمجھا۔ جب ابراہیم علیہ السلام نے اس کی کور مغزی دیکھی تو آپ نے دوسری دلیل کی طرف اس کو **عجز عن الفهم** (فہم کے عاجز ہونے) کے سبب نہ کہ اپنے **عجز عن الجواب** کے سبب انتقال کیا کیونکہ آپ نے یہ دیکھا کہ اگر میں اس کا جواب دوں اور احیاء واماتت کی حقیقت بیان کروں اور یہ بتلاؤں کہ تیرا فعل احیاء واماتت میں داخل نہیں تو یہ کوڑ مغز اس فرق کو نہ سمجھ سکے گا۔ اس لیے آپ نے دوسری دلیل اس سے بھی زیادہ واضح بیان فرمائی وہ یہ کہ میرا خدا وہ ہے جو آفتاب کو مشرق سے نکالتا ہے اگر تو خدا کا منکر ہے تو مغرب سے آفتاب کو نکال اس پر وہ کافر مبہوت ہو کر ان کا منہ تکنے لگا اور اس کا کچھ جواب نہ دے سکا۔

اہل مناظرہ کے اشکال کا جواب

یہاں سے اہل مناظرہ کے ایک اشکال کا جواب بھی ظاہر ہو گیا۔ اشکال یہ ہے کہ فن مناظرہ کا مسئلہ ہے کہ ایک دلیل سے دوسری دلیل کی طرف انتقال کرنا مناظرہ کو جائز نہیں اور یہ ایک مسئلہ عقلیہ ضرور یہ ہے کیونکہ اگر ایک دلیل سے دوسری دلیل کی طرف انتقال جائز کر دیا جائے تو اس طرح سلسلہ مناظرہ کبھی ختم ہی نہ ہوگا۔ تم نے ایک دلیل بیان کی خصم نے اس کو توڑ دیا' تم نے اس انتقال کر کے دوسری دلیل بیان کر دی اس نے اس کو بھی توڑ دیا' تم نے تیسری دلیل بیان کر دی تو یہ تو غیر متناہی سلسلہ ہو جائے گا۔ پھر حق کبھی ظاہر ہی نہ ہو سکے گا اس لیے علماء مناظرہ نے انتقال الی دلیل آخر کو ناجائز مانا ہے اور کوئی شخص اس اشکال کا یہ جواب نہ سمجھے کہ یہ تو علم مناظرہ کا ایک مسئلہ ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نبی ہیں ان کے ذمہ ہمارے اصول کا ماننا کب لازم ہے بلکہ ہم کو ہی ان کی بات کا ماننا لازم ہے۔ جواب ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ محض ہمارے اصول مسلمہ کی قسم سے نہیں بلکہ عقلی مسئلہ ہے جس کا تسلیم کرنا فی نفسہ ضروری ہے۔ پس اب اس اشکال کا صحیح جواب سنئے۔ بات یہ ہے کہ مناظرہ میں انتقال الی دلیل آخر اپنی مصلحت

سے تو نا جائز ہے لیکن خصم کی مصلحت سے جائز ہے۔ مثلاً ہم نے ایک دلیل غامض بیان کی جس کو خصم نہیں سکتا تو اب دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ دلیل غامض کو سہل عنوان سے بیان کیا جائے سو اگر اس میں تطویل زیادہ نہ ہو نیز مخاطب تسہیل کے بعد سمجھنے پر قادر ہو تب تو اس کی تسہیل کر دینی چاہیے اور اگر تسہیل میں تطویل ہو یا مخاطب ایسا بلید ہو کہ تسہیل کے بعد بھی دلیل غامض کو نہ سمجھ سکے تو اب دوسری صورت یہ ہے کہ اس دلیل غامض سے انتقال کر کے دوسری واضح دلیل بیان کر دی جائے جس کو خصم بخوبی سمجھ سکے تو ابراہیم علیہ السلام نے اس صورت میں مخاطب کی مصلحت سے انتقال کیا تھا کیونکہ آپ نے دیکھا کہ مخاطب بڑا ہی کوڑ مغز ہے اس لیے اس سے کیا امید تھی کہ وہ اماتت واحیاء کی حقیقت کو سمجھے گا اور جھک جھک نہ کرے گا۔ اگر نمرود کو کچھ بھی علم وفہم ہوتا تو اس کی بات کا جواب بہت سہل تھا۔ ابراہیم علیہ السلام یہ کہہ سکتے تھے کہ ازہاق روح تیری قدرت میں نہیں تیرا کام صرف گردن جدا کر دینا تھا۔ اس کے بعد روح کا نکل جانا عادۃ اللہ کے موافق ہوا' تیرا اس میں کچھ دخل نہیں کیونکہ قاعدہ عقلیہ ہے۔ "القدرة تتعلق بالضدين" کہ قدرت ضدین کے ساتھ متعلق ہوا کرتی ہے جو شخص جان نکالنے پر قادر ہوگا وہ اس کے روکنے پر بھی ضرور قادر ہوگا۔ پس تفریق گردن کے بعد اگر زہوق روح تیرے اختیار سے تھا تو اس پر بھی تجھ کو قدرت ہونی چاہیے کہ ایک شخص کی گردن جدا کر کے اسکی جان کو نہ نکلنے دے اگر تو اس پر قادر ہے کہ گردن کاٹنے کے بعد جان کو روک لے اور نہ نکلنے دے تو ایسا بھی کر دکھا اس کا جواب اس کے پاس ہرگز کچھ نہ تھا۔ پس حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پہلی دلیل کمزور نہ تھی اور نہ اس کی کمزوری کی وجہ سے آپ نے دوسری دلیل کی طرف انتقال کیا تھا بلکہ محض اس وجہ سے انتقال کیا کہ پہلی دلیل کے سمجھنے کی اس کوڑ مغز سے امید نہ تھی۔ غرض انسان کا کام محض تحلیل وترکیب ہے۔

موجد کا کام

ایجاد واعدام اس کا کام نہیں اور جو کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص فلاں چیز کا موجد ہے نہ اطلاق محض مجازی ہے کیونکہ جتنی ایجادیں عالم میں ہوتی ہیں ان کے اجزاء بسیط پہلے سے موجود ہوتے ہیں ان اجزاء بسیطہ کو خدا تعالیٰ کے سوا پیدا نہیں کیا' موجد کا کام صرف اس قدر ہے کہ ان سے ان اجزاء میں ترکیب دیدی ہے۔ پس ظاہر میں اس کو صرف ہیئت ترکیبیہ اجتماعیہ کا موجد کہہ سکتے ہیں لیکن حقیقت میں اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ ہیئت اجتماعیہ کا مؤجد بھی مجازاً ہی ہے کیونکہ یہ قاعدہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ قدرت ضدین سے متعلق ہوا کرتی ہے پس اگر ہیئت اجتماعیہ کا وجود اس

شخص کے اختیار سے ہوا ہے تو لازم ہے کہ اس کو اس پر بھی قدرت ہو کہ اجزاء بسیطہ کو ملا دینے کے بعد ان پر ہیئت اجتماعیہ کو طاری نہ ہونے دیں حالانکہ کسی شخص کو اس پر قدرت نہیں بلکہ جب چند اجزاء کو باہم ترکیب دیا جائے گا ہیئت اجتماعیہ لزوماً طاری ہو جائے گی' خواہ تم چاہو یا نہ چاہو' یہ اس کی صاف دلیل ہے کہ انسان کا کام بجز ترکیب کے اور کچھ نہیں نہ وہ بسیط کا موجد ہے نہ مرکب نہ ہیئۃ اجتماعیہ کا۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے لوہے اور مقناطیس کو باہم نزدیک کر دیا جائے کہ نزدیک کر دینا تو تمہارا فعل ہے اس کے بعد مقناطیس خود بخود اس کو جذب کر لے گا خواہ تم کتنا چاہو کہ جذب نہ کرے اب تمہارا کوئی اختیار نہیں۔ اسی طرح ترکیب کے بعد ہیئۃ اجتماعیہ خود بخود فائض ہو جاتی ہے اب تم کو کوئی نہیں پوچھتا کہ تم ہو کون۔ ہاں حق تعالیٰ کو قدرت ہے کہ ترکیب کے بعد بھی ہیئۃ اجتماعیہ کو فائض نہ کرے۔ چنانچہ ایک پتھر ایسا ہے کہ جب اس کو سرکہ میں ڈال دیا جائے تو وہ بھاگتا ہے۔ اب غور کیجئے کہ مٹی کو سیال چیز میں ڈال دینے کا مقتضا تو یہ ہے کہ وہ ساکن ہو جائے اور دونوں مجتمع رہیں مگر یہاں خلاف مقتضا اس میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور بدون کسی مخلوق کے صنع کے وہ جدا ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اس ہیئت اجتماعیہ کے آثار کی حالت ہے چنانچہ حق تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو آگ سے بچالیا حالانکہ اس اجتماع کا اثر اور مقتضا یہ تھا کہ ابراہیم علیہ السلام جل کر خاکستر ہو جاتے مگر حق تعالیٰ نے اس اثر کو رد کر دیا اور اس کے خلاف دوسرا اثر پیدا کر دیا۔ اسی طرح یونس علیہ السلام کو مچھلی کے پیٹ میں عرصہ تک زندہ رکھا اور ان کو ہضم نہ ہونے دیا حالانکہ اس ترکیب و اجتماع کا اثر و مقتضا یہ تھا کہ وہ مچھلی کے معدہ میں جا کر ہضم ہو جاتے اور زندگی ختم ہو جاتی۔ پس حقیقت میں ایجاد و اعدام حق تعالیٰ ہی کا کام ہے انسان کا کام صرف تحلیل و ترکیب ہے۔ پس حق تعالیٰ نے انسان کی تمام ضروریات کو اس کے پیدا ہونے سے پہلے ہی پیدا کر دیا تھا کہ جب وہ دنیا میں آیا ساری ضرورت کی چیزیں اس کو تیار ملیں' صرف تحلیل و ترکیب کرنا اس کا کام رہ گیا۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں:

یا نبودیم و تقاضا ما نبود لطف تو ناگفتہ ما می شنود

(نہ ہم تھے نہ ہمارا تقاضا تھا آپ کا لطف و کرم بلا کہے ہوئے سنتا تھا)

ممکن ہے کہ اس پر کوئی صاحب یہ فرمائیں کہ جب خدا تعالیٰ کو انسان کی ایسی خاطر منظور تھی اور وہ معزز مہمان تھا تو پھر اس کو یہ تکلیف بھی کیوں دی گئی کہ وہ ترکیب و تحلیل کرتا پھرے۔ بس تمام چیزیں کامل و مکمل اس کے واسطے موجود ہوتیں تو بہتر تھا۔ درختوں پر بجائے گیہوں کے روٹی لگا

کرتی، کپاس کے بجائے بنے بنائے کپڑے پیدا ہوا کرتے، وعلیٰ ہذا القیاس میں کہتا ہوں کہ اس میں حق تعالیٰ نے طبیعت انسانی کی بہت زیادہ رعایت کی ہے کیونکہ اس وقت تو گیہوں الگ پیدا ہوتا ہے اور چنا الگ تم کو اختیار ہے کہ خالص گیہوں کی روٹی پکالو یا خالص چنے کی یا دونوں کو ملا کر نیز یہ بھی اختیار ہے کہ روٹی پکاؤ یا گیہوں ابال کر کھاؤ یا اس کا ستو بناؤ، سوہن حلوہ تیار کرو، غرض صدہا قسم کی چیزیں بنا سکتے ہو اور اگر بجائے گیہوں چنے کے دونوں کی روٹیاں پکی پکائی لگا کرتیں تو بس ایک ہی غذا تم کو نصیب ہوتی یہ رنگ برنگ کی غذائیں تم تیار نہ کر سکتے۔ اسی طرح روئی کے پیدا ہونے میں حکمت یہ ہے کہ انسان اپنی مرضی کے موافق اس کا جیسا چاہے لباس تیار کرسکتا ہے۔ خواہ خالص سوت کا کپڑا بنائے یا سوت اور ریشم کو ملا کر یا اون اور سوت کو ملا کر نیز یہ بھی اختیار ہے کہ کرتہ بنائے یا پاجامہ یا قمیص یا اچکن اور اگر سئے سلائے کپڑے درختوں پر لگا کرتے تو بس وہ اسی کام آتے جس کام کے لیے وہ موضوع ہوتے، دوسرے لباس مختلف قسم کے تیار نہ ہوسکتے اور اگر ایسا ہوسکتا تو انسان ایک قسم کی غذا اور ایک ہی قسم کے لباس سے اکتا جاتا۔ چنانچہ اس کا تجربہ ایک زمانہ میں ہو چکا ہے۔ حق تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو من وسلویٰ عطا فرمایا تھا کہ بے محنت و مشقت دونوں وقت ان کو بیٹھے بٹھلائے غذا مل جاتی تھی اور غذا بھی بہت نفیس تھی مگر ان سے ایک غذا پر رہا نہ گیا، آخر کو اکتا کر کہنے لگے:

یٰمُوْسٰی لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّکَ یُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا.

''اے موسیٰ ہم سے ایک کھانے پر ہرگز صبر نہ ہو سکے گا۔ پس اپنے پروردگار سے دعا کیجئے کہ ہمارے لیے وہ چیزیں پیدا کرے جو زمین سے اگا کرتی ہیں، یعنی ترکاریاں اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز۔''

قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَکُمْ مَّا سَاَلْتُمْ.

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کیا تم عمدہ چیز کے بدلے ادنیٰ کو لینا چاہتے ہو جاؤ کسی شہر میں اترو وہاں جو کچھ تم مانگتے ہو مل جائے گا تو صاحبو! اگر حق تعالیٰ پکی پکائی روٹی آسمان سے اتارا کرتے تو آپ بھی چند روز میں بنی اسرائیل کی طرح اس سے گھبرا جاتے اس لیے انسان کی راحت اسی میں ہے کہ ترکیب وتحلیل کا کام اس پر چھوڑ دیا گیا کہ جس طرح چاہے اپنی طبیعت کے

موافق جوڑ توڑ کرتا رہے جیسا کہ قاعدہ ہے کہ بعض لوگوں کو دوسروں کے ہاتھ کا بنایا ہوا پان مزے نہیں لگتا تو ان کی راحت اور ان کا اعزاز یہی ہے کہ میزبان ان کے آگے پان دان لا کر رکھ دے کہ لو بھائی تم اپنے ہاتھ سے جیسا چاہو بنالو۔ پس جس طرح پان دان سامنے رکھ دینے کو ہر شخص غایت اعزاز سمجھتا ہے اور کوئی یہ نہیں کہتا کہ اس شخص نے میزبان کی تحقیر کی کہ اس کو پان لگانے کی تکلیف دی اسی طرح تحلیل وترکیب کو انسان پر چھوڑ دینے سے تکلیف اور بیقدری کا شبہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ حقیقت میں یہ بھی غایت اعزاز ہے کہ حق تعالیٰ نے انسان کو ایک سی غذا ایک سے لباس پر مجبور نہیں کیا بلکہ مختلف اقسام وانواع کے استعمال کی اس کو گنجائش دی خاص خاص شرائط وحدود کے ساتھ جن کی تفصیل کتب فقہ میں مذکور ہے۔

متعدد عبادات میں حکمت

کیونکہ انسان ایک حالت سے بہت جلد اکتا جاتا ہے اور یہی حکمت ہے عبادات کے تنوع و تعدد میں بھی یعنی حق تعالیٰ نے ہمارے لیے ایک ہی قسم کی عبادت مشروع نہیں فرمائی بلکہ رنگ برنگ کی عبادات ہیں۔ ایک وقت نماز ہے دوسرے وقت تلاوت قرآن ہے ایک وقت تدریس و تعلیم ہے، کبھی وعظ ونصیحت ہے، کبھی استغفار درود شریف ہے اور پھر ہر حالت کے مناسب الگ الگ دعا بتلائی گئی ہے۔ وعلیٰ ہذا القیاس تاکہ ایک عبادت سے انسان اکتا نہ جائے اور جدید عبادت سے اس کا شوق بڑھتا رہے۔

کسی ایک حالت پر انسان کو قرار نہیں

دیکھئے پہلے رمضان سردی میں تھا تو لوگ اس سے اکتاتے تھے کہ میاں یہ بھی کوئی روزہ ہے، ادھارے ادھارے بیٹھے ہیں نہ بھوک ہے نہ پیاس ہے، ذرا سا دن ہے خبر ہی نہیں ہوتی کہ روزہ بھی تھا یا نہیں، روزہ تو گرمی کے لطف کا ہے کہ ذرا خبر بھی ہو کہ ہاں روزہ ہے، پھر افطار میں شربت اور ٹھنڈے پانی کا اور بعض جگہ برف کا اہتمام ہوتا ہے، ٹھنڈے کنوؤں کی تلاش ہوتی ہے کہ جس کنویں کا پانی سب سے زیادہ ٹھنڈا ہو اس کا پانی لایا جاتا ہے، سردی میں تو یہ باتیں ہوتی تھیں اب جب رمضان گرمی میں آیا تو اس سے بھی گھبرا گئے۔ چنانچہ اب رمضان آنے والا ہے معلوم ہو جائے گا کہ کتنے آدمی روزہ رکھتے ہیں۔ اب یوں کہتے ہیں کہ صاحب رات تو ذرا سی ہوتی ہے، تراویح پڑھنے کے بعد سونے کا موقع ہی نہیں ملتا، ادھر آنکھ لگی ادھر سحری کا وقت آیا، اتنی دیر میں افطار کے وقت کا کھانا پانی بھی ہضم نہیں ہوتا اب سحری میں کیا کھالیں، بس سحری کا لطف تو

گرمیوں کی رات میں کچھ بھی نہیں۔ پھر دن ایسا پہاڑ کہ گھنٹے گنتے گنتے تھک جاؤ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا، پیاس کے مارے کلیجہ نکلا جاتا ہے پھر افطار کے وقت پانی اس بری طرح پیا جاتا ہے کہ تراویح پڑھنا محال ہو جاتا ہے بس گرمیوں میں نہ تراویح کا لطف ہے نہ روزہ کا لیجئے اب گرمیوں کے رمضان کی برائی ہونے لگی۔

انسان کی چلبلی طبیعت

غرض انسان کو کسی ایک حالت پر قرار و چین نہیں بس اس کو تو جنت ہی میں جا کر آرام ملے گا۔ مگر وہاں بھی اس کا چلبلا پن نہ جائے گا، ایک خدا کے بندے کو بیٹھے بٹھلائے کھیتی کا شوق ابھرے گا بھلا اس سے کوئی پوچھے کہ جب تجھے بیٹھے بٹھلائے بے مانگے ہر چیز مل رہی ہے پھر تجھے کھیتی کی ضرورت کیا ہے کچھ نہیں صرف وہی چلبلا پن کہ اس سے ایک حالت میں رہا نہیں جاتا، جنت میں جو بے محنت و مشقت کھانے کو ملے گا تو آپ کو اپنی وہی حالت یاد آئے گی کہ ایک وقت میں ہم کھیتی کر کے کھایا کرتے تھے یوں اناج بوتے ہی چلاتے کھیتی کاٹتے تھے۔ اب وہ بات ہی نہیں اس لیے اس کو کھیتی کا شوق ہوگا۔ چنانچہ یہ شوق بھی اس کا پورا کیا جائے گا۔ ادھر دانہ پڑا ادھر پیدا ہوا اور پکا اور تھوڑی دیر میں غلہ کا ڈھیر سامنے آ جائے گا۔ پھر ارشاد ہوگا: "**دونک یا ابن ادم فلن یشبعک شیئ**" کہ اے ابن آدم لے (یہ کھیتی بھی تیار ہوگئی) مگر تجھے کوئی چیز سیر نہیں کر سکتی۔ قیاس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص کوئی گاؤں کا رہنے والا کسان ہوگا جسے جنت میں بھی کھیتی ہی یاد آئے گی یا ممکن ہے کوئی ایسا شخص ہو جسے دنیا میں بھی سلطنت و راحت ہی ملی ہو اور جنت میں تو جو کچھ ہے سلطنت ہی سلطنت ہے تو اس شخص کو دنیا میں کھیتی کا موقع نہ مل سکا اس نے یہ چاہا کہ لاؤ جنت میں اس آرزو کو پورا کرلوں کیونکہ ہم نے سنا ہے کہ بعض دفعہ سلاطین غایت تکلیف اور ساز و سامان و فرش و تخت سے گھبرا جاتے ہیں، غرباء کے گھر جا کر بوریئے اور ٹوٹے ہوئے پلنگ پر بیٹھنے اور موٹی جھوٹی روٹی ان سے مانگ کر کھاتے تھے، یہ کہتے تھے کہ عیش و آرام اور تکلف سے طبیعت گھبرا گئی اس لیے سادگی کا مزہ چکھنے کے لیے کبھی کبھی جی چاہا کرتا ہے اب آپ نے دیکھا کہ انسان کی طبیعت ایسی چلبلی ہے کہ جس آسائش و آرام کا یہ ساری عمر طالب رہتا ہے جب وہ میسر ہو جاتا ہے تو اس سے بھی اس کی طبیعت اکتا جاتی ہے۔

انسان کی حالت

اسی واسطے خدا تعالیٰ نے انسان کی مرضی و نامرضی پر کچھ نہیں رکھا بلکہ سب کام اپنے قبضے میں رکھا ہے کیونکہ انسان کی حالت بچوں کی سی ہے۔ اب بچے اگر ایسی ویسی فرمائش کرنے لگیں تو کیا

باپ ان کی ہر فرمائش کو پورا کر دیا کرتا ہے ہرگز نہیں بلکہ باپ اپنی مرضی کے موافق کام کرتا ہے، بچوں کی مرضی پر اگر ہر کام چھوڑ دیا جائے تو اس میں ان کی ہلاکت اور بعض دفعہ اسی خلاف حکمت ہونے کے سبب بچوں کی ضدیں اور فرمائشیں پورا کرنا بھی بہت مشکل ہو جاتا ہے بعض دفعہ یہ ایسی ضدیں کرتے ہیں کہ والدین کو تنگ کر دیتے ہیں۔

بچوں کی ضد

چنانچہ ہمارے یہاں ایک بچہ نے رونا شروع کیا، پوچھا کیوں روتا ہے کہنے لگا مٹھائی لوں گا، خیر مٹھائی دیدی، پھر رونا شروع کیا، بھائی اب کیوں روتا ہے، بولا دودھ لوں گا، دودھ بھی آ گیا۔ اسی طرح بہت سی سوچ سوچ کر فرمائشیں کیں اور پوری کر دی گئیں اس کو اس وقت مقصود والدین کو عاجز کرنا تھا۔ پھر اس نے رونا شروع کیا، پوچھا اب کیوں روتا ہے، کہنے لگا کہ ہائے یہ چاند کیوں نکل رہا ہے اس کو چھپا دو۔ اب اس ضد کو کوئی کیونکر پورا کر سکتا ہے، آخر ماں باپ عاجز ہو گئے۔

تین ہٹوں کا پورا کرنا مشکل ہے

اسی واسطے بیربل اور اکبر میں ایک مرتبہ گفتگو ہوئی تھی، اکبر کہنے لگا کہ یہ جو مشہور ہے کہ تین ہٹوں کا پورا کرنا مشکل ہے، ایک راج ہٹ، ایک تریا ہٹ، ایک بالک ہٹ۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا، راج ہٹ اور تریا ہٹ کا دشوار ہونا تو مسلم ہو سکتا ہے کیونکہ بادشاہ اور عورت عاقل ہوتے ہیں ممکن ہے کہ وہ کوئی ایسی فرمائش کر بیٹھیں جس کا پورا کرنا دشوار ہو لیکن بالک ہٹ کا دشوار ہونا مسلم نہیں کیونکہ بچوں کی ایسی کیا فرمائش ہوگی جو پوری نہ ہو سکے۔ بیربل نے کہا کہ سب سے زیادہ مشکل تو بالک ہٹ ہی ہے اس کو بڑا ہی عاقل پورا کر سکتا ہے ہر شخص پورا نہیں کرتا۔ اکبر نے کہا کہ اس کے لیے عقل کی کیا ضرورت ہے، بچوں کی فرمائش کو ہر شخص پوری کر سکتا ہے۔ بیربل نے کہا کہ اچھا ہم بچہ بنتے ہیں آپ میری ضد کو پورا کریں، اس نے کہا اچھا اب بیربل بچہ بنا اور بچوں کی طرح سسکنے لگا (اکبر کا دربار ایسا ہی ہوتا تھا وہاں یہی خرافات اکثر رہا کرتی تھیں) غرض اکبر نے پوچھا کہ کیوں روتے ہو، بیربل نے کہا ہم تو ہاتھی لیں گے، اکبر نے فوراً ہاتھی خانہ سے ایک ہاتھی منگوا دیا اور کہا سبحان اللہ آپ نے بڑی مشکل فرمائش کی، بیربل پھر رونے لگا پوچھا اب کیوں روتا ہے کہ ہم تو کلھیا لیں گے، اکبر نے فوراً بازار سے ایک کلھیا بھی منگا دی اور کہا بس یہی بڑی مشکل ضد تھی، بیربل پھر رونے لگا پوچھا اب کیوں روتا ہے، کہنے لگا کہ اس ہاتھی کو اس کلھیا

میں رکھ رکھ دو۔اب تو اکبر کی عقل حیران ہوگئی کہ واقعی اس ضد کا پورا کرنا مشکل ہے' آخر عاجز ہوگیا اور مان گیا کہ بچوں کی فرمائش کا پورا کرنا مشکل ہے پھر اس نے بیربل سے کہا کہ یہ جو تم نے کہا تھا کہ عاقل بچوں کی ضد بھی پوری کر سکتا ہے۔ اب میری سمجھ میں جو بات نہیں آتی اس فرمائش کو عاقل کیونکر پورا کردے گا۔ بیربل نے کہا کہ اگر عقل ہو تو سب آسان ہے' اکبر نے کہا اچھا اب ہم بچہ بنتے ہیں تم ہماری ضد کو پورا کرو۔ اس نے کہا بہتر ہے' چنانچہ اب اکبر نے سسکنا شروع کیا' بیربل نے کہا کیوں روتے ہو' آپ نے کہا ہم تو ہاتھی لیں گے (میاں کو بس یہی سبق یاد تھا گھر کی عقل تو تھی ہی نہیں) بیربل نے ایک آدمی کو بھیجا کہ بازار سے جا کر مٹھائی یا مٹی کا ایک ہاتھی ذرا سا لے آؤ' چنانچہ لایا گیا اور اکبر کو دیدیا گیا' اب آپ نے پھر رونا شروع کیا' پوچھا اب کیوں روتے ہو کہنے لگا ہم تو کلھیا لیں گے اس نے کلھیا بھی منگادی' پھر آپ رونے لگے پوچھا اب کیوں روتے ہو کہنے لگا کہ اس ہاتھی کو کلھیا میں رکھ دو' اس نے اٹھا کر رکھ دیا' بس اکبر خاموش ہوگئے۔ بیربل نے کہا کہ یہ آپ کی عقل مندی تھی کہ بچہ کے ہاتھی مانگنے پر آپ نے اتنا بڑا ہاتھی منگادیا۔ آپ کو چاہیے تھا کہ بچہ کی فرمائش کو اس کی حیثیت کا لحاظ کر کے پورا کرتے۔ الغرض بچے بڑی الٹی الٹی ضدیں کیا کرتے ہیں' بعض دفعہ بچہ یہاں تک چاہتا ہے کہ آگ پکڑ لوں' سانپ کو ہاتھ میں لے لوں مگر ماں باپ اس کی اس خواہش کو پورا نہیں کر دیتے۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت عظیمہ

اسی طرح یہ بھی خدا کی رحمت عظیمہ ہے کہ حق تعالیٰ کو ہر فرمائش کے پورا کرنے پر قادر ہے۔ پھر بھی انسان کی خواہش کا اس لیے اتباع نہیں کرتا کہ اس کو حکمت ہی کی خبر نہیں بلکہ انسان کی خواہش کو حق کے تابع رکھا گیا ہے ورنہ بڑا فساد عظیم برپا ہوتا۔ چنانچہ حق تعالیٰ خود ارشاد فرماتے ہیں:

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَ هُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ الایتہ

(اگر حق تعالیٰ ان کی خواہشات کا اتباع کرتے تو زمین و آسمان سب فاسد ہو جاتے)

پس انسان کی مصلحت اسی میں ہے کہ اس کو اسی کی مرضی پر نہیں چھوڑا گیا ورنہ یہ اپنے ہاتھوں ہلاک ہو جاتا۔

مستقبل کی باتوں کے پہلے جاننے کا انجام

ایک شخص نے موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی تھی کہ حق تعالیٰ سے دعا کر دیجئے کہ مجھ کو اپنے متعلق آنے والی بات کی خبر ہو جایا کرے۔ موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی کہ اس شخص

سے فرما دیجئے کہ تیری مصلحت اسی میں ہے کہ تجھ کو آنے والی بات کی اطلاع نہ ہو' تیری مصلحتوں کو تجھ سے زیادہ ہم جانتے ہیں آپ نے اس شخص کو اطلاع کر دی' اس نے پھر اصرار کیا کہ میرا جی بہت چاہتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے پھر دعا کی جو قبول ہوگئی۔ چنانچہ اس کو آئندہ واقعات کی اطلاع پہلے ہی ہو جایا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ اس کو معلوم ہوا کہ میرا گھوڑا مرنے والا ہے' اس نے جلدی سے بازار میں جا کر اسے فروخت کر دیا اور نفع سے فروخت کیا اور اپنے جی میں بہت خوش ہوا کہ دیکھو اس علم سے میرا کتنا بڑا نفع ہوا کہ جانور میرے گھر میں نہیں مرا' دوسرے کے یہاں جا کر مرے گا اور مجھے اس کی قیمت مع شئی زائد وصول ہوگئی۔ پھر اس کو یہ معلوم ہوا کہ اب میرا غلام مرنے والا ہے اس نے غلام کو بھی جا کر فروخت کر دیا اور اپنے دل میں بہت ہی خوش ہوا۔ پھر یہ معلوم ہوا کہ اب میں خود مرنے والا ہوں اب تو بڑا پریشان ہوا کہ اپنے کو کہاں جا کر چھپا دوں۔ آخر موسیٰ علیہ السلام کے پاس دوڑا ہوا آیا کہ شاید وہ اس مصیبت سے نجات کی کوئی صورت بتلا دیں۔ موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی کہ اس شخص سے فرما دیجئے کہ اس نے اپنی موت اپنے ہاتھوں خریدی ہے۔ بات یہ ہے کہ اس کی تقدیر میں یہ لکھا ہوا تھا کہ اس عرصہ میں اس کے گھر پر ایک مصیبت نازل ہوگی ہم نے اول اس کے جانور پر ڈالنا چاہا' اس نے ہوشیاری کر کے اس کو اپنے سے الگ کر دیا' پھر ہم نے اس کے غلام پر اس کو ٹالنا چاہا اس نے اس کو بھی بیچ کر نفع حاصل کر لیا' اب خود یہی رہ گیا ہے لہٰذا اب وہ مصیبت اس کے اوپر ضرور آوے گی ٹل نہیں سکتی۔ اس سے کہہ دیجئے کہ بس اب حسن خاتمہ کی دعا کرے موت ضرور آوے گی۔ تو آپ نے دیکھا کہ انسان کی مرضی پر کام چھوڑنے کا کیا نتیجہ ہوا کہ خود اپنے ہاتھوں ہلاکت مول لے لی۔ بس حق تعالیٰ کی یہی بڑی رحمت ہے کہ سب کام اپنے قبضہ میں رکھا اور ہم کو کچھ بھی خبر نہیں دی کہ کل کو کیا ہونے والا ہے۔ لوگ علم غیب کی تمنا کیا کرتے' کشف کو کمال سمجھتے ہیں مگر دیکھ لیجئے کہ یہ ایسی چیز ہے کہ بعض دفعہ وبال جان ہو جاتی ہے' غیب کا علم محیط شاید کسی کو یہ اشکال ہو کہ قرآن میں تو علم غیب کو استکثار خیر و دفع مضرت کا سبب بتلایا گیا ہے اور تم کہتے ہو کہ کشف بعض دفعہ وبال جان ہو جاتا ہے۔ قرآن کی آیت یہ ہے: "وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَامَسَّنِيَ السُّوْءُ" (ترجمہ) اور اگر میں غیب کو جانتا ہوتا تو خیر بہت زیادہ حاصل کر لیتا اور مجھ کو کوئی مضرت نہ پہنچتی۔ اس کے چند جوابات ہیں اول تو یہ کہ آیت میں قضیہ کلیہ نہیں ہے بلکہ جزئیہ ہے یعنی کبھی ایسا بھی ہو جاتا کہ خیر ہی خیر حاصل ہوتی اور شر مس بھی نہ کرتا (دوسرے یہ

کہ آیت میں غیب سے مراد جمیع الغیب ہے حاصل یہ ہوا کہ اگر مجھ کو غیب کا علم محیط حاصل ہوتا الخ اور ظاہر ہے کہ غیب کا علم محیط حاصل ہونا استکثار خیر و رفع مضرت کا ضرور سبب ہوسکتا ہے اور اس قصہ میں جو اس شخص کو مصیبت پیش آئی اس کا سبب یہ تھا کہ اس کو علم محیط حاصل نہ تھا ورنہ اخیر تک کی سب حالت معلوم ہو جاتی تو وہ جان لیتا کہ اگر میں گھوڑے اور غلام کو فروخت کروں گا تو پھر یہ بلا میرے اوپر آوے گی۔)

پس کشف کے بعض دفعہ وبال جان ہونے پر کوئی اشکال نہیں کیونکہ کشف میں علم محیط نہیں ہوتا ادھورا علم ہوتا ہے اور علم محیط بشر کے لیے حاصل ہونا محال بھی ہے اور اس جگہ اس سے بحث ہی نہیں بلکہ جس قدر غیب کا علم انسان کو ہوسکتا ہے اس کے متعلق میں نے یہ کہا تھا کہ بعض دفعہ وہ وبال جان ہو جاتا ہے اور اس میں کچھ شک نہیں، خوب سمجھ لو یہ ساری گفتگو اس پر شروع ہوئی تھی کہ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر انسان کے لیے پکی پکائی روٹی اور سلے سلائے کپڑے پیدا ہوا کرتے تو وہ گھبرا جاتا کیونکہ ممکن ہے کہ ایک وقت میں اچکن پیدا ہوتا اور آپ کا جی قمیص کو چاہتا ہو دوسرے وقت میں پاجامہ پیدا ہوا اور آپ کی طبیعت لنگی کو چاہتی ہے اور انسان اس سے بھی گھبرا جاتا ہے کہ کوئی چیز اس کے سر پر سوار ہو جائے۔ اب خدا کا شکر ہے کہ اس کے سر پر سوار کوئی چیز نہیں وہ جیسا چاہے خود بنا سکتا ہے اور اگر کسی چیز کی ضرورت نہ ہو تو یہ بھی اختیار ہے کہ کچھ نہ بنائے۔ یہ حکمت ہے اس میں کہ حق تعالیٰ نے تحلیل و ترکیب کا کام انسان پر چھوڑ دیا ہے۔

میزبان کے لیے ایک ضروری ہدایت

سر پر سوار ہونے سے مجھے اپنا ایک قصہ یاد آیا، ایک صاحب نے جو کہ میرے دوست کے بیٹے ہیں، میری دعوت کی تھی، وہ بندہ خدا کھانا کھاتے ہوئے میرے سر پر سوار ہو گئے، بار بار مجھے ٹوکیں کہ مولانا آپ تو بہت کم کھاتے ہیں، اچھی طرح کھائیے، تکلف نہ فرمائیے، اب وہ تو مجھے زیادہ کھانے کو فرما رہے تھے مگر میری یہ حالت کہ جب مجھے اس کا تصور آتا کہ میزبان میرے لقموں کو دیکھ رہا ہے مجھ سے غیرت کی وجہ سے لقمہ نہ ٹوٹتا، آخر کار میں بھوکا ہی رہا اور اپنے گھر آ کر میں نے دوبارہ کھانا کھایا۔ اسی طرح ایک اور صاحب نے میری دعوت کی وہ ہر چیز مجھے اپنے آپ کھلاتے تھے مگر میری طبیعت اندر سے گھٹتی جاتی تھی۔ یہ آداب معاشرت کے بالکل خلاف ہے۔ میزبان کو چاہیے کہ مہمانوں کو کھاتے ہوئے ہرگز نہ گھورے۔ بس سرسری نگاہ سے اتنا معلوم کرتا رہے کہ کہاں کس چیز کی ضرورت ہے۔ باقی نہ اس سے کہے کہ آپ کم کھا رہے ہیں

نہ یہ کہے کہ آپ تکلف کر رہے ہیں کیونکہ جب مہمان کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ میزبان میرے لقمے دیکھ رہا ہے تو اس سے بالکل نہیں کھایا جاتا۔

حضرت امیر معاویہؓ اور ایک بدوی کی حکایت

ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ کے دسترخوان پر ایک بدوی بیٹھا ہوا کھانا کھا رہا تھا اور دیہاتیوں کی طرح بڑے بڑے لقمے بنا رہا تھا۔ حضرت معاویہؓ نے خیر خواہی کے طور پر اتنا فرما دیا کہ اے شخص اپنی جان پر رحم کر اور لقمہ چھوٹا لے تاکہ گلے میں نہ اٹک جائے۔ اتنا کہنا تھا کہ وہ بدوی فوراً دسترخوان سے اٹھ کھڑا ہوا اور حضرت معاویہؓ سے خطاب کر کے کہا کہ تم اس قابل نہیں ہو کہ کوئی شریف آدمی تمہارا کھانا کھاوے۔ تم مہمانوں کے لقموں کو تکتے ہو کہ کون چھوٹا لیتا ہے کون بڑا، تم کو اس سے کیا غرض تم کو دسترخوان پر مہمانوں کو بٹھلا کر پھر اپنے کھانے کی طرف نگاہ بھر کر بھی نہ دیکھنا چاہیے۔ یہ کہہ کر چلتا ہوا۔ ہر چند حضرت معاویہؓ نے اصرار کیا کہ کھانا اچھی طرح کھا کر جانا مگر اس نے ایک نہ مانی، خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا، میں بیان یہ کر رہا تھا کہ انسان کی مثال معزز مہمان جیسی ہے کہ جس طرح اس کی آمد سے پہلے تمام ضروریات کا انتظام کر دیا جاتا ہے اسی طرح حق تعالیٰ نے انسان کی پیدائش سے پہلے تمام عالم کو اسی کی خاطر اور اسی کے واسطے پیدا کیا، پھر جب انسان ہلاک ہو جائے گا تو سارا عالم بھی ہلاک ہو جائے گا کیونکہ جس کے لیے یہ ساز و سامان تھا جب وہی نہ رہا تو اس کے رہنے میں کیا فائدہ۔

جنت کو پہلے پیدا کرنے میں حکمت

حق تعالیٰ نے آسمان و زمین کو تو پہلے پیدا کیا ہی جنت کو بھی پہلے ہی پیدا کر دیا حالانکہ اس کی ضرورت اس عالم کے بعد انسان کو ہوگی کیا ٹھکانا ہے اس رحمت کا اور اس میں راز یہ ہے کہ انسان کو جب یہ معلوم ہوگا کہ میرا اصلی گھر جہاں ہر قسم کی راحت و آسائش ہے اس وقت موجود ہے تو اس کو ادھر زیادہ رغبت ہوگی اور دنیا میں اس کا دل نہ لگے گا اور اگر اس کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ جنت تو ابھی بنی بھی نہیں دنیا کے فنا ہونے کے بعد بنے گی تو اکثر طبائع کو عالم آخرت کی طرف رغبت نہ ہوتی اور اگر ہوتی بھی تو کم ہوتی کیونکہ معدوم کی طرف رغبت ہونا انسان کے طبائع میں نادر ہے گو وہ معدوم کیسا ہی یقینی الوجود ہو اور اب جس وقت حق تعالیٰ کے اس ارشاد پر نظر پڑتی ہے: "أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ" کہ جنت خدا سے ڈرنے والوں کے لیے تیار کی گئی ہے تو خواہ مخواہ اس کی طرف کشش ہوتی ہے اور تقویٰ کو جی چاہتا ہے۔ مسلمانوں میں بعض لوگ ایسے بھی ہوئے ہیں جو اس کے قائل ہیں کہ جنت ابھی پیدا نہیں ہوئی بعد میں پیدا ہوگی اور وہ اس کی وجہ یہ بتلاتے ہیں کہ ابھی سے اس کا

پیدا ہونا عبث ہے اور خدا تعالیٰ فعل عبث سے پاک ہے مگر ان کا یہ خیال غلط ہے جس کو اولاً نص قرآنی "اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ" (تیار کی گئی ہے خدا سے ڈرنے والوں کے لیے) رد کر رہی ہے کیونکہ صیغہ ماضی کو مستقبل کے معنے میں لینا مجاز ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ اپنے معنی پر محمول ہوا اور بلا وجہ معنی مجازی لینا جائز نہیں اور جو وجہ وہ بیان کرتے ہیں وہ صحیح نہیں کیونکہ میں نے ابھی اس کی حکمت بتلا دی ہے جس کو دوبارہ اعادہ کرتا ہوں۔ وہ حکمت یہ ہے کہ جنت کے پیدا کرنے کے بعد تو حق تعالیٰ ہم کو ان الفاظ سے خوشخبری سنا رہے ہیں کہ "اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ" (جنت متقیوں کے واسطے تیار کی گئی ہے اور اگر پیدا نہ ہوتی تو بجائے اس کہ یہ فرماتے "تعلوا لِلْمُتَّقِیْنَ" (یعنی جنت متقیوں کے واسطے تیار کی جائے گی) اور ان دونوں کی تاثیر فی الطبیعۃ میں جو فرق ہے اس کو ہر شخص بخوبی جانتا ہے کہ اس وقت ایک شے موجود کی طرف رغبت ہے اور اس وقت شی معدوم کی طرف رغبت ہوتی۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے پس جس فعل میں اتنی بڑی حکمت ہو اس کو عبث کون کہہ سکتا ہے اور یہ حکمت تو ہمارے ذہن میں آ گئی ہے اور نہ معلوم کیا کیا حکمتیں ہوں گی۔ الغرض "سَخَّرَ لَکُمْ مَّافِی السَّمٰوٰتِ وَمَافِی الْاَرْضِ" (کام میں لگا دیا ہے تمہارے نفع کے لیے تمام چیزوں کو جو آسمان و زمین میں ہے) میں تسخیر سے مراد یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے تمام عالم کو انسان کے کام میں لگا رکھا ہے اور وہ معنے مراد نہیں جو تسخیر کے لفظ سے محاورہ اردو میں متبادر ہوتے ہیں اور اس کے ضمن میں حق تعالیٰ نے توحید کی دلیل بیان فرمائی ہے۔ اصل مقصود آیت کا توحید ہی ہے۔ گو تبعاً دوسرے مضامین کی طرف بھی اشارہ ہو گیا ہے۔

معبود ہونے کے لیے خالق ہونا ضروری ہے

حاصل استدلال کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ چیزیں پیدا کی ہیں اور ان کے سوا صانع و خالق کوئی نہیں تو معبود بھی وہی ہونا چاہیے کیونکہ معبود کے لیے کامل الصفات و جامع الکمالات ہونا ضروری ہے اور خلق بہت بڑی صفت کمال ہے پس جو خالق نہیں وہ معبود بھی نہیں ہو سکتا اور جو خالق ہوگا وہ یقیناً تمام صفات کمال کا جامع ہوگا کیونکہ خلق کے معنے اعطاء وجود کے ہیں اور ظاہر ہے کہ تمام کمالات وجود کے تابع ہیں۔ پس جو ذات معطی وجود ہے یقیناً اس کے قبضہ میں خزائن وجود ہیں اور جس کے قبضہ میں وجود کے خزائن ہوں وہ تمام صفات کمال کا جامع ہوگا۔ اسی لیے حق تعالیٰ نے اکثر مواقع میں توحید کی دلیل میں صفت خالقیت کو بیان فرمایا ہے کیونکہ صفت خالقیت تمام کمالات کو مستلزم ہے حق تعالیٰ نے توحید کے دلائل میں زیادہ دقیق دلائل نہیں بیان فرمائے بلکہ

نہایت سہل سہل دلائل بیان فرمائے ہیں جن کو تھوڑی سی عقل والا بھی بہت جلدی سمجھ سکتا ہے۔ چنانچہ اکثر جگہ صرف خالقیت سے توحید کو ثابت فرمایا ہے اور اس میں راز یہ ہے کہ تدقیقات سے مخاطب ساکت تو ہوجاتا ہے مگر اس کی تسلی نہیں ہوتی اور سہل عنوانات سے تسلی خوب ہوجاتی ہے جیسا کہ اس آیت میں کتنا سہل عنوان ہے کہ کیا تم نے اس بات کو نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے کام میں لگا رکھا ہے ان تمام چیزوں کو جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہے۔ اس عنوان سے ہر شخص کا ذہن توحید کی طرف جلد منتقل ہوجاتا ہے۔ اگر منطقی استدلالی طرز ہوتا تو اس سے اس درجہ تسلی نہ ہوسکتی۔ اس جگہ شاید کوئی یہ سوال کرے کہ حق تعالیٰ کا خالق ہونا اس پر موقوف ہے کہ پہلے وجود صانع تو معلوم ہوجائے اور اس دلیل سے وجود صانع ثابت نہیں ہوتا۔

اہل عرب وجود صانع کے منکر تھے

اس کا جواب یہ ہے کہ اہل عرب دہری نہ تھے وہ محض مشرک تھے وجود صانع کا وہ انکار نہ کرتے تھے اس لیے وجود صانع کو ثابت کرنے کا قرآن نے اہتمام نہیں کیا۔ ہاں علمائے اسلام نے جب دہریوں کا بھی ایک فرقہ اسلام کے مقابل دیکھا تو انہوں نے وجود صانع پر بھی دلائل قائم کیے۔ اہل عرب کا دہری نہ ہونا قرآن کی بہت سی آیات سے معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: "وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ" (اگر آپ ان سے پوچھیں کہ کس نے پیدا کیا ہے آسمانوں کو اور زمین‘ تو وہ یہ ضرور کہیں گے اللہ نے)

سارا قرآن دلائل توحید سے بھرپور ہے

اور اس قسم کا مضمون قرآن میں جابجا مذکور ہے۔ پس جب اہل عرب صانع کے قائل تھے اور شرک میں مبتلا تھے تو ان کے واسطے دلائل توحید ہی کی ضرورت تھی۔ چنانچہ سارا قرآن دلائل توحید سے بھرا ہوا ہے لیکن وہ دلائل منطقی طرز پر صغریٰ و کبریٰ وحد اوسط وغیرہ سے مرکب نہیں ہیں یہ میں نے اس واسطے کہہ دیا تاکہ کوئی معقولی یہ نہ کہے کہ ہم نے تو سارا قرآن دیکھ لیا ہم کو تو ایک جگہ بھی دلیل عقلی نہیں ملی۔ سو بات یہ ہے کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ قرآن کا طرز دلائل کے بارہ میں استدلال منطقی کے طرز پر نہیں ہے بلکہ اکثر دلائل قرآن کے اقناعی ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ حقیقت میں بھی اقناعی ہی ہیں بلکہ محض طرز کے اعتبار سے اقناعی ہیں ورنہ حقیقت میں وہ سب دلائل عقلیہ ہیں جو طرز عقلی پر بخوبی منطبق ہوسکتے ہیں۔ بالخصوص دو موقعوں میں تو یہ انطباق بہت

ہی ظاہر ہے۔ایک سورہ بقرہ کی اس آیت میں:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَابِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِبَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ.

(آسمان اور زمین کی پیدائش اور رات دن کے ہیر پھیر اور کشتیوں کا لوگوں کو نفع دینے والی چیزوں کو لیے ہوئے سمندروں میں چلنا' آسمان سے پانی اتار کر مردہ زمین کو زندہ کر دینا اور اس میں ہر قسم کے جانوروں کو پھیلا دینا' ہواؤں کے رخ بدلنا تابع فرمان بادلوں کو آسمان و زمین کے درمیان ادھر ادھر پھرنا عقلمندوں کے لیے قدرت خدا کی نشانیاں ہیں)

اس آیت میں چونکہ لفظ یعقلون موجود ہے جس سے اس طرف اشارہ ہے کہ یہ دلیل عقل کے مطابق ہے اس لیے مفسرین کو موقع مل گیا کہ انہوں نے طرز عقلی پر اس کا انطباق خوب بیان کیا۔دوسرا موقع اس آیت میں ہے:"لَوْ كَانَ فِیْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا"(اگر ان زمین و آسمان میں چند معبود ہوتے تو البتہ فاسد ہو جاتے)

عبادت کی فرد اعظم توحید ہے

(حاصل اس دلیل عقلی کا یہ ہے کہ یہ اشیاء مذکورہ سب ممکن الوجود ہیں۔بعض تو بداہۃ (ظاہری) بوجہ مشاہدہ کے کیونکہ بعض کی نسبت ہم نے خود مشاہدہ کیا ہے کہ وہ پہلے معدوم تھیں پھر موجود ہوئیں اور بعض کے احوال میں تغیر و تبدل کا مشاہدہ ہو رہا ہے اور بعض چیزیں اجزاء سے مرکب ہیں یہ بھی امکان کی علامت ہے اور بعض اشیاء بعض کی محتاج ہیں اور احتیاج بھی ممکن کا خاصہ ہے۔ غرض یہ تمام چیزیں ممکن ہیں اور ممکن کا وجود و عدم چونکہ برابر ہوتا ہے اس لیے وہ کسی مرجح کا محتاج ہے وہ مرجح اگر ممکن ہے تو اس میں پھر یہی کلام ہوگا اور اس کے وجود کے لیے بھی کسی مرجح کی ضرورت ہوگی۔وعلیٰ ہذا القیاس اور تسلسل محال ہے اس لیے اس کو قطع کرنے کے لیے کسی جگہ یہ ماننا پڑے گا کہ مرجح واجب الوجود ہے(جس کا وجود ضروری اور معدوم ہونا محال ہے' وہی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے) یہ تو دلیل ہے وجود صانع کی اب رہا اس کا واحد ہونا سو اس کی تقریر یہ ہے کہ اگر نعوذ باللہ واجب الوجود متعدد مثلاً دو مانے جاویں تو آیا ان میں سے کسی کا عاجز ہونا ممکن ہے یا دونوں کا قادر کامل ہونا ضروری۔پہلی شق محال ہے کیونکہ عاجز ہو سکنے والا واجب الوجود نہیں ہو سکتا اور دوسری شق پر یہ سوال ہے کہ اگر ان

میں سے ایک نے کسی کام کا ارادہ کیا۔ مثلاً زید کے موجود کرنے کا تو دوسرا اس کے خلاف کا ارادہ کر سکتا ہے یا نہیں اگر نہیں کر سکتا تو اس کا عاجز ہونا لازم آئے گا جو کہ وجوب وجود کے منافی ہے اور اگر خلاف کا ارادہ کر سکتا ہے تو اس کے ارادہ پر مراد کا مرتب ہونا ضروری ہے یا نہیں۔ اگر ضروری نہیں تو قادر مطلق کے ارادہ سے مراد کا تخلف لازم آئے گا جو کہ محال ہے اور اگر ضروری ہے تو دو مختلف مرادوں کا اجتماع لازم آوے گا۔ کیونکہ ایک واجب کے ارادہ پر اس کی مراد یعنی زید کا وجود مرتب ہوگا اور دوسرے کے ارادہ پر اس کی مراد جو کہ پہلے کی ضد ہے یعنی زید کا عدم مرتب ہوگا اس صورت میں اجتماع ضدین لازم آوے گا جو کہ محال ہے پس واجب الوجود کا متعدد ہونا ہی محال ہے پس ثابت ہوگیا کہ واجب الوجود ہمیشہ واحد ہی ہوگا اور یہی مقصود ہے۔ خوب سمجھ لو اس جگہ ایک بات خاص طور پر سمجھنے کی ہے وہ یہ کہ اس طرز استدلال سے آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ توحید کی دلیل کے لیے مطلقاً کسی مصنوع کا بیان کر دینا کافی تھا مگر حق تعالیٰ نے ان مقامات پر خصوصیات کے ساتھ ان چیزوں کا بیان فرمایا ہے جو علاوہ مخلوق ومصنوع ہونے کے ہمارے حق میں نعمت بھی ہیں جس سے حاصل یہ ہوا کہ عبادت جس کی فرد اعظم توحید ہے اس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ خدا کے سوا صانع وخالق کوئی نہیں اور اس لیے بھی ضروری ہے کہ منعم بھی حق تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں گویا اس طرح دلیل عقلی کے ساتھ ایک داعی طبعی بھی بیان فرمادیا کیونکہ منعم کے احسان کا ماننا اور اس کا شکر ادا کرنا انسان کا طبعی امر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر عقلی دلیل سے متاثر نہیں ہوتے تو خدا تعالیٰ کے انعامات پر نظر کر کے طبعی مؤثر سے تو متاثر ہونا چاہیے۔ اس نکتہ کی وجہ سے تمام قرآن میں جہاں توحید کی دلیل کا ذکر ہے وہاں نعمتوں کا ذکر ضرور ہے۔ چنانچہ اس آیت میں سخر لکم میں لام منفعت سے انعام کی طرف اشارہ ہے اور آگے تو بالکل تصریح ہی کر دی۔

نعمت کی دو قسمیں

''وَاَسۡبَغَ عَلَیۡکُمۡ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً'' اور کامل کر دی تمہارے اوپر اپنی نعمتیں جن میں بعض ظاہری ہیں اور بعض باطنی ہیں اس میں نعمت کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں۔ نعمت ظاہرہ وہ ہے جو حواس ظاہرہ یا باطنہ سے محسوس ہو اور نعمت باطنہ وہ ہے جو عقل سے معلوم ہو یا یہ جو حواس ظاہرہ سے محسوس ہو وہ ظاہرہ ہے جو حواس باطنہ وعقل سے معلوم ہو وہ باطنہ ہے۔ بہرحال اس میں نعمتوں کا اجمالاً پوری طرح احاطہ کر دیا گیا اور یہ بھی حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ انہوں نے نعمت کی تقسیم ظاہر فرمادیں ورنہ نعم باطنہ (باطنی نعمتوں) کی طرف بہت کم لوگوں کی نظر جاتی کیونکہ اس تقسیم کے بعد بھی بہت لوگ ایسے ہیں جو نعم باطنہ کو نعمت ہی نہیں سمجھتے اور جو لوگ نعمت سمجھتے بھی ہیں وہ نعم ظاہرہ کی برابر ان کی قدر نہیں کرتے۔

نعم باطنیہ

چنانچہ نعمت باطنہ یہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ نے آپ کو اپنی معرفت عطا فرمائی جس کا فرد اعظم اسلام ہے اب ذرا انصاف سے بتلایئے کہ اتنے بڑے مجمع میں سے ایسے لوگ کتنے ہیں جنہوں نے کبھی زبان سے یوں کہا ہو کہ اے اللہ آپ کا شکر ہے کہ آپ نے ہم کو اسلام کی دولت عطا فرمائی' ایسے لوگ بہت کم نکلیں گے۔ اسی طرح علم اور حب فی اللہ' بغض فی اللہ' توکل و رضا وغیرہ یہ سب نعم باطنہ ہیں ان پر شکر بہت کم لوگ کرتے ہیں اور یہ حال تو اس پر ہے کہ حق تعالیٰ نے نعم باطنہ کی طرف متوجہ بھی فرمایا ہے اور اگر وہ نعمت کی تقسیم نہ فرماتے تو شاید کوئی بھی ان کی طرف توجہ نہ کرتا۔ الامن شاء اللہ (مگر جس کو اللہ چاہے) اور ایک بہت بڑی فہرست نعمتوں کی ہماری نظر سے غائب ہو جاتی چنانچہ خود عقل بھی ایک نعمت ہے جو کہ ایک نور کا نام ہے جو انسان کو حق تعالیٰ عطا فرماتے ہیں جس کی وجہ سے وہ مدرک کلیات ہے اور یہ بھی نعم باطنہ میں داخل ہے۔ باطنہ فرمانے سے اس پر تنبیہ ہو گئی اور اس پر تنبیہ کی ضرورت بھی تھی کیونکہ بعض لوگ عقل کے منکر ہیں انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ انسان کے اندر عقل نہیں ہے حالانکہ جانور اور انسان میں فرق ظاہر ہے مگر یہ خدا کے بندے پھر بھی عقل کے منکر ہیں اس کا عقلی جواب تو ہے ہی مگر لطیفہ کے طور پر ایک جواب یہ ہے کہ ہر شخص اپنے گھر کا حال خوب جانتا ہے تو وہ جو عقل کے منکر ہیں وہ اپنا حال بیان کرتے ہیں سو ان میں واقعی عقل نہ ہو گی اور ہم کو اپنے گھر کا حال معلوم ہے اور ہمارے اندر عقل ہے ہم کو خود اپنا حال معلوم ہے اس لیے ہم عقل کے منکر نہیں ہیں۔

یہ جواب ایسا ہے جیسا کہ ایک بزرگ نے معتزلہ کے جواب میں بطور لطیفہ کے فرمایا ہے کہ معتزلہ جو رویت الٰہیہ کے آخرت میں منکر ہیں وہ بھی صحیح کہتے ہیں۔ ان کی بات کو رد کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ بے چارے اپنا حال بیان کر رہے ہیں کہ ہم آخرت میں رویت الٰہیہ سے محروم رہیں گے سو وہ اس نعمت سے محروم ہیں اس لیے وہ انکار میں معذور ہیں اور اہل سنت والجماعت جو رویت کے قائل ہیں وہ اپنا حال بیان کر رہے ہیں۔ سو ان شاء اللہ ہم کو دیدار ہو گا اس لیے ہم اس کے قائل ہیں۔ الغرض عقل کے وجود میں بھی بعض لوگوں نے کلام کیا ہے اس لیے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نعمت پر متنبہ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ بہر حال عقل کے وجود پر دلیل صحیح اور کشف موجود ہے جس سے معلوم ہو گیا ہے کہ انسان کے اندر ایک نور ادراک ایسا ہے جو حیوانات کے اندر نہیں ہے اور اسی سے انسان حیوانات وغیرہ سے ممتاز ہے اور یہ عقل انسان کے ساتھ ساتھ اس میں پیدا ہوتی ہے

جوابتداء میں اپنا کام نہیں کرتی کیونکہ بچپن میں تمام قوی باطنہ قوی ظاہرہ کی تدبیر بدن میں مصروف ہوتے ہیں اس لیے پیدا ہونے کے ساتھ ہی عقل اپنا کام نہیں کرتی پھر جوں جوں بدن کی قوت بڑھتی جاتی ہے اسی قدر عقل اپنا کام کرتی ہے حتیٰ کہ بلوغ کے وقت شرعاً وہ کامل ہوجاتی ہے۔

بالغ احکام شرعیہ کا مکلّف ہے

اسی لیے شریعت نے بالغ کو احکام کا مکلّف بنایا ہے اس پر یہ اشکال نہ ہو کہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ ابتداء بلوغ میں بھی اکثر لوگوں کو پوری عقل نہیں ہوتی پوری عقل تو ۳۰، ۴۰ سال کی عمر میں پیدا ہوتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بلوغ کے وقت عقل تو کامل ہوجاتی ہے لیکن تجربہ کم ہوتا ہے اور ۳۰، ۴۰ سال کی عمر میں تجربہ بھی کافی ہوجاتا ہے اس عمر میں کچھ عقل نہیں بڑھتی بلکہ تجربہ بڑھ جاتا ہے لیکن تجربہ کی وجہ سے اس کی باتوں میں اور اعمال میں پختگی اور استواری (مضبوطی) پیدا ہوجاتی ہے اس سبب سے لوگوں کو شبہ ہوتا ہے کہ ۳۰، ۴۰ سال کی عمر میں عقل زیادہ ہوجاتی ہے۔ دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ اس عمر میں عقل ہی بڑھ جاتی ہو لیکن اس سے یہ تو لازم نہیں آیا کہ بلوغ کے وقت عقل کامل نہیں ہوتی بس یوں نفع ونقصان کو سمجھ سکے پھر اس کے بعد دن بدن عقل کو ترقی ہوتی رہتی ہے مگر وہ ترقی تکلیف احکام کا موقوف علیہ نہیں مکلّف ہونے کے لیے وہی مقدار عقل کافی ہے جو بلوغ کے وقت عموماً ہوتی ہے اور یہاں سے منکرین معاد کی ایک غلطی معلوم ہوئی وہ یہ کہ بعض لوگ معادیات کا انکار اس لیے کرتے ہیں کہ وہ امور محسوسہ نہیں ہیں۔ مثلاً جنت دوزخ کا انکار اس لیے کرتے ہیں کہ ان کا مشاہدہ نہیں ہوا تو ان کو اس تقریر سے سمجھنا چاہیے کہ بعض امور متفق علیہا مسلم عندالکل بھی ایسے ہیں جن کے وجود کا محض دلیل سے اعتقاد کیا گیا ہے اور ان کا مشاہدہ کسی نے آج تک نہیں کیا جیسے عقل اور روح وغیرہ کہ منکرین معاد بھی ان کے وجود کا اقرار کرتے ہیں اب اگر ہر چیز کا وجود مشاہدہ کے بعد ہی تسلیم کیا جائز کرے تو پھر یہ لوگ عقل وروح کے وجود کے کیونکر قائل ہوگئے۔ پس معلوم ہوا کہ بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جن کا وجود یقینی ہے مگر مشاہدہ محسوس نہیں۔ اسی طرح جنت ودوزخ وغیرہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان اشیاء کا وجود بھی دلیل صحیح سے ثابت ہے لہٰذا اس کو تسلیم کرنا لازم ہے گو مشاہدہ کسی نے نہ کیا ہو اور جس طرح عقل نعم باطنہ میں سے ہے اسی طرح بعض علوم بھی جن کا ادراک عقل سے ہوتا ہے نعم باطنہ میں سے ہیں جیسے تمام علوم عقلیہ گو وہ منقول ہی ہوں ان کا ادراک عقل ہی سے ہوتا ہے حواس سے نہیں ہوسکتا کیونکہ نقل میں الفاظ کا ادراک سمع سے ہوتا ہے اور نقوش کا بصر سے لیکن معانی کا ادراک تو عقل ہی سے ہوتا

ہے اور علوم نام معانی ہی کا ہے اسی طرح جس قدر باطنی حالات وکیفیات واخلاق ومقامات ہیں وہ بھی سب نعم باطنہ میں داخل ہیں اور یہ سب ظاہری اور باطنی نعمتیں حق تعالیٰ ہی نے عطا فرمائی ہیں ان کے سوا صانع وخالق اور منعم کوئی نہیں ۔ پس معبود بھی ان کے سوا کوئی نہیں ۔ یہ حاصل ہے توحید کی دلیل کا" آگے حق تعالیٰ منکران توحید کی شکایت فرماتے ہیں: "وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا وَّلا هُدىً كِتٰبٍ مُّنِيْرٍo" یعنی بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے بارے میں جدال کرتے ہیں ۔ یجادل فی اللہ (اللہ تعالیٰ کے بارے میں جدال کرتے ہیں) سے مراد یجادل فی توحید اللہ (اللہ تعالیٰ کی توحید کے بارے میں جدال کرتے ہیں) مضاف مقدر ہے یعنی خدا کی توحید میں جھگڑا کرتے ہیں اور اس کا انکار کرتے ہیں اور ان دلائل بینہ میں غور نہیں کرتے ہیں ۔ اس آیت میں منکران توحید کی متعدد مذمتیں مذکور ہیں ۔

جدال کی دو قسمیں

چنانچہ اول تو جدال ہی فی نفسہ مذموم ہے کیونکہ ہر چند کہ بظاہر جدال کی دو قسمیں ہیں ایک جدال بحق ہے ایک جدال بالباطل جیسا کہ "جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ" (ان سے احسن طریقہ سے خوش اسلوبی کے ساتھ جدال بحق کرو) سے معلوم ہوتا ہے کہ جدال کا اطلاق جدال بحق پر بھی ہوتا ہے لیکن قرآن کے تتبع سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں جدال اور جدل کا اطلاق اکثر جدال بالباطل پر ہی ہوتا ہے ۔ یہ بات سارے قرآن کو دیکھ کر بھی نہ ٹوٹے گی اور جہاں جدال بالحق پر جدال کا اطلاق آیا ہے وہ اطلاق صورت جدال پر مشاکلۃ ہے کیونکہ خواہ جدال بالحق ہو یا بالباطل صورت دونوں کی ایک سی ہوتی ہے ۔ جیسا مشاکلۃ "جَزٰٓءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا" (برائی کا بدلہ برائی ہے مثل اس کے) فرمایا گیا کیونکہ صورۃ دونوں یکساں ہوتے ہیں ۔ صورت کے یکساں ہونے پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا کہ ایک مولوی صاحب کی دستار بندی ہوئی تھی مگر وہ کسی قابل نہ تھے کتابیں سمجھ کر نہ پڑھی تھیں ۔

ایک مدفاضل کی حکایت

دستار بندی کے وقت استاد سے کہنے لگے کہ اس وقت تو لوگ مجھے فاضل سمجھیں گے مگر میں حقیقت میں مدفاضل ہوں اگر لوگ مجھ سے مسائل دریافت کرنے لگے تو میں کیا کروں ۔ استاد نے کہا کہ میں ایسی ترکیب بتلاتا ہوں جس سے تمہاری رسوائی نہ ہوگی بلکہ اور وقعت بڑھ جاوے

گی۔ تم ہر سوال کے جواب میں یہ کہہ دیا کرنا کہ اس مسئلہ میں اختلاف ہے، اس کے بعد کچھ نہ کہنا ورنہ قلعی کھل جائے گی۔ تو اب دیکھئے یہ جواب ایسا ہے کہ اس کو بڑا محقق وسیع النظر بھی بیان کر سکتا ہے اور ایک جاہل بھی کہہ سکتا ہے۔ ظاہر میں دونوں کے جواب یکساں ہوں گے لیکن حقیقت شناس فرق کو سمجھ لے گا اسی طرح جدال بالحق و بالباطل کی صورت یکساں ہوتی ہے اس لیے دونوں پر جدال کا اطلاق یکساں کر دیا جاتا ہے مگر حقیقت دونوں کی بالکل جدا ہے۔ چنانچہ اس واقعہ میں آخر ان مولوی صاحب کی قلعی ایک دن کھل ہی گئی۔ بات یہ ہے کہ سمجھنے والے لب ولہجہ سے سمجھ جاتے ہیں کہ اس قول کا منشاء تحقیق اور وسعت نظر ہے یا جہل محقق کے لہجہ میں جرأت اور استغناء کی شان ہوتی ہے اور ناقص اگر بڑی بات منہ سے نکالے گا تو اس کے لہجہ میں پستی اور کم ہمتی نمایاں ہوگی وہ محقق کی طرح جرأت کے ساتھ ایسی بات نہیں کہہ سکتا اس لیے کوئی پرکھنے والا سمجھ گیا کہ یہ مولوی صاحب جو ہر بات میں یہی کہہ دیتے ہیں کہ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو کچھ آتا واتا نہیں محض ڈھونگ بنا رکھا ہے۔ اس نے امتحان کے طور پر یہ پوچھا کہ مولانا لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے بارے میں کیا تحقیق ہے تو آپ بے ساختہ فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں اختلاف ہے بس ان کو یہی ایک جواب یاد تھا۔ جیسے ایک طوطی کا قصہ کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ کسی شخص نے اس کو یہ لفظ یاد کرا دیا تھا۔ دریں چہ شک (اس میں کیا شک ہے) اور بازار میں آ کر دعویٰ کیا کہ یہ طوطی فارسی زبان جانتی ہے۔ لوگوں کو بہت تعجب ہوا، ایک شخص نے اس کو خریدنا چاہا، مالک نے بہت قیمت بتلائی، اس نے طوطی سے پوچھا کہ کیا تو اس قیمت کے لائق ہے جو یہ شخص مانگتا ہے۔ اس نے وہی کہا دریں چہ شک۔ وہ بڑا خوش ہوا کہ واقعی طوطی فارسی خوب جانتی ہے دیکھو کیسا برمحل جواب دیا ہے اب تو خرید کر گھر لے گئے اور اس سے باتیں کرنے بیٹھے تو وہ ہر بات کے جواب میں دریں چہ شک ہی کہتی چلی جاتی ہے، موقع ہو یا نہ ہو آخر اس نے جھلا کر کہا کہ میں نہایت ہی احمق تھا جو اتنی رقم کثیر خرچ کر کے تجھ کو لایا اور دھوکہ میں آ گیا۔ اس نے اس کے جواب میں بھی یہی کہہ دیا دریں چہ شک (اس میں کیا شک) خیر یہاں تو جواب برمحل ہو گیا گو اس نے قصد نہیں کیا تھا۔ اسی طرح ان مولوی صاحب کو بھی بس اتنا ہی یاد تھا کہ یہ مسئلہ اختلافی ہے حتیٰ کہ آپ نے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کو بھی اختلافی بتلاتا۔ اگرچہ فی نفسہ یہ بھی صحیح تھا کیونکہ کفار کو توحید رسالت میں بھی اختلاف ہے لیکن مسلمان کے استفتاء کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ مسئلہ اختلافی ہے تو اس میں تو آئمہ مذاہب کا بھی اختلاف مراد ہوتا ہے۔ بس اب تو لوگوں میں ان مولوی صاحب کی

خوب ہی قلعی کھلی کہ یہ کون جاہل ہے جو کلمہ شریف کو بھی اختلافی بتلاتا ہے۔ اسی کے مشابہ ایک اور حکایت مجھے یاد آئی۔ کان پور میں عبدالرحمٰن خان صاحب مالک مطبع نظامی کا ایک ملازم تھا وہ مجھ سے کہا کرتا تھا کہ جب تم حج کو چلو تو مجھ کو بھی ساتھ لے چلنا' میں نے اس سے کہا کہ پہلے تم کچھ عربی سیکھ لو تا کہ وہاں کی زبان سمجھ سکو' وہ بے چارہ عربی سیکھنے پر بھی راضی ہو گیا' میں نے اس کو اول یہ لفظ سکھایا' ھات الحجر (ڈھیلے لا) اور یہ کہہ دیا کہ جب میں یہ لفظ کہا کروں تم اسی وقت استنجا کے واسطے مجھے ڈھیلا لا دیا کرو۔ وہ بیچارہ روز اس پر عمل کرتا۔ ایک دن مجھے استنجا کی ضرورت نہ تھی اس لیے میں نے ڈھیلا نہ مانگا تو آپ خود ہی کہتے ہیں مولوی صاحب ھات الحجر میں نے کہا' سبحان اللہ بندر کے ہاتھ لگی ہلدی کی گرہ اس نے کہا میں ہی پنساری ہوں' اب آپ نے ھات الحجر کیا سیکھا ہے کہ ہر جگہ اسی کا استعمال شروع کر دیا' امر کا صیغہ استفہام میں برت رہے ہیں۔

ایک لطیفہ

اسی طرح ایک مرتبہ جہاز میں بنگالی لوگ آ کر اپنی زبان میں کچھ سوالات کرتے جس کو میں نہ سمجھتا اور ان کو یہ بھی نہ سمجھا سکتا کہ میں نہیں سمجھا۔ آخر میں نے ایک اردو داں بنگالی سے کہا کہ مجھے اتنا بنگلہ سکھا دو کہ جب کوئی ایسا بنگالی مجھ سے بنگلہ میں باتیں کرے تو میں اس سے یہ کہہ دوں کہ میں بنگلہ نہیں سمجھتا۔ انہوں نے کہا کہ تم یوں کہہ دیا کرو بنگالی بوزی نا یعنی بوجھی نا (اور سننے میں بوزینہ آتا ہے جس کے معنی فارسی کے اعتبار سے بہت برے ہیں) تو مجھے ایک مشغلہ ہاتھ آ گیا' میں بنگالیوں سے یہی کہہ دیا کرتا' بنگالی بوزینہ اور اس میں میری نفس کی شرارت بھی مضمر ہوتی تھی مگر ایک بنگالی نے مجھے خوب ہی جواب دیا' جب میں نے اس سے کہا بنگالی بوزینہ تو اس نے بیساختہ جواب دیا ہندوستانی بوزینہ یعنی میں اردو نہیں سمجھتا۔ الغرض جدال بالحق کو مشاکلتہ جدال کہہ دیا گیا ہے۔ مجھے مشاکلت پر ایک اور مسئلہ یاد آ گیا وہ یہ کہ انبیاء و اولیاء پر جو مصیبت آتی ہے وہ صورت مصیبت ہے حقیقت مصیبت نہیں۔

انبیاء و اولیاء مصیبت سے پریشان نہیں ہوتے

کیونکہ مصیبت کے بارے میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: "مَآ اَصَابَکُمْ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ" کہ تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے ہاتھوں کے کرتوت کی وجہ سے ہے اس پر اشکال ہوتا ہے کہ انبیاء و اولیاء پر بھی تو مصیبت آئی ہے تو کیا ان پر بھی گناہوں کے سبب آئی ہے۔ اس کا ایک جواب تو تسلیمی ہے کہ ہاں اپنے اپنے درجہ کے موافق خطا سے کون

خالی ہے لیکن یہ جواب اولیاء کے بارے میں تو صحیح ہے' انبیاء کے بارے میں بے تکلف جاری نہیں ہوسکتا کیونکہ انبیاء علیہم السلام سے جو کچھ خطا ہوتی ہے وہ اجتہادی خطا ہے جس پر ان کو ثواب ملتا ہے۔ تعمد معصیت کی ان میں ہرگز گنجائش نہیں اس لیے وہاں یہ کہنا کہ مصائب کا سبب ان کی خطائیں ہیں بہت بعید ہے بلکہ ان کے مصائب کا سبب محض رفع درجات ہے تو ما اصابکم (تم پر جو مصیبت ہے) کا خطاب صرف عصاۃ کو ہوگا چنانچہ مَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ (تمہارے ہاتھوں کے کرتوت کا نتیجہ ہے) اس کا قرینہ ہے اس لیے دوسرا جواب سب سے لطیف یہ ہے کہ یہ بالکل سچ ہے کہ مصیبت گناہوں ہی کی وجہ سے آتی ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ مصیبت کہتے کس کو ہیں۔ مصیبت وہ ہے جس سے پریشانی اور انقباض لاحق ہو اور انبیاء و اولیاء بیماری وغیرہ سے پریشان اور منقبض نہیں ہوتے تو یہ بیماری اور فاقہ اور تنگدستی وغیرہ ان کے حق میں مصیبت ہی نہیں بلکہ راحت ہے جیسے کوئی معشوق پیچھے سے آکر اپنے عاشق کو بغل میں دبا لے اول اول تو اس کو کلفت معلوم ہوگی لیکن جب یہ معلوم ہو جائے گا کہ دبانے والا محبوب ہے اس وقت ساری کلفت دور ہو جائے گی اور چاہے گا کہ تھوڑی دیر اور دبائے رہے۔

زاہر صحابیؓ کی حکایت

حدیث میں زاہر صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قصہ وارد ہے۔ یہ دیہات کے رہنے والے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دیہات کی چیزیں لایا کرتے تھے اور آپ ان کو شہر کی چیزیں عطا فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مذکور ہے "زاهر باديتنا ونحن حاضرة" (زاہر دیہاتی ہے اور ہم شہری ہیں) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے بہت محبت تھی۔ ایک مرتبہ یہ بازار میں جا رہے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیچھے سے تشریف لا کر ان کو دبا لیا۔ اول تو زاہر بڑے گھبرائے کہ یہ کون ہیں' جب معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو حدیث میں آتا ہے کہ پھر تو زاہر اپنی کمر کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سینے سے خوب لگانے لگے تا کہ جسد اطہر سے مس ہو کر برکت حاصل ہو جائے' پھر آپ نے فرمایا کہ کوئی اس غلام کو خریدتا ہے وہ کہنے لگے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپ مجھے فروخت کریں گے تو مجھے بہت کھوٹا پائیں گے میرا کوئی بھی گاہک نہ ملے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لیکن تم خدا کے نزدیک کھوٹے نہیں ہو تو کیا کوئی ایسا کہہ سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دبا لینے سے حضرت زاہر کو کچھ کلفت ہوئی تھی ہرگز نہیں' اس میں جو کچھ ان کو لطف آیا ہوگا انہی کے دل سے پوچھنا چاہیے (پھر غلام کے لفظ سے یاد کرنے میں جو

مسرت حضرت زاہر کو حاصل ہوئی ہوگی اس کو ان کے سوا کون بتلا سکتا ہے) کسی نے خوب کہا ہے:

بس کہا مجھ کو اے میرے غلام سب سے پیارا نام ہے میرا یہی

اسی طرح انبیاء واولیاء پر جب کلفت آتی ہے تو وہ یہ سمجھ کر کہ نازل کرنے والا کون ہے۔ یوں کہتے ہیں:

ناخوش تو خوش بود برجان من دل فدائے یار دل رنجان من

(تیرا ناخوش ہونا مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے ایسے محبوب پر دل قربان ہے جو میرے دل کو رنجیدہ کرنے والا ہے)

بلکہ بعض دفعہ جو اس کلفت کے انوار وآثار کو دیکھتا ہے تو عراقی کی طرح زبان حال سے کہتا ہے:

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاکت تیغت سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ تمہاری تلوار سے ہلاک ہو دوستوں کا سر سلامت رہے کہ آپ اس پر خنجر آزمائی کریں)

حضرت رابعہ بصریہ رحمہا اللہ کا مذاق

پھر اس کو بیماری اور تنگدستی سے محبت ہو جاتی ہے اس کو دور ہونا پسند نہیں ہوتا۔ حضرت رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ علیہا پر جب فاقہ اور مرض نہ ہوتا تو یہ بے قرار ہو کر فرماتیں کہ شاید محبوب ناراض ہیں جو بہت دنوں سے پیام وسلام نہیں آیا۔ یعنی فاقہ اور بیماری یہ ان کے نزدیک محبوب کا پیام وسلام تھا۔ پھر ان لوگوں کی بیماری اور فاقہ مستی کو مصیبت کون کہہ سکتا ہے ہاں یوں کہئے کہ صورت مصیبت ہے جیسے آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض کاریگر لوگ مٹھائی کی چیزیں بنایا کرتے ہیں کبھی مٹھائی کا درخت بناتے ہیں کبھی پھول پتے وغیرہ تو عوام کی مصیبت کو اور خواص کی مصیبت کو یوں سمجھئے جیسے ایک تو نیم کا اصلی پتہ ہو دوسرا اسی کی شکل میں مٹھائی کا بنا ہوا پتہ ہو صورت دونوں کی یکساں ہے مگر حقیقت میں آسمان زمین کا فرق ہے کہ ایک تلخ ہے ایک شیریں ہے اسی لیے حضرت رابعہ فاقہ ومرض کے نہ آنے سے بے چین ہو جایا کرتی تھیں آخران کو کچھ تو مزہ اس میں آتا ہوگا لیکن یہ ایک مذاق ہے اور دوسرا مذاق اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ ہر حال میں خوش ہو۔ نہ صحت سے بے چین ہو نہ مرض سے نہ فاقہ کے آنے سے گھبرائے نہ جانے سے اس سے بھی راضی ہو اس سے بھی راضی ہو بس اس کا حال اس کا مصداق ہو۔

زندہ کنی عطائے تو وربکشی فدائے تو دل شدہ مبتلائے تو ہرچہ کنی رضائے تو

(آپ اگر زندگی بخشیں تو زہے نصیب اور موت دیں تو زہے قسمت جب جان آپ کی عاشق ہوگئی تو پھر آپ جو چاہیں کریں)

یار جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے

اور یہ حالت اس لیے افضل ہے کہ اس میں اپنے اختیار و ارادہ کا فناء کلی ہے کہ اپنے لیے کسی حالت کو تجویز نہیں کرتا اگر حق تعالیٰ تندرست رکھیں مال و دولت عطا فرما دیں' اس سے بھی راضی ہے اگر بیمار رکھیں فاقہ بھیجیں اس سے بھی خوش ہے' خوشی اور غم کلفت و راحت مدح و مذمت دونوں اس کے نزدیک برابر ہیں اور یہی کمال عبدیت ہے۔ لوگ اہل اللہ کی تکالیف کو دیکھ کر سمجھتے ہیں کہ وہ بھی ان کی طرح پریشان ہوں گے مگر جس کو یہ دولت حاصل ہو جس کا مذاق عبدیت اور فنا ہو چکا ہو بھلا وہ بھی کہیں تکلیف سے پریشان ہوا کرتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ وہ روتے بھی ہوں آہ بھی کرتے ہوں بیماری میں تڑپتے بھی ہوں مگر اس تڑپنے سے ان کا دل پریشان نہیں ہوتا دل کو اس وقت ایک خاص سرور و لذت حاصل ہوتی ہے۔ باطن میں وہ پوری راحت میں ہوتے ہیں۔

دمادم شراب الم درکشند وگر تلخ بینند دم درکشند

(ہر وقت رنج کی شراب پیتے ہیں جب اس میں رنج کی تلخی دیکھتے ہیں خاموش رہتے ہیں)

آخر آپ نے سنا ہوگا کہ بعض عشاق نے محبوبوں کے ہاتھ سے قتل ہونا بخوشی گوارا کیا ہے تو کیا قتل کے بعد ان کی لاش تڑپی بھی نہ تھی۔ تڑپی ضرور تھی لیکن اس کو خلاف محبت و عشق کوئی نہیں سمجھتا۔ اسی طرح اگر اہل اللہ سے ظاہر میں کلفت کی وجہ سے آہ و نالہ اور اضطراب صادر ہو تو یہ محبت کے خلاف نہیں کیونکہ یہ تو طبعی امر ہے کہ کلفت کا احساس ہو ہاں ان کا دل مسرور ہوتا ہے' جس پر واقعات بکثرت شاہد ہیں ایک بزرگ کے بدن پر کیڑے پڑے ہوئے تھے وہ بے چارے راستہ میں سڑک کے کنارے آپڑے تھے۔ ان پر ایک دوسرے بزرگ کا گزر ہوا ان کو ان کی حالت دیکھ کر رحم آیا۔ دیکھا کہ زخموں پر ہزاروں مکھیاں بیٹھی ہوئی ہیں ان بزرگ نے ترس کھا کر ان کا سر اٹھا کر اپنے زانوں پر رکھ لیا اور پنکھا جھلنے لگے۔ اس شخص نے معاً آنکھیں کھول دیں اور کہا جاؤ یہ کون ہے جو میرے اور محبوب کے درمیان آکر حائل ہو گیا تم میرے حال پر کیا ترس کھاتے ہو مجھے تمہارے حال پر رحم آتا ہے۔ یہ حکایت تو کتابوں میں لکھی ہوئی ہے اور ایک واقعہ میرے بچپن کے زمانہ کا ہے میرے ایک عزیز جو درویش تھے کمبل اوڑھے ہوئے اپنے ایک عزیز سے ملنے آئے وہ دوسرے صاحب شال اوڑھے ہوئے تھے۔ یہ شال اوڑھنے والے ان درویش سے کہنے لگے کہ تم نے کیا ڈھونگ بنایا ہے کہ لباس چھوڑ کر کمبل دلایا یہ کمبل تو زہر لگتا ہے تو وہ درویش بے ساختہ کہنے لگے کہ مجھے تمہارا یہ شال زہر لگتا ہے میں کیا کروں الغرض آپ کو ان کی کلفت پر رحم آتا ہے اور ان کو آپ کی تندرستی و ناز و نعم پر رحم آتا ہے کہ یہ لوگ آخرت میں درجات سے اور دنیا میں محبوب کی چھیڑ چھاڑ سے محروم ہیں۔

حکایت حضرت شبلی

حضرت شبلی جب کسی امیر کو دنیا میں منہمک دیکھتے تو یہ دعا پڑھتے ہیں:

الحمدللّٰہ الذی عافانی مما ابتلاک بہ وفضلنی علی کثیر ممن خلق تفضیلا۔[1]

(اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے مجھ کو عافیت دی اس چیز سے جس میں تجھ کو مبتلا کیا اور اپنی مخلوق سے بہتوں پر فضیلت دی)

حدیث شریف میں یہ دعا بیمار کو دیکھ کر پڑھنے کے لیے وارد ہوئی ہے کہ جب کسی مریض و مبتلا کو دیکھو تو یہ دعا پڑھ لیا کرو۔

ان شاء اللہ تم اس مرض و بلا سے محفوظ رہو گے۔ مگر فقہاء نے یہ لکھا ہے کہ یہ دعا آہستہ سے پڑھے مریض کو سنا کر نہ پڑھے تاکہ اس کی دل شکنی نہ ہو تو حضرت شیخ زیادہ دنیا کو بھی بلا سمجھتے تھے اور اس سے محفوظ رہنے پر شکر کرنے کے لیے یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ حضرات فقر سے کس درجہ راضی ہوں گے۔

حضرت غوث اعظم کو بادشاہ سنجر نے لکھا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ حضرت کی خانقاہ کے لیے ملک نیمروز کا کوئی حصہ وقف کردوں تاکہ ذاکرین و شاغلین کے خرچ کو کافی ہوجایا کرے۔ آپ نے اس کے جواب میں یہ قطعہ لکھ کر بھیجا:

چوں چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد   دردل اگر بود ہوس ملک سنجرم
زانگہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب   من ملک نیمروز بیک جونمی خرم

(چتر سنجری کی طرح میرا بخت سیاہ رو ہو اگر میرے دل میں سنجر کے ملک ہوس بھی ہو جب سے مجھے آدھی رات کی بادشاہت ملی ہے میں ملک نیمروز کو ایک جو کے بدلے میں نہیں خریدتا)

آخر کوئی بات تو ان کو نصیب ہے جو دنیا کی لذتوں سے اس قدر سیر ہوگئے۔ صاحبو! ان کے دل میں ایک دولت ہے جس نے ان کو سب دولتوں سے بے نیاز کردیا ہے وہ کیا ہے وہ یہ دولت ہے جس کو عارف شیرازی نے بیان فرمایا ہے:

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روئے   بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز وہائے وہوئے

(فراغ دل سے کچھ وقت محبوب کے چہرہ پر نظر کرنا تمام دن ہو وہائے کی چتر شاہی سے بہتر ہے)

واللہ ایک بار فراغت قلب کے ساتھ محبوب کی طرف نظر کرنا سلطنت ہفت اقلیم سے افضل ہے۔

---

[1] (سنن ابن ماجۃ: ۳۸۹۲' الدر المنثور ۱: ۱۵۴)

یک دم بہ خدا بودن کا مفہوم

خاقانی کہتے ہیں:

پس ازسی سال ایں معنی محقق شد بخاقانی　　　کہ یکدم باخدا بودن بہ از ملک سلیمان

(تیس سال کے بعد خاقانی کو یہ حقیقت محقق ہوئی کہ ایک دم خدا تعالیٰ کے ساتھ مشغول ہونا ملک سلیمانی سے بہتر ہے)

اس میں سلیمان علیہ السلام کی توہین کا شبہ نہ کیا جائے چنانچہ بعض لوگوں کو وہم ہوا ہوگا کہ یک دم باخدا ہونا ملک سلیمانی سے افضل ہے تو معلوم ہوا کہ نعوذ باللہ سلیمان علیہ السلام کی سلطنت ان کے لیے مفضول حالت تھی جواب یہ ہے کہ مطلب شعر کا یہ ہے کہ یکدم باخدا بودن بہ از ملک سلیمانی کہ بکسے غیر سلیماں علیہ السلام دادہ شود (ایک دم خدا کے ساتھ مشغول ہونا اس ملک سلیمانی سے بہتر ہے جو سلیمان علیہ السلام کے علاوہ کسی اور شخص کو دے دیا جائے) باقی سلیمان علیہ السلام کا ملک ان کے حق میں باخدا بودن کے خلاف نہ تھا بلکہ وہ تو اس سلطنت میں بھی ہر دم باخدا تھے ان کی سلطنت بھی ذکر میں داخل تھی کیونکہ ذکر کی ایک نوع یہ بھی ہے لنگوٹہ باندھنے ہی کا نام بزرگی نہیں کاملین کو دنیا خدا تعالیٰ سے غافل نہیں کیا کرتی یہ حالت ناقصین کی ہوا کرتی ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعا سلطنت کی عجیب تفسیر

حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب سلطنت کی دعا کی ہے تو ساتھ میں یہ بھی فرمادیا: ”رَبِّ هَبْ لِیْ مُلْكًا لَّا یَنْبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْ بَعْدِیْ“ (یعنی مجھے ایسا ملک عطا ہو جو میرے بعد والوں کے لیے ملنا مناسب نہ ہو)

مولانا رومی اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ظاہراً اس سے حرص و حسد کا شبہ ہوتا ہے مگر واقعہ میں یہ ضعفاء کے حق میں انہوں نے اس دعا میں عین رحمت فرمائی جس کی توجیہ یہ ہے کہ من بعدی میں بعدیت زمانیہ مراد نہیں بلکہ بعدیت رتبیہ مراد ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ایسا ملک مجھے عطا کیا جائے جو میرے درجہ والوں کے لیے خواہ مناسب ہو مگر مجھ سے کم درجہ والوں کے لیے غیر مناسب ہوگا یعنی ان کو عطا نہ کیا جائے کیونکہ وہ ایسی سلطنت سے کفر و تکبر میں مبتلا ہو جائیں گے اب اس تفسیر پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کچھ اشکال نہیں ہو سکتا کیونکہ آپ تو سلیمان علیہ السلام کے اعتبار سے من معی بلکہ من قبلی (مجھ سے پہلے) ہیں یعنی آپ تو ان کے ہم رتبہ نبوت و رسالت میں اور درجہ میں ان سے بھی افضل ہیں ختم ہوئی تفسیر مولانا کی۔ واقعی تفسیر کو ان حضرات سے سیکھے

الغرض سلیمان علیہ السلام کا ملک ان کے حق میں با خدا ہونے کے خلاف نہ تھا وہ سلطنت کے ساتھ بھی ہر دم با خدا تھے اور حضرت سلیمان کو تو ملک کیا مضر ہوتا جبکہ حضرات صحابہ کو مضر نہ ہوا۔ بزرگوں نے لکھا ہے کہ حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے پاس دنیا ایسی تھی جیسے منتر جاننے والے کے ہاتھ میں سانپ جس طرح منتر جاننے والے پر سانپ کے زہر کا اثر نہیں ہوتا اسی طرح حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر دنیا کا اثر نہ ہوتا تھا۔ اس کی وجہ کیا تھی' وجہ یہ تھی کہ ان حضرات کے ہاتھ میں دنیا تھی' دل میں دنیا نہ تھی' دل میں خدا کی محبت و معرفت اس درجہ بھری ہوئی تھی کہ وہاں دنیا و مافیہا کا گذر ہی نہ تھا۔ مولانا نے عجیب مثال بیان فرمائی ہے:

آب در کشتی ہلاک کشتی است — آب اندر زیر کشتی پشتی است

(کشتی میں پانی کشتی کو ڈبونے والا ہے اور اس کے نیچے ہونا کشتی کے لیے پشتی ہے)

حضرات صحابہؓ اور بعض اولیاء امت کی شان

اور حضرات صحابہؓ کی بھی بڑی شان ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے بعد انہی کا درجہ ہے۔ صاحبو! اولیاء امت میں بھی ایسے بکثرت ہوئے ہیں جن کو سلطنت و ملک نے ایک ساعت کے لیے بھی با خدا ہونے سے نہیں روکا۔

مولانا جامی اور حضرت خواجہ عبید اللہ احرار کی حکایت

حضرت خواجہ عبید اللہ احرار بہت بڑے بزرگ تھے اور اسی کے ساتھ آپ کے یہاں شاہانہ ٹھاٹھ بھی تھا۔ مولانا جامی زمانہ طلب میں حضرت خواجہ صاحب کی بزرگی کا حال سن کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے' دیکھا تو وہاں پورا شاہانہ سامان تھا' مولانا جامی کو خطرہ ہوا کہ یہ شخص ولی اور عارف کیا ہوگا جس کے یہاں اس قدر دنیا بھری ہوئی ہے۔ ولی کو تو فقیر ہونا چاہیے اس خطرہ کو قوت ہوئی تو آپ نے برملا خواجہ صاحب کے منہ پر کہہ دیا:

نہ مرد است آنکہ دنیا دوست دارد

(جو شخص دنیا کو دوست رکھے وہ مرد خدا نہیں ہے)

اور یہ کہہ کر وہاں ٹھہرے بھی نہیں آ کر مسجد میں لیٹ رہے۔ یہاں ان کی آنکھ لگ گئی تو خواب میں دیکھتے ہیں کہ میدان حشر قائم ہے اور ایک شخص مولانا جامی کے سر ہو رہا ہے کہ میرا آپ کے ذمہ فلاں حق ہے وہ ادا کیجئے آپ کہتے ہیں کہ بھائی میرے پاس تو کچھ نہیں اس نے کہا کہ پھر میں آپ کی نیکیاں لوں گا' یہ بڑے پریشان تھے کہ اتنے میں حضرت خواجہ عبید اللہ احرار کی

سواری سامنے سے گزری اور انہوں نے مولانا جامی کو اس حال میں دیکھ کر اپنی سواری روک لی اور فرمایا کیا قصہ ہے حق دار نے اپنا مطالبہ بیان کیا آپ نے فرمایا کہ یہ شخص میرا مہمان ہے اس کو تنگ نہ کرو اور جو کچھ لینا ہو ہمارے خزانہ سے جو ہمارا یہاں جمع ہے جا کر لے لو۔ ہیبت سے آنکھ کھل گئی تو دیکھا خواجہ صاحب نماز کے لیے سواری پر آرہے ہیں۔ مولانا جامی کے دل پر خواجہ صاحب کا رعب اور ان کی ہیبت جم گئی اور یہ سمجھے کہ واقعی یہ شخص خالی نہیں ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص بڑا ہی صاحب ظرف ہے جس کو دنیا خدا سے غافل نہیں کرسکتی۔ مولانا جامی بے ساختہ دوڑ کر قدموں میں جا گرے اور قصور کی معافی چاہنے لگے۔ انہوں نے ہنس کر فرمایا کہ میاں خواب و خیال پر اعتماد نہیں کیا کرتے اب تو ان کو اور بھی اعتقاد بڑھا کہ معلوم ہوتا ہے یہ خواب بھی آپ ہی کا تصرف تھا اور اگر تصرف نہ تھا تو آپ کا کشف ہی بہت صحیح ہے۔ بہرحال کھلی کرامت ظاہر ہوئی۔ مولانا جامی نے معافی چاہنے کے بعد سلسلہ میں داخل ہونے کی درخواست کی، خواجہ صاحب نے فرمایا کہ ذرا ہم کو اپنا وہ مصرعہ دوبارہ سنانا جو تم نے آتے ہی پڑھا تھا۔ مولانا جامی نے عرض کیا کہ حضور وہ تو میری جہالت تھی اب میری کیا مجال ہے جو ایسی بات زبان سے کبھی نکالوں۔ فرمایا: ایک بار تم نے اپنی خواہش سے پڑھا تھا ایک بار ہماری خاطر سے پڑھ دو اور یہ بے ادبی نہیں کیونکہ اب تو ہم خود اصرار کررہے ہیں "ثم الامر فوق الادب" تعمیل امر (ادب سے بڑھ کر ہے) کا لحاظ کرکے پڑھ دو۔ غرض انہوں نے مجبور ہوکر پڑھا:

نہ مرد است آنکہ دنیا دوست دارد

(جو شخص دنیا کو دوست رکھے وہ مرد خدا نہیں ہے)

حضرت خواجہ احرار نے بے ساختہ دوسرا مصرعہ ارشاد فرمایا:

اگر دارد برائے دوست دارد

(اگر دوست رکھے تو محبوب حقیقی کے لیے دوست رکھے)

کاملین کے پاس دنیا کی حقیقت

سبحان اللہ کیا عجیب جواب ہے جس میں کاملین کے پاس دنیا ہونے کی حقیقت کھول دی کہ وہ جو کچھ رکھتے ہیں دوست یعنی محبوب حقیقی کے لیے رکھتے ہیں اپنے نفس کے لیے یہ ساز و سامان نہیں رکھتے۔ یعنی مقصود بالذات نفس کی راحت نہیں ہوتی بلکہ ہر حال میں رضا کا قصد ہوتا ہے گو اس کے ساتھ راحت نفس بھی لازم آجائے اور حقیقت میں یہ بڑا کمال ہے کہ متاع دنیا میں مشغول

ہو کر انسان کا دل خدا سے غافل نہ ہو۔ الغرض کاملین کی نظر میں راحت وکلفت خوشی اور غم سب یکساں ہوتے ہیں کوئی حالت ان کو خدا تعالیٰ سے غافل نہیں کرتی۔ پس ان پر جو مصیبت آتی ہے وہ صورت مصیبت ہوتی ہے، حقیقت مصیبت نہیں ہوتی۔ گویا اس کو مشاکلۃ مصیبت کہہ دیا جاتا ہے اسی طرح یہاں جدال بالحق کو مشاکلۃ جدال کہہ دیا گیا کہ صورت ہر جدال کی ایک ہی ہوتی ہے۔ مگر یہ بات بھی پہلے ہی زمانہ کے ساتھ خاص تھی کہ جدال بالباطل کی صورت جدال بالحق کے مشابہ تھی کہ جس طرح اہل حق تہذیب کے ساتھ مناظرہ کرتے تھے اہل باطل بھی تہذیب کی رعایت کرتے تھے۔ باقی آج کل تو جدال بالباطل کا پہچاننا کچھ بھی مشکل نہیں کیونکہ آج کل مناظرہ میں خصم پر پھبتیاں اڑانا خلاف تہذیب باتیں استعمال کرنا خواہ مخواہ اپنی بات کی پچ کرنا ہر شخص کو معلوم ہو جاتی ہے جس سے سب سمجھ جاتے ہیں کہ اظہار حق مقصود نہیں محض ہار اور جیت مقصود ہے آج کل تو دنیا میں شاید ہی کہیں جدال بالحق ہوتا ہو ورنہ عموماً جدال بالباطل ہی ہوتا ہے اور گو یہ حالت بہت زمانہ سے ہے مگر اس زمانہ میں پہلے سے زیادہ ترقی ہے۔

حضرت امام اعظم کی اپنے صاحبزادہ کو نصیحت

امام ابوحنیفہ نے اپنے صاحبزادے حماد کو نصیحت فرمائی تھی کہ علم کلام و مناظرہ میں مشغول نہ ہونا۔ انہوں نے عرض کیا کہ میں نے آپ کو خود مناظرہ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ فرمایا: ہاں ہم نے مناظرہ کیا ہے لیکن ہماری یہ حالت تھی کہ ہم یہ تمنا کرتے تھے کہ حق بات خصم کے منہ سے نکلے اور ہم اس کو قبول کریں اور تم کو یہ تمنا ہوتی ہے کہ خصم کے منہ سے سوائے باطل کے کچھ نہ نکلے تاکہ تم غالب رہو ہم کو یہ بات گوارا نہ تھی کہ ہمارا مسلمان بھائی اپنی زبان سے غلط بات کہے۔ پھر اس کی پچ کرے یا ہم حق بات کہیں اور اس کو ہار کر ہماری بات ماننا پڑے جس سے ہمارا غلبہ اور اس کا عجز ظاہر ہو یا ضد میں آ کر وہ ہماری حق بات کو رد کرنے لگے تو اس کے ایمان کا ضرر ہو اس لیے ہم یہ تمنا کیا کرتے تھے کہ خصم کے منہ سے حق بات نکلے تو ہم اس کو جلدی سے قبول کر لیں جس سے اس کی عزت بھی ہو اور حق بھی واضح ہو جائے۔ میں کہتا ہوں کہ امام صاحب کے بعد کا زمانہ بھی غنیمت تھا کیونکہ اس زمانہ کے لوگ جو یہ تمنا کرتے تھے کہ خصم کے منہ سے باطل کے سوا کچھ نہ نکلے اور حق بات ہمارے ہی منہ سے نکلے تو اس تمنا کا منشا یہ تھا کہ وہ لوگ اس بات کا قصد کرتے تھے کہ اگر کبھی خصم کے منہ سے حق بات نکل گئی تو ہم ضرور مان لیں گے ورنہ اگر ان کی نیت یہ نہ ہوتی تو اس تمنا کی ان کو کیا ضرورت تھی کہ خصم کے منہ سے باطل ہی نکلے۔ معلوم ہوا کہ وہ ہمیشہ غلط بات ہی کا رد کرنا چاہتے تھے حق بات کے رد کرنے کا وہ قصد نہیں کرتے

تھے مگر آج کل تو یہ تمنا کرتے ہیں کہ خصم کے منہ سے حق بات نکلے نہ یہ تمنا کرتے ہیں کہ باطل نکلے کیونکہ وہ تو پہلے ہی سے یہ بات دل میں ٹھان لیتے ہیں کہ خصم کے منہ سے جو کچھ نکلے گا اس کو رد ہی کریں گے خواہ حق ہو یا باطل ہو۔ افسوس تو یہ ایک تیسرا درجہ ہے جو پہلے زمانہ میں نہ تھا یہ آج پیدا ہوا ہے کہ مناظرہ میں ہر شخص یہ ٹھان لیتا ہے کہ دوسرے کے منہ سے جو کچھ نکلے اس کو رد ہی کرنا چاہیے اگر چہ وہ حق بات ہی ہو۔ "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ" (ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں)

آدمیت روح انسانی پر موقوف ہے

کانپور میں ایک مرتبہ میں نے ایک مسئلہ بیان کیا، ایک طالب علم بولے کہ نہیں یہ مسئلہ اس طرح ہے۔ میں نے کہا کہ تم نے اس طرح کہاں دیکھا کہنے لگے ہدایہ میں لکھا ہے۔ میں نے ہدایہ ان کے سامنے رکھ دیا کہ لو اس میں نکالو اس میں ہر چند تلاش کیا مگر وہ مسئلہ نہ تھا تو اب بجائے اس کے کہ وہ اپنی غلطی تسلیم کریں کہتے ہیں کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ یہ ہدایہ ہے میں نے کہا سبحان اللہ پھر اس کی کیا دلیل ہے کہ آپ آدمی ہیں اور میرا یہ سوال پھر بھی موقع کا تھا کیونکہ آدمیت اس صورت کا نام نہیں بلکہ آدمیت نفس ناطقہ اور روح انسانی پر موقوف ہے جو ایک مخفی امر ہے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں:

گر بصورت آدمی انسان بدے ۔۔۔ احمد و بوجہل ہم یکساں بدے

(اگر صورت کی وجہ سے آدمی انسان ہوتا تو احمد اور ابوجہل برابر ہوتے)

بہت سے آدمی ایسے ہیں کہ ان کی صورت آدمی کی ہے لیکن روح درندوں اور جانوروں کی روح سباع اور بہائم کی ہے۔ ایسوں ہی کی نسبت ارشاد ہے: "**اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ**" (یہ لوگ مثل جانوروں کے ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر ہیں۔

مولانا فرماتے ہیں:

اینکہ می بینی خلاف آدم اند ۔۔۔ نیستند آدم غلاف آدم اند

(یہ جو آدمیوں کا اختلاف دیکھتے ہو یہ آدم نہیں یہ آدم کے غلاف میں ہیں)

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست ۔۔۔ پس بہر دستے نباید داد دست

(بہت سے آدمیوں کی شکل میں شیطان ہیں اس لیے ہر کس و ناکس کا اندھا ہو کر مرید نہ ہونا چاہیے)

حقیقی اور نقلی انسان کا فرق

غلاف آدم پر مجھے یاد آیا کہ حیدر آباد میں محرم کے زمانہ میں بعض لوگ شیر اور ریچھ بنتے ہیں یعنی شیر اور ریچھ کی کھال پہن کر لوگوں کو ڈراتے ہیں تو کیا اس سے وہ سچ مچ شیر ہو گئے ہرگز نہیں

بلکہ ان کو غلاف شیر کہا جائے گا۔ اسی طرح آدمی کی کھال بدن پر لگ جانے سے کسی کو آدمی نہیں کہا جاسکتا' آدمیت کچھ اور ہی چیز ہے' دیکھئے اصلی شیر میں اور غلاف شیر میں اتنا فرق ہوتا ہے کہ یہ نقلی شیر تو کتے سے بھی سب سے پہلے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں اور حقیقی شیر کی یہ شان ہوتی ہے۔

گر جہاں پر برف گرددسر بسر تاب خور بگداز دش ازیک نظر

(اگر تمام عالم بھی برف سے پر ہو جائے آفتاب کی تابش اس کو ایک نظر سے پگھلا دیتی ہے)

واقعی اگر جنگل میں ایک شیر آ کر دھڑو کے تو سارا جنگل کانپ جائے اور یہ نقلی شیر اس کی آواز ہی سن کر ہگ دے۔ یہی فرق ہے حقیقی انسان اور نقلی انسان میں دیکھئے ابوجہل بھی کعبہ میں جاتا تھا جبکہ وہاں تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے وہ تو جا کر سب بتوں کو سجدہ کرتا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایک بار کعبہ میں داخل ہوئے تھے تو سارے بت سرنگوں ہو کر آپ کے قدموں میں آ گرے ایک وہ انسان تھا ایک آپ انسان تھے۔ پس حقیقت میں ابوجہل آدمی نہ تھا بلکہ غلاف آدم تھا۔ اسی لیے میرا ان طالب علموں سے یہ سوال ایک حد تک صحیح تھا کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ آپ آدمی ہیں ممکن ہے کہ آپ غلام آدم ہوں۔ باقی ان کا سوال محض ہٹ دھرمی تھا کیونکہ ہدایہ کا ہدایہ ہونا تطابق عبارت سے معلوم ہوسکتا تھا' وہ اپنی ہدایہ لا کر اس ہدایہ کا مقابلہ کر سکتے تھے مگر صاحب ملا آن باشد کہ چپ نشود (ملا وہ ہے کہ چپ نہ ہو) ممکن ہے کہ تطابق عبارت کی صورت میں بھی وہ یہی کہتے کہ یہ ہدایہ نہیں کیونکہ وہ دونوں کی عبارت میں بھی اعتبار سے فرق نکال سکتے تھے کہ یہ نقوش اس حیثیت سے کہ میری کتاب میں ہیں ہدایہ کے نقوش ہیں اور اس حیثیت سے کہ دوسری کتاب میں ہیں ہدایہ کے نقوش نہیں ہیں کچھ اور ہوں گے۔

اعتبار کا فرق

جیسا کہ ایک طالب علم نے اپنے بھائی کو گالی دی تھی ماں کی' کسی نے کہا ظالم وہ تیری بھی تو ماں ہے تو آپ نے کہا کہ صاحب اعتبار کا فرق ہے اس حیثیت سے کہ وہ میری ماں ہے مخدومہ مکرمہ ہے اور اس حیثیت سے کہ اس کی ماں ہے ایسی ویسی ہے تو بھائی یہ اعتبار کا فرق بڑے غضب کا ہے جس کی بابت مشہور ہے: "**لولا الاعتبارات لبطلت الحکمة**" (اگر اعتبارات نہ ہوتے تو حکمت باطل ہو جاتی) لیکن اگر وہ اعتبارات ایسے ہی اعتبارات ہیں تو یوں کہنا چاہیے "**لولا الاعتبارات لبطلت الحماقة**" (اگر اعتبارات ہوتے تو حماقت باطل ہو جاتی) غرض ان طالب علم کے اس جواب سے سب کو معلوم ہو گیا کہ ان کو محض ضد اور اپنی بات

کی بچ منظور ہے آج کل عموماً یہ حالت ہے کہ محض ایک دوسرے کی ضد میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال کہہ دیتے ہیں۔ مثلاً دو عالموں میں مخالفت ہے تو اب وہ مخالفت دنیوی معاملات سے گزر کر مسائل شرعیہ تک پہنچتی ہے کہ جس مسئلہ میں ایک کا فتویٰ جواز کا ہوگا دوسرا اس کی ضد میں عدم جواز کا فتویٰ دے گا' بھلا کچھ ٹھکانا ہے اس ضد کا۔

ایسی ضد کا کیا ٹھکانا اپنا مذہب چھوڑ کر   یہ ہوا کافر تو وہ کافر مسلمان ہوگیا

شیخ سدو کے بکرے کو حلال کہنے والے علماء کی حکایت

یہیں دہلی کا قصہ ہے کہ ایک زمانہ میں یہاں علماء کی دو جماعتیں تھیں۔ ایک جماعت شیخ سدو کے بکرے کو حلال کہتی تھی اور ایک جماعت حرام بتلاتی تھی۔ ایک مرتبہ دونوں جماعت کے لوگوں کو ایک شخص نے دعوت میں جمع کر لیا۔ جب سب کے سامنے کھانا رکھ دیا گیا اور وہ کھانے کو تیار ہوئے تو اس نے کہا کہ ذرا تھوڑی دیر سب حضرات توقف فرمائیں' مجھے کچھ کہنا ہے' سب نے ہاتھ روک لیا تو اس نے کہا کہ یہ جو گوشت آپ کے سامنے رکھا ہوا ہے شیخ سدو کے بکرے کا ہے اب جس کا جی چاہے کھائے جس کا جی چاہے نہ کھائے۔ پس جو لوگ اس کو حرام سمجھتے تھے انہوں نے تو ہاتھ کھینچ ہی لیا' تماشا یہ کہ جو لوگ اس کو حلال کہتے تھے انہوں نے بھی ہاتھ روک لیا' داعی نے ان سے کہا کہ صاحب یہ حضرات اگر ہاتھ روکیں تو ان کو حق ہے کیونکہ یہ اس کو حرام سمجھتے ہیں مگر آپ نے کیوں ہاتھ روکا آپ کے نزدیک تو یہ حلال ہے۔ اس وقت وہ کہنے لگے کہ بھائی حق بات تو یہی ہے کہ یہ حرام ہے مگر ہم تو محض ان کی ضد میں اس کو حلال کہتے ہیں۔ سو دیکھئے یہ ضد ایسی بری بلا ہے کہ اس میں انسان کیا کچھ کر گزرتا ہے مگر میں کہتا ہوں کہ وہ لوگ آج کل کے اختلاف کرنے والوں سے پھر بہت غنیمت تھے کہ انہوں نے حرام کو صرف زبان ہی سے حلال کیا پیٹ کے اندر اس کو داخل نہیں کیا۔ گویا انہوں نے زبان سے نکالا اندر داخل نہیں کیا۔ نیز موقع پر اپنی غلطی کا اقرار بھی کر لیا کہ ہم جو کچھ کہتے تھے محض ضد میں کہتے تھے اور آج کل اگر کوئی مولوی کسی کی ضد میں حرام کو حلال کہتا ہو اور اس کو ایسا موقع پیش آجائے جیسا ان صاحبوں کو پیش آیا تھا تو آج کل کے ضدی مولوی کبھی اس کا اقرار نہ کریں گے کہ ہم محض ضد میں اس کو حلال کہتے تھے اور واقع میں حق یہی ہے کہ حرام ہے اور یقیناً سب کے سامنے اپنی بات کی لاج رکھنے کو طوعاً و کرہاً اس کو کھا بھی جائیں گے' گو ل دل نہ مانتا ہو اندر سے جی متلاتا ہو' طبیعت اس کو پھینکنا چاہتی ہو مگر یہ اپنی بات کے پکے بری بھلی طرح اس کو ضرور نگل ہی جائیں گے۔ الغرض امام صاحب

کے صاحبزادے کو صورت یکساں ہونے کی وجہ سے شبہ ہو گیا کیونکہ جدال بالحق وجدال بالباطل دونوں کی صورت یکساں ہی تھی اور جس طرح جدال کا اطلاق جدال بالحق پر بھی ہو جاتا ہے اسی طرح مراء کا اطلاق بھی مراء بالحق کبھی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن شریف میں ہے ''وَلَاتُمَارِ فِیْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا'' (سو آپ ان کے بارے میں سرسری بحث کے زیادہ بحث نہ کیجئے) اس میں مراء بالحق ہی مراد ہے کیونکہ مراء بالباطل کی اجازت کسی درجہ میں نہیں ہو سکتی اور اس آیت میں مراء ظاہر کی اجازت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی ہے تو اس کو صورۃ مراء کہہ دیا گیا بوجہ مشاکلت کے ورنہ حقیقی مراء حرام ہے۔

تحصیل علم کی اصل غرض محض رضاء الٰہی ہے

حدیث میں اس سے ممانعت آئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: ''من تعلم العلم لیماری به السفهاء الی اخره'' مجھے حدیث کے الفاظ بعینہ کم یاد رہتے ہیں اسی طرح حوالہ بھی یاد نہیں رہا کرتا کہ یہ کس کتاب کی حدیث ہے:

(قلت وفی ترغیب والترهیب المنذری ص ۲۹،۳۰ مانصه وروی عن کعب بن مالک قال سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول من طلب العلم لیجاری به العلماء اولیماری به السفهاء ویصرف به وجوه الناس الیه ادخله الله النار. رواه الترمذی واللفظ له و ابن ابی الدنیا فی کتاب الصمت وغیره والحاکم شاهد اوالبیهقی وقال الترمذی حدیث غریب ۱۲ وعن جابر قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لاتعلموا العلم للتباهوا به العلماء ولاتماروابه السفهاء ولا تحیروا به المجالس فمن فعل ذلک فالنار والنار رواه ابن ماجه وابن حبان فی صحیحه والبیهقی کلهم من روایته یحییٰ بن ایوب انعافقی عن ابن جریج عن ابی الزبیر عنه ویحییٰ هذا ثقته احتج به الشیخان وغیرهما ولا یلتفت الی من شذفیه الخ والله اعلم ۱۲ جامع)

اہل علم اس کی تحقیق کرلیں مجھے حدیث کا مضمون یاد ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص علم کو اس لیے حاصل کرے تاکہ اس کے ذریعے سے علماء کا مقابلہ کرے اور جاہلوں سے جھگڑا کرے اور

لے (کنز العمال : ۲۹۰۲۱، مجمع الزوائد ۱ : ۱۸۳)

لوگوں کا رخ اپنی طرف پھیرے خدا تعالیٰ اس کو جہنم میں داخل کریں گے تو دیکھئے مراء پر کس قدر شدید وعید ہے مگر افسوس کہ آج کل تحصیل علم سے زیادہ غرض وہی ہوتی ہے جس سے حدیث میں ممانعت وارد ہو رہی ہے بلکہ آج کل تو عجیب بات یہ ہے کہ بعض لوگوں کی تحصیل علم سے کوئی بھی غرض نہیں ہوتی نہ حسن نہ مذموم اب تک تو ہم یہ سنا کرتے تھے کہ افعال اختیار یہ بدون تصور غایت وغرض کے موجود نہیں ہو سکتے مگر آج کل کے طلبہ کی حالت دیکھ کر اس مسئلہ میں ہم کو شبہ ہو گیا اور جن کی کچھ غرض ہوتی بھی ہے تو ایسے لوگ بہت کم ہیں جن کی غرض محض رضائے الٰہی ہو بلکہ اکثر کو تو جاہ مطلوب ہوتی ہے کیونکہ بہت لوگ علم دین پڑھتے ہیں مگر اپنی اصلاح نہیں کرتے اگر رضائے الٰہی ان کو مطلوب ہوتی تو عمل کا اہتمام ضرور ہوتا بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت لوگوں کا مشغلہ تحصیل علم کے بعد جھگڑنا ہی رہ جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مراء جدال ہی کے واسطے علم حاصل کرتے تھے۔ بس آج کل اسی میں فخر و ناموری سمجھتے ہیں کہ اس سے مقابلہ بحث کر لی اس سے جھگڑ لئے، کچھ جاہل ان کی طرف ہو گئے پھر علاوہ ناموری کے اس صورت میں آمدنی بھی زیادہ ہوتی ہے اور جب ان دونوں جھگڑنے والوں میں فیصلہ نہیں ہوتا تو علماء محققین کے پاس سوالات جاتے ہیں اور خواہ مخواہ ان کو بھی اس جھگڑے میں پھانسا جاتا ہے اگر کوئی اللہ کا بندہ اس سے احتیاط کرے اور جھگڑے سے بچنا چاہے تو اس کے پاس سے ٹلتے نہیں اس کے سر ہو جاتے ہیں۔

ایک فضول بحث میں اضاعت وقت

چنانچہ لکھنؤ میں مفتی سعد اللہ صاحب و مولوی سراج الدین صاحب میں لفظ اختیر کی بابت اختلاف ہوا کہ فصیح اختیر (بکسر الہمزہ) ہے یا اُختیر (بضم الہمزہ) ایک کسرہ فصیح کہتے تھے۔ ایک ضمہ کو مگر فیصلہ نہ ہوتا تھا بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ اس اختلاف میں پڑنے سے تم کو کتنی رکعتوں کا ثواب ملا۔ ایک فضول بحث میں وقت ضائع کیا اور فریقین نے دوسرے علمائے سے استفتے کیے، مولوی سراج الدین صاحب نے جو کہ بہت ہی ذکی ہیں مفتی محمد یوسف صاحب کی خدمت میں بھی سوال بھیجا۔ انہوں نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ یہ کوئی دین کا مسئلہ نہیں جس کا جواب دیا جائے فضول بحث ہے تو مولوی سراج احمد صاحب بولے کہ اس کو دین بنانا کیا مشکل ہے۔ آپ نے فوراً ایک صورت اپنے ذہن سے گھڑی اور اس طرح استفتاء لکھا کہ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص نے اپنی بی بی سے کہا کہ اگر آج صبح سے شام تک تو نے کوئی لفظ غیر فصیح بولا تو تجھ پر تین طلاق۔ اس عورت نے لفظ اختیر بولا تو اس پر طلاق ہوئی یا نہیں۔ پھر یہ استفتاء مفتی

صاحب کے پاس بھیجا گیا' وہ بے چارے یہ سوال دیکھ کر مجبور ہو گئے اور ان کو اپنی تحقیق لکھنی پڑی' یہ بھی اس لیے کہ شاید مفتی صاحب اس سوال سے پریشان ہو گئے ورنہ آزاد محقق اس کا بھی جواب دے سکتا تھا۔ وہ یہ کہتا کہ میں صاحب واقعہ کو جواب دوں گا تم کو جواب نہ دوں گا یا یہ کہتا کہ جواب دینا فرض کفایہ ہے فرض عین نہیں' جاؤ میں تم کو جواب نہ دوں گا کسی اور سے پوچھو مگر ایسے جواب کے لیے کسی قدر ہمت کی ضرورت ہے کیونکہ ایسے جواب دینے والے کو لوگ جاہل اور بدمزاج کج اخلاق مشہور کریں گے تو جس میں اتنی ہمت ہو کہ اگر کوئی اس کو جاہل وغیرہ کہہ دے تو برا نہ مانے وہ شخص ایسا جواب دے سکتا ہے مگر ایسی ہمت والے کم ہیں۔

اعانت معصیت بھی گناہ ہے

خصوص آج کل تو یہ حالت ہے کہ علماء سوال کرنے والوں سے ڈرتے ہیں ان کو بیہودہ سوال سے روک نہیں سکتے کہ اگر روکیں گے تو یہ ہم کو بدنام کریں گے یا مدرسہ کا چندہ بند کر دیں گے اس لیے ہر سوال کا جواب دیتے ہیں حالانکہ بعض لوگ محض طعنت کی راہ سے سوال کرتے ہیں ان کا مقصود حق بات کا معلوم کرنا نہیں ہوتا بلکہ مجیب کو پریشان کرنا ہوتا ہے ایسے شخص کو تو جواب دینا شاید جائز بھی نہ ہو کیونکہ ایسا سوال گناہ ہے اور مجیب اس کی اعانت فی السوال کر رہا ہے کیونکہ اس کے جواب دینے سے سائل کو آئندہ کے لیے سوال کی جرأت بڑھتی ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ بھیک مانگنے والے جن کو بھیک مانگنا حرام ہو ان کو دینا بھی حرام ہے کیونکہ ان کو سوال کرنا ہی حرام ہے اور دینے سے سوال کی اعانت ہوتی ہے اور اعانت معصیت بھی داخل معصیت ہے پس ایسے شخص کو ہرگز جواب نہ دینا چاہیے اگر وہ یہ کہے کہ تم کو جواب معلوم ہی نہیں تو کہہ دو اچھا ہم تو جاہل ہیں پھر تم ہم سے کیوں سوال کرتے ہو اور اگر کوئی یہ کہے کہ تم کو تو جواب معلوم ہے پھر کیوں نہیں بیان کر دیتے اس سے کہہ دو کہ ہاں معلوم ہے مگر تجھ کو نہ بتلاویں گے۔

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی ۔۔۔ بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

(مدعی سے اسرار عشق و مستی کو بیان نہ کرو اس کو رنج اور خود پرستی میں مرنے دو)

غضب تو یہ ہے کہ آج کل ہر سوال کے جواب دینے کی کوشش کی جاتی ہے گو جواب معلوم بھی نہ ہو تو گھڑ مڑھ کر جواب لکھتے ہیں محض اس لیے تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ فلاں شخص کو اس سوال کا جواب معلوم نہیں۔ استغفر اللہ العظیم

مفتی کو سائل کا تابع نہ ہونا چاہیے

حالانکہ کسی بات کا جواب معلوم نہ ہونا کوئی عیب نہیں کیونکہ علم محیط تو حق تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں ہوسکتا۔ بڑے بڑے عالم بلکہ امام اور مجتہد کو بھی کہیں نہ کہیں لاادری کہنا پڑتا ہے کسی امام کی (یعنی مالک رحمۃ اللہ علیہ) کی حکایت ہے کہ ان سے ایک مجلس میں چالیس سوالات کیے گئے تو انہوں نے صرف چار کا جواب دیا باقی سب کی نسبت یہی فرماتے رہے لاادری لاادری یعنی مجھے معلوم نہیں۔ پس نہ معلوم ہونے کی صورت میں خواہ مخواہ درپے جواب کے ہونا تو مذموم ہے ہی میرے نزدیک تو اگر جواب معلوم بھی ہو تو متعنت کے سامنے بیان نہ کرے اس سے تو انکار ہی کردے اور یوں کہہ دے۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(مصلحت نہیں ہے کہ راز کو ظاہر کیا جائے ورنہ رندوں کی مجلس میں کوئی خبر ایسی نہیں ہے کہ نہ معلوم ہو)

الغرض جواب دینے والے کو سائل کا تابع نہ ہونا چاہیے بلکہ سائل کو اپنا تابع بنانا چاہیے اور اگر وہ تابع نہ رہے تو اس کو جواب ہی نہ دے۔ پس اگر یہ معلوم ہو کہ سائل منصف ہے اور طالب حق ہے اس کو ضرور جواب دے بلکہ اپنے کاموں کا حرج کر کے بھی اس کو جواب دینا چاہیے اور اگر متعنت ہے اس کو ہرگز جواب نہ دے۔ ایسے شخص کو جواب دینے کی طبیعت بھی نہیں چاہتی اور منصف کو جواب دینے کے لیے طبیعت میں خود بخود تقاضا ہوتا ہے، جی چاہتا ہے کہ اس کے سامنے حقیقت واضح کردی جائے۔

مسئلہ بتلانے میں مولانا عبدالقیوم کا معمول

مولانا عبدالقیوم صاحب کی عادت تھی کہ فضول سوال کا جواب نہیں دیا کرتے تھے اور محققین نے ہمیشہ اس کا لحاظ کیا ہے کہ وقت کو فضول ضائع نہ کیا جائے اول تو ان کی یہ عادت تھی کہ جب کوئی شخص کوئی مسئلہ ان سے پوچھتا تو اپنی طرف سے فتویٰ کبھی نہ دیتے تھے بلکہ کتاب کا نام لے کر فرمایا کہ درمختار یا ہدایہ وغیرہ میں یوں لکھا ہے یہ تو آپ کی غایت احتیاط کا نمونہ ہے اور اگر کوئی شخص فقہی مسئلہ معلوم کرنے کے بعد یہ سوال کرتا کہ یہ مسئلہ کسی حدیث میں بھی ہے یا نہیں تو آپ فرمادیتے کہ میں نومسلم نہیں ہوں خدا کا شکر ہے کہ میرے آباؤ اجداد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے مسلمان چلے آرہے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ کیا اس کو ان حضرات نے یاد رکھا جو اس زمانہ میں موجود تھے پھر جو کچھ ان کو کرتے ہوئے دیکھا اس پر ان کی اولاد نے

عمل کیا۔ اسی سلسلہ بسلسلہ دین مجھ تک پہنچا ہے اس لیے مجھے حدیث کی ضرورت نہیں حدیث کی احتیاج صرف نومسلم لوگوں کو ہے جن کے آباؤ اجداد نے اسلام لانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا۔ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اپنے باپ دادوں کے ذریعے سے معلوم نہیں ہوا اس لیے احادیث کے ذریعے سے معلوم کرنے کی ان کو ضرورت ہے۔ مولانا عبدالقیوم صاحب کے اس جواب کا منشا صرف یہ ہوتا تھا کہ وہ سائل کو یہ بتلانا چاہتے تھے کہ تیرا یہ سوال فضول ہے کیونکہ اگر ہم نے تجھے یہ بتلا بھی دیا کہ فلاں حدیث اس مسئلہ کی دلیل ہے تو تجھ کو وجہ دلالت کیونکر معلوم ہوگی اب اگر ہم وجہ دلالت بھی بیان کریں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سارے مقدمات اور مبادی تم کو اسی وقت پڑھا دیں اور اگر وجہ دلالت میں تم ہماری تقلید کرو گے کہ چونکہ مولوی صاحب یہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس مسئلہ پر دلالت کرتی ہے اس لیے مانتا ہوں تو پھر تم پہلے ہی سے ہماری تقلید کیوں نہیں کرتے کہ یہ مسئلہ شریعت میں اسی طرح ہے جس طرح مولوی صاحب نے بتلایا ہاں جو شخص وجہ دلالت کو سمجھ سکتا ہو یعنی طالب علم ہو جو مقدمات اور علم مبادی سے واقف ہو چکا ہو اس کو اس سوال کا حق ہے اس کے سامنے دلائل حدیثیہ بیان کرنے کو جی بھی چاہتا ہے۔ باقی جاہلوں کے سامنے یہ علوم بیان کرنا وقت کو ضائع کرنا ہے۔

مسائل کی تحقیق میں حضرت حاجی صاحب کا ارشاد

حضرت حاجی صاحب ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی تم کو تنگ کرے اور کسی مسئلہ کی تحقیق و تدقیق کرنی چاہیے تو سب رطب و یابس شبہات و جواب اس کے سامنے رکھ دو اور کہہ دو کہ ان میں سے تم خود انتخاب کر لو' مجھے انتخاب اور ترجیح کی فرصت نہیں مجھے اور بھی کام کرنا ہے جس کے واسطے میں پیدا ہوا ہوں۔ حضرت حاجی صاحب نے اس کی ایک مثال بھی ارشاد فرمائی کہ ایک شخص نے جس کے کچھ بال سفید کچھ سیاہ تھے' حجام سے کہا کہ میری داڑھی میں سے سفید سفید بال چھانٹ دے اس نے استرہ لے کر سارے بال مونڈھ کر اور سب کو سامنے رکھ کر کہا کہ اس میں سے سفید سفید چھانٹ لیجئے مجھے فرصت نہیں۔ لیکن حضرت حاجی صاحب کے ارشاد پر عمل کرنا اسی شخص کو آسان ہے جو ننگ و ناموس کو آگ لگا چکا ہو کیونکہ ایسے جواب سے مجیب کی وقعت نہیں ہوتی' لوگ اس کو جاہل یا بدمزاج مشہور کر دیتے ہیں۔ اسی لیے آج کل ایسے جواب بہت کم لوگ دیتے ہیں اکثر تو جھک جھک میں مشغول ہی ہو جاتے ہیں۔ سلف کو اس کا بہت اہتمام تھا کہ فضول وقت ضائع نہ کیا جائے۔

حضرات اکابر دیوبند کی بے نفسی

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب سے ایک معقولی صاحب آ کر لپٹ گئے کہ میں آپ سے مناظرہ کروں گا' مولانا نے فرمایا کہ مناظرہ سے دو مقصود ہوتے ہیں ایک اظہار حق یہ تو آج کل مفقود ہے دوسرے بڑا بننا اور اپنی شان علم جتلانا آج کل زیادہ تر یہی مقصود ہوتا ہے تو اس کے لیے آپ کو مناظرہ کی ضرورت نہیں' فضول کیوں مشقت میں پڑتے ہیں۔ بآواز بلند کہے دیتا ہوں کہ صاحبو! آپ مجھ سے زیادہ عالم ہیں میں جاہل ہوں مجھے کچھ نہیں آتا بس آپ کا مقصود حاصل ہوگیا۔ چنانچہ مولانا نے بآواز بلند یہ مضمون فرمادیا اور وہ معقولی اپنا سامنہ لے کر رہ گئے۔ سبحان اللہ یہ حضرات کیسے بے نفس تھے اپنے آپ کو بالکل مٹائے ہوئے تھے۔ حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ (مولانا محمد یعقوب صاحب) کی عادت تھی کہ درس میں اگر کسی طالب علم نے آپ کی تقریر پر اعتراض کیا اور آپ کو معلوم ہوگیا کہ مجھ سے تقریر میں غلطی ہوئی ہے تو فوراً اپنی غلطی کا اعتراف فرمالیتے تھے پھر ایک دفعہ نہیں بلکہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد بار بار فرماتے تھے کہ واقعی مجھ سے غلطی ہوئی یہاں تک کہ اعتراض کرنے والا شرما شرما جاتا تھا اور بعض دفعہ جب کسی مضمون میں پڑھاتے ہوئے شرح صدر نہ ہوتا تو صاف فرمادیتے کہ مجھے اس مقام پر شرح صدر نہیں ہوا پھر اسی پر بس نہیں کرتے تھے بلکہ عین درس میں طلبہ کے سامنے کتاب اٹھا کر اپنے ماتحت مدرسین میں سے کسی کے پاس پہنچ جاتے اور بے تکلف فرمادیتے کہ مولانا مجھے اس مقام پر شرح صدر نہیں ہوا ذرا آپ اس کی تقریر فرمادیجئے۔ انہوں نے تقریر کردی تو پھر اپنے حلقہ درس میں انہی صاحب کا نام لے کر فرماتے کہ مولانا نے اس مقام کی یہ تقریر کی حقیقت میں ایسا بے نفس ہونا بڑا مشکل ہے آج کل لوگ اس کو ذلت سمجھتے ہیں مگر واللہ عزت وتواضع ہی میں ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے: "من تواضع لله رفعه الله"[1] (جو شخص اللہ کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو رفعت عطا فرماتے ہیں) آخران حضرات نے جوایسی بے نفسی اختیار کررکھی تھی کیا اس سے ان کی جاہ وعزت میں کچھ کمی آگئی بخدا پہلے سے زیادہ عزت ہوگئی کہ آج ان کی یہ باتیں کمالات اور کرامات میں شمار ہورہی ہیں لیکن طلبہ کے ساتھ یہ برتاؤ اسی وقت تک ہونا چاہیے جب کہ سوال صحیح ہو۔

---

[1] (مجمع الزوائد ۸: ۸۲' کنز العمال: ۵۷۳۰)

حضرت شیخ الہند کی ظرافت

اور اگر بے ڈھنگا سوال ہو جس کے طرز سے یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا منشا محض اعتراض اور پریشان کرنا ہے تو اول اس کو حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ کی طرح الزامی جواب سے خاموش کرو۔ مولانا کو الزامی جواب میں بہت ملکہ تھا مگر وہ ایسوں ہی کے واسطے ہوتا تھا جن کا مقصود محض اعتراض ہوتا اور جو لوگ تحقیق کے طالب معلوم ہوتے ان کے سامنے تحقیقی جوابات بھی خوب بیان فرماتے تھے۔ مولانا میں ظرافت بھی بہت تھی جب طالب علم الزامی جواب سے ساکت ہو جاتا تو فرما دیا کرتے تھے کہ تالاب پاس ہے۔ (یعنی اس میں جا کر ڈوب مرو) اور اگر کوئی شخص اس سے بھی باز نہ آوے تو اس کو جواب ہی نہ دو۔

آنکس کہ بقرآن و خبر زور نرہی — آنست جوابش کہ جوابش ندھی

(جو شخص قرآن اور حدیث کے جواب کو تسلیم نہ کرے اس کا جواب یہ ہے کہ اس کو جواب نہ دو)

اور اگر اس پر بھی متنبہ نہ ہو اور جواب کا تقاضا ہی کرتا رہے تو اس کو حلقہ درس سے نکال دو کیونکہ جس شخص کو اپنی بات کی پچ کرنے کا مرض ہو وہ ہرگز پڑھانے کے قابل نہیں اگر اس کے اس مرض کا علاج نہ کیا گیا اور اسی طرح سر آنکھوں پر بٹھالیا گیا تو اس میں ہمیشہ کے لیے یہ عادت پختہ ہو جائے گی کہ جو بات اس کے منہ سے نکلے گی اس کی پچ کیا کرے گا حق و ناحق کی ذرا پروانہ کرے گا اور اس کا دین پر جو برا اثر پڑے گا وہ ظاہر ہے:

بد گہر را علم و فن آموختن — دادن تیغ است دست راہزن

(نااہل کو علم و فن سکھانا ڈاکو کے ہاتھ میں تلوار دینا ہے)

نااہل کو علم دین پڑھانے کا انجام

کلکتہ میں ایک عالم نے مسئلہ رضاع غلط لکھا اور علماء کے پاس اس کو دستخط کے واسطے بھیجا' علماء نے بالاتفاق اس پر دستخط سے انکار کیا کہ یہ تو بالکل غلط مسئلہ ہے کسی نے ان کا ساتھ نہ دیا آخر میں ان کو اپنی غلطی کا علم بھی ہو گیا تھا مگر بات کی پچ بری بلا ہے۔ انہوں نے اس مسئلہ میں ایک رسالہ لکھ مارا اور اس میں واہی تباہی دلائل سے اپنے مطلب کو ثابت کرنا چاہا پھر وہ اپنے استاد کے پاس اس فتویٰ کو لے گئے اور ان سے جا کر کہا کہ اس مسئلہ میں سب لوگ مجھ سے علیحدہ ہیں' کوئی میرے ساتھ نہیں' آپ ہی میرا ساتھ دیدیجئے۔ انہوں نے کہا کہ بھائی یہ تو غلط مسئلہ ہے اس میں ساتھ کیونکر دوں۔ کہنے لگے کہ یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ غلط ہے مگر اب تو زبان و قلم

سے نکل گیا اب تو جس طرح ہو میری تائید کر دیجئے مگر استاد نے ساتھ نہیں دیا۔ افسوس دین کو کھیل بنا رکھا ہے کہ محض اس وجہ سے کہ ایک بات زبان سے نکل گئی ہے اس کی لکیر پیٹے جاتے ہیں حالانکہ اس کا غلط ہونا معلوم ہے نہ معلوم ان لوگوں کے دلوں سے خوف خدا کہاں جاتا رہا۔ اب سنا ہے کہ ان عالم مفتی صاحب کا انتقال ہو گیا' خدا معاف کرے۔ اگر چہ جرم بہت سنگین ہے میں تمام مدرسین و مہتممین مدارس سے بالتجا کرتا ہوں کہ للہ اس بات کا کچھ انتظام کیجئے کہ سب طلبہ کو ایک لاٹھی سے نہ ہانکا جائے اور سب کی تعلیم کو ضروری نہ سمجھا جائے بلکہ جس شخص کے اخلاق خراب ہوں اول اس کے اخلاق کی اصلاح کا اہتمام کیا جائے' بات بات پر اس کو ٹوکا جائے' اگر اصلاح کی امید نہ ہو تو مدرسہ سے علیحدہ کیا جائے۔ اسی طرح جس طالب علم کی طبیعت میں کجی معلوم ہو سلامتی سے محروم ہو اس کو بھی ہرگز پورا نصاب نہ پڑھایا جائے کیونکہ تکمیل نصاب کے بعد وہ خود بھی اور دوسرے لوگ بھی اس کو عالم و مقتدا سمجھیں گے اور ایسا شخص مقتدا ہو کر جو کچھ ستم ڈھائے گا ظاہر ہے پھر ان سب کا وبال ان مدرسین و مہتممین کے اوپر ہو گا کہ انہوں نے ایسے نااہلوں کو کیوں علم پڑھایا۔ میری رائے میں ایسے لوگوں کے لیے ایک مختصر نصاب اردو میں یا فارسی میں یا کسی قدر عربی میں مقرر کر لیا جائے جو ضروری مسائل و احکام کے جاننے کے لیے کافی ہو وہ نصاب پڑھا کر ان سے کہہ دیا جائے کہ جاؤ دنیا کا کوئی کام سیکھو اور کماؤ کھاؤ۔ مجھے حیرت ہے کہ بعض مدارس میں ایک ہزار بعض میں پانچ سو بعض میں سو دو سو طلبہ تعلیم پاتے ہیں۔ کیا یہ لوگ سب کے سب مقتداء بننے کے اہل ہیں' یقیناً نہیں اور ہرگز نہیں' پھر اہل مدارس سب کو مقتداء کیوں بنانا چاہتے ہیں۔ بخدا مسلمانوں پر زیادہ تباہی ان نااہل مولویوں کی وجہ سے بھی آئی ہے کہ ان لوگوں نے دین کو کھیل بنا لیا ہے۔ جیسا موقع دیکھا ویسا فتویٰ دے دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ عوام کہنے لگے کہ بس جی دین تو مولویوں کے ہاتھ میں ہے جس چیز کو چاہیں حلال کر دیں اور جس کو چاہیں حرام' اس بدگمانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب انہوں نے علماء سے دریافت کرنا ہی چھوڑ دیا جس کے جو جی میں آیا کر لیا' خواہ حلال ہو یا حرام پھر اس صورت میں قہر خداوندی نازل ہونا ہی تھا۔

اہل مدارس سے خطاب

اس لیے میں مکرر کہتا ہوں کہ اہل مدارس کو طلبہ کا انتخاب کرنا چاہیے اور ان میں جو اہل نظر آئیں انہی کو پوری تعلیم اور انہی کو سند فراغ دینی چاہیے مگر اب تو بلا یہ ہے کہ لوگوں کو انتساب کا شوق ہے کہ ہمارے یہاں سے اس سال اتنے آدمی فارغ ہوئے۔ اے صاحبو! طلبہ کا فارغ کرنا بہت عمدہ ہے مگر وہ پہلے اہل اللہ تو ہوں واللہ کس قدر افسوس ہوتا ہے جب بعض فارغین کو دیکھا جاتا

ہے کہ وہ قرآن کے اعراب بھی صحیح نہیں پڑھ سکتے حالانکہ اس پر اعراب لگے ہوئے ہیں وہ ان کو دیکھ کر بھی غلطی کرتے ہیں اور کتابوں کے اعراب تو وہ کیا خاک صحیح پڑھیں گے۔ بھلا ایسے نااہلوں کے فارغ کرنے سے کیا خوشی ہوسکتی ہے بجز اس کے کہ اپنے ذمہ خیانت کا وبال رہے اور کچھ نفع نہیں صاحبو! مجھ کو سخت اندیشہ ہے کہ علماء سے خصوصاً اہل مدارس سے کہیں اس کی باز پرس خدا تعالیٰ کے یہاں نہ ہو اس کی اصلاح کی جلد فکر کیجئے۔ یہ مضمون بہت طویل ہوگیا میں یہ بیان کر رہا تھا کہ طلبہ کے فضول سوالات کا جواب نہ دینا چاہیے کیونکہ بعض طلبہ محض تنگ ہی کرنا چاہتے ہیں۔

جدال فی اللہ سب سے زیادہ مذموم ہے

حضرت مولانا محمود حسن صاحب کے یہاں ایک شخص پڑھتے تھے' ان کی عادت اعتراض کرنے کی بہت تھی مگر ہمیشہ ایک دعویٰ کر دیا کرتے کہ یہ بات تو یوں نہیں یوں ہے اور جب مولانا دلیل پوچھتے تو آپ کہتے کہ کیا سارا کام میں ہی کروں' دعویٰ میں نے کر دیا دلیل آپ بیان کر دیجئے۔ سبحان اللہ کیا خوبصورت دعویٰ تھا جس کی دلیل مدعی اپنے ذمہ نہیں سمجھتے تھے غرض آج کل جدال بالباطل کا بہت چرچہ ہے علماء وطلبہ میں سے کوئی بھی اس مرض سے خالی نہیں "الا من عصم اللہ" (مگر جس کو اللہ تعالیٰ بچائے) یہ آیت جو میں نے اس وقت پڑھی ہے قابل سبق لینے کے ہے اس میں حق تعالیٰ نے جدال بالباطل کی مذمت عجیب طرز سے بیان فرمائی ہے جس سے علم کی فضیلت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں: "وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ" یعنی بعض لوگ ایسے ہیں جو مجادلہ کرتے ہیں اللہ کے بارے میں یعنی خدا کی ذات وصفات واحکام میں جن میں توحید اعلیٰ فرد ہے اور بقیہ احکام اس کے بعد ہیں سب میں جدال کرنا جدال فی اللہ ہے گو درجات متفاوت ہیں اور جدال تو خود ہی مذموم ہے پھر جدال فی اللہ تو سب سے زیادہ مذموم ہے۔ آگے فرماتے ہیں: "بِغَيْرِ عِلْمٍ وَ لَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ" یعنی مجادلہ کرتے ہیں ذات وصفات و احکام الٰہی میں بدون علم کے اور بدون ہدایت کے اور بدون روشن کتاب کے اب یہاں یہ بات سمجھنے کے قابل ہے کہ یہ قیود احترازیہ نہیں ہیں کیونکہ جدال فی اللہ کی جو کہ مذموم ہی ہوگا دو قسمیں نہیں ہوسکتیں کہ ایک وہ جو علم و ہدایت اور کتاب کے ساتھ ہو دوسرے وہ جو ان کے بغیر ہو بلکہ جدال بالباطل جب ہوگا ان تینوں کے بغیر ہی ہوگا۔ معلوم ہوا کہ یہ قیود واقعیہ ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ جدال فی اللہ یعنی جدال بالباطل کا سبب ان ہدایت و کتاب منیر کا حاصل نہ ہونا ہے۔ پھر اسی کے ساتھ ایک بات اس جگہ یہ بھی سمجھنے کی ہے کہ علم سے مراد جس میں ہدایت و کتاب منیر بھی داخل ہے مطلق علم نہیں

کیونکہ جدال بالباطل کے ساتھ مطلق علم کا اجتماع تو ممکن اور مشاہد ہے بلکہ یہاں وہ علم مراد ہونا چاہیے جو کہ جدال بالباطل کے ساتھ جمع نہ ہو سکے۔ پس یہاں علم سے خاص علم یعنی علم صحیح و نافع مراد ہے۔ اب یہاں سے علم کی فضیلت معلوم ہوئی کہ علم صحیح و نافع کیسی قدر کی چیز ہے کہ جدال بالباطل اس کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا اور جو شخص علم صحیح و نافع سے محروم ہے وہ جدال بالباطل جدال فی اللہ میں جو کہ جدال بالباطل کا اعلیٰ فرد ہے پھنس جاتا ہے اور جدال بالباطل کا مذموم ہونا سب کو مسلم ہے تو جس چیز پر اس سے بچنا موقوف ہے اس کی ضرورت کا انکار نہیں ہو سکتا لہٰذا یہ مسئلہ ثابت ہو گیا کہ علم نافع و علم صحیح کی سخت ضرورت ہے اور یہاں سے ایک بات اور بھی معلوم ہو گئی کہ جب جدال بالباطل علم صحیح کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا تو جو لوگ باوجود علم صحیح و ہدایت و کتاب منیر کے حاصل کرنے کے پھر جدال بالباطل میں مبتلا رہتے ہیں یا تو انہوں نے ان تینوں کو سمجھ کر حاصل نہیں کیا یا اگر سمجھ کر حاصل کیا ہے تو جدال کے وقت جان بوجھ کر ان سے اعراض کر لیا ہے ورنہ اگر وہ ہر وقت ان تینوں پر نظر رکھتے اور پوری طرح عمل کرتے اور کسی وقت کسی مسئلہ میں ان سے اعراض نہ کرتے تو وہ ہرگز جدال بالباطل میں مبتلا نہ ہوتے خوب سمجھ لو جب علم کی ضرورت معلوم ہو گئی۔

بقدر ضرورت علم دین حاصل کرنے کا طریق

تو اب میرا مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں کو علم نافع حاصل کرنا چاہیے اور اس کی طرف پوری توجہ کرنا چاہیے۔ یہ دیکھا جاتا ہے کہ مسلمانوں کو نماز، روزہ کی طرف تو توجہ ہے مگر علم نافع کی طرف توجہ نہیں اگر کوئی نماز نہ پڑھے روزہ نہ رکھے زکوٰۃ نہ دے حج نہ کرے تو سب لوگ اس کو برا بھلا کہنے لگتے ہیں اور اگر کوئی شخص علم دین بالکل حاصل نہ کرے تو اس کو برا کوئی نہیں کہتا حالانکہ بقدر ضرورت علم حاصل کرنا ہر شخص کے ذمہ ویسا ہی فرض عین ہے جیسا کہ نماز روزہ وغیرہ۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ سب لوگ مولوی بن جاویں اور میرا یہ مطلب کیونکر ہو سکتا ہے میں تو ابھی اہل مدارس کو مشورہ دے چکا ہوں کہ وہ سب طلبہ کو مولوی نہ بنایا کریں تو جب میں سب طلبہ کا مولوی ہونا پسند نہیں کرتا تو عوام کا مولوی ہونا میں کیوں چاہوں گا۔ پس آپ اس سے نہ گھبرائیں کہ آپ کو مولوی بننا پڑے گا بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ مسائل و احکام شرعیہ کا علم بقدر ضرورت اردو زبان ہی میں حاصل کر لیا جائے اور بچوں کو اہتمام کے ساتھ مکتب میں قرآن اور دینی رسائل پڑھنے کے لیے بھیجا جائے۔ جب وہ بقدر ضرورت مسائل سے واقف ہو جائیں پھر تمہیں اختیار ہے جس کام میں چاہو لگاؤ اور جو رؤساء کے بچے ہیں جن کو خدا نے مالی وسعت عطا فرمائی ہے

ان کو چاہیے کہ علم دین کی پوری تعلیم دی جائے کیونکہ ان کو معاش کی فکر سے خدا نے بچایا ہے تو اس کا شکر اس طرح ادا کرنا چاہیے کہ یہ لوگ دین کی خدمت کریں اور اگر پوری تعلیم نہ دی جائے تو کم از کم قرآن اور اردو کے ضروری دینی رسائل تو ان کو ضرور پڑھا دیئے جائیں تاکہ وہ اپنے مذہب سے تو کسی قدر واقف ہو جائیں اور جو لوگ اردو بھی نہ پڑھ سکیں جیسے گاؤں کے کاشتکار وغیرہ ان کو چاہیے کہ علماء سے ملتے رہیں اور مسئلے پوچھتے رہیں اگر وہ روزانہ ایک مسئلہ بھی یاد کر لیا کریں تو سال بھر میں تین سو ساٹھ مسئلے یاد ہو سکتے۔

مستورات کے لیے طریق تحصیل علم دین

رہ گئی عورتیں ان کو مرد تعلیم دیا کریں اور جو مرد پڑھے لکھے نہ ہوں وہ عورتوں سے کہہ دیا کریں کہ تم کو جو مسئلہ پوچھنا ہو ہم سے کہہ دیا کرو ہم علماء سے پوچھ کر تم کو بتلا دیں گے۔ لیجئے اس ترکیب سے ساری امت بقدر ضرورت علم سے فیض یاب ہو سکتی ہے اور جو لوگ اردو پڑھ بھی سکتے ہیں ان کو علماء سے ملنے ملانے اور سوال کرنے کا عادی رہنا چاہیے کیونکہ بعض بات کتاب سے حل نہیں ہوتی علماء سے زبانی دریافت کر کے اس کی حقیقت حل ہو جاتی ہے اور دین کے ساتھ تعلق و مناسبت تو بدون صحبت کے حاصل ہوتا ہی نہیں۔

صاحبو! آج کل علم کی سخت ضرورت ہے کیونکہ اول تو مخالفین اسلام جاہل مسلمانوں کو طرح طرح سے بہکاتے پھرتے ہیں پھر خود مسلمانوں میں بعضے فرقے ایسے موجود ہیں جو ظاہر میں اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں مگر واقع میں وہ اسلام سے دور ہیں اور بعضے گو مسلمان ہیں مگر گمراہ ہیں تو بعضے جاہل مسلمان ان گمراہ لوگوں کی باتوں کو اسلام کی باتیں سمجھنے لگتے ہیں اور دھوکے میں پڑ جاتے ہیں۔ پھر جو جماعت اہل حق کی کہلاتی ہے ان میں بھی بعضے ایسے ہیں جنہوں نے دنیوی اغراض کو قبلہ و کعبہ بنا رکھا ہے کہ جس کام کے ساتھ ان کی دنیوی غرض متعلق ہوئی اس کو انہوں نے دین کا لباس پہنا کر عوام کے سامنے ظاہر کر دیا اور جس چیز کی ممانعت سے ان کی اغراض میں خلل پڑتا ہو اس کی حرمت کو ظاہر نہیں کرتے اسی لیے وہ بہت سی باتوں کو جن کو پہلے جائز کہتے تھے آج حرام کہنے لگے اور جن باتوں کو ہمیشہ سے حرام و ناجائز کہتے تھے آج اس کی حرمت کو ظاہر نہیں کرتے۔

غرض پرستی کے بھیانک نتائج

صاحبو! یہ غرض وہ چیز ہے جس میں انسان دین سے اندھا بن جاتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد	صد حجاب از دل بسوئے دیدہ شد
چوں دہد قاضی بدل رشوت قرار	کے شناسد ظالم از مظلوم زار

(جب غرض آ جاتی تو ہنر پوشیدہ ہو جاتا ہے اور دل کی جانب سے سینکڑوں پردے آنکھوں پر پڑ جاتے ہیں۔ جب قاضی رشوت لینے کی دل میں ٹھان لیتا ہے تو ظالم اور مظلوم میں امتیاز نہیں کرسکتا۔)

یعنی جب قاضی کے دل میں رشوت کی طمع ہوگی اس سے صحیح فیصلہ کی امید بیکار بلکہ دوراز کار ہے۔ شاید یہاں کسی کو یہ سوال پیدا ہو کہ پھر ایسے لوگوں کو تم اہل حق کیوں کہہ رہے ہو سوسن لیجئے کہ میں نے ان کو اہل عقائد کے لحاظ سے کہا ہے کہ ابھی تک شکر ہے ان کے عقائد صحیح ہیں اگر چہ اس غرض پرستی کے ساتھ عقائد کا بھی سخت اندیشہ ہے چنانچہ آج کل دیکھا جاتا ہے کہ اہل حق کی جماعت کے بعض افراد ان اہل بدعت اور ملحدین کے ساتھ باہم شیر وشکر ہو رہے ہیں جو ان کو کافر کہتے تھے اور یہ ان کو فاسق وفاجر کہتے ہیں۔ پس حب فی اللہ و بغض فی اللہ کا اثر تو ابھی سے مٹ چلا ہے آگے خدا حافظ ہے۔ غرض اہل حق میں سے بعض ہم جیسے بھی ہیں جنہوں نے دین کو اغراض کے تابع کر رکھا ہے۔ وہ صاف کہتے ہیں کہ آخر مصلحت وقت بھی کوئی چیز ہے یا نہیں۔ بعض علماء سے آج کہا گیا کہ عوام بعض امور میں شریعت کی حد سے بہت دور نکل گئے ہیں اس کی روک تھام ہونی چاہیے تو وہ فرماتے ہیں کہ یہاں جوش وخروش میں ایسا بھی ہو جاتا ہے کچھ پروا نہیں اس وقت تو کام ہونے دو پھر بعد میں مسائل کو بھی دیکھ لیا جائے گا۔ ''انا للہ وانا الیہ راجعون'' اے صاحبو! آسمان نہیں پھٹ جاتا زمین شق نہیں ہو جاتی جب ایک عالم کی زبان سے یہ بیہودہ کلمات نکلتے ہیں افسوس مسلمان کی مصالح پر ایسی نظر بالخصوص ایک عالم کی نہایت شرم کی جگہ ہے۔ مسلمان کو تو مصالح کے بارے میں یہ کہنا چاہیے:

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار بگذار ند وخم طرہ یارے گیرند

(یعنی بڑی مصلحت یہی ہے کہ سب کو چھوڑ کر بس ایک ہی محبوب حقیقی کے ہو رہو)

ساری مصلحتوں اور تدبیروں کی جڑ

بس ساری مصلحتوں اور تدبیروں کی جڑ یہ ہے کہ ایک کو راضی کر لو سب کام بن جائیں گے ذرا اس تدبیر کو اختیار کر کے تو دیکھو اسی میں وعدہ ہے مال وجاہ وعزت وشوکت وغیرہ حاصل ہونے کا۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا.

(وعدہ کیا اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے تم میں سے اور کئے انہوں نے اچھے کام کہ ضرور ضرور خلیفہ بنائے گا ان کو زمین میں جیسے خلیفہ بنایا تھا ان لوگوں کو جو ان سے پہلے تھے اور ضرورت تمکین دے گا ان کے لیے ان کے دین کو وہ دین جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے پسند کیا اور ضرور ضرور بدلے میں دے گا ان کو بعد ان کے ڈرنے کے اور عبادت کریں گے وہ میری اور نہ شریک کریں گے وہ میرے ساتھ کسی چیز کو)

استخلاف کی غایت

اس آیت میں استخلاف فی الارض کا وعدہ ایمان واعمال صالحہ پر مرتب فرمایا ہے اور اس استخلاف کی غایت بھی تمکین دین وعبادت مع التوحید بیان فرمائی ہے اس سے صاف معلوم ہوا کہ استخلاف فی الارض مقصود بالذات نہیں بلکہ مقصود بالذات ایمان واعمال صالحہ واتباع احکام ہے اس کے استحکام و حفاظت کے لیے سلطنت عطا فرمانے کا بھی وعدہ ہے۔ پس یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ آج کل مقصود بالذات کو تابع اور تابع کو متبوع بنایا جارہا ہے۔ ایک دوسری جگہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ.

(اور بتحقیق ہم زبور میں نصیحت کے بعد کہہ چکے ہیں کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے)

اس آیت میں عباد صالحین کے لیے وراثت ارض کا وعدہ ہے تو مسلمان کو ان آیات پر نظر کر کے احکام کا اتباع کرنا چاہیے اور تمام مصالح کو تابع احکام بنانا چاہیے ان شاء اللہ تعالیٰ یہ وعدہ ضرور پورا ہوگا۔ گو کسی وقت ظہور وعدہ میں دیر ہو جائے تو اس سے گھبرانا نہ چاہیے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی تباہی کے لیے بددعا فرمائی تھی:

رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالاً فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ.

ترجمہ: ''اور موسیٰ علیہ السلام نے (دعاء میں) عرض کیا کہ اے ہمارے رب ہم کو یہ بات کشف اور وحی کے ذریعے سے معلوم ہوگئی کہ آپ نے فرعون کو اور اس کے سرداروں کو سامان تجمل اور طرح طرح کے مال دنیوی زندگی میں دیئے۔ اے ہمارے رب اسی واسطے دیئے ہیں کہ وہ آپ کی راہ سے (لوگوں کو) گمراہ کریں (پس جب ہدایت ان کے مقدر میں ہے نہیں اور جو حکمت

تھی وہ حاصل ہو چکی تو اب ان کے اموال ونفوس کو کیوں باقی رکھا جائے۔پس) اے ہمارے رب ان کے مالوں کو نیست و نابود کر دیجئے اور ان کے نفوس کی ہلاکت کا سامان کر دیجئے' اس طرح کہ ان کے دلوں کو زیادہ سخت کر دیجئے (جس سے ہلاکت کے مستحق ہو جاویں) سو یہ ایمان نہ لانے پاویں (بلکہ روز بروز ان کا کفر ہی بڑھتا رہے) یہاں تک کہ عذاب الیم (کے مستحق ہو کر اس) کو دیکھ لیں۔'' اس دعا کے بعد حق تعالیٰ کا فوراً یہ ارشاد ہوا:

آمین کہنے والا دعا میں شریک ہوتا ہے

قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ.

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم دونوں کی موسیٰ و ہارون علیہما السلام مراد ہیں کیونکہ حضرت ہارون اس دعا پر آمین کہہ رہے تھے اور آمین کہنا بھی دعا میں شریک ہوتا ہے۔ دعا قبول کر لی گئی سو تم (اپنے منصبی کام پر) مستقیم رہو اور ان لوگوں کی راہ نہ چلنا جن کو علم نہیں۔ پس باوجود یہ کہ دعا قبول ہو چکی تھی اور اس کی قبولیت کی اطلاع بھی فوراً دیدی گئی تھی مگر مؤرخین نے لکھا ہے کہ ظہور اس دعا کا چالیس سال کے بعد ہوا۔ مفسرین نے ''وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ'' کی تفسیر میں لکھا ہے یعنی استعجال نہ کرنا یعنی جیسا کہ جاہل لوگ دعا کے اگلے ہی دن وحی کے منتظر ہوا کرتے ہیں۔ دیکھئے اگر آپ کسی طبیب کے پاس جائیں کہ مجھ کو مسہل کی ضرورت ہے' مسہل دیدو تو یہ بھی کہیں ہوسکتا ہے کہ آج تم نے درخواست کی اور کل ہی دست آنے لگیں' ہرگز نہیں بلکہ وہ اول منضج (مادہ کو پکانے والی دوا) کا نسخہ لکھے گا' مہینہ بھر اس کو پینا پڑے گا' اس کے بعد وقت اور موسم کو دیکھ کر مسہل دیا جائے گا اور ہر مسہل کے بعد تبرید ہوگی پھر اگر مسہل میں کچھ کسر رہ گئی تو کوئی ملین شربت مہینہ بھر پینا پڑے گا۔ غرض چار مہینہ کے بعد کہیں مسہل پورا ہوگا۔ لوگ یوں چاہتے ہیں کہ صبح کو نسخہ پی کر شام ہی کو دست آ جاویں' سو بعضے طبیب ایسے بھی ہیں لیکن وہ آپ کو ایسا مسہل دیں گے کہ مادہ کے ساتھ روح کا بھی اخراج کر دے گا۔ ایک جاہل طبیب نے ایک شخص کو مسہل دیا تھا نہ معلوم جمال گوٹہ دے دیا تھا یا کیا اس کو بے حد دست آنے شروع ہوئے' لوگوں نے طبیب صاحب سے آ کر کہا کہ دست بہت آ گئے' اب بند کر دینے چاہئیں' کہا نہیں ابھی اور آنے دو مادہ نکل رہا ہے' کچھ دیر کے بعد لوگ پھر آئے کہ حکیم جی ضعف بہت ہو گیا' دست بند ہی نہیں ہوتے کہا کچھ حرج نہیں مادہ فاسدہ نکل رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر اطلاع دی کہ وہ تو مرنے کو ہو رہا ہے' کہا نہیں جب مادہ نکل جائے گا خود اچھا ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ

وہ اسی میں مر گیا' لوگوں نے حکیم صاحب سے کہا کہ وہ تو مر بھی گیا تو آپ فرماتے ہیں اللہ رے مادے نکلنے میں تو یہ حال کیا کہ مار ڈالا اگر رہتا تو کیا حال ہوتا۔ اس احمق سے کوئی پوچھے کہ موت سے آگے کیا ہوتا۔ تو آج کل لوگ یوں چاہتے ہیں کہ ہم کو ایسا ہی مسہل دیا جائے لیکن محقق طبیب ایسا کبھی نہیں کر سکتا وہ ہر کام کو موقع اور وقت دیکھ کر کرے گا اگر تم اس سے یہ جا کر کہو کہ ہم نے کل نسخہ پیا تھا آج دست نہیں ہوئے تو وہ نسخہ لے کر پھاڑ ڈالے گا' میری غرض اس مثال سے یہ ہے کہ بعض دفعہ تاخیر ظہور میں حکمتیں ہوا کرتی ہیں اور حقیقت میں وہ تاخیر تمہارے ہی واسطے مصلحت ہوتی ہے مگر چونکہ ہم کو اپنی مصلحت کا بھی علم نہیں ہوتا اس لیے وہ تاخیر ناگوار ہوتی ہے۔ پس جن مصالح کی وجہ سے تم احکام الٰہیہ کو پامال کر رہے وہ مصالح خود اتباع احکام پر موقوف ہیں۔ یاد رکھو مسلمانوں کو تو ہرگز اس طرح فلاح حاصل نہیں ہو سکتی کہ وہ احکام الٰہیہ کو مصالح کے تابع بنا دیں اور دنیوی اغراض کو قبلہ و کعبہ بنالیں۔ باقی کفار کی حالت دیکھ کر تم کو دھوکہ نہ کھانا چاہیے کہ وہ خدا کو ناراض کر کے بھی ترقی کر رہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ کفار خدا کے نزدیک حقیر ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے پیر کا جوتہ۔ اگر جوتہ میں ناپاکی لگ جائے تو اس کو پھینکا نہیں جاتا اور مسلمان خدا کے نزدیک محبوب ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے ٹوپی کہ اس میں اگر ذرا سی بھی ناپاک چھینٹ پڑ جاتی ہے تو اس کو فوراً سر سے اتار پھینکتے ہیں تو کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ آپ کو بھی نعوذ باللہ جوتہ کی طرح بنا دیں کہ آپ برابر گندگی میں ملوث رہیں اور آپ کو اتار کر نہ پھینکا جائے۔ صاحبو! حق تعالیٰ آپ کو ٹوپی کی طرح معزز بنانا چاہتے ہیں لیکن اس کی عزت یہی ہے کہ جہاں ذرا اس میں ناپاکی لگ جائے فوراً سر سے اتار دی جائے۔ پس خوب سمجھ لو کہ ترک احکام کے ساتھ یا احکام کو اغراض و مصالح کا تابع بنا کر مسلمان کو کبھی فلاح حاصل نہیں ہو سکتی اور اگر بالفرض حاصل بھی ہو جائے تو رضائے الٰہی تو ہرگز حاصل نہ ہو گی کہ خود فلاح سے بھی وہی مقصود ہے کیونکہ فلاح دنیوی بھی وہی محمود ہے جو معین ہو جاوے۔ رضائے حق میں چنانچہ: "اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ" (یہ وہ لوگ ہیں اگر ہم ان کو زمین میں حکومت دیں تو قائم کریں گے نماز کو اور زکوٰۃ دیں گے) خود اس پر شاہد بین ہے۔

مسلمان کی اصل کامیابی

پس مسلمان کی اصل کامیابی رضائے حق ہے اور اس کی اصل کوشش اس کی طلب ہے جس کا طریق اتباع احکام ہے خواہ دنیا میں کسی حال میں رہے اور اس حالت میں جو حظ اور راحت مومن کو

ہوتی ہے وہ سب کامیابیوں سے بڑھ کر ہے اسی بناء پر حق تعالیٰ نے ایمان واعمال کے ثمرات میں راہ حق پر ہونے کو بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ قرآن شریف میں ارشاد ہے: "اُولٰٓئِکَ عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" (یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ فلاح اور نجات پانے والے ہیں۔)

صراط مستقیم ہونے کا نفع

یہاں حق تعالیٰ نے مسلمانوں کی جزاء میں دو باتیں بیان فرمائی ہیں جن میں ایک جزاء دنیوی یعنی واقع فی الدنیا ہے۔ "عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ" (اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں) دوسری جزاء اخروی یعنی واقع فی الاخرۃ ہے وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (اور یہی لوگ فلاح اور نجات پانے والے ہیں) اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں مسلمان کے لیے جس اصلی جزاء کا وعدہ ہے وہ یہ ہے کہ وہ ہدایت پر ہے اور سیدھے راستہ پر چل رہا ہے۔ پس ہدایت پر ہونا یہی بڑی رحمت اور راحت کی چیز ہے جس کا مشاہدہ مجھ کو ایک سفر میں اس طرح ہوا کہ ایک بار میں سہارن پور سے لکھنؤ جا رہا تھا اس لیے رڑکی جانے والی گاڑی میں سوار ہوا تو وہاں میرے ایک دوست بھی بیٹھے ہوئے ملے جو پورے جنٹلمین تھے۔ جب گاڑی چھوٹ گئی تو آپس میں باتیں ہونے لگیں، میں نے پوچھا کہ آپ کہاں جاتے ہیں بولے کہ میرٹھ جا رہا ہوں اس وقت میں نے انہیں کے محاورہ میں کہا کہ ممکن ہے آپ میرٹھ جا رہے ہوں لیکن افسوس ہے یہ گاڑی لکھنؤ جا رہی ہے وہ غلطی سے بجائے میرٹھ کی گاڑی کے اس میں بیٹھ گئے تھے۔ بس یہ سن کر ان کی یہ حالت ہوئی کہ چہرہ سے پریشانی ٹپکتی تھی، بات نہیں کر سکتے تھے، سردی کا موسم تھا اور وہ حضرت بالکل بیک بینی و دو گوش تھے کیونکہ جنٹلمینوں میں یہ بھی مرض ہے کہ وہ سفر میں نہ کپڑے ساتھ لیتے ہیں نہ پانی پینے کا برتن ساتھ لیتے ہیں۔

جنٹلمینوں کا عجیب مرض

ایک مولوی صاحب جو کہ ریاست بہاولپور میں کسی سکول میں پروفیسر ہیں وہ فرماتے تھے کہ ایک بار میں بہاولپور سے وطن کو آ رہا تھا میرے ساتھ ٹھنڈے پانی کی ایک صراحی تھی۔ اس گاڑی میں ایک جنٹلمین سوار تھے، وہ میرے برتنوں کو دیکھ کر ہنسنے لگے کہ یہ بھنگیوں کے سے برتن آپ کہاں سے ساتھ لائے۔ میں اس پر خاموش ہو رہا، تھوڑی دیر میں ان صاحب کو پیاس لگی تو اسٹیشن پر گلاس لے کر اترے وہاں پانی نہ ملا اور کئی اسٹیشن تک نہ ملا تو اب ان کا مارے پیاس کے برا حال تھا، بار بار کن انکھیوں سے میری صراحی تکتے تھے، آخر مجھے رحم آیا اور میں تختہ پر آنکھیں بند کر کے سوتا بن کر

لیٹ رہا، تھوڑی دیر میں وہ صاحب آہستہ آہستہ صراحی کے پاس آئے اور اس سے منہ لگا کر پانی پینا شروع کیا مگر حالت یہ کہ ایک آنکھ میری طرف تھی اور ایک آنکھ پانی کی طرف، بڑی گھبراہٹ میں غریب نے پانی پیا، میرے جی میں آیا کہ فوراً اس کا ہاتھ پکڑ لوں مگر میں نے خیال کہ بے چارہ پیاسا ہے جب پانی پی چکے گا پھر سمجھوں گا چنانچہ جب وہ خوب پانی پی چکے اور وہاں سے اٹھنے لگے تب میں نے ہاتھ پکڑ لیا کہ کیوں صاحب آپ نے بھنگیوں کے برتن سے کیوں پانی پیا۔ بس اب تو ان پر گھڑوں پانی پڑ گیا اور معافی چاہنے لگے میں نے پھر تو ان کی بدتہذیبی خوب ظاہر کی کہ تم تہذیب کا دعویٰ محض جھوٹا کرتے ہو تم میں خاک تہذیب نہیں، میں کہتا رہا اور خاموش سنتے رہے۔

غرض کچھ سردی کا بھی خیال تھا مگر زیادہ پریشانی یہ تھی کہ بے راہ جا رہے تھے کہیں لاحول پڑھتے ہیں کہیں اناللہ پڑھتے ہیں میں نے ان سے کہا کہ میاں اب تو جو ہونا تھا ہو گیا، یہ گاڑی ظاہراً رڑکی سے پہلے تو ٹھہر نہیں سکتی خواہ تم کتنے ہی پریشان ہو اس لیے پریشانی بے فائدہ اطمینان سے باتیں کرو، میں تو ان کو باتوں میں لگانا چاہتا تھا لیکن وہ اس سے جھنجلاتے تھے کہ واہ میاں تم کو ہنسی سوجھی ہے اور مجھے اپنی الجھن لگی ہوئی ہے اس حکایت سے میرا مقصود یہ ہے کہ میں نے اس وقت اپنی اور ان کی حالت کا موازنہ کیا تھا تو یہ ظاہر ہے کہ رڑکی پہنچنے سے پہلے نہ میں لکھنؤ پہنچا تھا نہ ان کو میرٹھ جانا کچھ زیادہ دشوار ہو گیا تھا لیکن پھر میں اپنے آپ کو ایسا مطمئن پاتا تھا گویا کہ بادشاہ تھا کیونکہ مجھ کو اس خیال سے راحت تھی کہ میں راہ پر ہوں اور وہ ایسے پریشان تھے جیسے کوئی مجرم پنجرہ میں قید کر دیا جائے۔ ان کو اس خیال سے الجھن تھی کہ میں راہ پر نہیں ہوں اسی طرح جو لوگ پیادہ سفر کرتے ہیں جب وہ راستہ بھولتے ہیں اس وقت کوئی ان کی پریشانی دیکھے کہ ایک ایک قدم من بھر کا ہو جاتا ہے، چلنا دشوار ہو جاتا ہے اب تو آپ سمجھ گئے کہ واقعی ہدایت پر ہونا بڑی رحمت ہے۔

شریعت پر عمل کرنے والا بادشاہ ہے

خدا کی قسم جو شخص شریعت کے موافق چل رہا ہو وہ بادشاہ ہے گو ظاہر میں سلطنت نہ ہو اور جو شخص شریعت سے ہٹا ہوا ہو وہ پنجرہ میں مقید ہے۔ گو ظاہر میں بادشاہ ہو مسلمان متبع شریعت کو چونکہ یقین ہے کہ میں سیدھے راستہ پر ہوں اس لیے اس کو ساری مصیبتیں سہل معلوم ہوتی ہیں کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ چند دن کی مصیبتیں ہیں پھر ختم ہو جائیں گی۔ کفار کو یہ دولت نصیب نہیں کیونکہ ان کو اپنی نجات کا کسی صحیح دلیل سے یقین ہی نہیں اور باطل کا خاصہ یہی ہے کہ اسے اطمینان وسکون کبھی حاصل ہوتا ہی نہیں ہاں کوئی جہل مرکب میں مبتلا ہو تو اور بات ہے مگر اس کو بھی اہل حق کے

برابر ہرگز اطمینان نصیب نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ مصائب کے وقت جس قدر استقلال اہل حق میں ہوتا ہے کسی جماعت میں نہیں ہوتا۔

صاحبو! راستہ تو یہ ہے کہ خدا کو راضی کرو، احکام کا اتباع کرو، شریعت میں گڑبڑ نہ کرو، ان شاء اللہ تعالیٰ پھر کسی کی مجال نہیں کہ مسلمانوں کو نگاہ بھر کر بھی دیکھ سکے، باقی جو راستہ تم نے اختیار کر رکھا ہے اس کی تو یہ حالت ہے:

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی　　کیں رہ کہ تو میروی بترکستانست

(اے اعرابی مجھ کو اندیشہ ہے کہ تو کعبہ نہ پہنچے گا اس لیے کہ جو راستہ تو نے اختیار کیا ہے ترکستان کا ہے)

سلطنت تقرب الی اللہ کا سبب نہیں

خدا کی قسم اگر ہم کو پاخانہ اٹھانا پڑے اور خدا ہم سے راضی ہو تو وہی ہمارے لیے سلطنت ہے اور اگر خدا راضی نہ ہوا تو لعنت ہے ایسی سلطنت پر جو خدا کو ناراض کر کے حاصل کی جاوے۔ یاد رکھو سلطنت کوئی تقرب الی اللہ کا سبب نہیں۔

بعض انبیاء علیہم السلام ایسے بھی ہوئے ہیں جن کو ساری عمر سلطنت نصیب نہیں ہوئی۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک نبی کے ساتھ صرف ایک ہی آدمی ہوگا اور بعض کے ساتھ ایک بھی نہ ہوگا، تو کیا سلطنت نہ ہونے سے ان انبیاء کے درجہ میں کوئی کمی آ گئی، اگر محض سلطنت کوئی قرب کی چیز ہوتی تو فرعون بڑا مقرب ہونا چاہیے جس نے چار سو برس تک نہایت شان و شوکت کے ساتھ سلطنت کی تھی۔

''لاحول ولاقوۃ الا باللہ واللہ'' اس نبی کے مرتبہ کے سامنے جن کے ساتھ صرف ایک آدمی ہوگا یا ایک بھی نہ ہوگا سلطنت فرعون کی کچھ بھی حقیقت نہیں اتباع احکام کی دولت کے سامنے سلطنت بھی کوئی چیز ہے کہ اس کی مصلحت سے دین میں تصرف کیا جاوے اور احکام کو مصالح ملکی کا تابع بنایا جاوے ہرگز نہیں۔

الغرض ہماری حالت یہ ہے کہ یا تو بعضوں کو علم نہیں وہ تو جہالت کی وجہ سے گناہوں میں زیادہ مبتلا ہیں اور بعضوں کو علم حاصل ہے تو علم صحیح حاصل نہیں انہوں نے غلط باتوں کو دین سمجھ رکھا ہے اور جن کو علم صحیح بھی حاصل ہے انہوں نے اس کو اغراض و مصالح کے تابع بنا رکھا ہے۔

ایک پردیسی مولوی کی حکایت

میں نے اسی سفر میں ایک پردیسی مولوی صاحب کو دیکھا ہے کہ پہلے ان کے لڑکے انگریزی پڑھتے تھے‘ اول تو یہی ان کو زیبا نہ تھا کہ مولانا ہو کہ اپنی اولاد کو انگریزی پڑھاویں لیکن خیر اگر انہوں نے یہ سمجھ کر کہ دنیوی ضرورتوں کے لیے اس کا پڑھنا جائز ہے بشرطیکہ درستی دین کا اہتمام کر لیا جاوے اور اس کا اہتمام انہوں نے کر لیا ہوگا کیونکہ خود عالم تھے تو اب سنئے قوم نے ان پر دباؤ ڈالا کہ انگریزی اسکولوں میں لڑکوں کو پڑھانا موالات میں داخل ہے اپنے لڑکوں کو اٹھاؤ‘ آخر انہوں نے مجبور ہو کر لڑکوں کو وہاں سے اٹھا لیا اور اپنے وطن بچوں کو بھیج دیا اور وہاں بھی ان کو انگریزی ہی پڑھائی‘ بھلا ان سے کوئی پوچھے کہ اگر تم نے لڑکوں کو اسکول سے اس لیے اٹھایا تھا کہ انگریزی پڑھنا پڑھانا حرام ہے تو پھر تین سو کوس پر ان کو بھیج کر انگریزی ہی کیوں پڑھائی اور اگر تمہارے نزدیک انگریزی پڑھانا جائز تھا تو پھر محض قوم کے کہنے سے ایک جائز کام کو ترک کرنا اور لوگوں کی خوشامد کے لیے ان سے دبنا یہ کب مناسب تھا‘ بھلا خدا کا طالب ہو کر مخلوق کی رضا جوئی کرے اور خوشامد کر کے ان سے دبے طالب کی یہ شان نہیں ہوا کرتی واللہ اہل علم کا تو یہ حال ہونا چاہیے۔

اے دل آں بہ کہ خراب از مے گلگوں باشی — بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی

(اے دل وہ بہتر ہے کہ سرخ شراب وعشق الٰہی سے تو مست رہے بغیر سونے چاندی کے خزانوں کے تو دولت مند بن جائے گا)

حرص وطمع کا انجام

ان کو اپنی فقیری میں مست رہنا چاہیے اور کسی مالدار یا رئیس سے دین کے معاملہ میں طمع یا ملامت کی وجہ سے نہ دبنا چاہیے اور اگر کوئی برا بھلا کہے تو کہنے دو اس کی ہرگز پروانہ کرو‘ خدا کے طالب ہو کر کسی کی ملامت وطعنہ کی پروا نہ ہونی چاہیے ہاں اگر کسی جگہ خوف کی صورت ہو تو شریعت سے استفتاء کر و اگر وہ موقع خوف میں درجہ اکراہ سمجھ کر تم کو معذور سمجھے تو دبنے کا بھی مضائقہ نہیں لیکن طمع اور حرص اور خوف کے لوگوں میں بھی عزت نہیں ہوتی خدا کی قسم جن عوام کی یہ پرواہ کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ ہمارے ساتھ لگے لپٹے رہیں ہم کو چھوڑ کر الگ نہ ہو جاویں اول یہ لوگ انہی کی نظروں سے گرتے ہیں کیونکہ حرص وطمع چھپی نہیں رہتی اور حریص کی عزت لوگوں کی نظروں سے گر جاتی ہیں۔

بئس المطاعم حین الذل تکسبها   القدر منتصب والقدر محفوض

(وہ کھانا بہت برا جس کو ذلت سے کھایا جاوے انجام کار یہ ہوگا کہ ہانڈی تو چڑھی ہوئی ہوگی اور عزت گری ہوئی قدر کی مناسبت ہے)

ایک لطیفہ شب دیگ

ایک لطیفہ یاد آیا۔ لکھنؤ میں ایک کھانا پکتا ہے جس کو شب دیگ کہتے ہیں۔ ایک طالب علم نے اس کا ترجمہ لیلۃ القدر (بکسر القاف) (رات کی دیگ) کیا تھا' شب کا ترجمہ لیلہ اور دیگ کا ترجمہ قدر بس لیلۃ القدر بن گیا۔ خوب سوجھی لیلۃ القدر (شب قدر) تو سنا کرتے تھے۔ اس نے لیلۃ القدر بھی ایجاد کر دی۔ خیر یہ تو ایک لطیفہ تھا۔ مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں کو ہر حال میں احکام شرعیہ کو اپنا رہنما بنانا چاہیے خواہ مال ملے یا نہ ملے جاہ حاصل ہو یا نہ ہو' طعنے سننے پڑیں یا تعریف کسی بات کی پروانہ کرنی چاہیے کسی کے برا کہنے سے انسان برا نہیں ہو جاتا اور کسی کے بھلا کہنے سے اچھا نہیں ہو جاتا۔ یاد رکھو اگر تم خدا کے نزدیک اچھے ہو تو چاہے ساری مخلوق تم کو کافر و فاسق و زندیق کہے کچھ اندیشہ کی بات نہیں اور اگر خدا کے نزدیک مردود ہو تو چاہے ساری دنیا تم کو غوث و قطب کہے اس سے کچھ بھی نفع نہیں پھر یہ بھی ضروری ہے کہ اہل حق کو اگر آج برا کہا جائے گا تو ان شاء اللہ تعالیٰ کسی دن پھر ان کو اچھا کہا جائے گا اور اہل باطل کی اگر آج مدح ہوگی تو کسی دن ان کی قلعی ضرور کھلے گی اور ان کے معتقدین ہی ان کو برا بھلا کہیں گے۔

شیخ ابن عربی کا مقام

شیخ ابن عربی کو ان کے زمانہ میں بہت لوگوں نے کافر و زندیق کہا حتیٰ کہ مرنے کے بعد ان کی قبر پر سالہا سال پاخانہ پڑتا رہا تو کیا جہلاء کے ان افعال سے نعوذ باللہ (اللہ کی پناہ) شیخ کا درجہ گھٹ گیا ہرگز نہیں تو اگر آج تم کو بھی لوگ برا بھلا کہنے لگیں تو کیوں ڈرتے ہو پھر ایک زمانہ وہ بھی آیا کہ شیخ ابن عربی امام اور شیخ اور صدیق کہلانے لگے اور ان کی قبر زیارت گاہ بن گئی۔ حضرت شیخ نے اس کی نسبت پیشین گوئی بھی فرمائی تھی۔ "اذا دخل السین فی الشین ظھر المیم" سین سے مراد سلطان سلیم ہیں اور شین سے مراد ملک شام ہے اور میم سے مراد خود حضرت شیخ ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ جب سلطان سلیم ملک شام میں داخل ہوں گے اس وقت محی الدین بن عربی کا ظہور ہوگا۔ چنانچہ جب سلطان سلیم کا شام پر تسلط ہوا ہے اور شیخ کی قبر کا حال معلوم ہوا تو اس کو گندگیوں سے صاف کرایا اور اس پر قبہ تعمیر کیا اس دن سے شیخ کی قبر زیارت گاہ خاص و عام بن گئی۔

امام غزالی کی وقعت و عظمت

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ جو کچھ معاملہ ہوا سب کو معلوم ہوا ہے۔ لوگوں نے ان پر کفر کے فتوے لگائے، ان کی کتاب احیاء العلوم کو جلایا گیا تو کیا اس سے ان کی وقعت کچھ کم ہوگئی ہرگز نہیں اس کے بعد ایک زمانہ وہ بھی آیا کہ احیاء العلوم کو سونے کے پانی سے لکھوایا گیا اور آج امام غزالی کے نام کی جو وقعت ہے مخفی نہیں ہر شخص ان کو حجۃ الاسلام اور امام کے لقب سے یاد کرتا ہے اور وہ لوگ جو امام غزالی اور شیخ ابن عربی کو کافر وزندیق کہتے تھے جن کی وقعت اس زمانہ میں بہت کچھ تھی خدا تعالیٰ نے آج ان کے ناموں کو ایسا مٹایا ہے کہ کوئی بھی ان کا نام نہیں لیتا۔

پھر اگر اتباع احکام کی وجہ سے لوگ تمہارا ساتھ چھوڑ دیں اور تم کو سب کے سب برا بھلا کہنے لگیں تو اس میں تمہارا نقصان ہی کیا ہے بہت سے بہت جاہ زائل ہو جائے گی، بدنام ہو جاؤ گے، سو یہ کوئی نقصان نہیں بلکہ عین منفعت ہے کیونکہ شہرت اور جاہ یہ وہ بلا ہے جو کہ دین و دنیا دونوں کو مضر ہے دینی ضرر تو یہ ہے:

اشتہار خلق بند محکم است بند ایں از بند آہن کے کم ست
خویش را رنجور ساز وزار زار تاترا بیروں کنند از اشتہار
اینت گوید نے منم انباز تو آنت گوید نے منم ہمراز تو
اوچو بیند خلق راسر مست خویش از تکبر میرود از دست خویش

ترجمہ: (مخلوق کی شہرت اللہ اور اس کے بندہ کے درمیان مضبوط بند ہے۔ یہ بند لوہے کے بند سے کب کم ہے اپنے آپ کو رنجور اور گم نام رکھو تا کہ لوگ تم کو شہرت سے باز رکھیں۔ ایک کہہ رہا ہے میں آپ کا ہم راز ہوں دوسرا کہتا ہے نہیں صاحب میں آپ کا شریک حال ہوں وہ شخص بیچارہ جب ایک مخلوق کو اپنا سر پرست اور عاشق دیکھتا ہے پس تکبر کی وجہ سے ہاتھوں سے نکل جاتا ہے)

جب آدمی دیکھتا ہے کہ ساری دنیا مجھ پر فدا ہے تو اس میں عجب و کبر پیدا ہو جاتا ہے اپنے اوپر نظر کرنے لگتا ہے۔ آخر کار اسی عجب و کبر کی وجہ سے برباد ہو جاتا ہے۔ افسوس بہت لوگ اس ورطہ میں آ کر ہلاک ہو گئے یہ تو دین کا ضرر ہوا دنیا کا ضرر یہ ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں:

خشمہاؤ چشمہاؤ رشکہا برسرت ریزد چو آب از مشکہا

(غصے اور آنکھیں اور رشک تیرے سر پر اس طرح ٹپکتے ہیں جیسے مشکوں سے پانی ٹپکتا ہے)

یعنی مشہور آدمی کے حاسد بہت پیدا ہو جاتے ہیں پس صاحب جاہ کو نہ دین کی راحت ہے نہ دنیا کی، اس کا دین کبھی خطرہ میں رہتا ہے اور دنیاوی خطروں کا بھی اندیشہ رہتا ہے ہاں جب حق تعالیٰ کی طرف سے بدون تمہاری طلب کے جاہ عطا ہو وہ نعمت ہے اس میں دین کا خطرہ نہیں ہوتا کیونکہ ادھر سے تمہاری حفاظت کی جاتی ہے ہاں بعض دفعہ امتحان کے طور پر دنیوی خطرات ایسے شخص کو بھی پیش آ جاتے ہیں لیکن جس کو خدا تعالیٰ سے تعلق ہے وہ خطرات سے گھبرایا نہیں کرتا وہ سب کو خوشی کے ساتھ برداشت کر لیتا ہے۔

علم حقیقی کی شان

الغرض جاہ کا طالب ہونا بہت برا ہے اور طلب کے بعد جو جاہ حاصل ہوتی ہے اس کی وہی حقیقت ہے جو میں نے اوپر بیان کی ہے پھر یہ ساری عزت و جاہ محض خیالی چیز ہے اس سے تم میں کیا کمال پیدا ہو گیا۔ مر گئے تو کچھ بھی نہیں اب تم مخلوق کی نظر میں اچھے ہوئے تو کیا برے ہوئے، تو کیا پس آج کل عموماً ایسا ہی علم لفظی واسمی دیکھا جاتا ہے جو جاہ طلبی میں برباد کیا جاتا ہے حالانکہ واللہ علم وہ جوہر ہے کہ اس میں خود ایسی لذت ہے جس کے سامنے سلطنت اور مال و دولت اور جاہ و عزت سب ہیچ ہے مگر ایسا علم محض کتاب خوانی سے میسر نہیں ہوتا۔

در کنز و ہدایہ نتواں یافت خدارا

(محض کنز و ہدایہ پڑھتے خدا تعالیٰ کو نہیں پا سکتے)

یہ علم تو اس طرح حاصل ہوگا:

قال را بگذار و مرد حال شو پیش مرد کاملے پامال شو

(قال کو چھوڑ و حال پیدا کرو اس حال کو پیدا کرنے کے لیے کسی کامل مرد کی جوتیوں میں جا کر پامال ہو)

علم حقیقی حاصل کرنے کا طریق

اگر یہ دولت حاصل کرنا چاہتے ہو تو کسی کی جوتیوں میں جا کر پامال ہو جاؤ، اگر وہ سر پر جوتے بھی مارے تو خوش رہو پھر چند روز کے بعد دیکھنا کہ تمہارے دل میں کیسا استغناء پیدا ہوتا ہے جو بادشاہوں کو بھی نصیب نہ ہوا ہوگا لیکن آج کل یہی بات تو نہیں رہی، مولوی اول تو اہل اللہ کے سامنے جاتے نہیں وہ سمجھتے ہیں کہ بس ہم عالم ہو گئے، اب ہم کو کسی کی کیا ضرورت ہے اور اگر کبھی پیر کی تلاش کا خیال ہوگا اور کسی کے پاس جاویں گے تو ایسی جگہ تلاش کریں گے جہاں ان کی

قدر ہو اور مشائخ بھی علم کا ادب کر کے علماء کی قدر زیادہ کرتے ہیں۔ اب یہ حضرت اس کے منتظر ہوتے ہیں کہ پیر صاحب مجھے خلافت عطا فرمادیں۔ پھر غضب یہ ہے کہ بعضے پیر بھی آج کل ایسے ہیں جو یہ سمجھ کر کہ یہ عالم ہم سے وابستہ رہیں گے تو ان کی وجہ سے ہمارا سلسلہ بڑھے گا ایسوں کو خلافت بھی دے دیتے ہیں۔ خوب یاد رکھو کہ ایسے طالب بھی خائن ہیں اور ایسے پیر بھی خائن ہیں' بھلا اگر کسی مریض کو آپریشن کی ضرورت ہو اور ڈاکٹر اس خیال سے کہ یہ مریض مجھ سے خوش رہے گا تو زیادہ انعام دے گا' بجائے آپریشن کے اس کے زخم پر مرہم لگا دے تو کیا وہ ڈاکٹر خائن نہیں' یقیناً اس نے خیانت کی اور بڑا ظلم کیا۔ پس اے وہ شیخ جو کہ مریدوں کے مکدر ہو جانے کے خوف سے ان کے امراض پر ان کو متنبہ نہیں کرتا خدا کے واسطے تو ان کے حال پر رحم کر اور اے وہ ڈاکٹر جو آپریشن کی جگہ مرہم لگا رہا ہے خدا کے لیے ایسا ظلم نہ کرو ورنہ یاد رکھ کہ آج اگر یہ مریض تجھ سے خوش بھی ہو گیا تو کل کو جب یہ زخم ناسور بن جائے گا اس وقت یہ تیرے اوپر لعنت کرے گا۔ اسی طرح میں طالب سے کہتا ہوں کہ تجھ کو طبیب سے نشتروں پر صبر کرنا چاہیے۔ جب ہی یہ ناسور اچھے ہو سکتے ہیں:

نرم گوید گرم گوید خوش بگیر   تار ہائی یابی از نار سعیر

(اس کی نرمی و گرمی کو خوشی سے برداشت کرو تاکہ تم دوزخ کی آگ سے رہائی پاسکو)

اور اگر یہ نہیں بلکہ تم ہر ڈانٹ پر غصے ہونے لگے تو اس طرح تمہاری صحت دشوار ہے بھلا اگر کسی کے ناسور ہو اور وہ نشتر کے چبھانے پر طبیب سے خفا ہونے لگے تو اس شخص کی تندرستی کی کیا امید ہو سکتی ہے۔

وز بہر زخمے تو پر کینہ شوی   پس کجا صیقل چو آئینہ شوی

(اگر ہر زخم پر کینہ ہوتے ہو یعنی مرشد کی ہر تنبیہ پر ناک بھوں چڑھاتے ہو تو کس طرح قلب مثل آئینہ کے صاف ہو سکتا ہے)

مولانا نے اس مضمون کو ایک حکایت کے ضمن میں تفصیل سے بیان فرمایا ہے:

ایک گودنے والے کی حکایت

یہ ہے کہ ایک شخص گودنے والے کے پاس گیا کہ میری پشت پر شیر کی تصویر بنا دے۔ اس نے اپنا کام شروع کیا اور ایک جگہ سوئی کو لگایا' اس نے آہ کی اور اس نے پوچھا کیا بنا رہے ہو' کہا منہ بنا رہا ہوں' کہنے لگا کہ یہ شیر کھاوے پیوے گا تھوڑا ہی جو اس کو منہ کی ضرورت ہو بس منہ کو رہنے

دو۔ اس نے دوسری جگہ سوئی کو کچ سے چبھایا آپ نے پھر آہ کی کہ اب کیا بنا رہے ہو‘ کہا دم بنا رہا ہوں‘ کہنے لگا بعضے دم کٹے شیر بھی ہوتے ہیں‘ دم کی ضرورت نہیں کچھ اور بناؤ اس کو رہنے دو۔ اس نے تیسری جگہ سوئی کو چبھایا اس نے پھر آہ کی کہ اب کیا بنا رہے ہو‘ آنکھیں بولا‘ اس کو آنکھوں کی کیا ضرورت ہے کوئی دیکھنا تھوڑا ہی رہ گیا ہے اس کو بھی چھوڑ‘ اس نے چوتھی جگہ سوئی کو چبھایا آپ نے پھر آہ کی کہ اب کیا بنا رہے ہو کہا شکم کہنے لگا ادنہ اسے شکم کی کیا ضرورت ہے کچھ کھانا پینا تھوڑا ہی ہے تو مصور نے جھلا کر سوئی پھینک دی اور کہنے لگا:

شیر بے گوش و سروا شکم کہ دید　　ایں چنیں شیرے خدا ہم نا فرید

(شیر بے دم و سر اور پیٹ کا کس نے دیکھا ہے ایسا شیر تو خدا نے بھی نہیں پیدا کیا)

بندہ خدا ایسا شیر تو خدا نے بھی پیدا نہیں کیا جس کے نہ شکم ہو نہ منہ ہو نہ دم ہو نہ آنکھیں جب تجھ کو سوئی کی تکلیف پر صبر نہیں تو شیر کی تصویر ہی کیوں بنواتا ہے جا اپنا کام کر۔

چوں نداری طاقت سوزن زدن　　بس تو از شیر زیاں کم دم بزن

(یعنی جب تم میں سوئی چبھنے کی طاقت نہیں ہے تو تم شیر ہونے کا دعویٰ مت کرو)

مشائخ کاملین کا مشفقانہ آپریشن

صاحبو! اگر علم حقیقی اور علم نافع حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس کا تو یہی راستہ ہے یہی طریقہ ہے نشتر اور زخم کھانے پڑیں گے۔ یعنی اپنی طرف سے اس کے لیے بھی آمادہ ہونا پڑے گا‘ باقی اس کا میں تم کو اطمینان دلاتا ہوں کہ جب تم اپنی طرف سے ہر طرح کی ذلت اور رسوائی کے لیے آمادہ ہو جاؤ گے تو پھر مشائخ کاملین تم سے سختی کا برتاؤ نہ کریں گے۔ یہ حضرات بہت رحم دل اور شفیق ہوتے ہیں البتہ اگر تمہارے اندر عجب و کبر کا مادہ رہا تو پھر یہ ناسور تو آپریشن ہی سے اچھا ہو گا۔ اس کا تو یہی راستہ ہے اگر یہ راستہ پسند نہیں تو پھر تمہارا اس منزل میں آنا ایسا ہو گا جس کی بابت ارشاد ہے:

وَلَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُھُوْرِھَا وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰی وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِھَا ○

(اس میں کوئی فضیلت نہیں ہے کہ گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آیا کرو لیکن فضیلت یہ ہے کہ کوئی شخص حرام سے بچے اور گھروں میں ان کے دروازہ سے آیا کرو)

ہر کام اصول سے اور انتظام ہی سے اچھا ہوتا ہے۔ خلاف اصول جو کام ہو گا خراب ہو گا۔

ضرورت علم نافع

صاحبو! میں اس علم نافع کی ضرورت آپ کو بتلا رہا ہوں یہ وہ علم ہے جو خلوص سے حاصل ہوتا ہے اس کی کوشش کیجئے اور یاد رکھئے کہ احادیث و قرآن میں جہاں علم کی فضیلتیں مذکور ہیں وہاں یہی علم مراد ہے جو خلوص کے ساتھ حاصل ہو اور جو علم طلب جاہ وغیرہ کے لیے ہو یا جو اغراض و مصالح کا تابع ہو وہ علم مراد نہیں چنانچہ اس حدیث نے اس کا فیصلہ کر دیا ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قیامت میں سب سے پہلے تین شخصوں کو بلایا جائے گا اول شہید پھر عالم پھر سخی۔

شہید سے سوال ہوگا کہ تو نے ہمارے واسطے کیا کیا وہ کہے گا الٰہی میں نے اپنی جان آپ کے واسطے فدا کر دی تھی۔ ارشاد ہوگا جھوٹ کہتے ہو تم نے جان اس واسطے دی تھی تا کہ لوگ یہ کہیں کہ بڑا بہادر ہے۔ ''لیقال انک لجری'' (تا کہ کہا جائے تو بڑا بہادر ہے) یعنی کیسی جان دی عدالت میں کیسا اظہار دیا، بڑی جرأت سے جواب دیا ''فقد قیل'' (تو بہادر کہا گیا) یعنی لوگوں میں بہت تعریف ہو چکی اور تمہارا مقصد پورا ہو چکا۔ پھر حکم ہوگا کہ اس کو جہنم میں گھسیٹ کر ڈال دو۔

پھر عالم صاحب بلائے جائیں گے ان سے بھی یہی سوال ہوگا کہ تم نے ہمارے واسطے کیا کیا وہ کہے گا کہ میں نے علم حاصل اور دوسروں کو پڑھایا، فتوے دیئے، مسئلے بتلائے، ارشاد ہوگا جھوٹ بولتے ہو بلکہ تم نے سب کچھ اس لیے کیا تھا تا کہ تم کو عالم کہا جائے ''فقد قیل'' (سو تم کو عالم کہا گیا) بہت لوگ آپ کو مولوی و مولانا کہہ چکے، خوب تعریفیں ہو چکیں اور تمہارا مدعا حاصل ہو چکا پھر حکم ہوگا کہ اس کو بھی گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دو۔ اسی طرح سخی کے بارے میں وارد ہے۔

صاحبو! ریا اور حب جاہ سے بچو یہ بہت بری بلا ہے۔

اب میں علم کی اس تقسیم کے بابت جو اس آیت میں وارد ہوئی ہے کچھ عرض کر کے بیان کو ختم کرنا چاہتا ہوں جو کچھ خدا تعالیٰ نے میرے قلب میں ڈالا ہے میں وہ بیان کر دوں گا، گو اس سے بھی اچھی توجیہ ممکن ہو جس کے پاس اس سے اچھی توجیہ ہو وہ اس کو پیش کر دے۔

جملہ علوم درسیہ کی ضرورت

میرے نزدیک اس آیت سے تمام علوم درسیہ کی ضرورت ثابت ہوتی ہے۔ اسی طرح کہ کتاب منیر سے تو مراد علم نقلی ہے کیونکہ کتاب میں اصلی نقلی ہی ہونا ہے مگر مراد مطلق علم نقلی نہیں ہے بلکہ علم استدلالی مراد ہے۔ چنانچہ علم کے مقابلہ سے اس کی تعیین معلوم ہوتی ہے اور ھدی سے مراد علم

عقلی ہے کیونکہ نقلی کا مقابلہ اسی کو مقتضی ہے لیکن یہاں بھی علم استدلالی عقلی مراد ہے مطلق عقلی مراد نہیں کیونکہ ھدی میں معنے دلالت کے ماخوذ ہیں اور استدلالی کی یہی شان ہوتی ہے اور اس سے پہلے فرمایا ہے بغیر علم (علم کے بغیر) اس سے علم ضروری مراد ہے کیونکہ اگر اس سے علم عقلی یا نقلی کسی کو مراد لیا جاوے تو تکرار لازم آئے گا اور اگر مطلق علم مراد لیا جاوے تو قسیم کا مقسم بننا لازم آئے گا۔ شق اول غیر مناسب اور شق دوم ناجائز ہے اس لیے میرے نزدیک اس سے علم ضروری مراد ہے۔

اقسام علم

پس یہاں علم کی یہ اقسام مذکور ہیں علم ضروری و علم کسبی اور کسبی کی دو قسمیں استدلالی عقلی و استدلالی نقلی ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ دوسر مقدمہ اس کے ساتھ یہ ملایا جاوے کہ مقاصد کے مقدمات بھی مقاصد کے حکم میں ہوتے ہیں:"لان مقدمة الواجب واجب" (واجب کا مقدمہ واجب ہوتا ہے)

اب تمام علوم درسیہ اس آیت میں داخل ہوگئے کیونکہ علوم درسیہ میں بعض علوم ضروریہ ہیں اور بعض استدلالی عقلی کی قسم سے ہیں اور بعض استدلالی نقلی میں داخل ہیں اور بعض علوم ان کے لیے مقدمات ہیں جیسے نحو وصرف و بلاغت وغیرہ اسی لیے میں اس وعظ کا نام تعظیم العلم مع تقسیم العلم رکھتا ہوں۔ اگرچہ یہ نام طویل ہے مگر اس عنوان سے معنوں پر دلالت واضح ہے۔

خلاصہ وعظ

خلاصہ بیان یہ ہے کہ علوم شرعیہ کی سخت ضرورت ہے اس کے حاصل کرنے کی کوشش کیجئے اگر تمام علوم درسیہ کی تحصیل دشوار ہو تو بقدر ضرورت ہی حاصل کر لیجئے لیکن علم حاصل کرنے کے بعد بے فکر نہ ہو جانا کیونکہ مقصود محض علم ہی سے حاصل نہیں ہوتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ علم اس مقصود کا ایک ذریعہ بن جاتا ہے اصل چیز کچھ اور ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں:

این ہمہ گفتیم ولیک اندر بیچ
بے عنایات خدا ہیچم و ہیچ

(یعنی گو ہم نے بہت سے وعظ و نصیحت کی ہے لیکن کسی کام کے پختہ ارادہ کرنے میں جب تک حق تعالیٰ کی عنایت نہ ہو ہم ہیچ ہیں)

اصل مقصود جب حاصل ہوگا جب کہ حق تعالیٰ کی طرف سے آپ کی کشش اور آپ پر عنایت ہوگی چونکہ مولانا شیخ اور مربی ہیں اس لیے آگے اس کا طریقہ

بتلاتے ہیں کہ تم ان عنایات الٰہیہ کے مورد کیونکر ہوسکتے ہیں۔

بے عنایات حق و خاصان حق
گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

(یعنی بغیر خدا تعالیٰ اور خاصان خدا کی عنایات کے اگر فرضاً فرشتہ بھی ہو تو اس کا ورق اعمال محض سیاہ ہوگا)

یعنی خدا تعالیٰ سے بلاواسطہ تعلق حاصل نہیں ہوسکتا یہ عادۃ اللہ کے خلاف ہے بلکہ خاصان حق کے ذریعے سے تعلق ہوسکتا ہے پھر تم بھی ان کی طرح مورد عنایات ہوجاؤ گے اور نصرۃ الٰہی تمہارے ساتھ ہوجائے گی۔ خاصان خدا سے جدا رہ کر توفیق الٰہی تمہارے ساتھ نہیں ہوسکتی' خوب سمجھ لو۔ خلاصہ یہ کہ خاصان حق سے طریقہ اور تدبیر سیکھو اور خدا تعالیٰ سے دعا کرو پھر ان شاء اللہ تعالیٰ کامیابی میں دیر نہ ہوگی۔ اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم و عمل مستقیم کی توفیق عطا فرماوے۔ آمین

وصلی اللّٰہ تعالیٰ علی سیدنا و مولانا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین. واخر دعونا ان الحمدللّٰہ رب العالمین.

اس کے بعد حضرت حکیم الامت دام مجدہم نے تھوڑی دیر تک حسب عادت ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی۔ پھر اہل مدرسہ کے اصرار پر طلبہ کو انعام اور سند وغیرہ اپنے ہاتھ سے عطا فرمائی۔ اس سے فراغت پا کر جلسہ بخیر وخوبی ختم ہوا۔

والحمدللہ علی ذالک (جامع عفا اللہ عنہ)

طلب العلم

بمقام پختہ گڑھی بر مکان امام علی خان صاحب ۱۲ ربیع الاول ۱۳۳۰ھ بعد نماز مغرب ۲ گھنٹے بیٹھ کر یہ وعظ ارشاد فرمایا: سامعین کی تعداد ۱۵۰ تھی۔ مولوی سعید احمد تھانوی صاحب نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ نَحۡمَدُهٗ وَنَسۡتَعِيۡنُهٗ وَنَسۡتَغۡفِرُهٗ وَنُؤۡمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيۡهِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَيِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ يَّهۡدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنۡ يُّضۡلِلۡهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشۡهَدُ اَنۡ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحۡدَهٗ لَا شَرِيۡكَ لَهٗ وَنَشۡهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدًا عَبۡدُهٗ وَرَسُوۡلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيۡهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصۡحَابِهٖ وَبَارِكۡ وَسَلِّمۡ. اَمَّا بَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيۡطٰنِ الرَّجِيۡمِ. بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ.

امابعد فقدقال النبی صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم . منھومان لایشبعان طالب العلم و طالب الدنیا. (کنزالعمال:۲۹۳۲۸)

ترجمہ: ’’دوحریصوں کا پیٹ نہیں بھرتا‘ طالب علم اور طالب دنیا کا۔‘‘

ایک مہتم بالشان امر

یہ ایک حدیث ہے جس کے الفاظ اس وقت پڑھے گئے اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نہایت سچا واقعہ جو نتیجہ خیز ہے اور جس سے ایک امر مہتم بالشان پر تنبیہ فرمایا ہے اور مہتم بالشان ہونے کے ساتھ ہم کو اس سے غفلت بھی ہے۔ بیان فرمایا ہے یعنی وہ مضمون نہایت ضروری ہے اور اس سے زیادہ ضروری ہونے کا کیا مرتبہ ہوگا کہ وہ باوجود یہ کہ مفید ہے مگر لوگ اس سے غافل ہیں اس حدیث میں ایسا ہی مضمون بیان کیا ہے اس لیے بیان کے لیے اس کو اختیار کیا گیا۔ اسی کی شرح سے اس کا مفید ہونا اور اس سے ہمارا غافل ہونا معلوم ہو جائے گا کیونکہ اپنی حالت میں غور کرنے سے یہ معلوم ہوگا کہ دو باتوں کی ضرورت ہے ایک امر واقعی پر مطلع ہونے کی دوسری اس امر واقعی کے متعلق اپنی حالت پر مطلع ہونے کی اس طرح سے کہ ہماری حالت کیا ہے دوسرے یہ کہ کیا ہونا چاہیے اس سے مضمون کا ضروری ہونا معلوم ہو جائے گا۔

حرص کا خاصہ

ترجمہ حدیث کا یہ ہے کہ دو حریصوں کا پیٹ نہیں بھرتا‘ طالب علم کا اور طالب دنیا کا۔ حرص کا خاصہ ہے کہ جس قدر چیز بڑھتی جائے اس کی طلب بڑھتی جائے۔ پس اس حدیث میں دو

حریصوں کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ان کا بھی پیٹ نہیں بھرتا' ایک تو طالب علم یعنی دین کا طلب کرنے والے کیونکہ علم شارع علیہ السلام نے اسی کو قرار دیا ہے۔

علم معین کی مثال

باقی علم دنیا اگر وہ معین ہو جائے تو علم ہے ورنہ نہیں اس کی ایسی مثال سمجھو کہ لکڑی باوجود یہ کہ کھائی نہیں جاتی اور نہ وہ کھانے میں داخل ہے لیکن چونکہ کھانے میں معین ہے اس لیے اس کو بھی کھانے کے حساب میں شمار کرتے ہیں کہ جب کھانے کا حساب ہوتا ہے تو یہ بھی حساب ہوتا ہے کہ ایک روپیہ ماہوار کی لکڑیاں صرف ہوئیں اور کھانا سب ملا کر پانچ روپیہ میں پڑا۔ اب اگر کوئی کہے کہ کیا لکڑیاں بھی کھاتے ہو تو اس کو دیوانہ بتلائیں گے اور کہیں گے کہ معین بھی تابع ہو کر مقصود میں شمار ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر علوم معاش معین ہوں تو ضمناً ان کو بھی اسی میں داخل کر دیں گے لیکن اصل علم دین ہی ہے اور جو نہ علم دین ہو اور نہ معین ہو وہ جہل ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: ''ان من العلم لجھلا'' (علم کا بعض حصہ جہالت ہے) کہ اس کا نام تو علم ہے اور حقیقت میں وہ جہل ہے اس میں وہ علم دین بھی جس پر عمل نہ ہو خاص اس بد عمل کے اعتبار سے داخل ہے اور علم دنیا میں جب کہ معین نہ ہو۔ بہر حال مقصود عمل ہے اور جب یہ نہ ہو خواہ علم دین ہو اور عمل نہ ہو اور خواہ علم دین ہی نہ ہو کہ اس سے عمل بالشریعۃ ممکن ہی نہیں تو یہ سب جہل ہیں۔ چنانچہ کسی کا قول ہے:

علمی کہ رہ بہ حق نماید جہالت است

(وہ علم جو حق کا راستہ نہ دکھلائے جہالت ہے)

علم کا حقیقی مفہوم

اس وقت گو اصطلاح میں ان کو علوم کہا جاتا ہے مگر شارع کی نظر میں وہ علم نہیں جیسا اہل دنیا کی نظر میں بہت سے علوم خسیسہ علم نہیں جیسا غلیظ اٹھانا کہ کوئی متمدن اس کو علم نہ شمار کرے گا باوجود یہ کہ وہ بھی بالمعنی الاعم علم ہے مگر فن خسیس ہونے کی وجہ سے اس کو علم کی فہرست سے خارج کر دیا کیونکہ باتفاق عقلاء علم وہ ہے جس میں کوئی وجہ شرف کی بھی ہو تو شارع علیہ السلام کے نزدیک چونکہ سوائے علم دین کے اور دوسرے علوم میں کوئی شرف نہیں۔ لہٰذا ان کو علوم میں شمار نہیں کیا اور اس باب میں شارع علیہ السلام اور ان کے متبعین پر تعصب کا الزام نہیں لگ سکتا کیونکہ آپ جیسا جواب دیں گے مہتر کے علم کو علم نہ کہنے میں وہی شارع علیہ السلام جواب دیں گے اسی لیے میں نے علم کے ترجمے میں دین کی قید لگا دی تھی۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ان دو شخصوں کا

کبھی پیٹ نہیں بھرتا ایک طالب علم دین اور دوسرا طالب دنیا۔ یہ ایک واقعہ ہے جس کو ہر شخص مشاہدہ کرتا ہے مگر مقصود صرف واقعہ کا بیان کرنا نہیں کیونکہ اس سے کچھ حاصل نہیں اور شارع علیہ السلام کا دامن تقدس اور دھبہ سے پاک ہے کہ وہ محض فضول باتوں کو بیان کریں۔

کلام شارع میں ہر جملہ خبریہ سے جملہ انشائیہ مقصود ہے

بلکہ میں غور کرتا ہوں تو یہ کلیہ پاتا ہوں کہ جتنے جمل خبریہ شارع علیہ السلام کے کلام میں ہیں وہ من حیثیتی خبر مقصود نہیں بلکہ ہر جملہ خبریہ سے کوئی جملہ انشائیہ مقصود ہے۔ خواہ وہ عقائد میں سے ہو یا اعمال میں سے۔ پس جب کوئی جملہ خبریہ دیکھئے سمجھئے کہ مقصود اس سے کوئی جملہ انشائیہ حتیٰ کہ قل ھواللہ احد (آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیجئے اللہ تعالیٰ ایک ہے) میں بھی ایک جملہ انشائیہ مقصود ہے کہ یہ اعتقاد رکھو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارا علاج کرتے ہیں۔ طبیب کا یہ کہنا تو تم کو تپ دق ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس کا علاج بہت جلد کرو تو جب شارع علیہ السلام ہمارے طبیب ہیں تو انہوں نے یا تو دوا کی خاصیت بیان کی ہے یا مرض کی خبر دی ہے اور دونوں سے مقصود انشائیہ ہی ہے۔ لہٰذا ہر عاقل پر ضرور ہے کہ ہر جملہ خبریہ سے انشاء کا پتہ چلالے۔ پس یہاں بھی ایک جملہ انشائیہ مراد ہے تو اس خبر سے کہ ان دو حریصوں کا پیٹ نہیں بھرتا بعد انضمام مقدمات خارجیہ کے کہ حرص دنیا کی مذموم ہے اور حرص علم کی محمود۔ ایک میں جملہ انشائیہ اترکوا اور دوسرے میں اطلبوا نکلا۔ مزید توضیح اس دعوے کی کہ مقصود اس خبر سے انشاء ہے یہ ہے کہ ان دونوں حریصوں کا سیر نہ ہونا ایک امر مشاہد ہے: چنانچہ دنیا کی نسبت تو سب ہی کو معلوم ہے کہ جب اس کی طلب ہوتی ہے تو واقعی ہرگز پیٹ نہیں بھرتا اور حدیث میں بھی ہے کہ اگر آدمی کے پاس دو نالے مال کے ہوں تو یوں چاہے گا کہ تیسرا اور ہو اور دو ندیوں کے ہونے سے یا تو یہ مراد ہے کہ خود چاندی سونے کا نالہ بہنے لگے اور یا یہ مراد ہے کہ جہاں وہ ندیاں ہوں اس جگہ مال بھرا ہو۔ کسی نے خوب کہا ہے:

گفت چشم تنگ دنیا دار را — یا قناعت پر کند یا خاک گور

(اس نے کہا کہ دنیادار کی تنگ آنکھ کو یا قناعت پر کر سکتی ہے یا قبر کی مٹی ہی اسے بھر سکے گی)

طلب دنیا دنیا ہے

حدیث میں ہے "لایملا جوف ابن ادم الا التراب"[1] (ابن آدم کا پیٹ صرف مٹی ہی بھرے گی) یہ حدیث میں بھی ہے اور بزرگوں کے کلام میں بھی اور مشاہدہ بھی ہے۔ خصوصاً اس

---

[1] (الصحیح للبخاری ۸:۱۱۵، الصحیح لمسلم الزکاۃ ب ۳۹، رقم: ۱۱۶)

زمانے میں کہ لوگ تعلیم بھی کرتے ہیں حرص دنیا کی جس کا نام ترقی رکھا ہے کہتے ہیں کہ دنیا کی ترقی کرو اور قناعت نہ کرو۔ میں دنیا کی ترقی کو منع نہیں کرتا مگر دنیا کو قبلہ توجہ بنانے سے روکتا ہوں۔ کسب دنیا منع نہیں ہے لیکن طلب دنیا منع ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے "کسب الحلال فریضة"[۱] (حلال کمائی مستقل فریضہ ہے) فرمایا اور "حب الدنیا راس کل خطیئة"[۲] (دنیا کی محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے) بھی فرمایا ہے تو کسب الدنیا دنیا نہیں طلب الدنیا دنیا ہے جہاں یہ پیدا ہو جاتی ہے۔ قناعت رخصت ہو جاتی ہے اور طمع غالب ہو جاتی ہے اسی پر میں ملامت کرتا ہوں اور یہی خدا کے نزدیک بھی ناپسندیدہ ہے اور اس کی خرابیاں بھی مشاہد ہیں۔

طلب علم میں حرص کے اختیار کرنے کا حکم

اسی طرح طلب علم میں بھی اہل علم کے حالات کے تتبع سے معلوم ہے کہ اس کا بھی کبھی پیٹ نہیں بھرتا، کتنا ہی بڑے سے بڑا علامہ ہو مگر پھر بھی ہر مسئلہ کی تلاش کرے گا اور کبھی قناعت نہ ہوگی اور جب تلاش سے معلوم ہوگا تو حظ ہوگا تو یہ بھی مشاہد ہے پس جب دونوں مشاہد ہیں تو ان کے خبر دینے سے کیا غرض ہے۔ یہ خبر دینا بظاہر تحصیل حاصل معلوم ہوتا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام اس سے پاک ہے۔ پس معلوم ہوا کہ مقصود اس خبر دینے سے کچھ اور ہے اور وہ یہی ہے کہ ایک حرص کے ترک کا امر اور ایک حرص کے اختیار کا امر اور اس میں ایک بات یہ بھی سمجھنے کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں دو چیزوں کو فرمایا، طالب علم اور طالب دنیا تو مضاف الیہ دو ہیں جن کو ایک دوسرے کے مقابلے میں فرمایا ہے اور چونکہ متقابلین تقابل کے درجے میں جمع نہیں ہوا کرتے اس لیے اس مقابلے سے معلوم ہوا کہ دنیا اور علم کی طلب جمع نہیں ہوتی ایک مقدمہ مقابلہ ہوا۔ دوسرا مقابلہ یہ ہے کہ "طلب العلم فریضة علی کل مسلم و مسلمة"[۳] کہ علم کا سیکھنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ یہ دوسرا مقدمہ ہوا اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ طلب علم سے تو بوجہ فرضیت کے کبھی تقاعد کرنا نہ چاہیے اور چونکہ طلب دنیا اس کے ساتھ جمع نہیں ہوتی اس لیے اس کو طلب دنیا نہ چاہیے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات فرمادی کہ اصلی کام مسلمان کا علم دین کا طلب کرنا ہے اور اس سے ان کی غلطی ظاہر ہوئی جو علم دین کو چھوڑ کر دنیا کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔

---

۱ (حلیة الاولیاء ۷: ۱۲۲) ۲ (کنز العمال: ۶۱۱۴، مشکوٰۃ المصابیح: ۵۲۱۳)
۳ (مشکوٰۃ المصابیح: ۲۱۰، کنز العمال: ۲۸۶۵۱)

کسب اور طلب میں فرق

اور میں اس تقریر سے کسب دنیا کو منع نہیں کرتا کسب وہ ہے کہ جس میں نقصان دین نہ ہو اور طلب وہ ہے جس میں دین مغلوب یا گم ہو جائے تو اصلی چیز مطلوب علم دین ہونا چاہیے اور علم دنیا ہو تو اس کا معین ہو۔ دیکھو جب ایک شخص گھوڑے کی خدمت کرتا ہے تو اصلی غرض قطع مسافت ہوتی ہے کہ یہ کھا کر قطع مسافت کرے گا اور گھاس دانہ دینا مقصود بالعرض ہوتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص گھوڑے کو کھلائے اور اس سے کام نہ لے تو کہا جائے گا کہ اس نے گھوڑے کو قبلہ توجہ بنا رکھا ہے اور سب اس کو بیوقوف کہیں گے کہ مقصود بالغیر کو مقصود بالذات بنالیا۔ غرض گھوڑے کی خدمت منع نہیں مگر جب اصل مقصود میں مزاحم ہو تو روکا جائے گا اور مشورہ نیک دیا جائے گا۔ اسی طرح کسب دنیا اس درجہ میں مزاحم نہ ہو طلب دنیا پر غالب نہ ہو تو اس کا کچھ مضائقہ نہیں۔ اسی کو فرماتے ہیں: "کسب الحلال فريضة بعد الفريضة "[1] (فرائض کے بعد کسب حلال مستقل فریضہ ہے) اور عجب نہیں کہ یہ بعدیۃ اسی اشارہ کے لیے ہو کہ یہ تابع ہے کیونکہ اس میں بعدیۃ رتبیہ ہے اور تابع رتبہ میں متبوع کے بعد ہوتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہ تابع ہے اسی پر تنبہ فرمایا ہے اس حدیث میں۔ مگر اس کے متعلق اکثر لوگ غلطی میں مبتلا ہیں کہ اس وقت مسلمان بہت کم طلب علم ہیں۔ اہتمام کے ساتھ مشغول ہیں اور دنیا میں بہت زیادہ مشغول ہیں بعض کی تو یہ کیفیت ہے کہ مہینوں میں بھی ان کو نوبت نہیں آتی کسی مسئلہ کے دریافت کی۔ کیا ان لوگوں کو کبھی کوئی شبہ نہیں پڑتا جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ لوگوں نے بہت سے کاموں کو دین سے خارج کر رکھا ہے۔ مثلاً معاملات معاشرت اخلاق کے بہت کم لوگ ہیں کہ جائیداد خرید کر یا بیچ کر کسی مولوی کو اس کا مسودہ دکھلاتے ہوں کہ کوئی معاہدہ اس میں خلاف شریعت تو نہیں۔ یوں سمجھ رکھا ہے کہ اس کو دین سے کیا واسطہ۔

دین ایک قانون الٰہی ہے

صاحبو! دین ایک قانون الٰہی ہے اس کو یاد رکھئے۔ اب سنئے کہ معاملات میں کیا قانون کی ضرورت نہیں اگر ایسا ہے تو بلا لائسنس افیون بھی فروخت کرنے کی جرأت کرنی چاہیے اگر کوئی ایسا کرے تو کیا اس میں دست اندازی قانون کی نہ ہوگی کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس کو قانون سے کیا واسطہ۔ کیا یہ عذر چل سکے گا' ہرگز نہیں بلکہ کہا جائے گا کہ حاکم ہر امر میں دست اندازی کر سکتا ہے تم

---

[1] (حلية الاولياء ۷: ۱۶۲)

محکوم ہو اور گورنمنٹ حاکم اور حاکم کو اختیار ہے کہ جو قانون جس طرح چاہے مقرر کرے گو کسی کو ناگوار ہو اور راز اس میں یہ ہے کہ حاکم وقت جمہور کی مصلحت پر نظر کرتا ہے لہٰذا بعض قوانین گو بعض کو ناگوار ہوں مگر جمہور کے لیے از بس مفید ہوتے ہیں۔ اس لیے باوجود بعض کی ناگواری کے پھر بھی حاکم کو صاحب اختیار اور صاحب عدل سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح خداوندی قوانین کو سمجھنا چاہیے۔ تعجب ہے کہ حاکم مجازی کو تو یہ اختیار ہو کہ اور آپ اس کی ضرورت کو بھی تسلیم کریں اور خدائے تعالیٰ کو اعتقاداً یا عملاً اس کا مختار نہ سمجھا جائے اور اپنے کو ان پر عمل کرنے میں مجبور نہ قرار دیا جائے۔ صاحبو! جب گورنمنٹ کے متعلق یہ کہہ دینا کہ فلاں امر میں گورنمنٹ کے قانون سے کیا واسطہ بیوقوفی ہے تو خدا تعالیٰ کے قوانین کے متعلق یہ کہہ دینا کیوں بیوقوفی نہ ہوگا۔

ہر امر میں قانون شریعت پر عمل کرنا ضروری ہے

یاد رکھو کہ ہر امر میں قانون شریعت پر عمل کرنا ضروری ہے ہم کسی امر میں آزاد محض نہیں اور وجہ اس آزاد سمجھنے کی یہ ہے کہ شریعت کا علم نہیں اور پوچھتے اس لیے نہیں کہ علی العموم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ شریعت میں ہر جگہ لایجوز ہے تو پوچھ کر کون مصیبت میں پڑے کیونکہ نتیجہ سوال تو ہم کو پہلے سے معلوم ہے کہ لایجوز جواب ملے گا حالانکہ یہ بڑی بھاری غلطی ہے کیونکہ شریعت کو لوگوں سے ضد نہیں بلکہ اس میں مباحات بھی ملیں گے۔ البتہ اگر چھانٹ چھانٹ کر ایسے ہی معاملات پوچھو گے جو ناجائز ہوں گے تو ان میں لایجوز ضرور ہی کہا جائے گا جیسے مثلاً طبیب سے کوئی مریض تمام مضر ہی اغذیہ کے کھانے کو پوچھے تو وہ ہر ایک کے استعمال سے منع کرے گا اب اگر کوئی کہنے لگے کہ یہ طب تو نہایت تنگ ہے تو یہ اس کی غلطی ہے طب ہرگز تنگ نہیں بلکہ تم نے چھانٹ کر اغذیہ ہی وہ انتخاب کی ہیں جو مضر ہیں اسی طرح جب ہم نے اپنے تمام معاملات تباہ کر دیئے اور صبح سے شام تک ناجائز ہی معاملات کرنے لگے تو شریعت ان کو کیسے جائز کہہ دے گی تو یہ تنگی شریعت میں نہیں بلکہ تمہارے عمل میں تنگی ہے۔ اگر کہو کہ جب سب کے سب ان ہی معاملات میں مبتلا ہیں تو ہم کیسے چھوڑ دیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ پھر شریعت کو کیوں الزام دیتے ہو اپنے کو یا اور لوگوں کو الزام دو۔ غرض اس خیال سے مسائل نہ پوچھنا بناء الفاسد علی الفاسد ہے جب پوچھو گے تو پھر معاملات دنیوی میں یوں نہ کہو گے کہ اس کو شریعت سے کیا واسطہ۔

دنیوی معاملات و معاشرت خارج از شریعت نہیں

صاحبو! یہ کہتے ہوئے شرم آنا چاہیے کہ شریعت سے اس کو کیا تعلق ذرا فقہ کی کوئی کتاب پڑھ کر دیکھو تو معلوم ہو کہ شریعت نے ہر چیز سے تعرض کیا ہے۔ علیٰ ہذا معاشرت کو بھی لوگوں نے

شریعت سے خارج سمجھ رکھا ہے کہ کوئی نہیں پوچھتا کہ فلاں وضع جائز ہے یا ناجائز اور فلاں قسم کا طرز و انداز حلال ہے یا حرام۔ بس سستا سا شیخ کا فتویٰ یاد کرلیا ہے کہ

در عمل کوش ہرچہ خواہی پوش

(نیک عمل کرنے میں پوری کوشش کر اور جو چاہے پہن)

میں کہتا ہوں کہ اگر ہرچہ خواہی پوش ایسا عام ہے تو ذرا مہربانی کر کے زنانے کپڑے بھی پہن کر دکھلا دیجئے اور بیوی صاحبہ کو اپنے مردانے کپڑے بھی پہنا دیجئے۔ اگر آپ ایسا کرلیں تو پھر ہم وضع کی نسبت فتویٰ دینا چھوڑ دیں گے اور سب اہل فتویٰ سے بھی یہ کہہ کر چھڑوا دیں گے کہ اب معاملہ بہت دور پہنچ گیا ہے اور اگر فتوائے شیخ کے عموم سے یہ مستثنیٰ ہے تو کیا وجہ کہ جس وضع کو شریعت منع کرے وہ اس کے عموم سے مستثنیٰ نہ ہو۔ اسی طرح کھانے کی چیزیں کہ ان میں بھی بہت سی چیزوں کو شریعت سے بے تعلق سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً آج کل آموں پر پھل آرہا ہے مگر ہزاروں آدمی اسی وقت بیچ رہے ہوں گے حالانکہ اس وقت کا فروخت شدہ غصب کے حکم میں ہے اس کا خریدنا آگے کو بھی جائز نہیں، نتیجہ یہ ہے کہ تمام بازار حرام سے بھرا ہوگا اور سب لوگ حرام کھائیں گے اور جب یہ حالت ہو تو نماز روزہ میں کہاں سے حلاوت ہو۔ صاحبو! اگر حلال غذا ہو تو پھر دیکھو کہ نماز روزے میں کیسی حلاوت ہوتی ہے۔ بعض قصبات میں یہ غضب ہے کہ کھانے کی چیزوں کا نرخ ظلماً مختلف کر رکھا ہے۔ مثلاً گوشت کہ غریبوں کا اور نرخ ہے اور رئیسوں نے اپنا اور نرخ مقرر کر رکھا ہے اور دونوں وقت اس حرام غذا سے پیٹ بھرتے ہیں اور اپنے جی کو سمجھا رکھا ہے کہ یہ ہمارے مکانوں میں رہتے ہیں یا ہماری گھاس چراتے ہیں۔ صاحبو! جی کو سمجھانا تو بہت آسان ہے مگر یہ دیکھئے کہ یہ عذر واقع میں چل بھی سکتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ گورنمنٹ کے قانون میں کیوں جی کو نہیں سمجھا لیا جاتا ذرا کسی مولوی سے پوچھا تو ہوتا کہ یہ سمجھ کر سستا گوشت خریدنا جائز بھی ہے یا نہیں اور آیا مکان کا کرایہ اس طور سے ٹھہرانا درست ہے یا نہیں یا چرائی کے عوض میں گوشت لینا جائز بھی ہے یا نہیں۔ رہی یہ بات کہ اس کے حرام ہونے کی وجہ کیا۔ سو اول تو وجہ سمجھنے کی ضرورت نہیں۔

وجوہ مسائل کے درپے ہونا بڑا خبط ہے

سہارنپور میں اسی وجہ سمجھنے کے متعلق ایک عجیب لطیفہ ہوا کہ بہشتی زیور کے ایک مسئلے کے متعلق ایک صاحب نے وجہ پوچھی میں نے کہا کیا آپ کو سب مسائل کی وجہ معلوم ہے اگر ہے تو

مجھ کو اجازت دیجئے کہ میں دو چار کی وجہ پوچھوں اور اگر معلوم نہیں تو چلو اس مسئلے کی بھی وجہ معلوم نہ سہی۔ پھر ایک اور صاحب تشریف لائے وہ اپنے نزدیک بوجھ بجھکڑ تھے۔ کہنے لگے کہ اگر آپ اس مسئلے کو مجمع عام میں صاف ہی کر دیں تو کیا حرج ہے میں نے کہا کہ آپ حکم کرتے ہیں یا مشورہ دیتے ہیں' کہنے لگے کہ مشورہ ہے میں نے کہا کہ بس آپ اپنا فرض ادا کر چکے اب مجھے اختیار ہے کہ مشورہ پر عمل کروں یا نہ کروں' آپ تشریف لے جائیے۔ غرض اول تو وجوہ مسائل کے درپے ہونا یہ بڑا خبط ہے۔ دیکھو اگر جج کوئی فیصلہ کرے تو ملزم کو یہ اختیار نہیں کہ وہ اس قانون کی وجہ دریافت کرے جس کی بناء پر یہ فیصلہ ہوا ہے اور اگر پوچھے تو کان پکڑ کر نکال دیا جائے گا اور حاکم کہے گا کہ ہم عالم قانون ہیں واضع قانون نہیں اس لیے ہم کو نہ وجہ معلوم ہونا ضرور نہ ہمارے ذمہ بتلانا ضرور۔ تو ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ ہم عالم قانون ہیں ہمارے ذمہ اس کے وجوہ اور اسرار کا بتلانا نہیں ہے نہ تو ہم جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اگر جانتے بھی ہیں تو بتلاتے نہیں۔ غرض بعض لوگ اس وجہ سے بھی رکے ہوئے ہیں مسائل پر عمل کرنے سے کہ وہ ان کو بظاہر عقل کے خلاف معلوم ہوتے ہیں۔

کرایہ دار قصائی سے سستا گوشت خریدنے کا حکم

ظاہر میں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب ایک شخص ہمارے مکان میں رہتا ہے تو ہم کو کرایہ میں اس سے سستا گوشت لینا درست ہے مگر بات یہ ہے کہ کرایہ کے شرعاً کچھ قانون ہیں چونکہ یہ اس پر منطبق نہیں لہٰذا درست نہیں۔ غرض اول تو ہم اسرار جاننے کا دعویٰ نہیں کرتے دوسرے لوگ ان اسرار کو سمجھ بھی نہیں سکتے۔ تیسرے ہر شخص سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کرتا بلکہ غرض زیادہ تر یہ ہوتی ہے کہ مجیب کو عاجز کیا جائے۔ غرض یہ مسئلہ طے شدہ ہے کہ بدون پھل آئے ہوئے فروخت کرنا جائز نہیں اسی طرح مکان میں رہنے کے عوض میں جبکہ اس کے معاوضہ کی کوئی حد نہ معلوم ہو کچھ لینا جائز نہیں اور یہ اس لیے کہا کہ اگر عوض کی کوئی حد مقرر ہو تو جائز ہے۔ یعنی مثلاً اگر ہم نے کسی کو مکان رہنے کو دیا تو اس کا عوض لینے کی ایک تو یہ صورت ہے کہ اس سے یوں کہا جائے کہ جب ہم کو ضرورت ہوگی ایک آنہ سیر گوشت لیں گے یا جب ضرورت ہوگی تم کو بیگار میں بلا لیں گے یہ تو ناجائز ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ سال بھر کے خرچ کا اندازہ کر لیں اور بلا کر اس سے یوں کہیں کہ ہم چار من گوشت تک تو آنہ سیر قیمت دیں گے اور اس کے بعد پوری قیمت دیں گے۔ یہ جائز ہے تو دیکھئے کتنی آسان صورت ہے البتہ اس میں یہ ضروری ہوگا کہ سال بھر کے گوشت کا

حساب یاد رکھنا پڑے گا محض من سمجھوتی سے کام نہ چلے گا کیونکہ اکثر غیر معین طور پر آتا ہے لہٰذا لکھنا چاہیے کہ فلاں تاریخ میں پانچ سیر آیا اور فلاں میں چھ سیر اور جب سال ختم ہو جائے تو اس کو جوڑ لو اگر ایک سیر بھی زائد آیا ہو تو اس کی پوری قیمت دے دو اور محض گول مول رکھنا کسی طرح جائز نہیں۔ اسی طرح اور بہت سے کام ہیں جن میں غرباء اور امراء مبتلا ہیں اور ان کو کوئی نہیں پوچھتا۔ مثلاً چرائی کا بکرا لینا یہ کسی طرح بھی جائز نہیں۔ ایک صاحب نے اس کے جواز کی ایک تاویل نکالی، واقعی پڑھے لکھے جنوں سے بچنا بہت ضروری ہے تو یہ تاویل نکالی کہ جب ہماری زمین میں آتے ہیں تو ہم زمین کا کرایہ لیتے ہیں تو اول تو اس کام کے لیے زمین کا کرایہ لینا ہی محل نظر ہے دوسرے یہ مسئلہ ہے کہ اگر کسی کی زمین میں گھاس ہو اور وہ کسی کو بدون عوض کے نہ آنے دے اور کسی شخص کو عوض دینا منظور نہ ہو مگر گھاس کی ضرورت ہو اور دوسری جگہ بھی اسی طرح نہ ملے تو زمین والے کو شرعی حکم ہے کہ گھاس کھود کر حوالے کرو پھر عوض لینے کا کیا حق ہوا۔ پس یہ تاویل بھی نہیں چل سکتی اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ کھلم کھلا گناہ کرنے والا اس قسم کی تاویل کرنے والوں سے اچھا ہے کہ وہ اپنے کو گنہگار تو سمجھتا ہے۔ غرض ان خرابیوں میں اکثر بڑے چھوٹے سب مبتلا ہیں اور اول تو احتیاط چاہیے کہ خود بھی نہ کھائیں اور اگر خود کھائیں تو کم سے کم دوسروں کو تو ہرگز نہ کھلائیں۔ میں نے تھانہ بھون میں بحمد اللہ اس رسم کو کئی گھروں سے روک دیا ہے اور یاد رکھو کہ اگر تم نے ایسا گوشت کسی کو کھلا دیا تو بے خبری میں کھانے سے اس کو گناہ تو نہیں ہوتا لیکن قلب پر تب بھی ایک ظلمت چھا جاتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اکثر معاملات اور معاشرت و اخلاق کو لوگوں نے شریعت سے خارج سمجھ رکھا ہے۔

لفظ بندگی کہنا شرک ہے

ایک اور جزئی یاد آئی یعنی سلام کرنا کہ شریعت نے حکم کیا ہے السلام علیکم کا مگر اب لوگوں نے اس کے بجائے بندگی اور آداب اختیار کیا ہے۔ میں جب کانپور گیا تو لوگوں نے آکر بندگی کہنا شروع کیا، مجھ کو بہت ناگوار ہوا کیونکہ یہ لفظ شرک کا ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ ہم آپ کی عبادت کرتے ہیں اس کو ظالم بادشاہوں نے ایجاد کیا تھا اور اس سے بھی زیادہ قابل افسوس یہ ہے کہ لوگوں کے السلام علیکم کو بے تمیزی میں داخل کیا ہے۔ ایک طالب علم نے اپنے والد کو جا کر سلام کیا تو وہ کہنے لگے کہ بیٹا یہ بے تمیزی ہے آداب کہا کرو۔

سلام کو بے تمیزی کہنا کفر ہے

صاحبو! یاد رکھو کہ سلام کو بے تمیزی کہنا کفر ہے کیونکہ سلام کو بے تمیزی کہنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو بے تمیزی کہنا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو بے تمیزی کہنے والا کافر اور واجب القتل ہے اسی طرح تمام معاشرت ہماری خراب ہو رہی ہے اور اخلاق بھی اور اخلاق سے مراد ملکات نفسانیہ ہیں۔ اس میں علماء بھی مبتلا ہیں کہ ان کو بھی اپنے اخلاق کی ذرا خبر نہیں۔

منتظر سلام رہنا تکبر کی علامت ہے

چنانچہ ہم لوگوں کی کیفیت یہ ہے کہ علم دین پڑھ کر ہم اس کے منتظر رہتے ہیں کہ لوگ ہم کو سلام کریں کیونکہ یہ دنیا دار ہیں اور ہم دیندار ہیں۔ نائب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں سو اس قسم کے لوگ متکبر ہیں اور زیادہ وجہ اس انتظار کی یہ ہوتی ہے کہ اپنے کو عالم سمجھتے ہیں مگر صاحبو! یہ کہاں لکھا ہے کہ جاہل عالم کو سلام کرے ہاں یہ لکھا ہے کہ سوار پیادے کو سلام کرے آنے والا بیٹھے ہوئے کو سلام کرے مگر یہ کہیں نہیں کہ جاہل عالم کو سلام کرے بلکہ دونوں کے ذمہ برابری ضروری ہے تو یہ انتظار تکبر نہیں تو کیا ہے۔ دوسرے ہم عالم ہی کیا ہیں اس سے اپنے کو عالم سمجھتے ہیں کہ ڈاڑھی درست ہو پاجامہ ٹخنوں سے اونچا ہو دو چار موٹی موٹی باتیں یاد ہوں سو ہم نے لباس کو درست کر لیا مگر اندر سینکڑوں خرابیاں بھری ہوئی ہیں ان ہی لوگوں کے بارے میں ہے:

از بروں چوں گور کافر پر خلل　　واندروں قہر خدائے عزوجل
از بروں طعنہ زنی بر بایزید　　وز درونت ننگ میدارد یزید

(باہر سے کافر کی قبر کی طرح مزین ہے اور اندر سے خدا کے عذاب کا مستحق ہے' باہر سے بایزید کو طعنہ مارتا ہے حالانکہ تیرا باطن یزید کو شرمندہ کر دینے والا ہے)

فقراء کا تکبر عجیب ہے

اور علماء کی کیا شکایت کروں اس وقت تو فقراء بھی الا ماشاءاللہ تکبر وغیرہ بہت سی خرابیوں میں مبتلا ہیں اور فقراء کا تکبر بہت ہی عجیب ہے کیونکہ فقیری کا تو حاصل یہ ہے کہ اپنے کو مٹایا جائے تو یہ فقیر ہو کر بھی نہ مٹے' غرض سب قابل الزام ہیں کہ معاشرت واخلاق وغیرہ کو سب نے دین سے نکال دیا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ جس کو دین سمجھتے ہیں اس کی بھی تحقیق نہیں جیسے نماز مثلاً اور ان میں بھی سب سے زیادہ خاص ان لوگوں کی شکایت ہے جو نمازی بھی ہیں کہ باوجود اس کے پڑھنے کے کوئی مسئلہ

کبھی کسی عالم سے دریافت نہیں کرتے۔ خدا جانے ان کو کبھی کوئی شبہ ہی نہیں ہوتا یا خود سارے مسائل معلوم ہیں یہ تو کہا نہیں جا سکتا کہ سارے مسائل ان کو معلوم ہیں کیونکہ نماز کے متعلق اتنے مسائل ہیں کہ اب تک بھی مجھے کتاب دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے تو جو لوگ نہ لکھے نہ پڑھے ہیں ان کو کیونکر معلوم ہو گئے۔ اصل بات یہ ہے کہ جی کو سمجھا لیا ہے کہ یوں بھی ہو جاتی ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ دین کی طلب نہیں یہی ہے وہ مرض جس کو میں بیان کر رہا ہوں اور اسی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اس تقریر کو پھر پیش نظر کر لیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں پر طلب دین کو فرض کر رہے ہیں اس حد تک کہ کبھی طالب کا پیٹ نہ بھرے تو ہر مسلمان پر فرض ہوا کہ کتنی ہی عمر ہو جائے برابر دین کی طلب میں رہے اس سے کوئی ڈرے نہیں کہ انہوں نے مولویت ہی کو فرض کر دیا۔

احکام سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے

صاحبو! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے طالب الکتاب نہیں فرمایا بلکہ طالب العلم فرمایا ہے تو احکام سے واقفیت پیدا کرو خواہ پوچھ کر یا پڑھ کر۔ عربی زبان میں یا اردو زبان میں۔ زبان کوئی خاص مقصود نہیں ہے اس پر مجھے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ یاد آیا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک شیخ رومی سعد آفندی تشریف لائے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ مثنوی شریف کا درس دے رہے تھے اور اردو میں تقریر فرما رہے تھے اور وہ شیخ متلذذ تھے۔ حضرت کے ایک خادم نے عرض کیا کہ اگر یہ اردو سمجھتے ہوتے تو ان کو زیادہ لطف آتا۔ حضرت نے فرمایا میاں کچھ زبان کی قید نہیں اور یہ شعر پڑھا:

پارسی گو گرچہ تازی خوشتر ست — عشق را خود صد زدن دیگر است
بوئے آں دلبر کہ پراں میشود — ایں زبانہا جملہ حیراں میشود

(فارسی کہہ اگرچہ عربی میں بولنا بہتر ہے عشق خود ہی دوسری سینکڑوں زبانوں کا عارف ہے اس دل ربا کی خوشبو جب پھیل جاتی ہے تو یہ تمام زبانیں خود حیرت میں رہ جاتی ہیں)

اللہ تعالیٰ صحیح اور غلط کے مقید نہیں

سو حقیقت میں خدا تعالیٰ زبان کو دیکھتے بلکہ صحت اور غلطی کو بھی زیادہ تر نہیں دیکھا جاتا۔ کہتے ہیں:

بر اشہد تو خند زند اسہد بلالؓ

(تیرے اشہدان لا الہ الا اللہ صحیح اور فصیح پڑھنے پر بھی حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اسہد غیر فصیح ہونے کے ہنسی کرتا ہے)

یہ روایت تو میری نظر سے نہیں گزری کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسھد کہتے تھے لیکن اگر کہتے ہوں تو وجہ اس مصرعہ کی یہ ہے کہ آج کل کا اشہد تو محض زبان تک ہے لایجاوز حناجرہم قلب پر ذرا اثر بھی نہیں ہوتا اور اللہ کے بندے جو نہ تجوید جانتے ہیں اور نہ کچھ ان کا قرآن شریف قلب اور عرش سے متجاوز ہے بلکہ عدم مہارت میں بھی دوہرا ثواب ملتا ہے وہ لفظ کو ادا نہیں کر سکتا اور کوشش کرتا ہے۔

آپ نے حکایت سنی ہوگی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ایک چرواہا تھا ایک مرتبہ وہ بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا کہ اے اللہ میاں تو کہاں ہے' میں تجھے روغنی روٹیاں کھلاؤں اور تیرے ہاتھ پاؤں دباؤں اور آرام سے سلاؤں وغیرہ ذالک۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو کہتے سنا تو پوچھا کہ کس کو کہہ رہا ہے۔ اسی کو مولانا رحمۃ اللہ کہتے ہیں:

ایں نمط بیہودہ میگفت آں شباں　　گفت موسیٰ باکیستت اے فلاں
گفت باآں کس کو مارا آفرید　　ایں زمان و چرغ از وآمد پدید
گفت موسیٰ ہائے خیرہ سرشدی　　خود مسلمان ناشدہ کافر شدی
ایں چہ کفرست ایں چہ ژاژست و فشار　　پنبہ اندرد ہان خود فشار

(چرواہا اس بیہودہ طریقے سے کہتا تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کس سے بات کر رہا ہے اس نے جواب دیا اس ذات کے ساتھ جس نے ہم کو پیدا کیا اور یہ زمین و آسمان اس سے وجود میں آئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ کیا تو پاگل ہوگیا ہے تو تو مسلمان نہیں رہا بلکہ کافر ہوگیا۔ یہ کیا کفر کی بات ہے اور کیا خلاف ورزی ہے تو خود اپنے منہ کے اندر روٹی رکھ لے اور خاموش ہوجا)

بس حضرت یہ سن کر سناٹا نکل گیا اور بہت ڈرا کہ سب کیا کرایا غارت ہوا اور

گفت اے موسیٰ دہانم دوختی　　وزپشیمانی تو جانم سوختی

(خدا کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی نازل ہوئی کہ ہمارے بندہ کو تو نے ہم سے جدا کر دیا' تو تو ملانے کے لیے آیا ہے نہ کہ جدا کرنے کے واسطے)

موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر تشریف لے گئے وہاں سے ارشاد ہوا:

وحی آمد سوئے موسیٰ ازخدا　　بندہ مارا زما کر دی جدا
تو برائے وصل کردن آمدی　　نے برائے فصل کردن آمدی

(خدا کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی نازل ہوئی کہ ہمارے بندہ کو تو نے ہم سے جدا کر دیا' تو تو ملانے کے لیے آیا ہے نہ کہ جدا کرنے کے واسطے) اور ارشاد ہوا کہ سنو!

ہر کسے را سیر تے بنہادہ ایم ہر کسے را اصطلاحے دادہ ایم
مابرو را ننگریم و قال را مادروں را بنگریم و حال را

(ہر شخص کو ہم نے ایک عادت دے رکھی ہے اور ہر شخص کو اس کی خاص اصطلاح عطا کر رکھی ہے ہم کسی کے ظاہر کو نہیں دیکھتے اور نہ کسی کے قال کو بلکہ ہم تو اس کے اندر (اس کے دل) اور اس کے حال پر نظر رکھتے ہیں)

غیر عربی دانوں کو فضیلت دین کے حصول کا طریق

تو صاحبو! خدا تعالیٰ صحیح اور غلط کے بھی مقید نہیں تو طالب علم کے یہ معنی نہیں کہ وہ عربی پڑھیں یہ تو ان کے لیے ہے جو فارغ ہوں ورنہ یہی معمول رہا ہے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا بھی اور تابعین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا بھی کہ ضرورت کے موافق پوچھتے اور اس پر عمل کرتے تھے تو عربی نہ پڑھنے والے یہ نہ سمجھیں کہ ہم کو طلب دین کی فضیلت نہیں ہوتی۔ حدیث میں ہے کہ "ان الملئكة لتضع اجنحتها رضالطالب العلم"[1] (بیشک فرشتے طالب علم کے مقصد سے خوش ہو کر اس کے لیے جھک جاتے ہیں) یعنی ان کے لیے جھک جاتے ہیں۔ یہ معنی ہیں تضع کے اور یہ کہیں نظر سے گزرا کہ طالب علم کے پیر کے نیچے پر بچھا دیتے ہیں اگر انہی لفظوں سے یہ سمجھا ہے تو محل کلام اور اگر کوئی اور روایت ہے جو ہم تک نہیں پہنچی تو بسر و چشم۔ تو ان روایتوں کو سن کر اکثر لوگ دل شکستہ ہوتے ہیں کہ ہم کو یہ فضیلت حاصل نہیں مگر میں مطلع کرتا ہوں کہ کوئی دل شکستہ نہ ہو ہر شخص یہ فضیلت حاصل کر سکتا ہے جس کی صورت یہ ہے کہ معاملات عقائد وغیرہ کا اہتمام کرے اور غور کرتا رہے اور جو نہ معلوم ہو پوچھتا رہے۔ بس یہ طالب علم ہو گیا اور اس کے لیے وہی تعظیم ہو گئی ہاں جو مقتدا بن جائے وہ اس فضیلت کے ساتھ نائب رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہو گا ورنہ فضیلت طلب ہر شخص کو حاصل ہو سکتی ہے تو یہ کیا کچھ کم دولت ہے۔ پس میں عورتوں اور مردوں دونوں سے کہتا ہوں کہ طلب علم میں جو بے فکری ہے اس کو چھوڑ دو اور آج کل اگر لوگوں کو کچھ فکر بھی ہے اور پوچھتے بھی ہیں تو صرف نماز کی بابت۔

دینی مدرسہ کے سبب جملہ اہل بستی پر رحمت خداوندی

صاحبو! سب چیزوں کی بابت پوچھو کہ یہ جائز ہے یا نہیں' یہ شان ہونی چاہیے مسلمان کی۔ اس میں بہت کمی ہے اس واسطے میں نے اس حدیث کو اس وقت بیان کیا اگرچہ احکام بہت سے

---

[1] (سنن ابی داؤد' العلم ب: ۱' سنن ابن ماجة: ۲۲۳)

بیان نہیں ہو سکے مگر مختصراً اصول کے طور پر جو مضامین بیان ہو گئے ہیں وہ بہت کافی ہیں نیز اس لیے بھی اس مضمون کو بیان کیا کہ میرا آنا اس وقت محض مدرسہ کی حالت دیکھنے کے لیے ہوا اور اسی لیے مجھے بلایا گیا تھا چنانچہ میں نے دیکھا اور دیکھ کر بہت ہی جی خوش ہوا۔ میں چند لوگوں کو مبارکباد دیتا ہوں اول واقفین جائیداد کو دوسرے منتظمین کو کیونکہ وہ معین ہیں ان کو بھی وہی ثواب ملتا ہے۔ تیسرے تمام اہل بستی کو مبارکباد دیتا ہوں کیونکہ حدیث میں اہل علم کے لیے ہے۔ "**حفتهم الملئكة ونزلت عليهم السكينة**" کہ فرشتے ان کو گھیر لیتے ہیں اور ان پر کیفیت جمعیت کی نازل ہوتی ہے "**وذكرهم الله فيمن عنده**" کہ اللہ تعالیٰ ان کا تذکرہ اپنے مقربین میں فرماتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ جب خدا تعالیٰ کی رحمت نازل ہوتی ہے تو سب پر نازل ہوتی ہے جیسے بارش کہ جب ہوتی ہے تو سب جگہ ہوتی ہے اور اگر کوئی اسی مثال پر یہ خدشہ کرے کہ بھادوں میں بارش سب جگہ نہیں ہوتی بلکہ کچھ دور تک ہوتی ہے اور کچھ دور تک خشک رہتا ہے تو میں کہوں گا کہ اول بدل کر سب جگہ ہو جاتی ہے تو خدا کی رحمت تو اس سے بھی عام ہے پس اسی طرح اول اہل علم پر رحمت ہوگی ان کی بدولت خدا کی رحمت ساری بستی پر ہوگی تو سب کو خوش ہونا چاہیے اور قدر کرنا چاہیے۔ مگر لوگ ڈریں نہیں کہ بس اب چندہ مانگا جائے گا ہم چندہ نہیں مانگتے ہیں ایک دوسرا چندہ مانگتے ہیں وہ یہ کہ اپنے بچوں کو مدرسے میں پڑھنے کے واسطے بھیجو کہ ان کو دین کی خبر ہو اور ان کی بدولت آئندہ کو یہ سلسلہ جاری رہے' یہ بچوں کا حق ہے اور یاد رکھو کہ جس گھر میں رحمت ہو اور گھر والے محروم رہیں تو یہ بہت بڑی محرومی کی دلیل ہے اور دوسرے یہ کرو کہ جو بچے پڑھ کر آتے ہیں ان کو تاکید کرو کہ عورتوں کو سبق سنائیں۔ اگر یہ انتظام ہو جائے تو ہر روز دو چار مسئلے ان کے کان میں بھی پڑ جائیں اور جب ہر روز یہ احکام سنیں گے تو کبھی نہ کبھی اثر بھی ضرور ہوگا۔

اللہ کے نام لینے کا اثر

صاحبو! خدا کا نام بے اثر نہیں ضرور اثر ہوگا۔ اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا مگر اس سے استدلال مقصود نہیں کیونکہ یہ امر مشاہد ہے مگر وہ نمونہ کے طور پر ایک نظیر ہے وہ یہ ہے کہ کھٹائی کا نام لینے سے منہ میں پانی بھر آتا ہے تو کیا خدا کا نام کھٹائی کے برابر بھی نہیں ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

مست ولا یعقل نہ ازجام ہو   اے زہو قانع شدہ برنام ہو

(وہ سالک جو ہو کے جام کو ہی کافی سمجھتا ہے وہ عقل میں ناپختہ ہے کیونکہ منزل اب بھی آگے

ہے ہو کے نام پر قناعت نہ ہو بلکہ جس ذات کا یہ نام ہے اس تک رسائی حاصل کرنے کا اسے ذریعہ بنا)
کہ مستی ہے نہ ذوق وشوق ہے، یہ تو شکایت ہے۔ آ گے فرماتے ہیں:

از صفت وزنام چہ زاید خیال　　　واں خیالت ہست دلال وصال

(نام اور صرف تعریف جان لینے سے کچھ حاصل نہیں ہاں اسے وصال کا پیمبر کہا جا سکتا ہے)
کہ یہ بھی غنیمت ہے کہ اس سے بھی اثر ہوتا ہے۔ ''اِذَا تُلِیَتْ عَلَیْھِمْ اٰیٰتُہٗ زَادَتْھُمْ اِیْمَانًا''، یعنی مسلمان کی شان یہ ہے کہ جب خدا کا نام لیا جائے تو ایمان بڑھ جاتا ہے۔

مستورات کے لیے حصول علم کا دین کا دستور العمل

اور عورتیں بھی اس پر توجہ کریں کہ روزانہ اپنے بچوں سے سبق پڑھوا کر سنا کریں اور جو بات نہ معلوم ہو اپنے مردوں سے کہہ کر علماء سے پوچھا کریں کیونکہ مسائل سیکھنا تو ضروری اور ان کو اس کے مواقع بکثرت حاصل نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اول تو یہ خیال ہر وقت رکھو کہ کونسا کام شریعت کے خلاف ہے کونسا شریعت کے موافق ہے اور اپنے مردوں سے کہو کہ علماء سے پوچھ پوچھ کر تم کو بتلائیں دوسرے اپنے بچوں سے سبق سنا کرو یہ بہت ہی سہل ترکیب ہے۔ یہ صورت تو عورتوں کے لیے ہے اور مردوں کو تو بہت ہی آسان ہے۔ نیز مردوں کو یہ بھی چاہیے کہ دیکھتے رہیں کہ کوئی بات خلاف شریعت تو عورتوں سے نہیں ہوتی اور اگر کوئی بات دیکھیں فوراً باز پرس کریں۔

نعمت مدرسہ کی قدر اور شکر گزاری

نعمت مدرسہ کی قدر اور شکر گزاری یہی ہے کہ دین کی تلاش میں لگ جاؤ۔ دوسرے قدردانی یہ کرو کہ آج کل جو ہم لوگ کسی کام کو ایک ہی کے ذمہ ڈال دیتے ہیں اس عادت کو بھی چھوڑ دو کیونکہ یہ بہت برا ہے۔ صاحبو! جو شخص جتنا کام کر رہا ہے غنیمت سمجھو کیونکہ وہ فرض کفایہ ہے وہ تم سب کی طرف سے کر رہا ہے سو جن باتوں میں تمہاری ضرورت ہے ان میں تم بھی شریک ہو جاؤ۔ مثلاً جو صاحب وسعت ہیں وہ اس طرح شرکت کریں کہ کچھ طالب علم یہاں باہر کے بھی رہیں اور وہ ان کی امداد کریں اگرچہ یہ ضروری ہے کہ سب بالکل باہر ہی کے نہ ہوں کیونکہ بستی کو زیادہ نفع ہونا چاہیے تو زیادہ تو بستی کے ہوں اور چار پانچ باہر کے بھی ہوں۔ اس میں ایک تو برکت ہوتی ہے دوسرے وہ صرف طلب علم کے لیے آئے ہیں ان کی امداد میں بڑی فضیلت ہے۔ تیسرے ان سے مدرسے کی رونق ہوتی ہے چوتھے ان سے مدرس کی دلچسپی ہوتی ہے تو خواہ تو یوں سمجھو کہ مدرسے میں ان کی امداد

کی گنجائش نہیں یا اگر گنجائش بھی ہو تو ثواب کے لیے ایک ایک آدمی کا کھانا اپنے ذمہ کر لیں یا دو آدمی ایک کا کھانا کر لیں یا دیو بند کے بعض غرباء کی طرح سات آدمی ہفتہ بھر میں نوبت بنوبت کھانا دیں۔ غرض اہل بستی مشورہ کر کے کوئی طریق مقرر کر لیں اور ایک ایسے صاحب جن کو لوگ سچا سمجھیں کھڑے ہو کر فہرست لکھیں، کون شخص کس طرح دے گا اور پھر دیکھ لیں کہ کتنے کھانے ہوئے ان ہی کے موافق اجازت دیدی جائے کہ اتنے طلبہ بلالئے جائیں اور اگر چندہ میں گنجائش ہو تو مہتمم سے لے کر بھی کچھ دیں لیکن اگر اور سب بھی شریک ہو جائیں تو اچھا ہے۔

یہ مدرسہ کے حالات تھے جن کو دیکھ کر میں نے بیان کیا اور اس لیے اس مضمون کو اختیار کیا۔ بہر حال اس مضمون سے آپ نے سمجھا ہوگا کہ ہم لوگوں کو واقعی مسئلوں کی تلاش نہیں ہے تو میں اس کے کئی ذریعے بتلاتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ کتابیں پڑھو، پھر اس میں دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ عربی پڑھو تو بہت ہی اچھی صورت ہے بالخصوص نوجوان لڑکے تو ایک چھوٹا سا سبق جا کر ضروری شروع کر لیں۔

مردوں کے لیے تحصیل علم دین کا دستور العمل

صاحبو! کیا چوبیس گھنٹے میں سے ایک گھنٹہ بھی اس کے لیے نہیں ہو سکتا یہ بھی نہ ہو تو ہفتہ میں دو دن ہی سہی اور اگر عربی کی کتابیں نہ پڑھ سکیں تو یہ کریں اگر کچھ پڑھے ہوئے ہیں تو مسئلوں کی کتابیں خرید کر پڑھا کریں اور جہاں شبہ ہو اہل علم سے پوچھ لیا کریں اور اگر بے پڑھے ہیں تو اس کے لیے یہ ترکیب کریں کہ ہر محلّہ کی مسجد میں ہفتہ کا کوئی ایک دن مقرر کر دیں اور کسی سمجھدار آدمی کو مقرر کر کے ایک مسئلوں کی کتاب اس کو دیں اور کہیں کہ نصف گھنٹے تک اس کو پڑھ کر سناتا جائے اور سمجھاتا جائے اگر ہر محلّہ میں ہفتہ میں ایک دن بھی ایسا ہو جائے تو اندازہ کرو کہ سال بھر میں کتنے مسئلے معلوم ہو جائیں اور پھر عمر بھر میں کتنا ذخیرہ مسائل کا اپنے پاس ہو جائے۔ اب رہ گئیں عورتیں وہ یا تو کتاب دیکھ کر پڑھیں اور اگر بے پڑھی ہیں تو مردوں سے کہیں کہ ہم کو مسائل سناؤ اور اپنے بچوں کا سبق روز سنا کریں اور اگر کسی کے بچہ نہ ہو وہ دوسرے کے بچے کو بلا کر اس سے سنے۔ یہ کوئی مشکل امر نہیں۔ دیکھو اگر ایک خط لکھوانا ہوتا ہے تو کیسا لڑکوں کو تلاش کیا جاتا ہے اگر بچے روزانہ نہ آ سکیں تو دوسرے تیسرے دن بلا لیا کرو۔ یہ طریقے ہیں علم دین سیکھنے کے ان میں جس کو جو آسان ہو وہ کرے اگر ایسا کیا تو انشاء اللہ چند روز میں ہر مسلمان آدھا مولوی ہو جائے گا۔ اگر ایک مسئلہ روزمرہ معلوم ہوا تو سال بھر میں تین سو ساٹھ مسئلے تو کان میں پڑیں گے پھر انشاء اللہ ہر وقت پوچھنے

کی ضرورت نہ ہوگی کیونکہ کافی ذخیرہ ہوگا اس لیے میں نے یہ حدیث پڑھی تھی۔ اب پھر حدیث کو مکرر پڑھتا ہوں۔ "منھو مان لایشبعان طالب العلم وطالب الدنیا" (دو حریصوں کا پیٹ نہیں بھرتا' طالب علم اور طالب دنیا کا)

خلاصہ وعظ

پھر اس کا خلاصہ عرض کرتا ہوں کہ مطلب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ہے کہ طالب دین کا پیٹ کبھی نہ بھرنا چاہیے جیسے طالب دنیا کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا اب میں ختم کرتا ہوں اور مجھے یہ امید ہے کہ چونکہ یہ کام کی بات تھی اور اسہل طور سے بیان ہوئی ہے اس لیے انشاء اللہ اثر ہوگا اور خدا کرے کہ جب دوسری مرتبہ آؤں تو سب پر اثر دیکھوں۔ اب دعا کیجئے کہ خدا تعالیٰ (تمام مسلمانوں کو اور محمد عبد المنان ناشر کو) توفیق دیں۔ آمین

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقه

سیدنا ومولانا محمد واله واصحابه اجمعین

برحمتک یا ارحم الراحمین.

وعظ مسمی بہ

الہدیٰ والمغفرۃ

بمقام سروٹ ضلع مظفرنگر مدرسہ محمودیہ ۱۳ جمادی الثانی ۱۳۴۲ھ بروز یکشنبہ شروع ۸ بج کر ۵۴ منٹ ختم ۱۲ بجے کل ۳ گھنٹے ۶ منٹ کرسی پر بیٹھ کر یہ وعظ ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد ۵۰۰ تھی۔ مولانا ظفر احمد تھانویؒ صاحب نے قلمبند فرمایا۔

دعوات عبدیت کا پانچواں وعظ ملقب بہ

خطبہ ماثورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰٓی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ. اَمَّابَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَۃَ بِالْھُدٰی وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَۃِ فَمَآ اَصْبَرَھُمْ عَلَی النَّارِo

ترجمہ: ’’یہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت چھوڑ کر ضلالت اختیار کی اور مغفرت کو چھوڑ کر عذاب سودوزخ کے لیے کیسے باہمت ہیں۔‘‘

یہ ایک آیت ہے سورہ بقرہ کی جس میں حق تعالیٰ جل شانہ وعم نوالہ نے اہل کتاب کے متعلق دو وعیدیں ارشاد فرمائیں کیونکہ اوپر سے اہل کتاب کا ذکر چلا آرہا ہے چنانچہ اس آیت سے پہلے یہ آیت ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ الْکِتٰبِ وَیَشْتَرُوْنَ بِہٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا . اُولٰٓئِکَ مَایَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِھِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا یُکَلِّمُھُمُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَلَایُزَکِّیْھِمْ وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌo

’’اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جولوگ اللہ کی بھیجی ہوئی کتاب کا اخفا کرتے ہیں اور اس کے معاوضہ میں متاع قلیل وصول کرتے ہیں ایسے لوگ اور کچھ نہیں اپنے شکم میں آگ بھر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ نہ تو قیامت میں کلام کریں گے اور نہ ان کی صفائی کریں گے اور ان کو سزائے دردناک ہوگی۔‘‘

اس میں اہل کتاب کی دین فروشی اور کتمان حق کا ذکر ہے اور اس پر سخت عذاب کی دھمکی ہے اس کے بعد یہ آیت ہے جو میں نے تلاوت کی اس میں ان اعمال سابقہ کا منشا بتلایا گیا ہے

کہ اہل کتاب جو دین فروشی اور کتمان حق پر دلیر ہیں اس کا منشا دو باتیں ہیں ایک یہ کہ ان لوگوں نے (دنیا میں) ہدایت چھوڑ کر ضلالت اختیار کی۔ دوسرے یہ کہ انہوں نے (آخرت کی چیزوں میں سے) اسباب مغفرت کو چھوڑ کر اسباب عذاب کو اختیار کیا اس کے بعد ان دونوں پر سخت وعید ارشاد فرماتے ہیں: "فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ" (دوزخ کے لیے کس قدر باہمت ہیں) یہ ایسا ہے جیسا ہمارے محاورہ میں کہا کرتے ہیں کہ شاباش ہے اس کی ہمت کو آگ میں کودنے کے لیے کیسا باہمت ہے۔حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ شاباش ہے ان کی ہمت کو دوزخ میں جانے کے لیے کیسے باہمت ہیں۔

اسباب مغفرت کو اختیار کرنے کی ضرورت

خلاصہ یہ کہ آیت ترک ہدایت اور اختیار ضلالت پر اور ترک اسباب مغفرت و اختیار اسباب عذاب پر وعید ہے اور میں نے اسباب کا لفظ ترجمہ میں اس لیے بڑھا دیا کہ عذاب کو بلاواسطہ کوئی اختیار نہیں کرسکتا جس سے بھی پوچھو ہر شخص عذاب سے نفرت و کراہت اور خوف ہی ظاہر کرے گا اور کوئی یہ نہ کہے گا کہ مجھے عذاب لینا منظور ہے مگر حق تعالیٰ نے اسباب کے لفظ کو اس لیے حذف کردیا تاکہ معلوم ہوجائے کہ اسباب کو اختیار کرنا ہے۔ دیکھئے جس شخص کو یہ معلوم ہو کہ بغاوت وقتل کی سزا پھانسی ہے وہ اگر قتل و بغاوت پر اقدام کرے تو عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ کمبخت پھانسی پر لٹکنا چاہتا ہے۔ حالانکہ وہ پھانسی پر لٹکنا ہرگز نہیں چاہتا مگر اس کے اسباب کو جان بوجھ کر اختیار کرنا عقلاء کے نزدیک پھانسی ہی کو اختیار کرنا ہے ایسے ہی حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب ان لوگوں نے اسباب مغفرت کو چھوڑ کر اسباب عذاب کو اختیار کرلیا تو یوں کہنا چاہیے کہ گویا مغفرت کو چھوڑ کر اسباب عذاب کو اختیار کرلیا تو یوں کہنا چاہیے کہ گویا مغفرت کو چھوڑ کر خود عذاب ہی کو اختیار کیا ہے۔ یہ تو وجہ ہوئی جانب عذاب میں اسباب کو مقدر کرنے کی کہ عذاب کو بلاواسطہ کوئی اختیار نہیں کرسکتا اور جانب مغفرت میں لفظ اسباب کے مقدر کرنے کی بھی یہی وجہ ہے کہ مغفرت ہر شخص کو مطلوب ہے اس کو بھی بلاواسطہ کوئی ترک نہیں کرتا جس سے بھی پوچھو گے وہ طالب مغفرت ہی ہوگا۔ پس ترک مغفرت کے بھی یہی معنی ہیں کہ اس کے اسباب کو ترک کردیا اور ایک علت مشترکہ مقدر کرنے کی یہ بھی ہے کہ ترک و اختیار کا تعلق ان اشیاء سے ہوا کرتا ہے جو بندہ کی قدرت میں داخل ہوں اور عذاب و مغفرت انسان کی قدرت سے خارج ہیں اس لیے بلاواسطہ ہمارے ترک و اختیار کا تعلق ان کے ساتھ نہیں ہوسکتا۔ البتہ دونوں کے اسباب ہمارے

قدرت کے تحت میں ہیں۔ان کے ساتھ ہمارا ترک واختیار متعلق ہوسکتا ہے اور اسباب کے واسطہ سے عذاب ومغفرت کے ساتھ بھی ان کا تعلق ہوتا ہے۔

تو یہ ترجمہ تھا آیت کا جس سے معلوم ہوگیا کہ ترک ہدایت واختیار ضلالت اور ترک اسباب مغفرت واختیار اسباب عذاب بڑا سنگین جرم ہے جس کے مرتکب کی بابت حق تعالیٰ یوں فرماتے ہیں کہ یہ لوگ جہنم میں جانے پر بڑے ہی دلیر ہیں اور اس جرأت کو تعجب کے صیغہ سے بیان فرماتے ہیں کہ شاباش ہے ان کی ہمت کو یہ جہنم میں جانے کے لیے کیسے دلیر اور بے باک ہیں اور غور کرنے سے یہ بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ یہی افعال منشا ہیں تمام جرائم کا جن میں سے دین فروشی اور کتمان حق کا ذکر خصوصیت سے اوپر بھی آ چکا ہے کہ ان کا منشاء یہی ترک ہدایت واختیار ضلالت وغیرہ ہوا ہے اور اس سے بطور مفہوم کے بھی معلوم ہوا کہ جس طرح ترک ہدایت وترک مغفرت صدور معاصی ودخول جہنم کا سبب ہے اسی طرح اختیار ہدایت وطلب مغفرت صدور طاعات و دخول جنت کا سبب ہے۔

معاصی کے اصل اسباب

پس حاصل یہ ہوا کہ جہل اور عذاب سے بے خوفی معاصی کا سبب ہے اور علم اور رغبت مغفرت طاعات کا سبب ہے اس طرح یہ آیت ترغیب وترہیب دونوں کو جامع ہوگئی اس وقت اس کے اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ حاضرین کو معلوم ہے کہ اس وقت ہم ایک دینی مدرسہ کے جلسہ میں مدعو ہیں جس کی غرض یہ ہے کہ حاضرین کے ذہن میں علم کی ضرورت اور اس کی ضد یعنی جہل کی خرابیاں واضح کی جائیں اس لیے میں نے اسی کے مناسب مضمون اختیار کیا۔ چنانچہ میں اس وقت علم وجہل اور عمل وبدعملی سے بھی بحث کروں گا اور مضمون آیت گو اس غرض سے بہت زیادہ مناسبت ہے جو ترجمہ میں ذرا غور کرنے سے معلوم ہوسکتی ہے کیونکہ ہدایت کو چھوڑ کر ضلالت اختیار کرنا اس کا حاصل یہی ہے کہ علم کو چھوڑ کر جہل کو اختیار کرنا اور چونکہ علم سے مقصود عمل ہے اگر عمل نہ ہوا تو گویا علم ہی نہ ہوا کیونکہ قاعدہ مسلمہ ہے: "الشئی اذا خلا عن فائدتمه لغا" (شئی جب فائدہ سے خالی ہو بیکار رہتی ہے) اس طرح ہدی اور ضلالت میں عمل وبدعملی بھی داخل ہے اور آیت کا جزو اول ہی مقصود کے دونوں اجزاء پر دلالت کرنے کے لیے کافی ہوگیا۔ اس کے بعد "وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ" (اور عذاب کو مغفرت کے عوض) میں تو عمل اور بدعملی کے تصریح ہوگئی کیونکہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ یہاں عذاب سے اسباب عذاب اور مغفرت سے اسباب مغفر...

مراد ہیں اور مغفرت و عذاب کا ترتب اعمال ہی پر ہوتا ہے جن پر علم و جہل بھی داخل ہیں گو افعال جوارح و افعال قلب دونوں کو کیونکر عمل کہتے ہیں صرف اختیار کو اور افعال قلب میں بھی صرف اختیار ہوتا ہے تو وہ بھی اعمال میں داخل ہیں۔

مغفرت کا حاصل

اس طرح علم و جہل بھی اسباب مغفرت و اسباب عذاب میں داخل ہو گئے اور اعمال صالحہ و اعمال سیئہ تو ان میں داخل ہیں ہی پس مغفرت کا حاصل علم طاعت ہے کیونکہ مغفرت کا ترتب طاعات ہی پر ہوتا ہے اور عذاب کا حاصل بدعملی ہے کیونکہ اعمال بد پر عذاب کا ترتب ہوتا ہے۔ غرض آیت کے دونوں اجزاء الگ الگ بھی مقصود کے دونوں اجزاء کو مشتمل ہیں اور مجموعتہ بھی کیونکہ میں اوپر بتلا چکا ہوں کہ ہدیٰ میں علم و عمل دونوں داخل ہیں اس لیے کہ علم سے عمل ہی مقصود ہوتا ہے پھر اس کے مقابل ضلالت میں بھی جہل و بدعملی دونوں مراد ہوں گے اور یہ بھی میں نے بتلا دیا کہ مغفرت سے بواسطہ تقدیر اسباب کے عمل طاعات مراد ہے اور علم بھی عمل میں داخل ہے تو عذاب میں بھی جہل اور بدعملی دونوں میں داخل ہوں گے اور یہ بات ادنیٰ تامل سے معلوم ہو سکتی ہے اور یہی مقصود وقت تھا اس لیے اس آیت کو اختیار کیا گیا۔ رہا یہ کہ ہدیٰ سے مراد علم کیسے ہوا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہدایت کے معنی ہیں راہ نمودن اور یہ علم پر موقوف ہے کیونکہ بدون جانے راستہ بتلانا مشکل ہے یہ تو اصلی معنی ہیں اور یہاں چونکہ ہدیٰ کا مقابلہ اضلال سے نہیں بلکہ ضلالت سے ہے اور ضلالت کے معنی گمراہ ہونے کے ہیں اس تقابل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ہدیٰ کے معنے راہ جاننے کے ہیں پس ہدیٰ کا حاصل علم اور ضلالت کا حاصل جہل صاف معلوم ہوا۔ صاحب ہدیٰ وہی ہے جو راستہ جانتا ہے اور راستہ پر چلتا ہو اور گمراہ وہی ہے جو راستہ نہ جانتا ہو یا جان کر اس پر چلتا نہ ہو۔ اب غور کرنا چاہیے کہ ہماری حالت کس میں داخل ہے کیونکہ قرآن مجید ہمارے لیے اصلاح کی ایک کتاب ہے ہمیں اس کے مضامین سے اپنی حالت کی اصلاح کرنی چاہیے یہ تو اجمالاً معلوم ہو گیا کہ قرآن شریف عموماً بھی اور بواسطہ اس آیت کے خصوصاً یہی علم و عمل کی تعلیم دے رہا ہے اور بدعملی و جہل پر وعید بتلا رہا ہے تو اب ہم کو اپنی حالت میں غور کر کے اس کو اپنے حال پر منطبق کرے کہ میرے اندر یہ امراض ہیں یا نہیں اگر امراض موجود ہیں تو ان کے خطرات پر مطلع ہو کر جلد اصلاح کی کوشش کرے ایسے مسلمان تو کم ہیں جن کو مضامین قرآن کی صحت میں شک ہو یہ تو سب کو مسلم ہے کہ قرآن کے مضامین سب صحیح ہیں۔

ضرورت فکر اصلاح

مگر غفلت اس سے ہے کہ اپنی حالت میں غور نہ کرتے اور مضامین قرآن کو اپنے اوپر منطبق نہیں کرتے، اہل علم تو بھلا اہل علم ہیں وہ تو اپنے علم پر قناعت کیے ہوئے ہیں ہی، گو ان کو بھی اپنی خاص خاص حالت کے اعتبار سے غور و تامل کی ضرورت ہے مگر عموماً غیر اہل علم بھی تو اپنی حالت موجودہ پر قناعت کئے ہوئے ہیں کسی کو اصلاح کی فکر نہیں۔ حیرت ہے کہ اگر کسی مکان میں ذرا سا نقص رہ جائے مثلاً دالان اور سہ دری تیار ہو مگر اسباب رکھنے کے لیے کوٹھری نہ ہو تو اس کو فکر ہوتی ہے کہ اگلے سال ایک مرہ بنائیں گے اگر زیادہ وسعت بھی نہ ہوئی تو ایک دو کڑیاں تو ضرور بنا ہی دیں گے۔ مگر قصر دین کی تکمیل کا کسی کو بھی خیال نہیں ہے جس تنگ کوٹھری میں ہم بسے ہوئے ہیں اسی پر قناعت ہے اس سے زیادہ ترقی کی ہوس ہی نہیں۔ پھر افسوس یہ ہے کہ خود اس کی درسی کی بھی فکر نہیں۔ اگر وہ کوٹھری کہیں سے گری ہوئی ہے یا اس کی چھت میں دو تین کڑیاں ٹوٹی ہوئی ہیں تو اسکی کچھ پرواہ نہیں۔ صاحب اگر زیادہ بھی نہ ہو تو کم از کم بقدر ضرورت تو دین کی عمارت درست کر لینی چاہیے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ ایک نقص فرائض و واجبات کا ہے اور ایک نقص سنن و مستحبات کا ہے اگر سنن و مستحبات کی تکمیل نہ ہو سکے تو کم از کم فرائض و واجبات کے نقص کو تو رفع کر لیا جائے۔ گو مسلمان ہونے کا تو مقتضی یہ تھا کہ سنن مستحبات کی بھی تکمیل کی جاتی کیونکہ مسلمان کا اعتقاد یہ ہے کہ دین دنیا سے مقدم ہے تو جب ہم کو قصر دنیا کا نقص گوارا نہیں تو قصر دین کا نقص کیونکر گوارا ہے لیکن افسوس تو اس کا ہے کہ ہم کو فرائض و واجبات کی تکمیل کا بھی اہتمام نہیں۔ شریعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم معتدلہ میں ہر حالت کے اعتبار سے حکم موجود ہے۔

ہر مرتبہ از وجود حکمے دارد (ہر مرتبہ وجود سے ایک حکم رکھتا ہے)

معاملات و معاشرت میں تعلیم اعتدال

شریعت نے عقائد و عبادات کے علاوہ معاملات و معاشرت وغیرہ میں اعتدال کی رعایت کی ہے اور اسی لیے اس امت کا لقب امت عادلہ ہے لیکن ہمارے تمام کام اعتدال سے گزرے ہوئے ہیں۔ کوئی کام بھی افراط و تفریط سے خالی نہیں اگر ہم اپنی حالت میں غور کریں تو معلوم ہو کہ ہماری عبادات بھی ناقص ہیں اور معاملات بھی اور معاشرت تو بالکل ہی گندی ہے۔ پھر وہ نقص سنن میں بھی ہے اور مستحبات میں بھی، واجبات میں بھی ہے اور فرائض میں بھی۔ اور اگر کسی کے فرائض و واجبات میں ظاہری نقص نہیں تو باطنی نقص تو ضرور موجود ہے کیونکہ نقصان کی دو قسمیں ہیں، ایک جلی، ایک دقیق، اگر کوئی نقص جلی سے محفوظ ہے تو نقص خفی سے وہ بھی بچا ہوا نہیں غرض ہمارا وہ حال ہے۔

تن ہمہ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

(ہمارا جسم داغوں سے بھرا ہوا ہے پھر یہ کہاں کہاں رکھیں)

سر سے پیر تک ہمارا دین زخمی ہے مگر کسی کو بھی علاج کی فکر نہیں۔ بعض لوگوں کو اس سے دھوکہ ہو گیا ہے کہ وہ کاملین کو بھی اپنے نقص کا اعتراف کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اس سے وہ یوں سمجھ گئے کہ جب ایسے ایسے بزرگ بھی ناقص ہیں تو ہم ہی سے کیا تکمیل ہوگی۔ بس وہ بھی ناقص ہیں اور ہم بھی ناقص، تو سب برابر ہیں، پھر تکمیل کس سے کرائیں۔ صاحبو! اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ ایک شخص کے تو ہاتھ پیر موجود ہوں مگر ان میں درد ہو رہا ہو اور ایک شخص کے ہاتھ پیر ہی نہ ہوں تو یہ دونوں برابر ہو جائیں گے۔ کیا اس کو کوئی عاقل تسلیم کرے گا ہرگز نہیں، دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ بس یہی فرق ہے آپ کے نقص اور کاملین کے نقص میں ان کے تو سب اعضاء صحیح سالم ہیں مگر کسی عضو میں درد ہو رہا ہے اس لیے وہ اپنے کو ناقص کہتے ہیں اور آپ کے دین کے تو اعضاء بھی ندارد ہیں تو کیا اس حالت میں آپ کو ان کی احتیاج نہیں، کیا اپاہج آدمی کو اس شخص کی احتیاج نہیں ہوتی جس کے ہاتھ پیر سالم ہیں چلتا پھرتا ہے گو کسی جگہ اس کے درد بھی ہو مجھے سخت تعجب ہوا۔

عارفین کی نظر موجودہ کمالات پر نہیں ہوتی

ایک شخص کی حالت پر جس نے مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک خط میں دیکھا تھا کہ مولانا قسم کھا کر لکھتے ہیں کہ واللہ میں کچھ نہیں تو اس سے وہ کہنے لگا کہ ہم مولانا کو سچا سمجھتے ہیں اور وہ لکھتے ہیں کہ میں کچھ نہیں تو ہم بھی یہی سمجھتے ہیں کہ وہ کچھ بھی نہیں اور حیرت یہ کہ مولانا کے ایک معتقد بھی شبہ میں پڑے ہوئے تھے کہ حضرت نے یہ جھوٹی قسم کیوں کھائی اس میں کیا تاویل کی جائے۔ میں نے کہا بندہ خدا ترقی تو انبیاء علیہ السلام کو بھی ہوتی رہتی ہے اور وہ بھی ترقی کے محتاج ہیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم فرماتے ہیں: "وَقُل رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْماً" (اور کہئے میرے پروردگار زیادہ دیجئے مجھ کو علم) اسی طرح اولیاء کو بھی ترقی ہوتی رہتی ہے اور وہ انبیاء سے زیادہ ترقی کے محتاج ہیں۔ پس مولانا کی یہ قسم کمالات حقیقیہ انتہائیہ کے اعتبار سے کیونکہ مولانا کی نظر طلب ترقی کی وجہ سے کمالات مستقبلہ پر ہے ان پر نظر کر کے مولانا فرماتے ہیں کہ واللہ میں کچھ نہیں اور ہمارا اعتقاد مولانا کے ساتھ کمالات موجودہ کے اعتبار سے ہے ان پر نظر کر کے مولانا سب کچھ ہیں اور عارفین کی نظر کبھی اپنے کمالات موجودہ پر نہیں ہوا کرتی بلکہ ہر دم اس سے آگے پر

نظر رہتی ہے۔اس لیے وہ قسم کھا کر کہہ دیتے ہیں کہ ہم کچھ نہیں ہیں۔پس ان کی قسم بھی سچی اور ہمارا اعتقاد بھی سچا (دونوں میں تعارض کچھ نہیں کیونکہ تناقض کے لیے وحدت موضوع بھی شرط ہے اور یہاں موضوع مختلف ہے ۱۲)

بلکہ اگر ان کو تمام کمالات ممکنۃ الحصول حالیہ واستقبالیہ بھی حاصل ہو جائیں جس سے ترقی بھی ممکن نہ ہو تب بھی چونکہ ان کی نظر کمالات حق پر ہوتی ہے ان کے اعتبار سے پھر بھی وہ قسم کھا کر یہی کہتے ہیں کہ ہم کچھ نہیں۔

اس تقریر سے ان کا شبہ جاتا رہا اور بہت خوش ہوئے۔معتقد کا شبہ تو ذرا سے اشارے میں رفع ہو جاتا ہے مگر افسوس اس مخالف کی بدحالی پر ہے جو سمجھانے سے بھی نہ سمجھا اور یہی کہتا رہا کہ آپ کی معتقدانہ تاویلات ہیں ہم تو مولانا کو سچا سمجھتے ہیں۔

پٹھانوں کی سادگی

اگر یہ بات اس نے بھولے پن سے کہی ہوتی تو زیادہ افسوس نہ ہوتا جیسے ریاست رام پور میں جو پٹھانوں کی بستی ہے ایک بزرگ تشریف لے گئے' لوگوں میں ان کی بزرگی کی شہرت ہوئی تو ایک خان صاحب ملنے آئے اور کہنے لگے کہ میں نے حضور کی بہت تعریف سنی تھی اس لیے زیارت کا اشتیاق ہوا۔بزرگ نے فرمایا کہ یہ لوگوں کا حسن ظن ہے میں تو کچھ بھی نہیں ایک نالائق بندہ ہوں تو وہ خان صاحب کہنے لگے کہ جب آپ نالائق ہیں تو میں جاتا ہوں میں خواہ مخواہ زیارت کو آیا' نالائقوں کی زیارت سے کیا فائدہ؟ یہ کہہ کر چلتے ہوئے۔

راستہ میں ایک دوست ملے ان سے پوچھا کہاں جاتے ہو' کہا فلاں بزرگ صاحب تشریف لائے ہیں ان کی زیارت کو جاتا ہوں۔انہوں نے کہا کہ وہ تو نالائق آدمی ہیں ان سے مل کر کیا لوگے؟ دوست نے کہا توبہ کرو توبہ! وہ تو بڑے بزرگ ہیں' کہا میاں وہ تو اپنی زبان سے خود اپنے کو نالائق کہتے ہیں' دوست نے کہا کہ بزرگ اپنے کو یوں ہی کہا کرتے ہیں' کہا اچھا یہ بات ہے تو چلو ہم بھی چلیں گے۔وہ خان صاحب پھر آئے اور کہا کہ حضور مجھ سے غلطی ہوئی میرا خطا معاف کیجئے' مجھے معلوم نہ تھا کہ بزرگ جھوٹ بھی بولا کرتے ہیں۔خواہ مخواہ اپنے کو نالائق کہہ دیتے ہیں اور واقع میں نالائق نہیں ہوتے۔میں نے تو یہ سنا تھا کہ بزرگ سچ بولا کرتے ہیں تو جب آپ نے یہ کہا کہ میں تو نالائق بندہ ہوں میں نے اس کو بھی سچ سمجھا اس لیے اٹھ کر چلا گیا۔اس پر دوسرے صاحب نے بزرگ سے کہا کہ حضرت یہ بھولے سیدھے پٹھانوں کی بستی ہے۔یہاں

ایسی باتیں نہ کہئے یہ تواضع اور فنا کو کچھ نہیں جانتے تو اس پٹھان نے تو بھولے پن سے یہ بات کہی تھی اس لیے اس پر افسوس نہیں مگر اس مخالف نے تو جان بوجھ کر حقیقت سمجھ کر محض عناد سے وہ بات کہی تھی اس کی حالت زیادہ افسوسناک ہے۔ غرض بزرگوں کے ایسے کلمات سے دھوکہ نہ کھانا چاہیے اگر وہ اپنے کو ناقص کہیں تو تم ان کو اپنے اوپر قیاس نہ کرو۔ مولانا فرماتے ہیں:

جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد　　کم کسے زا بدال حق آگاہ شد

گفت اینک مابشر ایشاں بشر　　ماوایشاں بستہ خوابیم وخود

(تمام جہان اس سبب سے گمراہ ہوا کہ کوئی شخص ابدال حق سے آگاہ نہیں ہوا اور کہا ہم بھی بشر ہیں یہ بھی بشر ہیں ہم اور یہ خواب وخورد ونوش میں مقید ہیں)

ایں ندانستند ایشاں از عمی　　درمیاں فرقے بود بے منتہا

(انہوں نے اندھا پن سے یہ جانا کہ ہمارے اور ان کے درمیان بے انتہا فرق ہے، ان کا نقصان ہمارے کمال سے بھی افضل ہے)

کار پاکاں راقیاس از خود مگیر　　گرچہ ماند در نوشتن شیر وشیر

(بزرگوں کے افعال اپنے اوپر قیاس مت کرو اگرچہ دونوں کے فعل یکساں ہیں جس طرح لکھنے میں شیر اور شیر یکساں ہیں)

اور فرماتے ہیں:

گر خطا گوید ورا خاطی مگو　　در شود پرخوں شہید آں رامشو

خون شہیداں راز آب اولیٰ ترست　　ایں خطا از صد صواب اولیٰ ترست

(اگر خطا کہے اس کو خطا کرنے والا مت کہو اگر شہید خون میں لتھڑا ہوا ہو اس کو غسل مت دو شہید کا خون پانی سے بہتر ہے یہ خطا سو صواب سے بہتر ہے)

ان سے اگر واقع میں بھی خطا تب بھی وہ ہمارے صواب سے بہتر ہے کیونکہ ان میں ایسی استعداد موجود ہے جس سے انکی خطا بھی نورانی ہوتی ہے اور ہمارے اندر ایسی ظلمت ہے جس سے ہمارا صواب بھی ظلمانی ہوتا ہے اس کی استعداد کی یہ حالت ہے: ”یَکَادُ زَیْتُهَا یُضِیُٔ وَلَوْلَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ“ (اس کا تیل اگر اس کو آگ بھی نہ چھوئے تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود بخود جل اٹھے گا نور علی نور ہے) ان کے زیت میں اگر آگ لگے گی تو نور علی نور ہوگا جس کی شان ہوگی۔

"وَجَعَلْنَا لَهُ نُوْرًا يَمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ" (اور ہم نے اس کو ایسا نور دیا کہ وہ اس کو لئے ہوئے آدمیوں میں چلتا پھرتا ہے) اور ہمارا زیت ایسا چکنا ہوتا ہے کہ جس میں اول تو آگ لگنے کی امید ہی نہیں اور اگر لگے گی بھی تو محض ایک ضعیف نور ہوگا جو ظلمت کے ساتھ آمیختہ ہوگا۔ پس بزرگوں کو اپنے نقص کا اعتراف کرتے ہوئے دیکھ کر ناقص سمجھنا اور اپنے برابر خیال کرنا سخت غلطی ہے۔

بزرگوں کے نقص کی مثال

صاحبو! وزارت بھی بادشاہت کے اعتبار سے کم درجہ پر ہے مگر کانسٹیبلی سے تو افضل ہے۔
مولانا اسی کو فرماتے ہیں:

آسماں نسبت بہ عرش آمد فرود لیک بس عالی ست پیش خاک تود

(اس کا تیل اگر اس کو آگ بھی نہ چھوئے تا ہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود بخود جل اٹھے گا نور علی نور)

بزرگوں کا نقص ایسا ہے جیسے آسمان عرش کے سامنے کم ہے مگر یقیناً آسمان زمین وغیرہ سے تو بڑا ہی ہے۔ ہمارے کمالات کمالات ارضیہ ہیں اور ان کے کمالات سماویہ ہیں جو کمالات الٰہیہ عالیہ متعالیہ سے ضرور کم ہیں مگر ہمارے کمالات سے بدرجہا افضل و اکمل ہیں اس لیے ہم کو ان سے استغناء نہیں ہوسکتا کیونکہ جس کو زمین سے عرش پر جانا مقصود ہوا اسے آسمان کو ضرور طے کرنا پڑے گا۔ صاحب اہل اللہ اپنے کو ناقص کیوں نہ کہیں وہ تو خدا کے راستہ کو طے کر رہے ہیں جس کی حالت یہ ہے:

اے برادر بے نہایت در گہیست ہر چہ بروئے مے رسی بروئے مایست

(بھائی بے نہایت دربار ہے جس مقام پر پہنچی اس مقام پر نہ ٹھہرو باطنی حالت میں ترقی کرو)

ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ علوم دنیا میں بھی جو لوگ صاحب کمال ہیں وہ بھی اپنے کو ناقص ہی کہتے ہیں۔ حالانکہ وہ ایک محدود کمال ہے جو ممکن الحصول ہے مگر اس کا بھی حقیقی درجہ بہت عالی ہے۔ اس پر نظر کر کے ہر کامل اپنے کو ناقص ہی کہتا ہے۔ دیکھئے حکیم عبدالمجید خان اور حکیم محمود خان اپنے فن میں کیسے کامل تھے کہ واقعی ان کو طب کا امام کہنا چاہیے مگر کوئی ان سے پوچھتا تو وہ یہی کہ ہم کو کیا کمال حاصل ہے کچھ بھی نہیں۔ تو کیا ان کے اس کہنے سے آپ یہ سمجھ لیں گے کہ وہ بھی ایسے ہی ناقص ہیں جیسے ہم ناقص ہیں اور دونوں برابر ہو گئے اور کیا یہ سمجھ کر آپ ان سے علاج کرانا چھوڑ دیں گے ہرگز نہیں بلکہ آپ ان کی اس بات کا یہی مطلب سمجھیں گے یہ اپنے کو طب کے حقیقی کمال پر نظر کر کے جو ان کے نزدیک جالینوس و بقراط وغیرہ کو حاصل تھا (گو یہ لوگ بھی اپنے کو حقیقی کمال سے قاصر ہی سمجھے تھے ۱۲) ناقص کہہ رہے ہیں مگر اس زمانہ میں تو یہ اس فن کے امام اور سب سے زیادہ

ہی کامل ہیں۔ افسوس دنیا کے کاموں میں تو لوگوں کو بہت جلدی عقل آ جاتی ہے اور کاملین دنیا اپنے کو ناقص کہیں تو اس سے کسی کو دھوکہ نہیں ہوتا نہ ان سے کوئی اپنے کو مستغنی سمجھتا ہے مگر دین کے باب میں نہ معلوم لوگوں کی عقل کہاں جاتی رہتی ہے اور یہاں ان کو یہ دھوکہ کیوں پیش آتا ہے۔

صاحب کمال کی علامت

یاد رکھو جو صاحب کمال ہوگا وہ کبھی اپنے کو صاحب کمال نہ کہے گا ہمیشہ اپنے کو ناقص ہی کہے گا کیونکہ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں وہ اس اپنے علم کی وسعت ولا متناہی اور گہرائی سے آگاہ ہے اس پر نظر کر کے وہ اپنے کمال کو بھی کمال نہیں کہہ سکتا اور جن کو آپ مدعی کمال دیکھتے ہیں ان کو کمال کی ہوا بھی نہیں لگی، دعویٰ کمال اکثر ناقصین ہی کیا کرتے ہیں اہل اللہ کبھی دعویٰ نہیں کر سکتے نہ اپنے کو صاحب کمال کہہ سکتے ہیں یہ اور بات ہے کہ کبھی تحدث بالنعمۃ کے طور پر خدا کی نعمتوں کا بیان کر دیں مگر اس وقت بھی ان میں دعویٰ کی شان ہرگز نہیں ہوتی بلکہ عبدیت اور عجز وفنا کی شان غالب ہوتی ہے چونکہ بعض لوگوں کو کاملین کے اعتراف نقص سے دھوکہ ہو جاتا ہے اس لیے میں نے تفصیل کے ساتھ اس شبہ کو دفع کر دیا کیونکہ اس چودھویں صدی کے بہت لوگ ذہین ہونے لگے ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ جیسے چودھویں رات کا چاند کامل ہوتا ہے ایسے ہی چودھویں صدی کے لوگ بھی کامل ہیں۔ واقعی کامل تو ہیں مگر اس میں کلام ہے کہ کامل کاہے میں ہیں دنیا کی ذہانت میں تو واقعی کامل ہیں مگر دین کی ذہانت میں کامل نہیں ہیں۔ آج کل کے آدمیوں کی عقل دنیا کے کاموں میں خوب چلتی ہے مگر دین میں کچھ نہیں چلتی۔ (بس یوں کہنا چاہیے کہ آج کل مادیت کی ترقی اور روحانیت کا تنزل ہے ۱۲ جامع) یہی وجہ ہے کہ اس وقت عام طور پر دین سے غفلت ہے اور تکمیل دین کا کسی کو اہتمام نہیں اسی لیے مسائل دین پر بھی توجہ نہیں کیونکہ مسائل دین کی ضرورت تو اس کو ہو جسے اپنا دین کامل کرنا ہو جیسے مسائل طب کی ضرورت اس کو ہے جسے تکمیل صحت مطلوب ہو مگر آج کل صحت جسم تو لوگوں کو مطلوب ہے صحت قلب مقصود نہیں تو پھر ان کو مسائل دین پر توجہ کیوں ہو۔ دیہاتیوں کو کیا کہا جائے وہ تو اپنے ہل پاتھوں میں ایسے مشغول ہیں کہ مسائل دین کے جاننے کی بھی ان کو فرصت نہیں عمل تو کیا ہی کرتے مگر جو لوگ تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں جو تقریریں کرتے اور لیکچر دیتے پھرتے ہیں جن کو کتب بینی اور سیاست دانی بلکہ ہمہ دانی کا بھی دعویٰ ہے مسائل دین سے وہ بھی بالکل ناواقف ہیں۔

لیڈران قوم کو مسائل نماز بھی معلوم نہیں

چنانچہ ایک جنٹلمین میرے ساتھ تھے وہ تھانہ بھون میں جوان کا اصلی وطن تھا فرض رباعی کی جماعت میں دو رکعت کے بعد بیٹھ گئے۔ امام نے تو تیسری رکعت کا قیام کیا اور انہوں نے نماز ختم کر دی' لوگوں نے بعد میں اس حرکت کی وجہ پوچھی تو کہا میں مسافر ہوں اس لیے میں نے قصر کیا ہے۔ سبحان اللہ اول تو وطن اصلی میں پہنچ کر سفر کیسا پھر وہ بھی امام مقیم کے پیچھے۔ اسی طرح ایک صاحب ہمیشہ حضر میں قصر کیا کرتے تھے اور یہ وجہ بتلاتے کہ حدیث میں ہے:

حضرات اہلحدیث اور حدیث النفس

"کن فی الدنیا کانک غریب اوعابر سبیل"[1] (دنیا میں مسافر یا رہگذر کی طرح رہ) اور ہم اس کے موافق عمل کرتے ہیں تو ہم ہر وقت مسافر ہی رہتے ہیں گو وطن کے اندر ہی کیوں نہ ہوں ایسے لوگ اپنے کو اہل حدیث کہتے ہیں اور ان کو استدلالات سوجھا کرتے ہیں۔ مولانا قاری عبدالرحمٰن صاحب پانی پتی ایسوں کے نسبت فرماتے تھے کہ یہ لوگ اہل حدیث تو ہیں مگر حدیث سے مراد حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں بلکہ حدیث النفس ہے یہ لوگ حدیث النفس کا اتباع کرتے ہیں واقعی اکثر تو ایسے ہی ہیں۔ میں سب کو نہیں کہتا بھلا ان حضرات سے کوئی یہ پوچھے کہ تم نے اس حدیث پر عمل کر کے نماز میں تو قصر کیا۔ دنیا کے کاموں میں بھی تو قصر کیا ہوتا' مسافر کے ساتھ سفر میں نہ پلنگ ہوتا ہے نہ تخت نہ میز ہے نہ کرسی نہ کپڑوں کے دس بیس جوڑے ہوتے ہیں نہ زمین جائیداد ساتھ ہوتی ہے نہ مکان ذاتی ہوتا ہے تو تم نے ان چیزوں میں بھی تو قصر کیا ہوتا مگر ان میں کوئی اختصار نہیں کیا جاتا پس تمہارا یہ دعویٰ غلط ہے کہ ہم حدیث "کن فی الدنیا کانک غریب اوعابر سبیل"[2] (دنیا میں مسافر یا رہگذر کی طرح رہو) پر عمل کرتے ہیں (اور اگر کوئی دنیا کے کاموں میں بھی اختصار کر دے تب بھی اسے اس حدیث سے قصر صلوۃ فی الحضر (حضر میں قصر) پر استدلال کرنے کی گنجائش نہیں کیونکہ کن فی الدنیا (دنیا میں رہ) کی قید صراحتہً موجود ہے جس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے کاموں میں مسافر کی طرح رہنے کا امر فرما رہے ہیں نہ کہ دین کے کاموں میں' دوسرے آپ نے یہ تو نہیں فرمایا "کن فی الدنیا مسافرا" (دنیا میں مسافر رہ) بلکہ کانک مسافر (گویا تو مسافر ہے) فرمایا ہے اور (قصر کی اجازت مسافر حقیقی کو ہے نہ کہ مماثل مسافر کو خوب سمجھ لو ۱۲ جامع)

---

[1] (الصحیح للبخاری ۸: ۱۱۰' مشکوٰۃ المصابیح: ۵۲۷۴)
[2] (الصحیح للبخاری ۸: ۱۱۰' مشکوٰۃ المصابیح: ۵۲۷۴)

کھیت میں نماز کا قصر

ایک صاحب کی حکایت سنی ہے کہ جب وہ اپنے گھر سے جنگل میں جاتے، کھیت پر جاتے تو قصر کیا کرتے اور کہتے کہ قرآن میں "اِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلٰوۃِ" (اور جب تم زمین میں سفر کرو سو تم کو اس میں کوئی گناہ نہ ہوگا کہ تم نماز کو کم کردو) مطلق آیا ہے اس میں مطلقاً زمین میں چلنے پر قصر کی اجازت دی گئی ہے تین دن یا چار دن کی مسافت کا کچھ ذکر نہیں۔ یہ بھی کوئی اہل حدیث ہی میں سے تھے۔ مولانا سخاوت علی صاحب جونپوری نے فرمایا تھا کہ پھر جنگل اور کھیت ہی میں جا کر قصر کیوں کرتے ہو بلکہ گھر سے محلّہ کی مسجد میں آ کر قصر کیا کرو کیونکہ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ (اور جب تم زمین میں سفر کرو) تو اس پر صادق ہے۔ یہ فہم اور دین رہ گیا ہے۔ کچھ نہیں بس یہ لوگ ضربتم (تم کو پیٹا جائے) بصیغہ مجہول کے مستحق ہیں۔ پھر غضب یہ ہے کہ اس فہم پر یہ لوگ اپنے کو تعلیم یافتہ سمجھتے ہیں۔ پس جس نے ایک دو کتابیں ادب تاریخ کی دیکھ لیں وہ بھی اپنے کو عالم سمجھتا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ جنٹلمینوں نے انگریزی پڑھنے کو بھی علم میں شمار کرلیا ہے اور جتنے فضائل احادیث میں علم کے وارد ہیں انگریزی تعلیم پر بھی ان کو جاری کرتے ہیں اور اس کے متعلق یہ حضرات ایک حدیث بھی پیش کرتے ہیں "اطلبوا العلم ولو بالصین"[1] (علم کو طلب کرو اگرچہ چین میں ہو ۱۲) وہ کہتے ہیں کہ دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چین سے بھی طلب علم کی ترغیب دی ہے حالانکہ اس وقت چین میں دین کا علم بالکل نہ تھا بلکہ محض دنیوی علم تھا معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مطلق علم کی ترغیب دے رہے ہیں خواہ دنیا کا علم ہو یا دین کا پس انگریزی بھی علم ہے اور اس حدیث کے تحت میں داخل ہے ان لوگوں کو اول تو اس حدیث کا ثبوت دینا چاہیے۔ ان الفاظ سے یہ حدیث محدثین کے نزدیک ثابت ہی نہیں۔

(قلت ذکر له فی المقاصد طریقین وقال ابن حبان انه باطل لا اصل له واخرجه ابن الجوزی فی الموضاعات ۱ ص ۳۰ قال واخرجه البیهقی فی الشعب قلت وقدالتزم ان لا یخرج موضوعا فالا شبه الحکم علیه بالضعف والضعیف لایحتج به فی الاحکام ۱۲ جامع)

(مقاصد میں دو طریق سے اس کو بیان کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث دو وجہ سے ضعیف ہے ابن حبان نے کہا ہے کہ یہ باطل بے اصل ہے۔ ابن جوزی نے کہا کہ یہ ضعیف احکام اس کو حجت میں پیش نہیں کیا جا سکتا)

---

[1] (کنز العمال: ۲۸۶۹۷، اتحاف السادۃ ۱: ۹۸)

اور اگر ثابت بھی ہوتب بھی ان لوگوں کا مدعا حاصل نہیں ہوتا کیونکہ انہوں نے لفظ ولو پر نظر نہیں کی۔ یہ لفظ فرض کے لیے آتا ہے مطلب یہ ہے کہ اگر بالفرض چین میں بھی علم ہو تو وہاں سے بھی کوشش کر کے حاصل کرنا چاہیے اور فرض اسی چیز کو کیا جاتا ہے جو معدوم یا مستبعد ہو موجود کو فرض نہیں کیا جاتا اور دنیوی علم کا چین میں اس وقت موجود ہونا آپ کو مسلم ہے تو اس کو لفظ ولو سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد اس حدیث میں وہی علم ہے جو چین میں اس وقت موجود نہ تھا اس لیے بطور فرض کے فرما رہے ہیں کہ اگر وہاں بھی ہو تو حاصل کرو اور وہ علم دین ہی ہے ورنہ اگر علم کو ایسا عام کیا گیا کہ دنیوی علم بھی اس میں داخل ہو جائیں تو پھر ایک بھنگی اور چمار کو بھی عالم کہنا چاہیے کیونکہ اس کو بھی دنیا کا ایک علم حاصل ہے جو کام وہ کرتا ہے اس کو وہ خوب جانتا ہے اگر آپ ان کاموں کو بھی علم میں داخل کر لیں گے تو پھر آپ کی خاطر سے ہم انگریزی کو بھی اس میں داخل کر لیں گے اور خیر جانے دیجئے ہم لفظ ولو سے بھی استدلال نہیں کرتے مگر ہم کہتے ہیں: "اطلبوا العلم ولو بالصين"[1] (علم کو طلب کرو اگرچہ چین میں ہو) میں تو تصریح نہیں کہ اس سے کونسا علم مراد ہے اب شریعت کی دوسری نصوص سے اس کو دریافت کیا جاوے۔

علم شرعی کا مفہوم

بس علم شرعی وہ ہے جس کو شریعت علم کہتی ہے جس کے جاننے والوں میں ایک شیخ سعدی بھی ہیں وہ فرماتے ہیں:

علمے کہ رہ بحق نماید جہالت است

(جو علم حق کا راستہ نہ دکھائے وہ جہل ہے)

دنیائے ملعونہ

اور حدیث میں ہے: "الدنيا ملعونة ومافيها ملعون الاذكر الله وما والاه الحديث" (دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے ملعون بجز ذکر اللہ کے اور وہ چیز جو ذکر کو قریب کرے) معلوم ہوا کہ جو چیز خدا کی طرف قریب نہ کرے وہ دنیا ملعونہ ہے۔ اس میں ایسے علوم بھی داخل ہیں، اب میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ کیا سائنس اور جغرافیہ اور انگریزی زبان سے خدا کی طرف قرب ہوتا ہے؟ وصل ہوتا ہے یا فصل قرب ہوتا ہے یا بعد۔ مشاہدہ ہے کہ ان سے بعد ہی بڑھتا ہے گو چاہیے تو یہ تھا کہ سائنس سے اور خدا کی طرف قرب بڑھتا کیونکہ اس سے قدرت

---

[1] (کنز العمال: ۲۸۶۹۷، اتحاف السادة ۱: ۹۸)

صانع کا انکشاف زیادہ ہوتا ہے اور اپنا عجز زیادہ مشاہدہ ہوتا ہے کیونکہ اہل سائنس رات دن ترقی کی فکر میں رہتے ہیں اس لیے ان کے مقاصد بہت وسیع ہیں جن میں کثرت سے ایسے مقاصد بھی ہیں جو عرصہ تک پورے نہیں ہوتے' زمانہ دراز تک ان میں ناکامی رہتی ہے۔ بخلاف ہمارے مقاصد کے کہ وہ معدودے چند ہیں جو اکثر پورے ہوجاتے ہیں مگر ہم پھر بھی اپنے عجز کے معترف ہیں اور ان لوگوں کے زیادہ مقاصد ناکام رہتے ہیں جو کھلی دلیل ہے عجز کی مگر یہ لوگ باوجود مشاہدہ عجز زائد کے پھر بھی اپنے کو قادر کہتے ہیں وجہ یہ کہ یہ لوگ اپنے عجز پر نظر نہیں کرتے بس عرصہ کے بعد جو کسی مقصود میں کامیابی ہوگئی اس پر نازاں ہوتے ہیں کہ ہم نے یہ ایجاد کر لی' ڈلے پتھر اتجاد کر لی۔ اگر ایجاد تمہارے اختیار میں تھی تو پہلے ہی دن کیوں نہ ایجاد کر لی۔ تمہارا کام صرف اتنا ہے کہ سوچو اور غور کرو' باقی ذہن میں ایجاد کا صحیح طریق آ جانا یہ تمہارے اختیار سے بالکل خارج ہے۔ یہ محض حق تعالیٰ کے قبضے میں ہے مگر عادت الٰہیہ یہ ہے کہ جب کسی بات کے لیے انسان غور وفکر کرتا ہے تو وہ اکثر راستے کھول دیتے ہیں اور بعض دفعہ اپنی قدرت ظاہر کرنے کے لیے ہزار غور وفکر کے بعد بھی حقیقت ظاہر نہیں کرتے۔ چنانچہ اب تک کسی کو یہ بات معلوم نہیں ہوئی کہ مقناطیس لوہے کو کیوں جذب کرتا ہے اور ایسی نظائر بکثرت موجود ہیں اگر غور وفکر کے بعد حقیقت تک پہنچ جانا تمہارے اختیار میں ہے تو ان چیزوں کی حقیقت کا انکشاف کیوں نہ کر لیا' غرض تجربے سے یہ بات مشاہد ہے کہ کچھ عوارض کہ بمنزلہ لوازم کے ہیں ایسے جمع ہورہے ہیں کہ سائنس اور جغرافیہ سے قرب خداوندی نہیں بڑھتا بلکہ بعد ہی میں ہوتا ہے تو یہ علم شرعی میں داخل نہیں ہوسکتے اور نہ ان کے جاننے سے دین کا علم حاصل ہوسکتا ہے ہاں ایسے لوگوں کو ایسے علم دین ضرور حاصل ہوجاتا ہے۔

ایک لیڈر کا تیمّم

جیسے ایک لیڈر کا قصہ ہے جو آج کل مسلمانوں کے مقتدا بنے ہوئے ہیں کہ کسی جگہ نماز کا وقت آ گیا اور پانی نہ تھا۔ تیمّم کی ضرورت ہوئی تو لیڈر صاحب نے اس طرح تیمّم کیا کہ اول تو مٹی کو ہاتھوں پر بہایا جیسے پانی کو بہایا کرتے ہیں پھر کلی کرنے کے واسطے منہ میں مٹی دی' شاید اس کے بعد وہ دو ہتڑ بھر کر منہ پر بھی ڈالتے اور مسح کے لیے سر پر بھی ڈالتے اور پیروں پر بھی مٹی بہاتے مگر منہ میں مٹی دیتے ہوئے بعض لوگ ہنس پڑے اس لیے وہ آگے نہ بڑھ سکے۔ بس انگریزی پڑھ کر ایسا علم آتا ہے کہ عقل خاک میں مل جاتی ہے بھلا اگر وہ کسی سے پوچھ ہی لیتے کہ تیمّم کا طریقہ کیا

ہے تو اس میں کچھ حرج تھا مگر پوچھتے کس طرح لیڈر ہو کر اپنی جہل کو یوں ظاہر کریں، گومتی سے کلی کر کے اس سے زیادہ جہل ظاہر کر دیا اور مزا یہ کہ ظہور جہل کے بعد بھی وہ قوم کے لیڈر ہی رہے۔ یہ حالت قوم کی ہے کہ اس جہل پر بھی ان کو مقتدا ہی بنائے رکھا۔

موٹر میں بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز نہیں

ان ہی حضرات کا یہ واقعہ بھی ہے کہ ایک دفعہ موٹر میں سوار تھے نماز کا وقت آ گیا، موٹر ٹھہرایا گیا اور اسی میں بیٹھے بیٹھے نماز پڑھ لی حالانکہ سامنے سڑک پر ایک طرف کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکتے تھے مگر انہوں نے موٹر کے اندر ہی بیٹھ کر پڑھی۔ بھلا موٹر میں ترک قیام کس طرح جائز ہو گیا جبکہ موٹر کھڑا ہوا تھا۔ چلتی ریل میں تو اگر گرنے کا اندیشہ ہو تو بیٹھ کر نماز کی گنجائش بھی ہے مگر موٹر میں تو چلتے ہوئے بھی ترک قیام کی گنجائش نہیں کیونکہ اس کا ٹھہرا لینا ہر وقت ہمارے اختیار میں ہے اور ریل کا ٹھہرانا ہمارے اختیار میں نہیں اور اگر موٹر کھڑا ہوا ہو تب تو کسی طرح ترک قیام کی گنجائش ہی نہیں مگر ان لوگوں نے تو محض لیڈر بننے کے لیے نماز شروع کی ہے اس لیے نماز بھی لیڈری ہوتی ہے۔ شرعی نماز کی ان کو کیا ضرورت ہے۔

عاجزی کا نفع

گو ایسی غلطیاں دیہاتیوں سے بھی ہوتی ہیں اور ان کو بھی مسائل کا علم نہیں مگر وہ اپنے کو تعلیم یافتہ تو نہیں کہتے نہ علم کا دعویٰ کرتے ہیں بلکہ بیچارے اپنے جہل کا اقرار کرتے ہیں تو گو ان سے بھی علم دین سے غفلت کرنے پر کچھ مواخذہ ہو مگر شاید ان کے عجز و نیاز کی وجہ سے ان کے ساتھ رحمت کا معاملہ ہو جائے چاہے تھوڑی سی سزا کے بعد ہی سہی حق تعالیٰ کو عاجز پر بہت رحم آتا ہے اس لیے بعض دفعہ گنہگاروں کو ان کی عاجزی پر بخش دیا جاتا ہے اور دعوے کے ساتھ سارا علم اور تصوف اور تقویٰ بھی دھرا رہ جاتا ہے۔ چنانچہ ایک شخص نے جن کا نام گلاب خان تھا نیک اور صاحب علم تھے مجھ سے ایک طویل خواب دیکھنا بیان کیا، جز و مقصود اس کا بیان کرتا ہوں یہ دیکھا کہ میدان قیامت قائم ہے اور حق تعالیٰ ایک ایک کا حساب لے رہے ہیں اور یہ حساب مختلف کتابوں کے امتحان کے رنگ میں ہے اور عرش پر حق تعالیٰ کی تجلی ہے اور عرش کے ایک گوشہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بھی تشریف فرما ہیں۔ میں بہت ڈر رہا ہوں کہ میرا بھی حساب ہو گا، اتنے میں کسی شخص کا امتحان ہوا اور اس پر بہت خفگی ہوئی اور ایسی غضب ناک آواز میں خفگی محسوس ہوئی کہ رعد کی کوئی حقیقت نہیں، میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ کچھ مدد فرمایئے ارشاد ہوا

خفگی کے وقت میں کیا کروں جب میں نے دوبارہ عرض کیا تو ارشاد فرمایا تم یوں کہہ دینا کہ میں تو پڑھا ہوا نہیں چنانچہ مجھ کو پکارا گیا کہ جلالین میں (غالباً) امتحان دو میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ میں تو پڑھا ہوا نہیں' اس پر تبسم فرمایا اور ارشاد ہوا کہ اچھا ایک دن کی قید (جو اوروں کی سزا سے بہت خفیف تھی) اور اس سزا کے بعد بھی بہت جلد نجات بھی دیکھی۔ یہ تو عاجز کے ساتھ معاملہ تھا۔

اسباب میں فی نفسہ کوئی تاثیر نہیں

اب دعویٰ کا حال سنئے حضرت بایزید بسطامی کا قصہ ہے کہ ان کو کسی نے بعد وفات کے خواب میں دیکھا' پوچھا آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا۔ فرمایا مجھ سے سوال ہوا تھا کہ ہمارے واسطے کیا لائے' میں نے سوچا کہ اور اعمال تو میرے ناقص ہیں ان کا تو کیا نام لوں' البتہ میں مسلمان ہوں اور بحمداللہ توحید میری کامل ہے اس کو پیش کردوں۔ چنانچہ میں نے عرض کیا کہ توحید لایا ہوں ارشاد ہوا "ماتذکر لیلة اللبن" (وہ دودھ والی رات بھی یاد نہیں رہی) یہ ایک واقعہ کی طرف اشارہ تھا کہ ایک رات حضرت بایزید نے دودھ پیا تھا اس کے بعد پیٹ میں درد ہوگیا تو آپ کے منہ سے نکل گیا کہ دودھ پینے سے پیٹ میں درد ہوگیا اس پر مواخذہ ہوا کہ تم نے درد کو دودھ کی طرف منسوب کیا۔ یہی توحید ہے دودھ کی کیا ہستی ہے کہ کچھ تاثیر کرسکتے۔ اسباب میں فی نفسہ کچھ تاثیر نہیں یہ تو محض علامات و امارات ہیں۔ مؤثر حقیقت میں حق تعالیٰ ہیں اور گو آثار کی نسبت اسباب کی طرف کردینا شرعاً جائز ہے مگر کاملین سے بعض مباحات پر بھی مواخذہ ہوتا ہے کیونکہ ان کی نظر حقیقت پر ہوتی ہے پھر وہ اسناد مجازی کا استعمال کس لیے کرتے ہیں ان کو ہمیشہ اسناد حقیقی کا لحاظ کرنا چاہیے اور اسباب کی طرف مسببات کی اسناد حقیقی نہیں ہوسکتی ان کی تو حالت مشاہدہ کی یہ ہے:

نیارد ہوا تانگوئی بیار زمین نادرد تانگوئی بیار

(جب آپ ہوا سے یہ نہ کہیں کہ برس اس وقت تک ہوا نہیں برساتی)

اسباب بدون حکم کے کچھ نہیں کرسکتے عارف کا تو مذاق یہ ہوتا ہے۔

گر گزندت رسد زخلق مرنج کہ نہ راحت رسد زخلق نہ رنج

از خدادان خلاف دشمن دوست کہ دل ہر دودر تصرف اوست

(اگر مخلوق سے تجھ کو کوئی تکلیف پہنچے تو رنجیدہ نہ ہو اس لیے کہ مخلوق سے نہ راحت پہنچ سکتی ہے نہ رنج دوست اور دشمن کے خلاف کو خدا کی طرف سے جان کیونکہ دونوں کے دل اللہ تعالیٰ کے تصرف میں ہیں)

جس کا یہ مذاق ہو اور جس پر یہ حقیقت منکشف ہو چکی ہو اس کی زبان سے یہ بات کیونکر نکل سکتی ہے کہ دودھ سے پیٹ میں درد ہو گیا۔

حق تعالیٰ شانہ کے سامنے اسباب کی مثال

مولانا اسی باب میں فرماتے ہیں:

انت کالریح ونحن کالغبار یختفی الریح وغبر اھا جھار

ماہم شیران و لے شیر علم

جملہ شان از باد باشد دمبدم

آن کہ ناپیداست ہرگز کم مباد

(اے ازدل مادل ۱۲) یعنی حق تعالیٰ کے سامنے اسباب کی ایسی مثال ہے جیسے ہوا کے سامنے غبار ہوتا ہے۔ ظاہر میں غبار اڑتا ہوا نظر نہیں آتا' ہوا نظر نہیں آتی۔ مگر ظاہر ہے کہ غبار کی حرکت جو کچھ ہے وہ ہوا ہی کی وجہ سے ہے۔ آگے فرماتے ہیں کہ ہم بھی ظاہر میں شیر کی طرح حملہ کرتے ہیں مگر ایسے شیر ہیں جیسے جھنڈے پر شیر کی تصویر بنی ہوئی ہے کہ جب ہوا چلتی ہے تو وہ حملہ آور معلوم ہوتا ہے مگر حملہ تو ظاہر ہے اور ہوا جس سے ان کی حرکت اور حملہ کا وجود ہوا ہے مخفی ہے اسی طرح ہم جو کچھ بھی کرتے ہیں اس کا منشاء حق تعالیٰ کی مشیت ہے مگر ارادہ حق مخفی ہے اور ہمارے اعمال ظاہر ہیں اس لیے لوگوں کو دھوکہ ہو جاتا ہے کہ وہ اسباب کو فاعل کہہ دیتے ہیں۔ مولانا چونکہ ادب سے بھرے ہوئے ہیں اس لیے آگے ان تشبیہات و تمثیلات سے استغفار کرتے ہیں کیونکہ حق تعالیٰ کے لیے کوئی تشبیہ حقیقی نہیں ہو سکتی سب ناقص مثالیں ہیں۔ اس لیے فرماتے ہیں:

اے بروں از وہم و قال و قیل من خاک برفرق من تمثیل من

مثنوی کی ظاہری فصاحت و بلاغت

سبحان اللہ مولانا کو کیسے عمدہ الفاظ ملتے ہیں۔ مثنوی میں معنوی خوبی تو ہے ہی ظاہری بلاغت وفصاحت بھی بہت اعلیٰ پایہ کی ہے۔ آگے ان تشبیہوں کا عذر بیان کرتے ہیں کہ جب یہ مثالیں ناقص ہیں تو پھر ان کو بیان ہی کیوں کیا جاتا ہے تو اس کی وجہ بتلاتے ہیں:

بندہ نہ شکیبد زتصویر خوشت ہردمت گوید کہ خانم مفرشت

یعنی بندہ کو آپ کی خوشنما تصویریں بیان کرنے سے صبر نہیں آتا کیونکہ آپ کو دیکھ تو سکتے نہیں پھر کیا آپ کے کمالات کو بھی نہ سمجھیں اور آپ کی صفات سے بھی مزے نہ لیں اور اس کے

لیے تمثیل وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ پس گو یہ ناقص مثالیں مگر ان سے صفات کمال الٰہیہ تک کسی قدر ذہن پہنچ جاتا ہے۔ علماء ظاہر بعض دفعہ عارفین کو بے ادب کہہ دیتے ہیں کیونکہ ان کے کلام میں تمثیلات بہ کثرت ہوتی ہیں کہیں حق تعالیٰ کو ہوا سے تشبیہ دیتے ہیں کہیں دریا سے، کہیں آفتاب سے مگر حقیقت میں عارفین سے زیادہ مؤدب کوئی نہیں اور ان تمثیلات کا عذر مولانا نے بیان کر دیا ہے کہ عاشق کو محبوب کی تصویر سے صبر نہیں آتا اسے تصویر بھی پیاری ہوتی ہے حالانکہ ذات کے آگے تصویر ہے کیا چیز محض چند نقوش کا مجموعہ مگر جو عشق سے آشنا ہے وہ جانتا ہے کہ کاغذ کی تصویر ہی سے دل کو کس قدر تسلی ہو جاتی ہے۔ یہی حال عارفین کی تمثیلات کا ہے کہ وہ صفات الٰہیہ کی تصویر کے واسطے ناقص مثالوں کو ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ گو یا ظاہر میں یہ بے ادبی معلوم ہو مگر ان کا باطن عشق کی وجہ سے سراپا ادب ہے۔ مولانا اسی کو فرماتے ہیں:

بے ادب ترنیست زوکس درجہاں   باداب ترنیست روکس درنہاں

(بے ادب تر ان سے دنیا میں کوئی شخص نہیں اور باادب بھی زیادہ کوئی نہیں)

مثالوں کے بیان کرنے کا نفع

غرض مولانا نے اس مقام پر یہ ظاہر فرما دیا کہ مؤثر حقیقی حق تعالیٰ ہیں کوئی چیز مؤثر نہیں۔ اس مسئلہ کو مولانا نے تمثیلات سے بخوبی واضح کر دیا ہے اور بات یہ ہے کہ یہ مثالیں گو ناقص ہوں مگر ان سے مضمون کی توضیح خوب ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عارفین کے کلام سے مخاطب کی تسلی ہو جاتی ہے اور علماء ظاہر کے کلام سے تسلی نہیں ہوتی کیونکہ ان کو ایسی مثالیں نہیں ملتیں جن سے معقول کو محسوس بنا دیں۔ عارفین کو نہ معلوم یہ مثالیں کہاں سے مل جاتی ہیں وہ دقیق سے دقیق مضمون کو مثالوں سے ایسا واضح کر دیتے ہیں کہ بات دل میں گھس جاتی ہے۔ عارفین نے اس طرز میں عادۃ اللہ اور عادۃ الانبیاء کا اتباع کیا ہے۔ حق تعالیٰ کے کلام میں بھی مثالیں بہت ہوتی ہیں۔ چنانچہ زبور کا زیادہ حصہ امثال ہی ہیں اسی طرح انبیاء علیہم السلام اور حکماء کے اقوال میں بھی امثال بکثرت ہیں۔ جب کمال توحید کی حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کی طرف کسی فعل کی اسناد نہ کی جائے نہ حقیقی نہ مجازی بلکہ ہر فعل کی اسناد حق تعالیٰ کی طرف کی جائے تو عارف کے نزدیک یہ بات توحید کے خلاف کیوں نہ ہوتی کہ دودھ سے درد ہو گیا چونکہ حضرت بایزید عارف کامل تھے اس لیے ان سے ان کے درجہ کے موافق مواخذہ ہوا کہ یہ ہی توحید ہے جس کو تم ہمارے واسطے لائے ہو کہ دودھ کی طرف درد کی نسبت کرتے ہو۔

حضرت بایزید کی مغفرت کا سبب

حضرت بایزید یہ سن کر گھبرا گئے اور عرض کیا الٰہی میرے پاس تو کچھ بھی نہیں' ارشاد ہوا کہ
راہ پر آ گئے تو جاؤ اب ہم تم کو ایسے عمل سے بخشتے ہیں جس پر تمہارا گمان بھی نہ تھا کہ اس سے بخشش
ہو جائے گی وہ یہ کہ تم نے ایک رات ایک بلی کے بچے کو سردی میں اکڑتے ہوئے دیکھا تھا تم کو
اس پر رحم آیا اور اپنے لحاف میں لا کر سلا لیا' اس بچے نے دعا کی کہ اے اللہ اس کو بھی ایسی ہی
راحت دیجئے جیسے اس نے مجھے راحت دی' جاؤ آج ہم تم کو اس بلی کے بچے کی دعا سے بخشتے ہیں'
سارا تصوف گاؤ خورد ہو گیا' سارے مراقبے اور مجاہدے رکھے رہ گئے اور ایک بلی کے بچے کی
سفارش سے بخشے گئے۔ آپ نے دیکھا کہ ذرا سے دعوے میں حقیقت کھل گئی اور معلوم ہو گیا کہ
ہماری توحید بھی ناقص ہے وہ بھی اس قابل نہیں کہ جو خدا تعالیٰ کے سامنے پیش کی جا سکے حالانکہ
حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ واقع میں عارف کامل تھے ان میں تو محض ایک معنی کر اضافی
نقص تھا جب ان سے ذرا سے دعویٰ پر مواخذہ ہوا تو ہمارا کیا حال ہو گا۔ جہاں اضافی نقص کیا
معنے حقیقی نقص موجود ہے بلکہ سر سے پیر تک نقص ہی نقص ہے اور اس پر دعوے ایسے لمبے چوڑے
کہ اپنے کو تعلیم یافتہ اور عالم اور مقتدا اور مجتہد سب کچھ سمجھتے ہیں اور عمل کی حالت ہے کہ رات دن
گناہوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے جو دیندار بھی کہلاتے ہیں وہ کسی ایک کام کے اعتبار سے
دیندار ہیں دوسرے کاموں میں وہ دینداری کی ذرا پرواہ نہیں کرتے جیسے آج کل ڈاکٹر ہوتے
ہیں کہ کوئی آنکھ کے علاج میں ماہر ہو جاتا ہے وہ یہی کام کرتا ہے اور اسی میں مشہور ہو جاتا ہے'
آنکھ کے سوا وہ کسی عضو کا علاج نہیں کرتا۔ دوسرا دانت کے علاج میں ماہر ہے وہ اسی کا کام کرتا
ہے کوئی چیر پھاڑ کا مشاق ہے وہ زخموں ہی کا علاج کرتا ہے۔ اسی طرح ہم نے بھی دین کے
شعبوں میں انتخاب کر لیا ہے جیسے گلستان بوستان کا انتخاب کیا گیا ہے۔

مریض کو ہر عضو کا علاج ضروری ہے

حالانکہ اول تو طبیب کے لیے بھی یہ بات عیب کی ہے کہ وہ کسی خاص مرض ہی کا معالجہ کرتا
ہے' کمال جامعیت ہی میں ہے لیکن اگر وہ انتخاب کرے تو چنداں مضائقہ نہیں مگر مریض کو تو
نتخاب نہ کرنا چاہیے کہ اس کی آنکھ ناک اور ہاتھ پیر میں بیماری ہو تو ان میں سے صرف ایک کا
لاج کر لے اور باقی اعضاء کا علاج نہ کرے۔ مریض کو ایک عضو کا علاج کر کے کبھی صحت نہیں
کتی اس کو تو سارے ہی جسم کا علاج ضروری ہے ورنہ بیکار ہو جائے گا۔ ہاں اس کا مضائقہ نہیں

کہ چنداں اعضاء میں نقص ہو تو ایک کا علاج پہلے کرے دوسرے کا پیچھے۔ مگر علاج تو سارے جسم کا ہی ضروری ہے اس میں یہ انتخاب کر لینا کہ ایک کا علاج ہو ایک کا نہ ہو سخت حماقت ہے لیکن آج کل انتخاب کا بازار گرم ہے ہر چیز کا ست نکالا جاتا ہے دین کا بھی ست نکال لیا گیا مگر اس کا نتیجہ وہی ہوگا ایک شخص کی آنکھ اور ناک اور ہاتھ پیروں میں مرض تھا اور اس نے صرف آنکھ کا علاج کیا تو ظاہر ہے کہ وہ لنگڑا النجارہ جائے گا۔ اس انتخاب پر مجھے ایک حکایت یاد آئی۔

کلام پاک میں مکرر آیات کے اعتراض کا عجیب جواب

کسی مسلمان بادشاہ کے زمانہ میں ایک ملحد نے قرآن پر اعتراض کیا تھا کہ اس میں مکرر آیات بھی موجود ہیں یہ خدا کا کلام نہیں معلوم ہوتا بادشاہ نے اس کو گرفتار کر کے بلایا اور پوچھا کہ قرآن پر تجھ کو کیا شبہ ہے بیان کر۔ اس نے یہی کہا کہ قرآن میں بعض جگہ مکررات موجود ہیں اس لیے یہ خدا کا کلام نہیں معلوم ہوتا (نعوذ باللہ) خدا تعالیٰ کو مکررات لانے کی کیا ضرورت تھی۔ بادشاہ نے جلاد کو حکم دیا کہ اس شخص کے اعضاء مکررہ میں سے ایک ایک کاٹ دو ایک ہاتھ رہنے دو اور ایک پیر۔ ایک آنکھ رہنے دو اور ایک کان کیونکہ یہ خدا کا بنایا ہوا نہیں معلوم ہوتا' خدا تعالیٰ کو مکررات کی کیا ضرورت تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے اس میں اضافہ کیا ہے لہٰذا مکررات کو حذف کر دو اور ایک ایک عضو رہنے دو۔ واقعی خوب سزا دی۔ اسی طرح آج کل ہمارے بھائیوں نے دین میں انتخاب کیا ہے کہ کوئی نماز کو ضروری سمجھتا ہے اور نماز ہی کی پابندی کرتا ہے نہ زکوٰۃ دے نہ حج کرے نہ معاملات میں سود اور رشوت سے پرہیز کرے' کوئی روزہ کو ضروری سمجھتا ہے اور رمضان میں روزہ کا خوب اہتمام کرتا۔ ہے اور بقیہ اعمال وطاعات کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔ کوئی حج کو ضروری خیال کرتا ہے اور حج کر کے اپنے خیال میں جنت کا مالک ہو جاتا ہے اب نہ ظلم سے بچنے کا اہتمام ہے نہ غصب سے نہ امانت میں خیانت سے نہ زنا وغیرہ سے' لوگ ایسے ہی حاجی کو پاجی کہتے ہیں غرض اتنا اختلاف ہے آزاد افراد میں کہ اس کو دیکھ کر یہ کہنا بجا معلوم ہوتا ہے کہ انسان نوع نہیں کیونکہ نوع کے افراد میں اتنا اختلاف نہیں ہوتا بلکہ جنس ہے اور اس کے افراد انواع ہیں جس میں ہر نوع منحصر فی فرد واحد ہے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب کی یہ تقریر ہے واقعی قیمتی لطیفہ ہے انسان کے ہر فرد کی طبیعت کو دوسرے سے اتنا اختلاف ہے کہ دونوں کو متحد کہنا بعید معلوم ہوتا ہے۔ منطقین نے نطق سب کو متحد مانا ہے جس سے ادراک مراد ہے۔

دیہاتی اور عاقل فلسفی کے ادراک کا فرق

ایک دیہاتی اور ایک عاقل فلسفی کے ادراک میں اتنا زمین آسمان کا فرق ہے کہ دونوں کو ایک ایک ادراک کے تحت میں داخل کرنا نہایت دشوار ہے۔ بس فلاسفہ ہی نے دونوں کو ایک نوع کے افراد سمجھا ہے ممکن ہے ان کا ادراک ایسا ہی ہو جو تمام افراد انسان سے متحد ہو سکتا ہو تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ امام ابوحنیفہ کا اور ایک کاشتکار ہل جوتنے والے کا ادراک ایک ہی حقیقت کے دو فرد ہیں۔ خیر یہ تو اپنی اپنی اصطلاح ہے کہ کوئی اس اختلاف کے بعد بھی انسان کو نوع کہے اور کوئی اس کو نوعیت کے منافی سمجھ کر انسان کو جنس کہے مگر اس میں شبہ نہیں کہ انسان کی رائے میں اس درجہ اختلاف ہے کہ شاید اجناس میں بھی اتنا اختلاف نہ ہو۔ اسی وجہ سے دین کے اجزاء میں انتخاب کرنے والے بھی باہم مختلف ہیں جو نماز کو ضروری سمجھتا ہے۔ وہ نماز کے وقت تو دیندار معلوم ہوتا ہے بہت گڑگڑا کر منہ بنا کر دعائیں مانگتا ہے۔ جیسے بالکل فرشتہ ہیں اور جہاں مسجد سے باہر نکلے پھر شیطان بھی ان سے پناہ مانگتا ہے۔ بس یہ حالت ہے:

گہ رشک برد فرشتہ بر پاکی ما   گہ خندہ زند دیوز ناپاکی ما

ایماں چو سلامت بلب گور بریم   احسنت بریں چستی و چالاکی ما

گر زندہ برم بگور ایمان خودم

(کبھی فرشتہ کو ہماری پاکی پر رشک ہوتا ہے اور کبھی ہماری ناپاکی پر ہنستا ہے جب قبر کے کنارے ہم ایمان سلامت لے جائیں تو ہماری اس چالاکی اور چستی پر آفریں کہنا چاہیے اور اگر گور میں اپنا ایمان زندہ لے جائیں)

امراض روحانی

بعض لوگ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج سب کے پابند ہیں۔ ظاہری گناہوں سے بھی بچتے ہیں مگر ان کو اصلاح اخلاق کا اہتمام نہیں۔ تکبر، حسد، کینہ، ریا وغیرہ میں مبتلا ہیں اور عجب سے تو شاید ہی کوئی بچا ہو۔ نماز پڑھ کر اپنی حالت کو دوسروں سے اچھا سمجھتے ہیں بے نمازیوں کو حقیر جانتے ہیں اہل علم اور ذاکرین بھی اس مرض میں مبتلا ہیں۔ علماء کو اپنے علم پر ناز ہے۔ وہ جہلاء کو جانور سمجھتے ہیں، ذاکرین کو ذکر و شغل پر ناز ہے وہ غیر ذاکرین کو بے ہودہ سمجھتے ہیں۔

عطائے حق کی ناشکری

یہاں ایک علمی شبہ ہوتا ہے میں اس کو رفع کر دینا چاہتا ہوں وہ یہ کہ اگر کوئی آدمی نماز پڑھے، روزہ رکھے تو کیا وہ اپنے کو نمازی نہ سمجھے بے نمازی ہی سمجھے اور خدا نے ایمان کی دولت عطا کی ہے

تو کیا وہ اپنے کو مؤمن نہ سمجھے، اپنے کو کافر سمجھے، اگر یہی تواضع ہے تو یہ تو ایسا واقعہ ہوا جیسے ایک دفعہ الٰہ آباد سے کانپور جا رہا تھا ریل میں چند نو جوان جنٹلمین سوار تھے۔ ایک مصنف صاحب بھی سوار تھے، وہ مصنف صاحب پرانے آدمی سادی وضع کے تھے تو جنٹلمینوں نے ان کو بنانا شروع کیا، کھانے کا دسترخوان بچھایا اور ایک نے مصنف صاحب سے کہا کہ جناب آپ بھی گوہ موت کچھ کھا لیجئے، دوسرے ساتھی نے کہا کہ کمبخت توبہ کر تو بہ کھانے کو گوہ موت کہتا ہے تو آپ فرماتے ہیں کہ کھانے کو کھانا کہنا یہ بھی تکبر ہے اس حیثیت سے کہ اپنا کھانا ہے گوہ موت کہنا ہی تواضع ہے اس قاعدہ سے تو واقعی اپنے ایمان کو ایمان کہنا تکبر ہے اور اسے کفر کہنا ہی تواضع ہے مگر شریعت نے اس کی اجازت نہیں دی بلکہ یہ ناشکری میں داخل ہے تو اگر نماز پڑھ کر اپنے کو نمازی نہ کہے تب تو ناشکری اور اگر نماز پڑھ کر اپنے کو نمازی سمجھیں اور نمازی کہیں تو یہ "لَاتُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ" (اپنے نفس کا تزکیہ نہ بیان کرو) کے خلاف ہے اور عجب میں داخل ہے تو اب حیرت ہوتی ہے کہ کیا کریں اور کیا سمجھیں اور کیا کہیں۔ اس حیرت میں بعض ناحقیقت شناس تو گھبرا کر کہہ اٹھے:

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ
بازی گوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

(تختہ سے باندھ کر قعر دریا میں ڈال دیا ہے پھر کہتے ہو ہوشیار دامن نہ بھیگے)

او قال شاعر من العرب (عرب کے شاعر نے کہا ہے)

القاہ فی الیم مکتوفا وقال لہ
ایاک ایاک لا تبتل بالماء

(دریا میں باندھ کر اس کو ڈال دیا ہے پھر کہتے ہیں خبردار پانی نہ بھیگ ۱۲ جامع)

مگر محققین نے اس حیرت کو رفع فرمایا۔ وہ فرماتے ہیں کہ نماز پڑھ کر اپنے کو نمازی ہی کہے اور نمازی سمجھے مگر ساتھ میں یہ بھی سمجھے کہ یہ میرا کمال نہیں بلکہ محض عطائے حق اور یوں کہے:

واللہ لولا اللہ ما اھتدینا
ولا تصدقنا ولا صلینا

اور یوں کہے:

الحمدللہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ

(اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے جس نے ہم کو اس مقام تک پہنچا دیا اور ہماری کبھی رسائی نہ ہوتی اگر اللہ تعالیٰ ہم کو نہ پہنچاتے)

یعنی بخدا اگر خدا کا فضل نہ ہوتا تو نہ ہم سے صدقہ خیرات ہو سکتا نہ نماز پڑھ سکتے، خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ہم کو ان کاموں کی توفیق دی اگر خدا تعالیٰ توفیق نہ دے تو ہم ہرگز یہ کام نہ کر سکتے۔

ہماری حقیقت ہی کیا ہے

صاحبو! اگر کسی چمار کو بادشاہ ایک بیش قیمت موتی دیدے جو اس کی لیاقت سے کہیں زیادہ ہے تو بتلایئے وہ کیا کہے کیا وہ اپنے کو موتی والا نہ کہے' نہیں موتی والا ضرور کہے مگر ساتھ ہی یہ بھی کہے کہ بادشاہ کی بڑی عنایت ہے کہ ایک چمار کو اتنی بڑی چیز دیدی۔ اسی طرح آپ نماز پڑھ کر اپنے کو نمازی سمجھیں مگر ساتھ میں یہ بھی سمجھیں کہ ہم تو اصل میں نالائق تھے اس نعمت کے قابل نہ تھے یہ خدا کی عطا ہے کہ ہم جیسے نالائقوں کو اپنے دربار میں آنے کی اجازت دیدی۔ دیکھئے اب شکر اور تواضع دونوں جمع ہو گئے اس طریق میں نہ عطائے حق کی ناشکری ہوئی نہ تکبر ہوا۔ نماز کو نماز بھی سمجھا اور اپنے کو نالائق بھی سمجھا اور نماز کو محض عطائے حق سمجھا اس صورت میں آپ نماز پڑھ کر بے نمازیوں کو حقیر نہیں سمجھیں گے ہاں ان کے حال پر رحم کریں گے بلکہ اگر ضرورت ہو تو بے نمازوں کو دھمکاؤ بھی اور جن پر زور ہو ان کو مارو بھی مگر اس سزا کی شان یہ ہو کہ جیسے بادشاہ بھنگی کو حکم دے کہ کسی جرم میں شہزادے کے سو تازیانے مارے تو وہ حکم شاہی کی وجہ سے مارے گا تو سہی مگر دل میں تھوڑا تھوڑا ہوتا جاوے گا اور اسے کبھی شہزادہ سے افضل ہونے کا گمان نہیں ہوسکتا۔ محض مجبور ہو کر حکم کی تعمیل کرے گا بس یہی حال ہمارا بھی ہونا چاہیے۔ شریعت کے حکم سے اپنے نوکروں چاکروں کی اصلاح کریں اہل وعیال پر حکومت کریں بے نمازوں کو ماریں دھمکائیں مگر ان کو اپنے سے افضل سمجھیں مگر جزماً افضل نہ سمجھو تو کم از کم احتمالاً ہی سمجھو کہ شاید خدا تعالیٰ کے نزدیک کسی خاص صفت یا فعل کے سبب یہ ہم سے فی الحال افضل ہو یا فی المال اس کو افضل بنا دیں کیونکہ آپ کو محض خدا تعالیٰ کی توفیق سے نماز وغیرہ کی توفیق ہوئی ہے اور وہ توفیق کو سلب بھی کر سکتے ہیں وہ پکے نمازی کو بھی بے نمازی بنا سکتے ہیں اور ہماری اور آپ کی تو حقیقت ہی کیا ہے۔ حق تعالیٰ تو اپنے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ فرماتے ہیں:

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ۝

''اور اگر چاہیں تو اس وحی کو بالکل سلب کر لیں جو آپ کی طرف بھیجی گئی ہے پھر آپ ہمارے مقابلہ میں کسی کو کارساز نہ پائیں۔

آہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا خطاب دلیل ہے قرآن کے کلام اللہ ہونے کی خدا تعالیٰ کے سوا کسی کی ہمت نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا خطاب کر سکے نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مضمون خود بنا سکتے تھے جس سے آپ کے کمالات کے زوال کا امکان ظاہر ہو پھر چونکہ اس سے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کانپ اٹھنے کا موقع تھا اس لیے آگے تسلی فرماتے ہیں: ''اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّکَ'' یعنی صرف رحمت کارسازی کرسکتی ہے پھر چونکہ رحمت مشیت کے تابع ہے اور مشیت ہر مقدور کے ساتھ متعلق ہوسکتی ہے تو یہ کیسے معلوم ہو کہ یہاں مشیت کا تعلق بصورت رحمت ہی ہوگا اس لیے آگے تاکید کے ساتھ فرماتے ہیں: ''اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا'' بیشک خدا تعالیٰ کا فضل آپ کے حال پر بہت کچھ ہے۔ اب پوری تسلی ہوگئی کہ گو حق تعالیٰ کو سلب وحی پر پوری قدرت ہے مگر بوجہ کمال فضل کے سلب کا وقوع کبھی نہ ہوگا۔ پس وہ ممتنع بالذات نہیں تو ممتنع بالغیر ضرور ہے اور فضل و رحمت کے ساتھ سلب پر قدرت ہونا یہی علامت ہے۔ غایت رحمت وفضل کی کہ ایک بات پر قدرت ہے مگر فضل و انعام کی وجہ سے قدرت کو ظاہر نہیں کرتے اور اگر سلب پر قدرت نہ ہوتی تو اضطرار ہوتا اور اضطرار کی صورت میں وحی کا سلب نہ ہونا دلیل رحمت وفضل نہ ہوتی۔ غرض ایک دفعہ کو حق تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی فرما دیا کہ ہم ایسے قادر ہیں کہ آپ جیسے کامل و اکمل کے کمالات بھی سلب کرسکتے ہیں گو کریں گے کبھی نہیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ ارشاد ہے پھر ہم تو کیا چیز ہیں جو دعویٰ کرسکیں۔ ہماری نماز کیا اور ہمارا علم کیا اگر حق تعالیٰ چاہیں تو دم بھر میں سب سلب کرلیں۔

مقام عبرت

مولانا محمد رشید کانپوری رحمۃ اللہ علیہ کو فالج پڑا تھا تو سورۃ فاتحہ تک بھول گئے تھے حالانکہ وہ بہت بڑے عالم وفقیہ تھے مگر فالج میں یہ حالت ہوئی کہ علم تو الگ رہا سورہ فاتحہ تک بھی بھول گئے تھے جو مسلمانوں کے بچوں کو بھی یاد ہوتی ہے۔ جب فالج سے افاقہ ہونے کے بعد ہفتہ بھر میں ان کو الحمد یاد ہوئی تو کثیر مقدار میں شیرینی تقسیم ہوئی تھی جیسے بچوں کو بسم اللہ کے موقع پر مٹھائی بانٹا کرتے ہیں۔ واقعی عبرت کا موقع ہے ایک بار مجھے خود یہ واقعہ پیش آیا کہ عشاء کے بعد ذرا سی دیر مدرسہ میں لیٹ کر جو میں گھر جانے لگا تو گھر کا راستہ بھول گیا۔ حالانکہ گھر مدرسہ سے کچھ بھی دور نہیں نہ راستہ پیچدار' سیدھا راستہ برسوں سے پیروں کو لگا ہوا مگر اس وقت بالکل بھول گیا اور دوسروں کے گھر پر جا پہنچا۔ جب وہاں جا کر معلوم ہوا کہ یہ فلاں شخص کا گھر ہے تو پھر بہت ہی مشکل سے سوچ ساچ کر اپنے گھر پہنچا۔ پس سمجھ لیجئے کہ ہمارا علم کیا ہے کچھ بھی نہیں سب خدا تعالیٰ کے قبضہ میں ہے اور موٹی بات ہے کہ رات کو سوتے ہوئے روزانہ ہمارے سب علوم سلب ہوجاتے ہیں پھر یہ حق تعالیٰ کا فضل ہی تو ہے کہ صبح کو سب خزانہ واپس مل جاتا ہے اگر وہ چاہیں تو ایسا بھی

کر سکتے ہیں کہ جیسے سوتے ہوئے علم سے معرا ہو گئے تھے ایسے ہی صبح کو کورے کے کورے اٹھیں اس لیے ہم کو دعویٰ ہرگز نہ کرنا چاہیے۔ دیکھیے حضرت بایزید کے منہ سے توحید کا دعویٰ نکل گیا تھا اسی لیے اسی وقت مواخذہ ہوا اور حقیقت کھل گئی۔ جب دعوے کے بعد ایسے کاملین کی توحید بھی ناقص ثابت ہوئی تو ہمارا تو کیا منہ ہے جو دعویٰ کریں ہماری توحید ہی کیا ہے۔

توحید کا ایک خاص مرتبہ عارفین کے ساتھ مخصوص ہے

بس ہماری توحید تو اتنی ہے کہ دل سے اعتقاد اور زبان سے تکلماً خدا تعالیٰ کو واحد کہتے ہیں گو اس کی حقیقت منکشف نہ ہو وہ حقیقت یہ ہے:

مغرور سخن مشو کہ توحید خدا واحد دیدن بود نہ واحد گفتن

(توحید خدا کا دعویٰ مت کرو کہ توحید اللہ تعالیٰ شانہ کو واحد جاننا ہے نہ کہ واحد کہنا)

یعنی خدا تعالیٰ کے سوا کسی فاعل کا مشاہدہ ہی نہ کرے گا مگر اس جگہ یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ توحید کا یہ مرتبہ عارفین کے ساتھ مخصوص ہے۔ عام لوگ اس کے مکلّف نہیں ہیں کہ کسی سبب کی طرف بھی مسبب کو منسوب نہ کریں ان کو اس کی اجازت ہے۔ بس وہ تو اس کے مکلّف ہیں کہ خدا تعالیٰ کے سوا کسی چیز کو مؤثر حقیقی نہ سمجھیں۔ اس کے بعد اگر وہ تاثیر مجازی کے درجہ میں کسی سبب کی طرف اثر کو مضاف کر دیں تو ان سے مواخذہ نہ ہوگا۔ البتہ کاملین سے اس پر بھی مواخذہ ہوتا ہے وہ اس کے بھی مکلّف ہیں کہ تاثیر مجازی کے درجہ میں بھی کسی چیز کی طرف اسناد نہ کریں اور عوام کو اس کا مکلّف اس لیے نہیں کیا گیا کہ اگر وہ جملہ حوادث کی نسبت بلا واسطہ حق تعالیٰ کی طرف کرنے لگیں نافع کاموں کی بھی اور مضر کاموں کی بھی تو چونکہ ان کے قلوب میں حق تعالیٰ کی محبت وعظمت اس قدر نہیں اس لیے اندیشہ ہے کہ نعوذ باللہ ان کے قلب میں حق تعالیٰ کی طرف سے ناگواری پیدا نہ ہو جائے اور عارفین کو بوجہ غلبہ محبت کے یہ ضرر نہیں ہوتا۔ یہاں سے اسباب کی حکمت معلوم ہوگئی کہ حق تعالیٰ نے ان کو بیچ میں واسطہ اس لیے بنا دیا ہے تا کہ عوام کو ضرر یعنی حق تعالیٰ کی طرف سے ناگواری نہ ہو۔ اب یہاں میں آپ کو ایک بات بتلاتا ہوں جس سے حاجی صاحب کا امام فن ہونا معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ حضرت نے ضیاء القلوب میں مراقبہ توحید کو نقل کر کے تحریر فرمایا ہے لیکن محققان حال از یں مراقبہ منع فرمودہ اند (لیکن محققین نے اس مراقبہ سے منع فرمایا ہے)

ضیاء القلوب عجیب متن ہے

میں عرصہ تک اس شش و پنج میں رہا کہ محققین نے اس مراقبہ سے کیوں منع کیا اس میں کیا مفسدہ تھا' بہت دنوں کے بعد حقیقت واضح ہوئی اس وقت حضرت کے اس جملہ کی کیا قدر ہوئی۔

ضیاء القلوب عجیب متن ہے جب یہ کتاب لکھی گئی تو مولانا محمد قاسم صاحب نے حضرت حاجی صاحب سے عرض کیا تھا کہ حضرت اس کی تو بہت بڑی شرح ہو سکتی ہے۔ حضرت نے بہت سادہ لہجہ سے فرمایا کہ بھائی میں نے متن لکھ دیا ہے تم شرح کر دو۔ بہر حال حضرت نے مراقبہ توحید سے ممانعت فرمائی ہے اور میں نے حضرت کے سوا کسی محقق کے کلام میں اس کی ممانعت نہیں دیکھی۔ اب یا تو حضرت نے کسی کے کلام میں یہ بات دیکھی ہو یا کسی سے زبانی سنی ہو یا خود حضرت ہی کی رائے ہو جسے ابہام کے ساتھ تحریر فرمایا اور یہی ظاہر ہے اس میں راز وہی ہے جو مجملاً اوپر عرض کیا ہے۔ یعنی اس زمانہ میں قلوب میں محبت الٰہی کم ہے اس حالت قلب محبت میں اگر توحید مذکور کا استحضار ہوا تو تمام افعال کو حق تعالیٰ کا فعل سمجھے گا۔ اولاد مر گئی یا کوئی مالی نقصان ہو گیا تو اس شخص کو حق تعالیٰ کا فعل بلا واسطہ منکشف ہوگا اور محبت ہے کم تو خدا تعالیٰ سے نعوذ باللہ عداوت و بغض ہو جاوے گا۔ اس لیے آج کل اس توحید کا انکشاف عام طور پر نافع نہیں ہوتا۔

محبّ کا حال

اور اگر محبت کامل ہو تو پھر کچھ ضرر نہیں ہوتا۔ محبّ کا تو حال ہوگا اور قال یہ

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو   دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

(زندہ کریں آپ کی عطا ہے قتل کریں آپ پر قربان ہوں دل آپ پر فریفتہ ہے جو کچھ کریں اس پر راضی ہوں)

اور وہ یوں کہے گا:

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت   سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا ایسا نصیب ہو کہ آپ کی تلوار سے ہلاک ہو دوستوں کا سر سلامت رہے کہ آپ خنجر آزمائی کریں)

مسلمانوں میں صفائی معاملات کا فقدان ہے

یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ آج کل ہم لوگوں نے دین میں انتخاب کر لیا ہے۔ کسی نے صرف نماز کو لے لیا' کسی نے صرف روزہ کو کسی نے عبادات میں واجبات و فرائض کا اہتمام کیا تو اخلاق کو چھوڑ دیا۔ اس لیے اعمال بلا اخلاق کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ نماز پڑھ کر عجب اور تکبر میں مبتلا ہو جاتے ہیں' دعویٰ اور فخر کرنے لگتے ہیں' دوسروں کو حقیر سمجھتے ہیں اور اس حالت کی اصلاح کی طرف توجہ بھی نہیں کرتے ایسے لوگوں نے دین کو نماز روزہ پر منحصر سمجھ لیا ہے اخلاق و معاملات کو بالکل پس

پشت ڈال دیا۔ چنانچہ اخلاق کی کیفیت تو اوپر معلوم ہو چکی' معاملات کی حالت یہ ہے کہ مسلمان معاملات عدالت کو وکلاء سے تو پوچھتے ہیں' علماء سے کبھی نہیں پوچھتے کہ ہم یہ معاملہ کس طرح کریں۔ یہ شریعت کے مطابق ہے یا نہیں بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ شریعت کو معاملات سے کیا مطلب۔

ایک بیوہ کا کلمہ کفر

چنانچہ بعض بدنصیب اس بات کو زبان سے بھی کہہ دیتے ہیں جو کہ ایک سخت کفریہ کلمہ ہے ایک شخص کی لڑکی بیوہ ہوگئی لوگ اس کو عقد ثانی کی ترغیب دے رہے تھے کہ بیوہ کے نکاح کی شریعت میں بہت فضیلت ہے تم اپنی لڑکی کا دوسرا عقد کر دو۔ تو وہ کمبخت کہتا ہے: (نقل کفر کفر نہ باشد) کہ صاحب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے روزہ نماز کے نبی ہیں' شادی بیاہ کے نبی نہیں اس میں ہم اپنی رائے سے جو چاہیں گے کریں گے (نعوذ باللہ واستغفر اللہ) ایک عورت کمبخت نے اسی باب میں جبکہ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض صاحبزادیوں کے عقد ثانی کا ذکر کیا گیا تو اس نے سن کر یہ کہا کہ (نعوذ باللہ) وہ لڑکیاں جن کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عقد ثانی کیا ہے شریف بیوی کے پیٹ سے نہ تھیں (نعوذ باللہ) دیکھو حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا نہیں ہوا۔ کمبخت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیوں کو کم ذات قرار دیا' بھلا کوئی اس احمق سے یہ پوچھے کہ تو نے جو حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی مثال دی تو ان کے عقد ثانی کی ضرورت ہی کہاں اور کب ہوئی تھی وہ تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سامنے ہی انتقال فرما گئی تھیں۔ پھر اس احمق کو اتنی بھی خبر نہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سب بیٹیاں ایک ہی بیوی سے تھیں اور دوسری بیبیوں سے آپ کی اولاد ہوئی ہی نہیں اور ہوئی بھی تو وہ سب بھی حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا جیسی شریف زادیاں ہوئیں کیونکہ آپ کی سب بیبیاں عالی خاندان اور اشرف نسب کی تھیں' غرض معاملات میں اکثر لوگ اپنے کو خود مختار سمجھتے ہیں اور شریعت میں ان کو داخل ہی نہیں سمجھتے۔

اس انتخاب کی وجہ سے ہماری وہ حالت ہو رہی ہے کہ کسی کے ہاتھ ہے تو پیر نہیں' سر ہے تو دھڑ نہیں' دھڑ ہے تو سر نہیں۔ مجموعہ مل کر تو ایک ایک فرد سالم نکل سکتا ہے مگر فرداً فرداً تو ہم سب ناقص ہی ہیں اور بقاعدہ منطق دیکھا جاوے تو مجموعہ بھی ناقص ہی ہے کیونکہ ناقصین کا مجموعہ بھی منطقی قاعدہ سے ناقص ہی ہوتا ہے مگر افسوس کہ ہم لوگ اس نقص پر ہی کفایت کئے ہوئے ہیں مجموعہ کے کامل ہونے پر مجھے ایک حکایت یاد آئی۔

دور حاضر کی نئی تفسیر

آج کل ایک نئی تفسیر چھپی ہے جس کی تمہید میں لکھا ہے کہ اس تفسیر کی تصنیف میں بہت سے علماء جمع تھے تو سب کامل نہ تھے، ہر فرد ناقص تھا مگر مجموعہ مل کر تو ضرور کامل ہو گیا تھا۔ سو وہ ایسا مجموعہ تھا جیسے ایک بنئے نے دریا کے کنارے پہنچ کر گاڑی بان سے کہا تھا کہ پانی کو کنارے اور درمیان سے دیکھ کر بتلاؤ اس نے بتلایا تو آپ نے سب کا اوسط نکال لیا' اوسط کے حساب سے ہر حصہ میں پانی کمر تک نکلا' آپ نے حکم دیا کہ گاڑی ڈال دو کیونکہ اوسط نکالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم ڈوبیں گے نہیں۔ اس نے گاڑی ڈال دی جب بیچ میں پہنچے تو لگے ڈوبنے' بنئے نے فوراً حساب کو پھر دیکھا تو اوسط حساب کا برابر تھا تو آپ فرماتے لکھا جوں کا توں کنبہ ڈوبا کیوں۔ یہ برکت مجموعہ کے اعتبار سے کرنے کی ہوئی۔ اسی طرح اس مفسر نے چند ناقصوں کو ملا کر ایک مجموعہ بنایا کہ ایک تو کامل ہو گیا' جی ہاں وہ ایسا کامل ہوا کہ سب کو لے کر ڈوبے گا۔

متعدد ناقص کا مجموعہ کامل نہیں بن سکتا

صاحبو! کیا ایک محلّہ کے بہت سے آدمی مل کر اپنے مکانوں کی ایسی تکمیل پر کفایت کر سکتے ہیں کہ فرداً فرداً تو ہر ایک کا مکان ناقص ہو اور مجموعہ ملا کر سب حاجات مجتمع ہوں کہ ایک گھر میں باورچی خانہ نہ ہو اور ایک کے گھر میں پاخانہ نہ ہو' باورچی خانہ ہو' ایک کے یہاں دالان نہ ہو سہ دری ہو' دوسرے کے ہاں سہ دری نہ ہو دالان ہو' ایک کے مکان میں اوپر بھی کمرہ ہو دوسرے کے یہاں نہ ہو۔ کسی کے یہاں بیٹھک ہو کسی کے یہاں نہ ہو اور سب یہ کہہ کر خوش ہو رہیں کہ بلا سے الگ الگ گو ہر ایک کا گھر ناقص ہے مگر تکمیل افراد کی کچھ ضرورت نہیں کیونکہ مجموعہ تو کامل ہے بھلا ایسے کمال مجموعی سے نفع کیا۔ اگر کسی کو رات کے بارے بجے پاخانہ لگا تو وہ اس کمال سے کیا فائدہ اٹھا سکتا ہے کیا آدھی رات دوسرے کے گھر ہگنے جائے گا اور جس کے یہاں باورچی خانہ نہیں کیا وہ روزانہ دوسرے کے چولہے پر کھانا پکایا کرے گا۔ صاحب غور کر کے دیکھ لیجئے چار دن میں حقیقت نظر آ جائے گی۔ دنیا کے معاملات میں سب جانتے ہیں کہ کمال مجموعی محض فضول ہے بلکہ کمال شخصی کی ضرورت ہے اسی لیے ہر شخص فرداً فرداً اپنے مکان کی تکمیل میں کوشش کرتا ہے اور دوسرے شخص کے مکان کے بھروسہ پر کبھی اپنے گھر کو ناقص نہیں رکھ سکتا مگر دین کے بارے میں عقل مسخ ہو جاتی ہے۔

اور سنئے اگر چند مریض اکٹھے ہو کر باہم یہ کہیں کہ میاں بعض اعضاء تمہارے درست ہیں اور بعض اعضاء میرے اور بعض فلاں کے بس مجموعہ کامل ہے پھر حکیم صاحب کے پاس جانے اور علاج کرانے کی کیا ضرورت ہے۔ بتلائیے کیا اس طرح وہ تندرست ہو سکتے ہیں ہرگز نہیں ان شاء اللہ سب ہی مریں گے۔ اسی طرح دین میں بھی اس سے کام نہیں چل سکتا کہ ایک نے نماز پڑھ لی' ایک نے روزہ رکھ لیا' ایک نے زکوٰۃ دے لی' ایک نے حج کر لیا بلکہ ہر ہر شخص کو اپنی ہر ہر حالت کی تکمیل پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے جس کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ اول علم کی' پھر عمل کی کیونکہ عمل بدون علم کے نہیں ہوسکتا' کوئی کام بھی ہو پہلے اس کا طریقہ جاننا ضروری ہے پھر اگر علم کامل ہے تو عمل بھی کامل ہوگا اور علم ناقص ہے تو عمل بھی ناقص ہوگا۔ دنیا کے کاموں ہی کو دیکھ لیجئے کہ جو شخص جس کام کو خوب جانتا ہے وہ اس کو عمدگی سے کرتا ہے اور جو پوری طرح نہیں جانتا وہ بہت غلطیاں کرتا ہے بلکہ بعض دفعہ کام کو خراب کر دیتا ہے۔ ایک شخص اصولی تجارت سے واقف ہے وہ تجارت اچھی طرح سے کرے گا۔ تھوڑے سرمایہ سے بہت کچھ نفع کما لے گا اور ایک شخص اصولی تجارت سے ناواقف ہے اس کو نفع تو کیا ہوتا بعض دفعہ اصل سرمایہ بھی ڈوب دیتا ہے۔ اسی طرح ایک شخص زراعت کا طریقہ جانتا ہے وہ تھوڑی سی محنت سے بہت فائدہ حاصل کر لیتا ہے اور جو اس کام کو نہیں جانتا وہ بیج کو بھی ضائع کر دیتا ہے۔

ہر مسلمان کو علم دین کی ضرورت ہے

میں کہاں تک مثالیں دوں خود سوچتے چلے جاؤ بس یہی حال دین کا ہے۔ اے اللہ آخر اس کی وجہ کچھ سمجھ میں نہیں آتی کہ دنیا کے کاموں کا قاعدہ تو سب جانتے ہیں اور اس میں سب کا یہی مشورہ ہوتا ہے کہ بھائی پہلے اس کام کو سیکھ لو پھر کرنا مگر دین کے بارے میں علم کی ضرورت کوئی نہیں سمجھتا۔ پس جو لوگ دین پر عمل ہی نہیں کرتے وہ بھی سن لیں اور جو عمل کر رہے ہیں وہ بھی سن لیں کہ علم کی ضرورت سب کو ہے کیونکہ جو لوگ دین پر عمل کر رہے ہیں اگر وہ علم سے کورے ہیں تو ان کا عمل ضرور ناقص ہوگا ان کو تکمیل عمل کے لیے علم کی ضرورت ہے اور جو عمل نہیں کرتے ان کو عمل کی بھی ضرورت اور چونکہ وہ موقوف ہے علم پر اس لیے پھر علم کی ضرورت۔ غرض علم کی ضرورت سب کے لیے ہوئی۔

علم کی غایت عمل ہے

رہا عمل تو خود علم کی غایت وہی ہے تو اس کی ضرورت میں کیا کلام ہوسکتا ہے مگر یہ ضرورت نہیں کہ پہلے ہی دن فاضل بھی بن جائیں اور کامل بھی بن جائیں۔ بلکہ ایک ایک دو دو بات سیکھ کر

اس کے موافق عمل شروع کردیں پھر علم وعمل دونوں کی تکمیل میں لگے رہیں۔ان شاءاللہ ایک دن دونوں میں ایک کمال حاصل ہوجائے گا۔

حکم عموم الفاظ پر ہوتا ہے

افسوس تو اس کا ہے کہ ہم لوگوں نے نقصان پر قناعت کررکھی ہے تکمیل کا اہتمام ہی نہیں اس آیت میں جو میں نے تلاوت کی ہے ان ہی دو چیزوں کا ذکر ہے علم کا اور عمل کا اس میں حق تعالیٰ نے ہدی ومغفرت کی ترغیب دی ہے۔(ہدی سے مراد علم اور مغفرت سے مراد عمل طاقت ہے ۱۲)اور جہل وبدعملی پر وعید بیان فرمائی ہے شاید اس پر طلبہ یہ شبہ کریں کہ یہ آیت تو اہل کتاب کے متعلق ہے تمہاری تقریر میں مسلمانوں کو اس کا مخاطب کیوں کیا گیا' سو خوب سمجھ لو کہ حکم عموم الفاظ پر ہوتا ہے نہ خصوص مورد پر یہی قاعدہ ہے جس کو فقہاء نے اصول میں مصرح فرمادیا ہے۔ دوسرے میں پوچھتا ہوں کہ قابل ملامت اہل کتاب کی ذات "من حیث ھی ذات" (اس حیثیت سے کہ ذات) تھی یا ان کے اعمال قابل ملامت تھے۔ظاہر ہے کہ ذات پر ملامت نہ تھی بلکہ ان کے اعمال ہی قابل ملامت ہیں۔پس یہ اعمال جس جگہ بھی پائے جائیں گے قابل ملامت ہوں گے۔اس لیے مسلمانوں کو اس کا مخاطب کرنا اگر ان میں بھی ان اعمال کا وجود ہو صحیح بلکہ اگر یہ مخاطب نہ ہو لیکن ان میں یہ اعمال پائے جاتے ہوں جن پر اہل کتاب کو ملامت ہو رہی ہے تو اس صورت میں مسلمانوں کو اور زیادہ غیرت کرنی چاہیے کہ ان میں وہ اعمال پائے جاتے ہیں جو اہل کتاب کے مدار مذمت ہیں اور اس غیرت کا مقتضی ہے کہ بہت جلد جہل اور بدعملی کی اصلاح کریں اور علم وعمل کا اہتمام شروع کردیں۔

اردو میں مسائل پڑھنے کا طریقہ

بحمداللہ آج کل علم کا سامان بہت کچھ میسر ہے' جابجا دینی مدارس موجود ہیں' سب مسلمانوں کو ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے' میں یہ نہیں کہتا کہ سب عربی پڑھ کر عالم ہی بنیں بلکہ جن کو عربی پڑھنے کی فرصت نہ ہو وہ اردو رسائل ہی سے دینی مسائل کا علم حاصل کریں۔آج کل خدا کا شکر ہے کہ اردو میں بھی مسائل کا ذخیرہ کافی مقدار میں موجود ہے لیکن ان کا خود مطالعہ کرنا کافی نہیں بلکہ سبقاً سبقاً کسی عالم سے سمجھ کر پڑھنے کی ضرورت ہے کیونکہ اردو میں مسائل کا ترجمہ ہوجانے سے صرف زبان سہل ہوجاتی ہے مضامین سہل نہیں ہوجاتے۔چنانچہ اردو میں اقلیدس اور طب کی کتابیں بھی ترجمہ ہوگئی ہیں تو کیا ان کے مطالعہ سے کوئی شخص ریاضی داں یا طبیب ہوسکتا ہے ہرگز

نہیں بلکہ استاد سے پڑھنے کی ضرورت ہے پھر قرآن یا فقہ کا اردو ترجمہ آپ کو استاد سے کیونکر مستغنی کرسکتا ہے، میں تجربہ کی بناء پر سچ کہتا ہوں کہ محض ترجمہ کے مطالعہ سے آپ قرآن مجید یا فقہ کو ہرگز نہیں سمجھ سکتے یقیناً بہت جگہ ٹھوکریں کھائیں گے اور مطلب کچھ کا کچھ سمجھ جائیں گے اس لیے عربی میں نہ پڑھو تو اردو ہی میں پڑھو لیکن کسی عالم سے سبقاً سبقاً پڑھو اپنے مطالعہ کو کافی نہ سمجھو۔

بقدر ضرورت علم دین کا حاصل کرنا فرض ہے

مجھے پہلے بھی معلوم ہوا تھا اور اب مدرسہ کی رپورٹ دیکھ کر بھی معلوم ہوا کہ اس مدرسہ کا زیادہ تر مقصود یہ ہے کہ دیہات کے جو لوگ پوری تعلیم حاصل نہیں کرسکتے ان کو ضروریات دین یعنی قرآن اور نماز روزہ وغیرہ کے ضروری مسائل کی تعلیم دی جائے۔ سو یہ موقع بہت اچھا ہے اس کو غنیمت سمجھنا چاہیے اور یہ خوب سمجھ لو کہ پورا عالم بننا تو فرض کفایہ ہے فرض عین نہیں لیکن بقدر ضرورت دین کا علم حاصل کرنا فرض عین ہے اس لیے اگر فرض کفایہ کی ہمت نہ ہو تو فرض عین کی مقدار تو ضرور حاصل کرلینی چاہیے۔ آج کل لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ بس ہو تو پورا عالم ہو ورنہ جاہل ہی رہے، یہ بڑی غلطی ہے۔ جن لوگوں کو عالم بننے کے لیے فراغت نہ ہو وہ بیچ ہی کے راستہ پر رہیں کہ نہ عالم ہوں نہ جاہل بلکہ ضروریات دین کو حاصل کرکے اپنی دنیوی کاروبار میں لگیں اور اس کے لیے ایک سال کی ضرورت ہے زیادہ نہیں۔ ایک سال میں قرآن مجید کا ایک دو سپارہ پڑھ کر اردو میں مسائل کا علم بقدر ضرورت حاصل ہوسکتا ہے اور اتنی فرصت تو دیہات والوں کو بھی مل سکتی ہے اس لیے کم از کم سال تو اپنے بچوں کو دینی علم کی ضرور تعلیم دینی چاہیے اور یہ مدت میں نے ان لوگوں کے لیے بیان کی ہے جو پورا قرآن پڑھانے کے لیے فراغت نہیں پاتے اور نہ ایک درجہ میں پورے قرآن کی بھی ضرورت ہے بلکہ حفظ کی بھی ضرورت ہے۔ اگر سب کے سب دو تین ہی سپارے پڑھا کریں تو پھر قرآن کی حفاظت کیونکر ہوگی اور سب ناظرہ ہی پڑھنے لگیں حفظ نہ کریں تو قرآن مسلمانوں کے پاس کیونکر رہے گا کیونکہ اس صورت میں اگر کوئی دشمن قرآن کے سب نسخے مسلمانوں سے چھین کر ضائع کردے تو مسلمان قرآن سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے اور اب کسی کی مجال نہیں کہ مسلمانوں سے قرآن چھین سکے، اگر مصاحف کو بھی کوئی ضائع کردے گا تو مسلمانوں کے ہزاروں بچے اور لاکھوں جوان اور بوڑھے حافظ موجود ہیں وہ اپنی یاد سے قرآن کو پھر لکھ سکتے ہیں۔ مسلمانوں کی یہ خصوصیت جملہ اہل ادیان کے مقابلہ میں حفظ ہی کی برکت سے تو ہے۔

حفظ قرآن کی فضیلت

پس جن کو حق تعالیٰ نے فراغت دی ہے وہ اپنے بچوں کو پورا قرآن پڑھائیں اور جن کے دو چار لڑکے ہوں وہ ان میں سے ایک کو حافظ بھی ضرور بنائے۔ حفظ قرآن کی بڑی فضیلت ہے

قیامت میں حافظ کی شفاعت سے ایک بڑی جماعت کی بخشش ہوگی اور اس کے والدین کو ایسا تاج پہنایا جائے گا جس کی روشنی سے آفتاب بھی ماند ہو جائے گا۔ اس سے اندازہ کرلو کہ خود حافظ کی کیا کچھ قدر و منزلت ہوگی جب اس کے والدین کی یہ عزت ہوگی اس لیے اس دولت کو بھی ضرور حاصل کرنا چاہیے مگر جن کو فراغت نہ ہو وہ سارا نہ پڑھیں مگر کچھ تو ضرور پڑھ لیں کتنے شرم کی بات ہے کہ مسلمان اپنے مذہب کی کتاب سے بالکل ہی نا آشنا ہوں' افسوس آج کل تعلیم یافتہ طبقہ قرآن پڑھانے کو بالکل بیکار اور فضول سمجھتا ہے۔ چنانچہ رام پور میں ایک صاحب جنٹلمین نے اپنے دوست سے کہا کہ آپ بھی اپنے بچہ کو انگریزی سکول میں بھیجیں۔ انہوں نے کہا کہ نصف قرآن اس کا رہا ہے وہ ہو جاوے تو بھیجوں' انہوں نے پوچھا نصف قرآن کتنے روز میں ہوا ہے بولے دو سال میں تو آپ کیا کہتے ہیں کہ تم نے اپنے بچے کے دو سال تو ضائع کیے دو سال اور کیوں ضائع کرتے ہو۔ اس مدت میں یہ ایک دو درجہ تو تعلیم کا طے کرتا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون اس ظالم کو یہ خبر نہیں کہ اس قرآن پڑھنے والے لڑکے نے دو سال میں نہ معلوم جنت کے کتنے درجے طے کر لیے ہیں کیونکہ قیامت میں قرآن پڑھنے والے کو حکم ہوگا کہ قرآن پڑھتے جاؤ اور چڑھتے چلے جاؤ جہاں تمہارا قرآن رک جائے وہیں تم رک جاؤ بس وہی تمہارا درجہ ہے مگر تعلیم یافتہ لوگوں کو تو سکول کے درجوں کی ضرورت ہے۔ جنت کے درجوں کی کیا ضرورت ہے اس لیے قرآن پڑھانے کو بیکار سمجھتے ہیں مگر ذرا ٹھہریں ابھی چند دن میں مرنے کے بعد بلکہ مرتے وقت ہی معلوم ہو جائے گا کہ سکول کے درجوں کی ضرورت تھی یا جنت کے درجوں کی۔

گوالیار کی حکایت سنی ہے کہ ایک صاحب نے اپنے لڑکے کو بچپن ہی سے انگریزی میں ڈال دیا تھا اور اس کی تعلیم پر بہت روپے خرچ کئے تھے لندن بھی پاس کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ وہاں سے آ کر وہ بیمار ا ہوا اور مرنے لگا تو ابا جان اس کے سرہانے بیٹھ کر رونے لگے کہ ہائے بیٹا میں نے تو تیری تعلیم پر بیس پچیس ہزار روپے خرچ کئے تھے۔ میں نے اپنی محنت کا پھل بھی نہ دیکھا۔ لڑکے نے آنکھیں کھول دیں اور کہا ابا جان اب کیا روتے ہو جب مجھ کو آخرت میں جہنم میں جاتا ہوا دیکھو گے اس وقت روؤ گے کیونکہ آپ نے یہ بیس پچیس ہزار روپے خرچ کر کے مجھے جہنم میں پھینکنے کا انتظام کیا ہے تم نے اس رقم سے میرے واسطے دوزخ خریدی ہے کیونکہ تم نے مجھے دین کی تعلیم سے بالکل کورا رکھا اس وقت میں دیکھتا ہوں کہ میرا سارا لکھا پڑھا بیکار ہے' موت کے فرشتے آنے والے ہیں' تم نے اتنی بڑی رقم میرے اوپر خرچ کر کے میرے ساتھ دوستی نہیں کی بلکہ سراسر دشمنی کی ہے۔

جنت کی ڈگری بھی حاصل کرو

صاحبو! اس لڑکے نے تو اپنی حسرت کو ظاہر کر دیا اور امید ہے خدا کے فضل سے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ وہ اس حسرت کی بنا پر بخش دیا گیا ہوگا مگر جو لوگ حسرت بھی ظاہر نہیں کر سکتے وہ بھی مرنے کے وقت اور مرنے کے بعد اس پر ضرور نادم ہوں گے کہ افسوس ہم نے ساری عمر اسکولوں کے درجے اور ڈگریاں حاصل کرنے میں گنوادی اور جنت کی ایک ڈگری بھی حاصل نہ کی۔

فسوف تری اذا انکشف الغبار افرس تحت رجلک ام حمار

(غبار جانے دو عنقریب دیکھ لو گے کہ تم گھوڑے پر سوار تھے یا گدھے پر)

ابھی ہوائے نفسانی کا غبار چڑھا ہوا ہے اس لیے آپ جتنا چاہیں دعویٰ کر لیں کہ ہم ترقی یافتہ ہیں ہم گھوڑے پر سوار ہیں ذرا غبار کو اترنے دو ابھی معلوم ہو جائے گا کہ تم گھوڑے پر سوار تھے یا لنگڑے گدھے پر۔ میں کہتا ہوں کہ جنٹلمینوں کو اگر جنت کی طلب کے لیے تعلیم قرآن کی ضرورت نہیں تو کم از کم قومی حمیت کے ہی لحاظ سے اس کو ضروری سمجھا ہوتا۔ یہ لوگ قومی حمیت کا تو بڑے زور سے دعویٰ کرتے ہیں اور رات دن اسی کا سبق رٹتے ہیں وہ ذرا بتلائیں تو کہ قومیت اسلامی کی بنیاد کیا ہے۔ یقیناً اگر مسلمان ہیں تو یہی کہیں گے کہ قومیت اسلامی کی بنیاد قرآن مجید ہی ہے پھر حیرت ہے کہ جس چیز کے وہ حامی اسی کی جڑیں اکھاڑتے ہیں۔

وجود عالم کی محافظ حمایت

صاحب اگر تعلیم قرآن بیکار ہے تو وہ قومی حمیت ہی کیا کارآمد ہے جس کا آپ دعویٰ کرتے رہتے ہیں۔ بس وہ حال ہے ان لوگوں کا

یکے برسر شاخ و بن می برید

(ایک شخص شاخ کی جڑ پر بیٹھا ہوا شاخ کاٹ رہا تھا)

میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر آپ کی اس بے اعتنائی سے قرآن مجید کا وجود دنیا سے ناپید ہو گیا تو ساتھ ساتھ اسلام اور مسلمانوں کا نام بھی مٹ جائے گا۔ اب تک جو اسلام کا نام دنیا میں روشن ہے وہ اس مبارک کتاب ہی کی بدولت ہے اور جس فرقہ کو آپ مسلمانوں میں سب سے زیادہ بیکار سمجھتے ہیں واللہ وہی اسلامی قومیت کا محافظ ہے تم ہو کس ہوا میں، خدا کی قسم اگر یہ قرآن مجید کے پڑھنے پڑھانے والے نہ رہے تو مسلمان دنیا کے طبقہ میں کہیں بھی نہ رہیں گے، ساری قومی حمیت ناک کے رستہ نکل جائے گی بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ یہ فرقہ جو تمہارے نزدیک

بیکار ہے صرف قومیت اسلامی کا محافظ نہیں بلکہ وجود عالم کا محافظ ہے۔ اگر یہ جماعت دنیا میں نہ رہے تو دنیا نہ رہے گی بلکہ سارا عالم برباد ہو کر قیامت آ جائے گی اور یہ میں اپنے گھر سے نہیں کہتا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

لاتقوم الساعة حتٰی یبقی فی الارض واحد یقول اللّٰہ اللّٰہ او نحوہ۔[1]

قیامت اس وقت تک نہ آئے گی جب تک زمین میں اللہ اللہ کہنے والا ایک شخص بھی موجود رہے اور ظاہر ہے کہ اللہ اللہ کرنے والے یہی لوگ ہیں جن کو آپ بیکار سمجھتے ہیں اور دوسرے طبقوں میں بھی اگر کوئی خدا کا نام لینے والا ہے تو وہ بھی ان ہی کی برکت سے ان ہی کے تعلق سے ہے۔ اب تو ان جنٹلمین صاحب کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ مسلمان کا بچہ دو سال قرآن پڑھ کر دنیا و آخرت کے کتنے درجے طے کرتا ہے۔ اسکول کا ایک درجہ طے کر کے تو وہ خاک بھی حاصل نہیں کرتا اور قرآن کی ایک سورت بلکہ ایک آیت پڑھ کر وہ اسلامی قومیت کا محافظ بلکہ تمام عالم کا محافظ بن جاتا ہے۔ یہ تو دنیا کا نفع ہے اور آخرت کا نفع تو سب جانتے ہیں پھر میں کہتا ہوں کہ آج کل جس علم کی وجہ سے لوگ تعلیم قرآن سے غفلت کر رہے ہیں زمانہ نے اس وقت اس کی قلعی کھول دی ہے۔ پہلے انگریزی تعلیم کی جس درجہ قدر تھی اب اس کی حقیقت معلوم ہو گئی۔ خدا اس محکمہ تخفیف کا بھلا کرے اس نے دکھلا دیا کہ بہت سے انگریزی پڑھنے والے جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں گو اس سے رنج بھی ہوتا ہے کہ ملازمت چھوٹنے سے بعض مسلمانوں کو تکلیف ہوئی اور ان پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا مگر اس کی خوشی ہے کہ جس کے نشہ میں وہ دین سے غافل ہو رہے تھے اس محکمہ نے وہ نشہ ان کے دماغوں سے اتار دیا اور ان کو معلوم ہو گیا کہ انگریزی تعلیم سے دین تو حاصل ہوا ہی نہ تھا، دنیا بھی سب کو حاصل نہیں ہوتی۔ ایک صاحب نے خوب کہا کہ علم دینا تو جب تک مکمل نہ ہو کسی مصرف کا نہیں اور علم دین کا جو درجہ بھی حاصل ہو جائے وہ نافع ہے۔ آخرت کا تو نفع ہے ہی دنیا کا بھی نفع اگر کوئی حاصل کرنا چاہے وہ بھی حاصل کر سکتا ہے۔

صرف مؤذن پکی پکائی روٹی کھا سکتا ہے

چنانچہ اگر کسی کو دین میں اور بھی کچھ حاصل نہ ہو صرف اذان ہی یاد کر لے جو سب سے ادنیٰ درجہ ہے علم دین کا تو وہ بھی اپنا پیٹ پال سکتا ہے دونوں وقت چین سے پکی پکائی روٹی کھا سکتا ہے۔ بخلاف انگریزی کے کہ اس میں انٹرنس سے کم تو بالکل بیکار ہے اور انٹرنس بھی آج کل زیادہ کارآمد

---

[1] (الصحیح لمسلم کتاب الایمان ب: ۶۶، رقم: ۲۳۴، کنز العمال: ۳۸۴۸۵)

نہیں کیونکہ انگریزی پڑھنے والے اس کثرت سے ہوگئے ہیں کہ ہر محکمہ میں بی اے اور ایم اے والوں کی درخواستیں پہلے سے رکھی رہتی ہیں۔ پھر اعلیٰ کے ہوتے ہوئے انٹرنس والوں کو کون پوچھتا ہے۔ بعض لوگ اپنی اولاد کو علم دین اس لیے نہیں پڑھاتے کہ مولوی غریب ہوتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ علم دین غریب ہی پڑھتے ہیں اگر امراء کے بچے علم دین پڑھنے لگیں تو مولوی امیر ہونے لگیں گے تو تم اس کا اہتمام کیوں نہیں کرتے پھر تم امیر ہی مولویوں سے وعظ کہلایا کرنا ان ہی سے مسائل دریافت کیا کرنا' پھر غریب مولویوں کا تعلق صرف غریبوں ہی سے رہ جاوے گا۔ دوسرا امراء کی تعلیم سے یہ فائدہ ہوگا کہ چندہ کا کام بند ہو جاوے گا جو جڑ ہے ذلت کی۔ امیر مولویوں کو چندہ کی ضرورت ہی نہ ہوگی بلکہ اگر وہ چندہ کریں گے تب بھی وہ نظروں میں ذلیل نہ ہوں گے مگر ان شاء اللہ وہ اگر چندہ کریں گے تو ڈاکہ ہی ڈالیں گے لیکن وہ ڈاکہ ڈال کر بھی معزز رہیں گے۔ غریب مولوی تو چندہ چار روپے ہی پر قناعت کر لیتے ہیں اور وہ چار سو سے کم پر قناعت ہی نہ کریں گے مگر بلا سے ان کی عزت تو کم نہ ہوگی اور غریب مولویوں کے چندہ سے تو دین کی بڑی بے وقعتی ہو رہی ہے عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سارا دھندہ اپنے پیٹ کے واسطے کیا جا رہا ہے اس لیے میری رائے ہے کہ علماء کو چندہ کا کام ہرگز نہ کرنا چاہیے بلکہ جو کام دین کا کرنا ہو اس کے قوم کے معزز آدمیوں کو جمع کر کے یہ کہہ دیا جائے کہ صاحبو! دین کی حفاظت کے لیے اس کام کی ضرورت ہے۔ آپ بھی غور کر لیں کہ اس کی ضرورت ہے یا نہیں۔ اگر وہ ضرورت کو تسلیم کر لیں تو ان سے کہا جائے کہ سب مل کر اس کا انتظام کریں۔ علماء اصل میں کام کریں اور معززین روپیہ کا انتظام کریں' غریب علماء ہی پر سارا بار کیوں ڈالا جاتا ہے کہ وہ کام بھی کریں اور روپیہ بھی جمع کریں اور اگر وہ یہ کہیں کہ یہ کام ضروری نہیں فضول ہے تو علماء کو چندہ کی ضرورت نہیں بس وہ کام بند کر کے اپنے گھر پر رہیں اور تجارت و زراعت یا کسی اور شغل میں لگیں اور فرصت کے وقت میں جتنا ہو سکے دین کا کام کر لیا کریں۔ اس صورت میں قیامت کے دن ان پر مواخذہ نہ ہوگا' یہ صاف کہہ دیں گے کہ ہم نے مسلمانوں کے سامنے دینی خدمت کی ضرورت ظاہر کر دی تھی انہوں نے اس کو فضول بتلایا اور روپیہ کا انتظام نہ کیا اور ہمارے چندہ کرنے سے دین کی بے وقعتی ہوتی تھی اس لیے ہم نے چندہ نہ کیا اور معاش کے لیے دوسرے کاموں میں لگ گئے اور اسی کے ساتھ جتنا ہم سے ہو سکا اس قدر دین کی خدمت بھی کرتے رہے اس کے بعد اگر ان لوگوں کی گردنیں نہیں گی جو دین کی خدمت کو فضول بتلاتے تھے ذرا علماء اس طرح کر کے تو دیکھیں ان

شاء اللہ تعالیٰ عوام سب سیدھے ہو جائیں گے اور خود چندہ کر کے روپے لا لا کر دیا کریں گے۔
میں نے اوپر جہاں رپورٹ مدرسہ کے حوالے سے مدرسے کے مقصد کو ظاہر کیا تھا یہ وہ کہہ رہا تھا
کہ طبقہ امراء کو میں نصف قرآن یا ربع قرآن پڑھنے کی اجازت نہیں دیتا ان کو تو پورا قرآن
پڑھنا چاہیے پھر قرآن پڑھ کر دین کا عالم بننا چاہیے۔ ہاں جن کو ملازمت کی ضرورت ہو ان کو اتنی
رخصت ہے کہ اگر وہ عربی زبان میں دین کو حاصل نہ کر سکیں تو کم از کم اردو ہی میں پڑھ لیں
کیونکہ ایسے لوگوں کو انگریزی کی بھی ضرورت ہے اور دیہات والے جو فراغت نہیں پاتے وہ کم از
کم ایک سال تو دین کے لیے خرچ کر دیا کریں اتنی وسعت دینے کے بعد بھی اگر لوگ جاہل ہی
رہیں تو اس وعید کے لیے تیار ہو جاویں جو اس آیت میں مذکور ہے۔

جہل وضلالت موجب وعید ہے

اب میں عنوان آیت سے ایک بات پر متنبہ کرتا ہوں کہ وہ یہ کہ اس جگہ حق تعالیٰ نے اشتری
کا لفظ اختیار فرمایا ہے جس کے معنی استبدال بالتراضی (رضا مندی سے بدلنا) اس سے معلوم ہوا
کہ رضا وخوشی سے جہل وضلالت کو اختیار کرنا یہ موجب وعید ہے اور افسوس ہے کہ آج کل یہی
صورت ہو رہی ہے کہ لوگ خوشی کے ساتھ علم دین سے اعتراض کر رہے ہیں جس کی دلیل یہ ہے کہ
اپنی اس غفلت پر کبھی ان کو افسوس نہیں ہوتا نہ علم سے محرومی پر حسرت ہوتی ہے بلکہ غضب یہ ہے کہ
جو بیچارہ طالب اصلاح ہو اور اپنے بچوں کو علم دین پڑھانا چاہے اس پر چاروں طرف سے ملامت و
طعن ہوتا ہے کہتے ہیں کیا اپنی اولاد کو ملا بناؤ گے اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ ملا ہو کر یہ دنیا کے کام کا نہ
رہے گا' دنیا سے نکما ہو جائے گا ہم اس الزام کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کے جواب میں مولانا رومی
کے التزام کو پیش کرتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں:

تا بدانی ہر کرا یزداں بخواند   از ہمہ کار جہاں بیکار ماند

(جس شخص کو اللہ تعالیٰ اپنا بنا لیتے ہیں اس کو تمام دنیا کے کاروبار سے بیکار کر دیتے ہیں)

واقعی ملانے دنیا کے کاموں سے بیکار ہو جاتے ہیں مگر خبر بھی ہے کن کاموں سے بیکار
ہوتے ہیں سب کاموں سے نہیں بلکہ ان کاموں سے جو خلاف شرع ہیں یا مباحات زائدہ ہیں۔
باقی جو کام شروع کے موافق ہیں اور ضرورت کے درجہ میں ہیں گو دنیا ہی کے ہوں ان میں وہ بہت
چست ہوتے ہیں۔ چنانچہ اپنے اہل وعیال کی طرف سے کبھی بے فکر نہیں ہوتے بلکہ ان کے حقوق
واجبہ کو دنیا داروں سے زیادہ ادا کرتے ہیں۔ البتہ طالب علم خاص زمانہ طالب علمی میں دنیا کے

بعضے ضروری کاموں میں بھی سست ہوتے ہیں مگر اس کا راز یہ ہے کہ وہ ایک اہم کام میں مشغول ہیں اس کی طرف توجہ لگی ہوئی ہے اور نفس ایک وقت میں دو طرف متوجہ نہیں ہوسکتا آپ اس کو عیب سمجھتے ہیں کہ طالب علم کو کھانے کی فکر نہیں ہوتی بعض دفعہ مطالعہ کتاب میں اس کو بھوک کی خبر نہیں رہتی مگر میں انصاف سے پوچھتا ہوں کہ اگر آپ کا ایک کمیرا بالدی ہل جوتنے میں ایسا مشغول ہوجائے کہ اسے روٹی کی بھی خبر نہ رہے تو کیا آپ اس کو عیب سمجھیں گے یا اس کی تعریف کریں گے کہ بڑا نمک حلال نوکر ہے آقا کے کام کو ایسی محنت سے کرتا ہے کہ اپنی جان کی بھی خبر نہیں رہتی۔ افسوس آپ کے کام میں کسی کو اپنی خبر نہ رہے وہ تو نمک حلال قابل تعریف ہوا اور خدا کے کام میں کوئی اپنے سے بے خبر ہوجائے تو وہ سست اور کاہل اور قابل ملامت ہے۔

علماء کے وقت میں خیر و برکت

صاحبو! غور تو کیجئے کیا یہی انصاف ہے اور طلباء کی یہ سستی بھی صرف زمانہ طلب ہی تک رہتی ہے پھر فارغ ہوکر تو وہ ایسے چست ہوجاتے ہیں کہ ان کی برابر دنیا دار کبھی بھی چست نہیں ہوسکتے وہ تھوڑی دیر میں اتنا کام کر لیتے ہیں کہ دنیا دار دو چار مل کر بھی اس سے زیادہ دیر میں وہ کام نہیں کر سکتے۔ آپ طلباء و علماء کے پاس رہ کر ان کی حالت دیکھیں کہ وہ تعلیم اور تعلم اور تصنیف و تالیف کا کام کتنی چستی سے کرتے ہیں اور اس سے فارغ ہوکر دنیا کے کام کس پھرتی سے انجام دیتے ہیں اور اہل و عیال کی کیسی خبر گیری کرتے ہیں اور اس میں راز یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے ان کی امداد ہوتی ہے اس لیے تھوڑی دیر میں وہ بہت کام کر لیتے ہیں اس امداد پر ایک دیندار کا قصہ یاد آیا کہ وہ جمعہ کے دن اپنے کھیت میں پانی دے رہے تھے کہ جمعہ کی اذان ہوگئی۔ انہوں نے سوچا کہ پانی کا انتظام کرتا ہوں تو جمعہ ہوجاتا ہے اور جمعہ کو جاتا ہوں تو پانی کا کام رہ جاتا ہے۔ انہوں نے دین کو دنیا پر ترجیح دی اور کھیت کا کام چھوڑ کر جمعہ کو چلے گئے۔ جمعہ کے بعد جو آکر دیکھا تو کھیت پانی سے بھرا ہوا تعجب ہوا' پڑوسی کہنے لگے کہ عجب بات ہے ہم اپنے کھیتوں میں پانی دیتے تھے اور ڈول ٹوٹ ٹوٹ کر وہ تمہارے کھیت میں پہنچ جاتا تھا تو کبھی حق تعالیٰ کی امداد کھلی آنکھوں نظر آجاتی ہے اور باطنی امداد تو ہمیشہ ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ ان کے وقت میں برکت دے دیتے ہیں اس لیے یہ خیال نہ کرو کہ تمہارا لڑکا علم سے فارغ ہوکر دنیا کے کام کا نہ رہے گا۔ بخدا اگر وہ دیندار ہوگیا تو اپنے مفید کاموں میں وہ دنیا داروں سے زیادہ چست ہوگا دوسرے وہ کم خرچ ہوگا' شان اور وضع اور فیشن کا پابند نہ ہوگا۔ تھوڑی آمدنی میں اپنا سارا خرچ چلائے گا اور انگریزی پڑھنے والی اولاد کو اگر اعلیٰ ملازمت نہ ملی

تو وہ ساری عمر باپ ماں ہی سے خرچ منگاتے رہیں گے۔ چنانچہ ایسے نظائر موجود ہیں اب آپ کو چاہیے کہ اپنی اولاد کو اس مدرسہ میں بھیج دیں اور میں نے اس مدرسہ میں یہ بھی رائے دی ہے جو قبول کر لی گئی کہ ایک نصاب ایسا بنایا جائے جس میں اردو فارسی میں لوگ دینیات حاصل کر سکیں اور میری رائے میں ہر مدرسہ کے اندر ایک ایسا نصاب ہونا چاہیے اور میں نے کئی جگہ یہ رائے ظاہر بھی کی لیکن اہل مدارس نے اس پر توجہ نہیں کی اگر اس مدرسہ میں اس پر عمل کیا گیا اور ان شاء اللہ امید ہے کہ کیا جائے گا تو یہ بات اس مدرسہ کی خصوصیات میں سے ہوگی۔ ایک خصوصیت اس مدرسہ کی اسی جلسہ میں یہ معلوم ہوئی کہ اس مرتبہ جو جلسہ کی وجہ سے مہمانوں کا مجمع ہوا ہے ان کی دعوت وغیرہ کے لیے اور اسی طرح جلسہ کے جملہ اخراجات کے لیے خاص احباب سے چندہ کیا گیا ہے عام چندوں کی رقم میں سے جلسہ کے مہمانوں کو کھانا نہیں کھلایا گیا یہ بات بڑی خوشی کی ہے میری ہمیشہ سے یہی رائے ہے کہ اول تو مہمانوں کو مدرسہ کی طرف سے کھانا کھلانے کی ضرورت نہیں یہ کسی کے بیٹے کی تقریب تھوڑا ہی ہے جو آنے والوں کو کھانا دیا جائے یہ ایک قومی اور دینی کام ہے جو آئے اس کو اپنے پاس سے خرچ کر کے بازار میں کھانا چاہیے جیسے عام قومی جلسوں میں کھانے پینے کا خرچ ہر شخص خود برداشت کرتا ہے اور اگر یہ نہ ہو اور مہمانوں کو کھانا کھلایا ہی جاوے تو اس کے لیے خاص چندہ کرنا چاہیے جس میں سب شریک ہونے والوں کو اس بات کی صریحاً اطلاع ہو کہ یہ رقم مہمانوں کے کھانے وغیرہ میں صرف ہوگی۔ عام چندہ سے یہ اخراجات نہ کرنے چاہئیں کیونکہ عام چندہ دینے والے زیادہ تر یہ سمجھ کر مدارس میں چندہ دیتے ہیں کہ ہماری رقم تعلیمی کام میں صرف ہوگی اس سے طلبہ کو کھانا کپڑا دیا جائے گا وغیرہ وغیرہ اور اسی کو زیادہ ثواب سمجھتے ہیں اور اگر ان کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس سے جلسہ کے مہمانوں کو کھانا کھلایا جائے گا جن میں بہت سے امراء وخوش حال بھی ہوتے ہیں تو شاید بعض لوگ اس اطلاع کے بعد چندہ نہ دیتے اس لیے میرے نزدیک عام رقوم چندہ سے جلسہ کے اخراجات میں صرف کرنا شبہ سے خالی نہیں اور شبہ بھی قوی پس یا تو اس کے لیے خاص چندہ کیا جایا کرے یا کم از کم جلسہ میں جب چندہ جمع کیا جائے اسی وقت اعلان کر دیا جائے کہ اس جلسہ کا خرچ اس چندہ سے نکالا جائے گا جو صاحب اس میں متفق نہ ہو اس وقت ظاہر فرما دیں تا کہ ان کا چندہ علیحدہ رکھا جاوے۔ اس طرح بھی شبہ سے بچاؤ ہو سکتا ہے مگر اہل مدارس اتنی سہل صورت سے بھی تساہل کرتے ہیں مگر جائے خوشی ہے کہ اس مدرسہ میں اس کا لحاظ کیا گیا مجھے ایک بڑی خوشی اس مرتبہ یہ ہوئی کہ بعض دفعہ مدرسہ کی طرف سے چندہ کے لیے جو سفیر بھیجا جاتا ہے تو اس کے متعلق میں نے

ایک رائے دی اور وہ بھی مان لی گئی اور وہ رائے یہ ہے کہ سفیر اگر عالم نہ ہو تو اس کو وعظ گوئی سے منع کر دیا جائے۔ محض ترغیب چندہ کا محدود الفاظ سے مضائقہ نہیں۔

غیر عالم کے وعظ میں مفاسد

مگر غیر عالم وعظ کبھی نہ کہے اس میں چند مفاسد ہیں ایک تو یہ کہ اس میں حدیث کی مخالفت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امر ہے کہ ہر کام اس کے اہل کے سپرد کرنا چاہیے اور آپ فرماتے ہیں: "اذا وسد الا مرالی غیر اهله فانتظر الساعة"[1] کہ جب کام نااہلوں کے سپرد کیے جانے لگیں تو قیامت کے منتظر رہو۔ گویا نااہل کو کوئی کام سپرد کرنا اتنی سخت بات ہے کہ اس کا ظہور قیامت کی علامات سے ہے اور یہ امر مصرح و ثابت ہے کہ جو فعل اختیاری علامات قیامت سے ہوں وہ معصیت اور مذموم ہے اور ظاہر ہے کہ غیر عالم وعظ گوئی کا اہل نہیں یہ منصب صرف علماء کاملین کا ہے اس لیے غیر عالم کو اس کی اجازت ہرگز نہ دی جائے۔ دوسری خرابی اس میں یہ ہے کہ بعض دفعہ جاہل کو کسی مسئلہ میں بوجہ ناواقفیت کے ایسی غلطی پیش آتی ہے کہ اسے خبر بھی نہیں ہوتی گو بعضے بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں مگر ظاہر ہے کہ وہ اپنی علمی حیثیت ہی کے موافق اختیار کر سکتے ہیں اس سے زیادہ نہیں کر سکتے اور جب پورا علم نہیں تو غلطی کا احتمال رہے گا۔ علاوہ ازیں جب یہ شخص وعظ کہے گا تو لوگ عالم سمجھ کر اس سے ہر قسم کے مسائل بھی پوچھیں گے۔ پھر آج کل ایسے نفس کہاں ہیں جو صاف کہہ دیں کہ ہم جاہل ہیں ہم کو مسائل معلوم نہیں، ضرور کچھ گڑھ مڑھ کر جواب دیں گے اور اکثر وہ غلط ہوگا اور اگر گول مول جواب دیا اور اس طرح غلط جواب سے اپنے کو بچالیا تو ممکن ہے کہ عوام اس سے کسی غلطی میں پڑ جاویں۔ بعض دفعہ جاہل ایسے ہوشیار ہوتے ہیں کہ جو مسئلہ ان کو معلوم نہیں ہوتا اس کا ایسا جواب دیتے ہیں جس سے نہ جواب معلوم ہو نہ جہل ظاہر ہو۔ گنگوہ میں ایک جاہل فتویٰ دیا کرتا تھا۔ مولانا گنگوہی نے اپنی نوعمری میں اس سے امتحاناً سوال کیا کہ حالت حمل میں بے شوہر عورت سے نکاح کرنا کیسا ہے، کہا ایسا ہے جیسے گھیرا دینا۔ اس گول مول جواب سے نہ اس کا جہل ظاہر ہوا نہ جواز کا فتویٰ ہوا۔ مگر ایسے جوابات سے عوام کیا سمجھیں گے یقیناً غلطی میں پڑیں گے شاید کوئی جاہل واعظ یہ کہے کہ ہم کتابیں دیکھ دیکھ کر فتویٰ دیا کریں گے اور آج کل اردو میں بھی مسائل کا ذخیرہ موجود ہے تو میں کہتا ہوں کہ بعض مسائل کا تعلق دو باب سے ہوتا ہے۔ ایک باب تو اطلاق ہوتا ہے اور دوسرے باب میں اس کا مقید ہونا معلوم ہوتا

[1] (الصحیح للبخاری ۱: ۲۳، کنز العمال: ۳۸۴۲۲)

ہے اور یہ قیود و شرائط بعض دفعہ ایسے ہوتی ہیں جن پر جاہل تو جاہل ناقص عالم کی نظر بھی نہیں پہنچتی۔ بعض دفعہ ناتمام علم سے لوگوں کو تنگی میں ڈالے گا اور جب وہ تنگی کی برداشت نہیں کرسکیں گے تو شرع کو بدنام کریں گے۔ مثلاً شریعت کا حکم ہے کہ اتحاد جنسین کے ساتھ تفاضل ناجائز ہے۔ مثلاً چاندی کے بدلے چاندی یا سونے کے بدلے سونا خریدا جائے تو مساوات ضروری ہے تفاضل (کمی بیشی) حرام ہے اب جاہل تو اس مسئلہ کو دیکھ کر اسی طرح بیان کردے گا اور ممکن ہے کہ ایک وقت میں چاندی کا بھاؤ روپے کے برابر نہ ہو بلکہ چاندی دس آنے تولہ ہو جو ایک روپیہ کے مقابلہ میں روپیہ کے وزن سے زیادہ آجائے گی اور ان حضرت کو صرف اتنا ہی مسئلہ معلوم ہے کہ اتحاد جنس کے وقت تفاضل حرام ہے تو یہ حضرت یا تو خود روپے کے برابر ہی لائیں پھر گھر والے ان کو بیوقوف بنائیں گے اور یا دوسروں کو اس پر مجبور کریں گے تو دونوں صورت میں شریعت کو بدنام کریں گے کہ یہ اچھا مسئلہ ہے کہ ایک چیز روپے میں روپے سے زیادہ آسکتی ہے مگر شریعت کہتی ہے کہ نہیں برابر ہی لو زائد مت لو۔ تو یہ خرابی جہل کی وجہ سے ہوئی محقق اگر اس مسئلہ کو بیان کرے گا تو ساتھ ساتھ یہ بھی کہہ دے گا کہ اگر چاندی ایک روپیہ کے بدلہ میں اس سے زیادہ آتی ہو تو اس وقت روپے سے چاندی نہ خریدو بلکہ روپے کو بھنا کر کچھ دونیاں چونیاں اور ان کے ساتھ کچھ پیسے ملا کر خریدو اب جائز ہے کہ ایک روپے کے بدلے میں تولہ بھر سے زیادہ چاندی لے آ ؤ کیونکہ ریزگاری میں جتنی مقدار چاندی ہوگی اس کے مقابلہ میں تو اس کے برابر چاندی آجائے گی باقی چاندی پیسوں کے مقابلہ میں ہو جاوے گی اور پیسہ اور چاندی میں جنس بدل گئی اس میں کمی بیشی جائز ہے بعض جاہل کہہ دیتے ہیں کہ یہ بات ہی کیا ہوئی روپیہ دینا اور روپیہ کی ریزگاری دینا ایک ہی بات ہے پھر اس کی کیا وجہ کہ روپے کے بدلہ میں تو تولہ بھر سے زیادہ چاندی نہ لے سکیں اور ریزگاری کے بدلہ میں زیادہ لے سکیں میں کہتا ہوں کہ یہ ضابطہ کی بات ہے کہ شریعت نے اس کو ناجائز کیا ہے اور اس کو جائز کیا ہے اس میں ایسے سوالات کا حق نہیں شریعت کا مقصود یہ ہے کہ تم کو نقصان نہ ہو اور احکام کے پابند بھی رہو۔ اس طرح سے کہ جو کام کرو شریعت سے پوچھ کر کرو تاکہ تم معاملات میں آزاد اور مطلق العنان نہ رہو کہ جس طرح چاہا کرلیا بلکہ حکم کے پابند ہو کر کام کرو کیونکہ جو ضروری کام تم آزادی کے ساتھ کرنا چاہتے ہو پابندی شریعت کے ساتھ بھی وہ کام نکل سکتا ہے۔ پھر خواہ مخواہ گناہ میں مبتلا ہونا کونسی عقلمندی ہے۔ یہ تو مثال تھی تنگی میں ڈالنے نہ ڈالنے کی۔

اختاری کہنے سے کس صورت میں طلاق واقع ہوتی ہے

اب مسئلہ کے اطلاق وتقیید کی مثال سنئے۔ مثلاً طلاق کے باب الکنایات میں فقہا نے لفظ اختاری کو کنایات طلاق میں بیان کیا ہے اور اس کا حکم یہ بیان کیا ہے کہ اس سے وقوع طلاق نیت کے بعد ہوتا ہے تو اس سے ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ اختاری میں بھی صرف نیت سے وقوع طلاق کا ہو جاوے گا لیکن اسی اختاری سے وقوع طلاق کی ایک اور شرط بھی ہے جو باب التفویض میں مذکور ہے وہ یہ کہ اختاری میں نیت کے ساتھ وقوع نہیں ہوتا بلکہ عورت جب اسی مجلس میں طلاق کو اختیار کرلے اس وقت وقوع ہوتا ہے اور اختیاری منکوحہ کی شرط فقہاء نے باب الکنایات میں نہیں بیان کی بلکہ یہ شرط باب التفویض میں لکھی ہے پس اب اگر کوئی اختاری کو صرف باب الکنایات میں دیکھ کر حکم بیان کرلے گا وہ ضرور غلطی کرے گا اور نیت زوج کے بعد فوراً وقوع کا فتویٰ دے دے گا حالانکہ یہ بالکل غلط ہے اور اس میں بعض علماء تک بھی غلطی کر چکے ہیں۔ چنانچہ علامہ شامی نے ایک فقیہ کی غلطی نکالی ہے کہ انہوں نے اس مسئلہ میں ایک غلط فتویٰ دیا ہے۔ نیز بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک مسئلہ ایک کتاب میں مطلق ہے دوسری کتاب میں مقید ہے اس لیے مسائل مہمہ میں مفتی کو لازم ہے کہ صرف ایک کتاب میں دیکھ کر فتویٰ نہ دے بلکہ مختلف کتابوں میں دیکھ کر جواب دے۔

فقہ کا فن بہت دقیق ہے

غرض فقہ کا فن بہت دقیق ہے اسی لیے میں فقہ حنفی کے سوا کسی دوسرے مذہب کی فقہی کتاب طلباء کو پڑھانے کی جرأت نہیں کرتا۔ کان پور میں ایک طالب علم نے جو شافعی المذہب تھے مجھ سے اپنے مذہب کی کوئی فقہی کتاب پڑھنا چاہی میں نے عذر کر دیا' مجھے یہ اختاری کا مسئلہ اس وقت یاد آ گیا میں نے ان سے یہی عذر کیا کہ بعض دفعہ ایک مسئلہ ایک مقام پر مطلق ہوتا ہے اور دوسرے مقام سے یا دوسری کتاب سے اس میں کچھ قید معلوم ہوتی ہے جیسے ہمارے یہاں مسئلہ اختاری اس کی نظیر ہے تو ممکن ہے کہ آپ کے فقہ میں بھی کوئی ایسا مسئلہ ہو جس میں دوسری جگہ کوئی قید مذکور ہو اور مجھے اس کی خبر نہ ہو تو ممکن ہے کہ میں آپ کو اطلاق کے ساتھ مسئلہ سمجھا دوں اور آپ بھی اسکو مطلق سمجھ کر ساری عمر غلطی میں مبتلا رہیں اس لیے میں آپ کے مذہب کی کتاب نہیں پڑھا سکتا اپنے مذہب کی کتابوں پر تو تھوڑی بہت نظر ہے اس کا ذخیرہ بھی اپنے پاس موجود ہے۔ دوسرے مذہب پر نہ اتنی نظر ہے نہ کتابوں کا زیادہ ذخیرہ اس میں غلطی ہو جانا کچھ بعید نہیں۔ پھر میں نے ان سے کہا کہ تم رام پور جا کر مولوی طیب صاحب عرب سے فقہ شافعی پڑھ لو وہ شافعی

المذہب ہیں ان کی نظر اپنے مذہب پر زیادہ ہے وہ اچھی پڑھائیں گے۔ علماء حنفیہ فقہ شافعی کو صحیح طور پر نہیں پڑھا سکتے جیسے علماء شافعیہ فقہ حنفیہ کو اچھی طرح نہیں پڑھا سکتے ہر مذہب والا دوسرے مذہب کے مسائل میں ضرور غلطیاں کرے گا۔ چنانچہ ہدایہ میں بعض مسائل کی نسبت دوسرے امام کی طرف غلط کر دی گئی اسی طرح شافعیہ کی کتابوں میں حنفیہ کی طرف بعض مسائل غلط منسوب کیے گئے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے ہندوستان میں تقلید مذہب حنفی کے وجوب کی کہ یہاں رہ کر کسی دوسرے مذہب پر صحیح عمل نہیں ہوسکتا کیونکہ ہندوستان کے علماء اکثر حنفی ہیں اور یہاں کتابیں بھی فقہ حنفی کی زیادہ ملتی ہیں اساتذہ بھی اسی فقہ کے میسر ہوسکتے ہیں۔ دوسرے فقہ کی نہ زیادہ کتابیں یہاں موجود ہیں نہ ان کے پڑھانے والے میسر آسکتے ہیں تو پھر عمل کی کیا صورت ہو۔

تلعب بالمذہب حرام ہے

ہمارے ایک مہربان مکہ مکرمہ جا کر شافعی بن آئے ہیں یہ تو کوئی ملامت وطعن کی بات نہیں تھی اگر تحقیق کے ساتھ دوسرے مذہب کو اختیار کیا جائے تو کچھ مضائقہ نہیں، مذاہب اربعہ سب حق ہیں۔ ہاں تلعب بالمذاہب البتہ حرام ہے کہ اس کو کھیل بنالیا جائے آج حنفی ہوگئے کل شافعی بن کر کیونکر رہ سکتے ہیں۔ یہاں رہ کر امام شافعی کے مذہب پر تمام مسائل میں وہ صحیح عمل کیونکر کریں۔ اس کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو وہ خود عالم ہوتے اور فقہ شافعی کو کسی فقیہ شافعی سے حاصل کیا ہوتا سو ان میں یہ وصف موجود نہیں یا ہندوستان کے علماء سے پوچھ پوچھ کر عمل کریں گے سو میں بتلا چکا کہ ہندی علماء مذہب شافعی کے مسائل کو صحیح طور پر نہیں بتلا سکتے۔ اب یہاں امام شافعی کے فقہ پر عمل کیونکر ہوگا۔ بس اس کی تیسری صورت یہ ہے کہ وہ مکہ مکرمہ ہی جا کر رہیں اور جہاں سے وہ شافعی بن کر آئے ہیں وہیں رہ کر اس پر عمل کریں وہاں اس مذہب کے مشائخ وعلماء واساتذہ بہت موجود ہیں جب وہ ملیں گے تب یہ بات ان سے کہوں گا (مذاہب کو کھیل بنانا) ابھی تو انہوں نے دوسرے گذشتہ واقعات سے معافی چاہی ہے میں نے لکھ دیا ہے کہ سب معاف ہے۔

کفرست درطریقت ماکینہ داشتن   آئین ماست سینہ چوں آئینہ داشتن

(ہماری طریقت میں کینہ رکھنا کفر ہے ہمارا آئین سینہ کو آئینہ کی طرح رکھتا ہے)

نااہل کو وعظ کہنے کی اجازت نہیں دینا چاہیے

الحمدللہ میرے دل میں کسی کی طرف سے کینہ کبھی نہیں ہوتا ہاں دوستانہ شکایت کبھی پیدا ہو جاتی ہے وہ بھی قائم نہیں رہتی جلدی زائل ہو جاتی ہے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ ایسے مسائل میں جو ایک جگہ

مطلق ہوں دوسری جگہ مقید ہوں جاہل واعظ ضرور غلطی کرے گا اور اس کے امتحان کی آسان صورت یہ ہے کسی جاہل کے وعظ میں ایک عالم کو دو چار دفعہ پردہ میں بٹھلاؤ' دو چار دفعہ کی اس لیے ضرورت ہے کہ ایک دفعہ تو غلطی سے محفوظ رہ جانا ممکن ہے مگر ہمیشہ محفوظ رہنا جاہل سے دشوار ہے دو چار دفعہ کے بعد ان عالم صاحب سے پوچھ لینا کہ اس نے کتنی غلطیاں کی ہیں ان شاء اللہ حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ یہ کام نااہل کو نہ دینا چاہیے۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ عالم سے غلطی نہیں ہوتی عالم بھی بشر ہے اس سے بھی غلطی ہو سکتی ہے مگر وہ خفیف اور قلیل غلطی کرے گا شدید اور بکثرت غلطی نہ کرے گا۔ یعنی اس کے بیان میں شاذ و نادر کبھی سو بار میں ایک غلطی ہو گی اور جاہل کے وعظ میں کثرت سے غلطیاں ہو گی۔ پھر عالم کو دوسرے وقت اپنی غلطی پر تنبہ ہو سکتا ہے اور دوسرے بیان میں اس کی اصلاح بھی کر سکتا ہے اور جاہل کو تنبہ بھی نہیں ہوتا کہ میں نے کیا غلطی کی ہے اس لیے یہ اس سے اشد ہے۔ خوب سمجھ لو صاحب آپ کو تجربہ نہیں اور مجھے تجربہ ہے جس کی بناء پر میں کہتا ہوں کہ نااہل کو وعظ کی اجازت نہ دینا چاہیے' واللہ جہل کی وجہ بڑی خرابیاں ہو رہی ہیں۔ کان پور میں ایک شخص نے ایک ایسے بکرے کی قربانی کی جس کا کوئی عضو عیب سے خالی نہ تھا' لوگوں نے اس سے کہا کہ اس کی قربانی جائز نہیں تو وہ کہتا ہے وہ ہماری بی بی صاحبہ نے فتویٰ دیا ہے کہ اس کی قربانی جائز ہے۔ پھر اس نے بیوی سے جا کر کہا کہ لوگ تمہارے فتویٰ میں غلطی نکالتے ہیں۔ اس نے شرح وقایہ کا اردو ترجمہ پڑھا تھا اس میں مسئلہ کا موقع نکال کر باہر بھیج دیا کہ دیکھو اس میں لکھا ہے کہ تہائی عضو سے کم کٹا ہوا ہو تو قربانی جائز ہے اور اس بکرے کا کوئی عضو تہائی سے زائد نہیں کٹا بلکہ کم ہی ہے کہ مجموعہ مل کر بہت زیادہ تھا' کچھ ٹھکانا ہے اس نامعقول حرکت کا کہ ایک عورت بھی شرح وقایہ کا ترجمہ پڑھ کر مفتی بن گئی۔ اب میں مکرر خلاصہ مقام کا عرض کرتا ہوں کہ آیت کا حاصل مدلول یہ ہوا کہ تحصیل علم کی بھی سخت ضرورت ہے اور عمل کی بھی۔

سخت وعید

اس کے بعد حق تعالیٰ فرماتے ہیں: "فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ" (پس دوزخ کے عذاب) یہ سخت وعید ہے جس میں حق تعالیٰ صیغہ تعجب سے فرماتے ہیں کہ یہ لوگ جو ہدایت و مغفرت کو اور بعنوان دیگر علم و عمل کو چھوڑ کر ضلالت و معصیت میں مبتلا ہیں جہنم میں جانے کے لیے کیسے دلیر اور کیسے بے باک ہیں۔ لفظ اصبر کے اختیار کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ وعید صبر و ثبات علی المعصیۃ پر ہے یعنی گناہوں پر اصرار کرنا اور ان پر جما رہنا سبب وعید ہے ورنہ ایک بار گناہ کر کے

پھر نادم ہو کر اس پر ثبات نہ کرنا اس وعید کا محل نہیں بلکہ توبہ کر لینے سے آئندہ و ماضی دونوں کی مغفرت ہو جاتی ہے۔ سبحان اللہ حق تعالیٰ کے کلام میں کیسی بلاغت اور کتنی رعایت ہے کہ لفظ سے علم عظیم پیدا ہوتا ہے۔ بس اب میں ختم کرتا ہوں وقت بہت ہو گیا بارہ بج چکے ہیں اتنی دیر بیان کا قصد نہ تھا میں نے اس وقت علم و عمل کی ضرورت پر بقدر ضرورت کافی تقریر کر دی ہے اور چندہ خاص کی کوئی ترغیب نہیں دی ہاں چندہ کے اصول بیان کر دیئے ہیں اور علماء کو چندہ خاص کی ترغیب سے منع کیا ہے۔ البتہ کام کرنے کی صورت بتلا دی ہے کہ جو کام کریں اس کی ضرورت کو مسلمانوں پر ظاہر کر دیں۔ اگر وہ ضرورت کو تسلیم کر لیں تو ان سے کہا جائے کہ اس کا انتظام کریں پھر چندہ وغیرہ وہ لوگ خود کریں گے علماء کو اس کی ضرورت نہیں اور ضرورت نہ سمجھیں تو کام کو بند کر دیں۔

مہتمم مدرسہ کی رپورٹ

اب مہتمم صاحب مدرسہ کچھ رپورٹ مدرسہ کی طرف سے سنائیں گے اس کو سننا چاہیے منتشر نہ ہونا چاہیے۔ اکثر عادت ہے کہ لوگ وعظ کے بعد منتشر ہو جاتے ہیں۔ یہ اچھا طریقہ نہیں جس جلسہ میں آپ مدعو ہیں اس کی کارروائی پوری ہونے کے بعد جانا چاہیے۔ لہٰذا سب صاحب مدرسہ کی رپورٹ سنیں اور اگر مدرسہ کے قائم رہنے کی ضرورت سمجھ میں آ جائے تو اس میں کوشش سے امداد کریں اور اگر اس کو فضول سمجھیں تو یہی ظاہر کر دیں تاکہ اس کے موافق عمل کیا جائے۔

والحمد للّٰہ رب العالمین وصلی اللّٰہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد وعلی الہ واصحابہ اجمعین۔

دعوات عبدیت کا تیسرا وعظ ملقب بہ

ضرورۃ العمل فی الدین

بمقام الہ آباد برمکان عبدالباقی خان صاحب ۷ ذیقعد ۱۳۲۹ھ وقت شب بعد عشاء ۳ گھنٹے کھڑے ہو کر یہ وعظ ارشاد فرمایا' سامعین کی تعداد تقریباً ۲۰۰۰ تھی۔ مولوی سعید احمد صاحب تھانوی مرحوم نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَاشَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارِکۡ وَسَلِّمۡ. اَمَّابَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ. بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ.

قال اللّٰہ تبارک و تعالیٰ رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِیۡھِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡھُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡھِمۡ اٰیٰتِکَ وَیُعَلِّمُھُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَۃَ وَیُزَکِّیۡھِمۡ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُالۡحَکِیۡمُ.

تین جزو کا بیان

یہ وہی آیت ہے جو اس کے قبل پڑھی گئی تھی دو مجلسوں میں اس کی تلاوت ہوئی ہے۔ مجلس اول میں اس کے متعلق تمہید عرض کی گئی تھی اور مجلس دوم میں ایک جز کی یعنی بحث الفاظ کی زیادہ تفصیل اور دوسرے جز کی یعنی علم معانی کی قدرے تفصیل کی گئی تھی۔ تیسرا جز یعنی عمل باقی تھا اس کی تفہیم اور دوسرے جز کی تتمیم کے لیے یہ وقت تجویز کیا گیا۔ یہ حاصل ہے اس آیت کا اس کے قبل یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اس آیت میں خدا تعالیٰ نے تین جزو کا بیان کیا ہے یتلوا اور **یعلمھم الکتب** اور **یزکیھم** اور یہ تینوں سب دین کے جزو ہیں۔ دین کی ضرورت اس سے پہلے بیانوں میں ثابت کردی گئی تھی اس کے اعادے کی ضرورت نہیں اور اس کے تین جزو میں سے یتلوا کے متعلق تحصیل الفاظ قرآنیہ کا مضمون بھی اس کے قبل بیان کیا جا چکا ہے پس اس وقت صرف جزو عملی کا بیان ہوگا باقی محض مضامین سابقہ کا مختصراً اعادہ بطور استحضار تمہید کے مکرر کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ یہ معلوم ہوا تھا کہ ہر مقصود میں خواہ وہ ادنیٰ درجے کا ہو یا اعلیٰ درجے کا ہو دو جزو ہوتے ہیں۔ ایک جزو علمی اور ایک جزو عملی۔ مثلاً اگر ہم کوئی دنیاوی کام کرنا چاہیں تو اول ہمیں اس کا علم ہوگا پھر اس کے بعد ہم اس پر عمل کریں گے یا جیسے میں نے پہلے بیان میں عرض کیا تھا کہ طبیب اس کو کہیں گے جس کو علم

ادویات بھی ہو اور ان کا استعمال بھی جانتا ہو۔ اسی طرح ہر مقصود کے اندر یہ ہی دو جزو ہیں تو دین بھی چونکہ مقاصد علیہ سے ہے اس لیے اس میں بھی یہ دو جزو معتبر ہوں گے اور میں نے یہ بھی بیان کیا تھا کہ علوم میں ایک مرتبہ دال کا ہوا کرتا ہے اور ایک مرتبہ مدلول کا۔ سو جس طرح تقسیم الی الجزئین ہر مقصود میں ہوتی ہے کچھ دین کی تخصیص نہیں اسی طرح دال و مدلول کا مرتبہ بھی ہر مقصود علمی میں ثابت ہوگا۔ اس میں دین کی تخصیص نہ ہوگی۔ مثلاً طب کے الفاظ کہ وہ دال ہیں معانی مقصودہ پر ان کے بغیر ان معانی کا سمجھنا مشکل ہے۔ پس الفاظ دال ہوئے معانی مدلول ہوئے۔ یہاں سے الفاظ کے دال علی المعانی اور کافی فی الدلالتہ ہونے کے متعلق ایک عجیب کام کی بات یاد آئی کہ وہ اہل باطن کے لیے بہت مناسب ہے چونکہ مجمع میں اس قسم کے لوگ بھی ہوں گے اس لیے اس کا ذکر مفید ہوگا وہ یہ ہے کہ بعض اہل باطن یہ سمجھتے ہیں کہ سلوک طے کرنے کے لیے کسی شیخ کی ضرورت نہیں اور اس خیال کی وجہ سے اگر کسی کو تجویز کرتے بھی ہیں تو پھر اس کو چھوڑ دیتے ہیں۔ بالخصوص اگر قلب میں کچھ حرکت و حرارت عبادت میں کسی قسم کی لذت آنے لگے تو سمجھتے ہیں کہ اب ہم کامل ہوگئے حالانکہ تکمیل اس کو کہتے ہیں جسے اہل فن تکمیل کہہ دیں۔ بچہ ایک دو کتاب پڑھ کر سمجھتا ہے کہ میں عالم ہوگیا حالانکہ علم سے ابھی اس کو مناسبت بھی نہیں ہوتی ہاں جب اہل علم یہ تجویز کردیں کہ اب یہ عالم ہوگیا ہے اس وقت کہا جائے گا کہ اس کو کمال فی العلم ہوگیا۔ ان لوگوں کی بعینہ وہ حالت ہے جیسے کہ مشہور ہے کہ بندر کے ہاتھ ایک ہلدی کی گرہ آگئی تھی کہنے لگا کہ میں بھی پنساری ہوں تو جیسے وہ بندر ایک ہلدی کی گرہ سے پنساری بنا تھا ایسے ہی یہ لوگ بھی اپنے خیال میں ذرا سی قلب کی حرارت وغیرہ کو دیکھ کر اپنے کو کامل سمجھ بیٹھے۔ بہرحال تکمیل سے مراد وہ ہے کہ جس کو اہل فن تکمیل سمجھیں۔

کشف قبور کوئی کمال نہیں

تو اگر قبل تکمیل شیخ کی وفات ہو جائے تو دوسرے سے رجوع نہیں کرتے بالخصوص اگر کشف قبور ہی ہو کہ اس صورت میں تو اپنے کمال میں شبہ بھی نہیں رہتا کیونکہ کشف قبور کے لیے صاحب نسبت فنا ہونا ضروری ہے تو جب صاحب نسبت بھی ہوگئے پھر کیا کسر رہی حالانکہ کشف قبور کوئی کمال نہیں ہے نہ مطلق نسبت کا حصول دلیل کمال ہے۔ کشف قبور کے نسبت فنا پر موقوف ہونے پر مجھے ایک محقق کی حکایت یاد آئی کہ ان سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ قبور سے فیض ہوتا ہے یا نہیں فرمایا کہ فیض لینے والا کون ہے اس شخص نے کہا کہ مثلاً میں ہوں، فرمایا کہ نہیں ہوتا۔ اللہ اکبر کتنا بڑا مسئلہ اور کس طرح دو جملوں میں حل کردیا۔ یہ بات اہل علم کے یاد رکھنے کی ہے کہ ان کو

جواب سائل کے تابع ہرگز نہ ہونا چاہیے اور جو طرز جواب کا ان کے لیے مصلحت ہو اس کو اختیار کرنا چاہیے گو وہ ان کی رائے کے خلاف ہو یہ ضروری نہیں کہ جس راہ سائل لے چلے اسی راہ چلیں جس طرح اس حکایت میں سائل نے تو یہ چاہا کہ پوری تحقیق مسئلے کی بیان کی جائے اور محقق مجیب نے اس کو بیکار سمجھ کر ان کی حالت کے مناسب جواب دیدیا کہ تم پورے مسئلے کو کیا کرو گے اپنا تعلق جس قدر مسئلے سے ہے اس کو سمجھ لو کہ تم کو قبور سے نفع نہیں ہو سکتا۔ پس سائلین تو یہ چاہتے ہیں کہ جس راہ ہم لے چلیں اس راہ اگر چلیں تو ہم جانیں گے کہ ہمارے سوال کا جواب ہوا ورنہ ہم سمجھیں گے کہ جواب نہیں ہوا' مجیبوں نے جب دیکھا کہ ان کی یہ حالت ہے تو جس چال انہوں نے چلایا اسی چال انہوں نے چلنا اختیار کیا۔ اس میں بڑی خرابی یہ ہوئی کہ سائلین کے امراض میں ترقی ہوتی گئی اور شبہات ترقی پذیر ہوتے گئے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے طبیب کے پاس کوئی مریض جائے کہ جس کو مرض و دق بھی ہوا اور زکام بھی ہو اور جا کر حکیم سے فرمائش کرے کہ اول زکام کا علاج کر دیجئے تو اگر طبیب زکام کے علاج میں ایک مدید مدت صرت کر دے تو وہ خائن ہے۔ اس کو چاہیے کہ مریض کو رائے دے کر ہرگز ایسا نہ کرو اول دق کی خبر لو اگر مریض اس تجویز پر یہ کہے کہ حکیم صاحب کچھ نہیں جانتے تو طبیب اس وقت کیا کرے گا۔ ظاہر ہے کہ اس کے جہل پر رحم کرے گا اور پھر بھی اپنی ہی تجویز اور اس کی مصلحت پر عمل کرے گا اور اگر اس نے مریض کا اتباع کیا تو وہ خود غرض ہے۔

اسی طرح محقق پر واجب ہے کہ جواب مصلحت کے موافق دے نہ کہ سائل کی مرضی کے موافق سوال میں جتنا ناشائستہ جز ہو اس کو نکال دے اگر سارا ہی ناشائستہ ہو تو جواب ہی نہ دے اور اگر جواب دے تو یہ ضروری نہیں کہ سب کا جواب دے بلکہ جتنا مناسب ہو اتنا جواب دے۔ مجھے یاد آیا کہ مجھ سے ایک شخص نے پوچھا کہ کافر سے سود لینا کیوں ناجائز ہے تو ان کی مرضی کے موافق تو یہ تھا کہ میں دو ورق میں مدلل جواب دیتا مگر میں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ ایسا کرنا ان کی مصلحت کے خلاف تھا بلکہ میں نے یہ لکھا کہ کافر عورت سے زنا کیوں ناجائز ہے۔ یہ اس سوال کا جواب تحقیقی ہی تھا لیکن اس وقت کم علمی اس قدر چھا گئی ہے کہ وہ اس کو سمجھے ہی نہیں۔ حاصل اس جواب کا یہ تھا کہ جو حرام قطعی ہے وہ کسی محل میں بھی جائز نہیں یہ تھا جواب اس کو سمجھ کر وہ جتنے شبہے کرتے وہ صحیح ہوتے۔ اتفاق سے وہ شخص ایک مرتبہ مجھ سے ملے وہ تو مجھے پہچانتے تھے لیکن میں نہ پہچانتا تھا' کہنے لگے کہ آپ نے تو مجھے نہ پہچانا ہوگا میں نے کہا بیشک' میں نے نہیں پہچانا' کہنے لگے کہ میں وہی شخص ہوں جس کے پاس سے اس قسم کا سوال جناب کے پاس آیا تھا اور اب میں پوچھتا ہوں کہ آپ نے اس قسم کا جواب کیوں دیا تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ یہ

جواب کو ابھی تک نہیں سمجھے تو میں نے ان کی سمجھ کے موافق اس استفسار کا ایک دوسرا جواب دیا' میں نے کہا کہ آپ ایک عہدیدار ہیں آپ کو ہر قسم کے آدمیوں سے سابقہ پڑتا ہے کیا آپ سب کے ساتھ ایک سا برتاؤ کرتے ہیں یا احباب کے ساتھ دوسری قسم کا برتاؤ ہے اور اجانب کے ساتھ دوسری قسم کا کہنے لگے کہ ہر قسم کے آدمیوں سے علیحدہ برتاؤ ہوتا ہے میں نے کہا کہ جب یہ ہے تو افتاء کا بھی ایک محکمہ ہے اس میں بھی اسی طرح کسی کو ضابطہ کا جواب دیا جاتا ہے کسی کو دوسری قسم کا' میں چونکہ آپ کی حالت سے واقف نہ تھا' اس لیے میں نے آپ کو ضابطہ کا جواب دیا اور اب چونکہ آپ سے ملاقات ہوگئی ہے اب انشاء اللہ تعالیٰ اس قسم کا جواب نہ آئے گا لیکن اس ملاقات کا جیسا اثر مجھ پر ہوگا آپ پر بھی ہوگا' آپ کے پاس سے بھی اس قسم کا لغو سوال کبھی نہ آئے گا۔ غرض اس وقت یہ ایسی آفت ہے کہ مجیب سائل کے تابع ہوجاتے ہیں مگر ان محقق کا جواب نہایت ہی نفیس تھا کہ اگر فیض لینے والا تو ہے تو نہیں ہوتا۔ مقصود یہ ہے کہ قبور سے جو فیض ہوتا ہے تو صاحب نسبت فناء کو ہوتا ہے خیر یہ حکایت تو تبعاً بیان ہوگئی۔ اصل بیان اس کا ہے کہ طالب اگر صاحب کشف بھی ہوجائے تب بھی اس کو شیخ سے استغناء جائز نہیں کیونکہ اس میں کفایت نہیں ہوتی۔

فیض کی دو قسمیں

وجہ یہ ہے کہ فیض کی دو قسمیں ہیں ایک بہ دلالت لفظیہ یعنی تعلیم و تلقین ایک غیر لفظیہ یعنی تقویت نسبتاً افادہ اور استفادہ میں لفظیہ بہت مفید اور ممد ہے پس صرف قبور سے استفادہ پر بس کرنا غلطی ہے کیونکہ قبور سے اتنا فیض ہوتا ہے کہ حالت موجودہ میں ترقی ہوتی ہے و بس بخلاف زندہ کے کہ اگر کوئی شبہ ہو تو اس کو پیش کر کے حل کر سکتا ہے۔ خوب مشبع طور سے تو اسکی برابر ہرگز فیض قبور نہیں ہوسکتا۔ یہ اس کی فرع تھی کہ الفاظ کی برابر افادہ نہیں ہوسکتا' یہ ہی میں نے اجمالاً بیان کیا تھا' پس علم کے متعلق دو جز ہوئے الفاظ اور معانی اور تیسرا مقصود عمل ہوا یہ حاصل ہے اس آیت کا اور یہ میں نے بیان کر دیا تھا کہ الفاظ کے متعلق کافی بحث ہوگئی ہے اور چونکہ اور علوم میں الفاظ کی ضرورت مقصود نہیں ہے اس لیے اس میں اردو وغیرہ نفس مقصودہ کے حصول میں سب برابر ہیں اور قرآن شریف میں بخصوصہا الفاظ بھی مقصود ہیں اس کو خوب بیان کر دیا تھا البتہ الفاظ کے متعلق ایک چھوٹی سی بات رہ گئی تھی وہ اب بیان کئے دیتا ہوں۔

الفاظ قرآنی کے حقوق

وہ یہ کہ الفاظ کے کچھ حقوق ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ اپنی ہیئت کے ساتھ پڑھنے اور لکھنے دونوں میں محفوظ رہیں کیونکہ عربیت ایسی ہی ہے جیسے اردو سو اگر اردو کے قواعد پر رہے تو وہ اردو کہلائے گی

ورنہ نہیں جیسے آج کل تشبہ کے لیے اردو غلط بولنے لگے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ اردو نہیں ہے میں نے خود اسٹیشن کانپور پر دیکھا کہ ہندوستانی شخص نے اردو کو خراب کر کے ایک شخص سے کہا کہ ہم یہ بات سننا نہیں مانگتا اور فصیح اردو کا چھوڑنا محض اس نیت سے کہ انگریزوں سے تشبہ ہو۔ افسوس ہے کہ وہ اس کوشش میں ہیں کہ ہم کو اردو آ جائے اور ہم اس کوشش میں ہیں کہ جو کچھ آتی ہے وہ بھی خراب ہو جائے۔ میں نے پہلی مجلس میں عرض کیا تھا کہ وہ تو ہماری چیزیں لیتے جاتے ہیں اور ہم ان کی چیزیں اختیار کرتے جاتے ہیں۔ یہ بھی اسی کا ایک شعبہ ہے کیا انتہا ہے کہ الفاظ میں بھی باوجود اختیار اور قدرت کے ان کے موافق ہونے کی کوشش کی جاتی ہے۔ غرض جیسے یہ اردو نہ تھی اسی طرح اگر عربی کو بگاڑ کر پڑھا جائے تو وہ عربی نہ ہوگی۔ اس وقت جو لوگ قرآن شریف کے پڑھنے کی طرف توجہ کرتے ہیں وہ بھی اس کی تصحیح کی طرف توجہ نہیں کرتے بلکہ اکثر علماء کو بھی اس کا خیال نہیں ہے حالانکہ اس پر توجہ نہ کرنے سے بڑی بڑی غلطیاں ہوتی ہیں۔

تلاوت کی تین غلطیاں

قرآن شریف میں تین قسم کی غلطیاں ہوتی ہیں ایک تو وہ کہ جن کو عوام بھی سمجھتے ہیں دوسرے وہ جن کو خواص سمجھتے ہیں تیسرے وہ جن کو خواص الخواص سمجھتے ہیں اس کی ایک مثال اردو میں پیش کرتا ہوں۔ مثلاً لفظ پنکھا بولتے ہیں تو نون کے بعد کاف ہے اور نون ساکن ہے لیکن نون کو اس کے مخرج سے نہیں نکالتے بلکہ اس کو خیشوم سے نکالا جاتا ہے اس کو سب جانتے ہیں اس کو اصطلاح میں اخفا کہتے ہیں۔ یہ اظہار اور ادغام کے بین بین ہوتا ہے تو پنکھا میں نون اخفا کے ساتھ ہو تو اگر کوئی یہاں اظہار کرے یعنی نون کو اس کے مخرج سے نکالے اس طرح پن تو سب ہنسیں گے اور اس کو اردو نہ کہیں گے اس لیے کہ اخفاء نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ اگر قواعد سے زبان ہے تو اصلی ہے ورنہ نہیں۔ بس اسی طرح عربی زبان میں بھی مثلاً موقع اخفاء میں اخفاء واجب ہوگا جیسے پنکھا اظہار کے ساتھ غلط ہے۔ اسی طرح عربی میں بھی اگر اخفاء کی جگہ اخفاء نہ ہوا تو لفظ غلط ہے۔ کتنی موٹی بات ہے مگر اس کو کوئی نہیں سمجھتا تو جیسے پنکھا اظہار سے اردو نہ رہے گا اسی طرح عربی لفظ بھی اخفاء کی جگہ اظہار کرنے سے عربی نہ رہے گا اور خدا تعالیٰ فرماتے ہیں: "قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا" تو جب قرآن عربی میں ہے اور تجوید کے خلاف کرنے سے عربی نہ رہے گا تو قرآن عربی میں نہ پڑھا۔ عاقل کے لیے یہ تقریر بالکل کافی ہے میں نے علماء قرأت کے اقوال اس لیے نقل نہیں کیے کہ لوگ ان کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ ایک مثال دے دی جس کو سب مانتے ہیں اور یہ ایک مثال

نمونے کے طور پر بتلا دی ہے اسی طرح بہت سے قاعدے ہیں۔ مجھے اس کا افسوس ہے کہ اس کثرت سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ "وَلَا الضَّالِّيْنَ" ہے یا "وَلَا الظَّالِيْن" لیکن اس کے سیکھنے کی طرف توجہ نہیں کی جاتی جو کام تلفظ کا ہے اس کو کتابت سے نکالا جاتا ہے حالانکہ تلفظ کا کام کتابت سے کیسے ادا ہو کتابت میں تو صرف صفات آ سکتے ہیں باقی جو امور مدرک بالسمع ہیں وہ کس طرح کتابت میں آ جائیں گے۔ کسی نے خوب کہا ہے:

گر مصور صورت آن دلستاں خواہد کشید   لیک حیرانم کہ نازش راچساں خواہد کشید

(اگر مصور کی بنائی ہوئی تصویر لوگوں کے دلوں کو کھینچ لے گی لیکن میں حیران ہوں کہ اس محبوب کے ناز وانداز کس طرح دکھائے گا)

قرآن پاک تجوید سے پڑھنے کی ترغیب

اگر محبوب کی تصویر مصور بنا بھی لے گا تو اس کے ناز وادا کو کیونکر دیکھا جائے گا تو اگر ض کی صفات لکھ کر بھیج دے تو اس کے ادا کرنے کی کیفیت تو نہیں لکھ سکتا۔ کوئی فوٹو گراف تو نہیں کہ اس کو بھیج دیا جائے ہاں اگر یہ کہا جائے کہ ہر سوال کے جواب میں ایک قاری بھیج دیا جائے تو خیر۔ غرض یہ سخت غلطی ہے کہ کتابت سے کام نکالنا چاہیں بلکہ آ کر سیکھنا چاہیے تو تجوید کی ضرورت ثابت ہوگئی اور بدوں اس کے جس طرح آپ جاہلوں کو غلط بولتے دیکھتے ہیں اور ان پر ہنستے ہیں اسی طرح مجودین آپ پر بھی ہنستے ہیں مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک مدنی لکھنؤ میں آئے اور انہوں نے قرآن سنایا، ہندوستانی ذہین تو ہوتے ہیں ایک لڑکے نے ان کی قرأت کا چربہ اتارا، لوگوں نے اس کو خوب مشق کرائی اور جب اپنے نزدیک وہ قاری صاحب سے افضل ہوگئی تو اپنا کمال ظاہر کرنے کے لیے قاری صاحب کے پاس اس لڑکے کو لے گئے اور کہا کہ اس نے کچھ تبرکاً آپ کا اتباع کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہا سنائیے چنانچہ لڑکے نے سنایا جب سنا چکا تو یہ لوگ داد کے منتظر ہوئے۔ قاری صاحب نے کچھ نہ کہا تو خود ہی پوچھا کہ اس نے کیسا پڑھا۔ قاری صاحب نے کہا کہ ایسا پڑھا جیسا ہم نے ایک لغات اردو بنایا ہے کہ "**الحنار ککری الحطب لکری العنکبوت مکری**" اس وقت حقیقت معلوم ہوئی کہ کیسا قرآن صاحبزادے نے پڑھا ہے۔ دیکھئے اگر کوئی شخص ککری اور لکری کہنے لگے تو کیا اس کو اردو بولنے والا کہیں گے ہرگز نہیں۔

مولانا محمد یعقوب مہاجر مکی سے ایک عربی نے کہا کہ آپ لوگ اتنے دنوں سے عرب میں رہتے ہیں لیکن اب تک عرب جیسا قرآن شریف نہیں پڑھ سکتے۔ انہوں نے کہا کہ غیر زبان میں

اہل زبان کی سی مہارت نہیں ہو سکتی، کہنے لگے کہ کیوں نہیں ہو سکتی، آخر ہم اردو بولتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ آپ ہرگز اہل زبان کے برابر نہیں بول سکتے اور اگر بول سکتے ہیں تو کہیے ٹٹو، ٹھٹھا۔ ان بیچارے نے کہا تو تو تا ہی نکل سکا مگر یہ تو دفع الوقتی تھی وہ لوگ تو اس کے مکلف نہیں کہ اردو صحیح بولیں اور ہم تو مکلف ہیں قرآن صحیح پڑھنے کے مگر خدا کا شکر ہے کہ اب چند روز سے علماء نے اس پر توجہ کی ہے کہ مدارس میں قراء بھی نوکر رکھے ہیں لیکن ضرورت اس کی ہے کہ سب ادھر متوجہ ہوں اور کچھ لہجے کی ضرورت نہیں، صرف حروف کو صحیح کر لینا چاہیے اور اس میں کچھ زیادہ مدت نہیں لگے گی، صرف اٹھائیس حرف ہیں اور ان میں بعض ایسے ہیں کہ ان کی مشق کی ضرورت ہی نہیں البتہ بعض حروف کی مشق کی ضرورت ہے جیسے ت ط ز ض ظ ر کی ترقیق تفخیم تو اگر ایک ایک حرف کے لیے تین تین دن لیے جائیں تو ایک ماہ سے زیادہ صرف نہ ہوگا اور قرآن شریف صحیح ہو جاوے گا، رہے محسنات سو ان کا سیکھنا ہر ایک کے لیے ضروری نہیں نیز سارے قرآن کو سیکھنے کی ضرورت نہیں، قواعد کے موافق اگر تھوڑا بھی پڑھ لیا جائے تو کافی ہے پھر سب خود صحیح ہو جائے گا، ہاں کسی استاد سے پیش کرنا سارے قرآن شریف کا ضروری ہے اور یہ مضمون بہت ہی ضروری ہے۔ اس کی طرف علماء کو بالخصوص توجہ کرنا چاہیے۔ اس وقت اگر پچاس مولویوں کو جمع کر کے قرآن شریف سنا جائے تو بہ مشکل دو آدمی صحیح قرآن شریف پڑھنے والے نکلیں گے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ طلبہ فلسفہ پڑھتے ہیں، منطق پڑھتے ہیں اور راس العلوم قرآن شریف کو نہیں پڑھتے اور پھر غضب یہ کہ ایسے لوگ امام ہو جاتے ہیں اور اس میں دنیاوی خرابی یہ ہے کہ بعض اغلاط پر عوام بھی مطلع ہو جاتے ہیں اور علماء کی بے قدری کرتے ہیں۔ ایک صاحب نے سورہ الناس میں **"من الجنات والنس"** پڑھا ایک صاحب نے سورہ ابی لہب میں **"تبت یدا ابی لحب"** پڑھا۔ ایک صاحب نے کہا کہ حضور اتنے بڑے عالم ہو کر غلط پڑھتے ہیں، کہنے لگے کس طرح پڑھوں، ان صاحب نے آہستہ سے بتلایا کہ **ابی لھب** آہستہ اس لیے بتایا کہ کوئی سنے نہیں، ناحق کی رسوائی ہے تو وہ بزرگ اس آہستگی ہی کو مقصود سمجھ کر فرماتے ہیں، ہاں زور سے نہ پڑھا کروں ہلکے سے پڑھا کروں۔ (اناللّٰہ وانا الیہ راجعون) سمجھانے پر بھی نہ سمجھے، بات یہ ہے کہ بلا حاصل کیے ہوئے کچھ آتا نہیں۔ دیکھئے آج کل اس کی کوشش کرتے ہیں کہ انگریزوں کا لب و لہجہ آجائے اور اس کے لیے کیا کیا تدبیریں کی جاتی ہیں، کوئی اپنی اولاد کو لندن بھیجتا ہے کسی نے اپنے بچوں کو میموں کے سپرد کر دیا ہے حالانکہ اس پر نہ پاس ہونا موقوف ہے ڈگری لیکن باوجود اس کے اس کی طرف تو

اتنی توجہ کہ اس کے صرف پڑھنے پر ہی اکتفا نہیں بلکہ لب ولہجہ حاصل کرنے کی بھی تمنا اور کوشش ہے اور قرآن شریف کو ایسا چھوڑا جائے کہ اول تو پڑھا ہی نہ جائے اور اگر پڑھیں بھی تو یوں خراب کر کے۔ صاحبو! اگر قرآن شریف کو چھوڑ دیں تو بتلایئے کہ پھر اور کون اس کو پڑھے گا' ہر شخص کو قرآن شریف اس طرح پڑھنا چاہیے کہ معلوم ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پڑھ رہے ہیں۔ واللہ اس میں ایسی لذت ہے کہ اگر ادراک میں تھوڑی سی صحت ہو تو ساری تغنی ایک طرف اور تلاوت قرآن شریف ایک طرف۔

ایک بزرگ تھے مولوی کرامت علی صاحب انہوں نے قرآن شریف عرب میں سیکھا تھا' ایک مغنی نے ان کو پڑھتے سنا اور کہا کہ اس سے اچھی بھیرویں میں نے آج تک نہیں سنی۔ مولوی صاحب نے فرمایا میں کیا جانوں بھیرویں کیا ہوتی ہے' کہنے لگا آپ کو خبر نہیں کہ یہ بھیرویں ہے تو قرآن شریف ایسی عجیب چیز ہے کہ ہر لہجے میں ڈھل جاتا ہے۔ دیکھئے مولوی صاحب کو خبر بھی نہیں مگر اس مغنی کو اس کے مذاق کے موافق لطف آیا۔

بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ میدارد برنگ اصحاب صورت را بو ارباب معنی را

(اس عالم کی دلکش بہار دل و دماغ کو تازہ کر دیتی ہے اصحاب صورت کے رنگ معنی ادا ہو جاتے ہیں۔

کبھی مکہ معظمہ جانا ہو تو دیکھئے گا کہ ہر گوشے سے کیسی پیاری پیاری آوازیں آتی ہیں۔ واللہ انسان محو ہو جاتا ہے اور ہم کو جو مزہ نہیں آتا تو اس لیے کہ ہم کو پڑھنا آتا نہیں ورنہ صحیح پڑھنے والوں کو خود مزہ آتا ہے۔

قرآن شریف کی خاصیت

فرماتے ہیں کہ قرآن شریف کی تو خاصیت یہ ہے: "تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ" قرآن سن کے تو ان اللہ سے ڈرنے والوں کے رونگھٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ہم میں یہ اقشعرار ہے نہیں تو کیا بات ہے کچھ تو قلوب ہی درست نہیں کچھ غلط پڑھنے کی بدولت اور جب کبھی کوئی صحیح پڑھنے والا آ جاتا ہے تو غور کر کے دیکھ لیجئے کہ قلوب کی کیا حالت ہوتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے پڑھنے میں جو ہم کو مزا نہیں آتا اس کی بڑی وجہ یہ ہی ہے کہ ہم کو پڑھنا نہیں آتا' لہٰذا اس کی کوشش کرنی چاہیے کہ ہم کو پڑھنا آئے۔ یہ حصہ لفظی علم کا بحمداللہ ختم ہو گیا اب علم معانی کا درجہ اور عمل باقی رہ گیا۔ آج اس میں جو رہ گیا تھا' قابل بیان ہے یہ تو معلوم ہے کہ اس وقت کتنی بے

التفاتی علوم دینیہ سے ہو رہی ہے اب دیکھئے کہ یہ مضر ہے یا نہیں، میں فضائل بیان نہیں کرتا کیونکہ ضرورت کے بتلا دینے کے بعد فضائل کے ذکر کی حاجت نہیں۔ تو میں صرف اتنا بیان کروں گا کہ جس گورنمنٹ کے ماتحت کوئی شخص رہتا ہے اس کو اس گورنمنٹ کے قوانین جاننے کی ضرورت ہے۔

قوانین کی دو قسمیں

قوانین دو قسم کے ہیں ایک تو وہ کہ جن میں محض ہار جیت ہو جیسے مال کے قوانین۔ سو اول تو ان کا جاننا بھی ضروری ہے کہ ان میں جلب منفعت اور دفع مضرت ہے لیکن اگر ان کو نہ سیکھا جائے تو زیادہ ضرر نہیں کیونکہ ہار جانا خسارہ ہے جرم نہیں۔ دوسرے وہ قوانین ہیں کہ ان کی خلاف ورزی جرم اور بغاوت ہے اس کا سیکھنا واجب ہوتا ہے۔ خواہ پڑھ کر یا پوچھ کر جیسے ایک شخص کو تجارت کی اجازت ہے اور جب معلوم ہو کہ مثلاً کو کین کی تجارت کی اجازت نہیں تو اس سے رکے۔ اب یہ سوال کرتا ہوں کہ ہم لوگ خدا تعالیٰ کی عملداری میں ہیں یا نہیں اور دوسرا سوال یہ کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ کے کچھ قوانین ہیں کہ نہیں اگر ہم اس کی عملداری سے باہر ہوتے یا وہ صاحب قوانین نہ ہوتا تب تو چنداں فکر نہ تھی اور جبکہ یہ دونوں باتیں ہیں تو اب بدوں قوانین سیکھے چارہ نہیں۔ خدا تعالیٰ کی عملداری سے باہر نہ ہونا تو ظاہر ہے کہ وہ سب کو قدرۃً محیط ہے ہر مذہب کے لوگ بلکہ حکماء بھی اس کو جانتے ہیں رہا دوسرا جز تو اس کو سب مسلمان بلکہ ہر مذہب کے لوگ مانتے ہیں اب یہ بات رہ گئی کہ وہ قوانین کس قسم کے ہیں۔ آیا ان میں صرف اپنا نقصان ہے یا ان کی مخالفت جرم اور بغاوت بھی ہے۔ سو قرآن شریف کو اٹھا کر دیکھ لیجئے کہ تمام قرآن شریف اس سے بھرا پڑا ہے۔ کہیں ''اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا'' اللہ نے خرید و فروخت حلال کی ہے اور سود حرام کیا ہے۔ ''لَاتَقْرَبُوا الزِّنَا'' دور رہو زنا سے ہے۔ غرض تمام قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ہمارے معاشرت اور معاملات دونوں کے متعلق کافی انتظام فرمایا ہے اور عدم اطاعت پر وعید بھی فرمائی ہے پھر کیا شبہ رہ گیا۔ آج کل لوگ قوانین خداوندی صرف نماز روزہ کو سمجھتے ہیں باقی دوسرے امور میں اپنے کو آزاد محض سمجھتے ہیں۔ سو اول تو میں یہ پوچھتا ہوں کہ آپ نے نماز روزے ہی میں کونسا اہتمام کیا ہے۔ افسوس ہے کہ معاملات سے یہ آزادی شروع ہوتی تھی مگر چونکہ زمانہ ترقی کا ہے ہر چیز کو ترقی ہوتی ہے اس کو بھی یہاں تک ترقی ہوئی کہ تحریراً اور تقریراً یہ کہا جاتا ہے کہ جس غرض سے نماز مقرر ہوئی تھی یعنی تہذیب نفس اب بوجہ غلبہ تہذیب کے چونکہ وہ ضروری نہیں رہی اس لیے نماز کی ضرورت نہیں۔ روزہ کے متعلق کہتے ہیں کہ فدیہ دیدیں تو روزہ رکھنے کی ضرورت نہیں اور یہ خرابی اس کی ہے کہ ہر شخص قانون شریعت کے معنی بیان کرنے میں

آزاد ہے جس کا جو جی چاہے کہہ دے حالانکہ موٹی سی بات ہے کہ اس وقت قانون کی کتابیں موجود ہیں لیکن پھر بھی اگر کوئی فیصلہ ہائی کورٹ میں جا کر منسوخ ہو تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ماتحت نے اس دفعہ کے معنے نہیں سمجھے اب دیکھئے کہ ماتحت بھی جج ہے اور حاکم بالا بھی جج ہے مگر چونکہ یہ مان لیا گیا ہے کہ ہائیکورٹ کے جج کی برابر کوئی قانون کو نہیں سمجھتا تو سب اس کا اتباع کرتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ گو قانون عام ہو اور سب کے پاس ہو مگر پھر بھی یہ ماننا پڑے گا کہ بعض لوگ اس قدر سمجھتے ہیں کہ دوسرے نہیں سمجھتے۔

حضرات متبعین کے علوم کا فرق

اب میں اس کی شرح کرتا ہوں کہ قرآن شریف کے سمجھنے والے ایک ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما و حنیفہ رحمہ اللہ تھے۔ ایک آج کل کے زید وعمر ہیں تو اپنے اور ان کے علوم کا مقابلہ کر کے دیکھ لیں بلکہ ان حضرات کے متبعین ہی کے علوم سے مقابلہ کر لیں جو کہ اپنے کو ان سے بدرجہا کم تر سمجھتے ہیں۔ انشاء اللہ ان ہی کے علوم سے زمین و آسمان کا فرق ظاہر ہو گا اور ابوحنیفہ کے علم سے تو کیا جانے کتنا فرق ہو گا تو دیکھئے کہ ہائیکورٹ کے جج اور ماتحت جج باوجود یہ کہ دونوں یکساں ہیں مگر پھر بھی فرق مانا گیا تو دین میں اس کا قائل کیوں نہ ہوا جائے گا خود رائی کی اجازت کیونکر دی جائے گی۔ ان سلف صالحین کے مقابلہ میں اگر ہم تفسیر کرنے بیٹھیں وہ تفسیر ایسی ہو گی جیسے کہ ایک غیر ملکی دیہاتی کے پاس ایک من کا بورا تھا' جب وہ اسٹیشن پر پہنچا تو پلیٹ فارم پر جانے کے وقت ٹکٹ کلکٹر نے کہا کہ اس کی بلٹی لاؤ' کہنے لگا کہ ہمارے پاس یہ ٹکٹ ہے یہ ہی کافی ہے ٹکٹ کلکٹر نے کہا کہ یہ تو تمہارا ٹکٹ ہے ہم اس اسباب کا ٹکٹ مانگتے ہیں کیونکہ یہ پندرہ سیر سے زائد ہے۔ اب یہ دیہاتی صاحب قانون ریلوے کی تفسیر کرتے ہیں کہ پندرہ سیر کی جو حد مقرر کی گئی ہے اس لیے کہ ہندوستانی لوگ اس سے زائد اسباب اپنے ہاتھ میں اٹھا نہیں سکتے اور ہم چونکہ اٹھا سکتے ہیں اس لیے یہ حد ہمارے واسطے نہیں بلکہ جس قدر ہم اٹھا سکیں اس قدر کی ہم کو اجازت ہے۔ آپ اس تفسیر کو سن کر اندازہ کیجئے۔ کیا یہ تفسیر ٹکٹ کلکٹر کے مقابلے میں صحیح مانی جائے گی اور کیا ٹکٹ کلکٹر کے ذمہ یہ واجب ہے یا اس کو جائز ہے کہ اس کو اس تفسیر کی اجازت دے۔ نیز کیا اس کے ذمہ یہ ضروری ہے کہ وہ اس کے ساتھ مناظرہ کرے یا صرف یہ کافی ہے کہ اس کو ڈانٹ دے اور اس سے محصول وصول کرے اور کیا اس کا یہ کہنا کہ منشاء قانون کا یہ ہے کہ ہندوستانی پندرہ سیر سے زیادہ نہیں اٹھا سکتے قابل سماعت ہے اور کیا ٹکٹ کلکٹر پر یہ ضروری ہے کہ اس کو نہایت ٹھنڈے دل سے

سن کر نہایت اطمینان سے اس کو سمجھا دے کہ نہیں بھائی تم غلط سمجھتے ہو قانون کا یہ منشا نہیں اور اگر وہ غصہ ہو تو کیا وہ قابل ملامت ہے جیسے آج کل علماء پر الزام دھرا جاتا ہے کہ ان کو بہت جلد غصہ آ جاتا ہے ہرگز نہیں۔ بات یہ ہے کہ صاحب فن غیر فن داں سے کلام کرنے کو اپنے لیے عار اور تضیع اوقات سمجھتا ہے اور بزبان حال وہ کہتا ہے کہ

تو ندیدی گہے سلیماں را   چہ شناسی زبان مراغاں را

(لو تم نے حضرت سلیمان علیہ السلام تک کو نہ دیکھا تم چڑیوں کی زبان کیا جانو گے)

بلکہ غیر فن داں پر واجب ہے کہ بجائے مناظرے کے وہ یہ ہی کہہ دے کہ

من ندیدم گہے سلیماں را   چہ شناسم زباں مراغاں را

(میں نے کبھی حضرت سلیمان علیہ السلام کو نہ دیکھا' میں چڑیوں کی زبان کیا جانوں)

باقی سوالات کا پیدا ہونا وہاں بھی ہے جس نے کبھی قوانین نہ سنے ہوں اس کو بھی یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اس کی کیا وجہ' پندرہ سیر کی اجازت کیوں ہوئی' چودہ سیر یا سولہ سیر کی اجازت کیوں نہ ہوئی۔

فن داں اور غیر فن داں کا فرق

تو اگر اس دیہاتی کی رائے مقبول ہے تو آج کل کے عقلاء کی رائے بھی مقبول ہے۔ صاحبو! کیا فن داں اور غیر فن داں برابر ہو سکتے ہیں' کبھی نہیں۔ "هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ" کیا جاننے اور نہ جاننے والے برابر ہو سکتے ہیں۔ معلمین خوب جانتے ہیں کہ ان کو اپنے طالب علموں کی کم فہمی پر اکثر غصہ آتا ہے کہ کمبخت سمجھتا ہی نہیں تو کیا ان لوگوں کو طالب علموں سے عداوت ہوتی ہے ہرگز نہیں بلکہ یہ طبعی قاعدہ ہے غرض دیکھئے کہ باوجود اس بات کے کہ اس دیہاتی کی تفسیر ناواقف کے دل کو لگتی ہے مگر جس نے ریلوے کا یہ قاعدہ بچپن سے سنا ہے اس لیے اس کی تفسیر پر ہنسی آتی ہے۔ کاش اگر اہل علم کو قابل اعتماد سمجھتے تو ان کے مقابلے میں کوئی مخترع تفسیر آپ کے دل کو نہ لگتی۔ صاحبو! کیا تیرہ سو برس کے بعد آج قرآن شریف کے معنی حل ہوئے ہیں۔

دوسرے طور پر عرض کرتا ہوں کہ آج کل کے قاعدہ کے موافق کثرت رائے سے ہر بات طے ہوتی ہے اور اگر کسی بات پر اتفاق رائے ہو جائے تو بہت ہی قوت کے ساتھ وہ بات طے ہو جاتی ہے۔ سو مسائل شرعیہ تو تیرہ سو برس سے آج تک مسلمہ متفقہ چلے آتے ہیں اور اگر یہ بات

بھی نہ ہو تو کثرت کے بعد غیر ممبروں کی رائے کوئی قابل وقعت نہیں شمار ہوتی۔ بس اسی طرح دین میں بھی کثرت رائے کے بعد چند ناواقفین کا اختلاف کرنا جوئی چیز نہ سمجھا جائے گا۔ افسوس سے کہا جاتا ہے کہ روزے کے بارے میں اس قدر گڑ بڑ کی ہے کہ جس کی حد نہیں اور آیت کی تفسیر بالکل اپنی رائے سے خلاف مقصود کی ہے حالانکہ اس کی حقیقت کو اہل علم ہی سمجھ سکتے ہیں لیکن بعض لوگوں کو کچھ شوق ہوا کرتا ہے کہ وہ اپنے مرتبے سے زیادہ سمجھنا چاہا کرتے ہیں اگر ان کو اصلی جواب دیا جائے تو سمجھتے نہیں اور اگر دوسرا جواب دیا جائے تو زبردستی پر محمول کرتے ہیں۔ مثلاً روزے ہی کو لیجئے کہ یطیقون کا ترجمہ اثبات کا کیا اور نسخ سے انکار کر دیا۔ حالانکہ یہ آیت معنی اثبات پر منسوخ ہے اور عدم نسخ کی تقدیر پر معنی نفی پر محمول ہے تو ایک توجیہ پر تو اصول کے جاننے کی ضرورت ہے اور دوسری توجیہ پر عربیت کے جاننے کی ضرورت ہے اور جس کا ذہن دونوں سے خالی ہو وہ تو اس کو بات بنانا ہی سمجھے گا اور اگر نفس فن سے مناسبت ہو تو تھوڑے اشارے سے اس کو شفاء ہو جاتی ہے۔ ایک منطقی صاحب کو شبہ ہو گیا کہ قرآن شریف سے مسئلہ غلامی کا ابطال ثابت ہوتا ہے کیونکہ قرآن شریف میں ہے "اِمَّامَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً" یا تو یونہی احسان چھوڑ دو یا فدیہ لے کر اور یہ صیغہ حصر کا ہے پس غیر من اور غیر فداء منفی ہوگا۔ ایک عالم مجھ سے کہتے تھے کہ میں نے ان سے کہا کہ یہ قضیہ کونسا ہے کہنے لگے منفصلہ پھر انہوں نے پوچھا کہ حقیقیہ یا مانعۃ الجمع یا مانعۃ الخلو اس کو سن کر ان منطقی مولوی صاحب کی آنکھیں کھلیں اور شبہ زائل ہوا اور بے انتہا خوش ہوئے۔ وہ یہ سمجھے ہوئے تھے کہ یہ حقیقیہ ہے انہوں نے تنبہ کر دیا کہ ممکن ہے کہ مانعۃ الجمع ہو تو وہ تو چونکہ ذی علم تھے اس لیے ایک اشارہ کر دینے سے ان کو حل ہو گیا لیکن جس شخص کو معلوم ہی نہ ہو کہ حقیقیہ مانعۃ الخلو یا مانعۃ الجمع کس کو کہتے ہیں وہ تو اس کو گھیر گھار کا جواب ہی سمجھے گا۔ اگر ایک شخص سے کہا جائے کہ مثلث کے تین زاویے مل کر دو قائموں کے برابر ہوتے ہیں اور فن اقلیدس سے واقف نہ ہو تو کسی طرح بھی آپ اس کو نہ سمجھا سکیں گے۔ اگرچہ ہزار دفعہ ناپ کر دکھلا دیجئے جیسے ہمارے ہاں ایک شاعر تھے کہ وہ اپنے اشعار کے مصرعے دھاگے سے ناپ کر برابر کیا کرتے تھے ایک مرتبہ ان سے کسی نے کہا کہ آپ کا ایک مصرعہ چھوٹا ایک بڑا ہے' کہنے لگے کہ یہ تو اوپر سے ہوتی آئی ہے۔ الٰہی غنچہ امید بکشا۔ (اے اللہ امید کی کلی شگفتہ ہو جائے) اس کو تو کھینچ کھینچ کر پڑھا۔ گلے از روضہ جاوید بنما۔ (ہمیشہ بہار میں رہنے والے باغ سے پھول کی نشوونما فرما) اس کو جلدی سے پڑھ دیا۔ دیکھو اس میں بھی مصرعہ ثانی چھوٹا ہے۔ اب جو لوگ فن شعر سے واقف ہیں وہ اس کو سن کر داد دیں گے

اور سمجھیں گے کہ اس شخص کو کسی طرح بھی نہیں سمجھایا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں مصرعے برابر ہیں۔ واللہ اے صاحبو! علماء کے نزدیک آج کل کی دلیلیں اس سے بھی بدتر ہیں جیسے یہ شاعر سمجھا تھا کہ میں نے بہت بڑی دلیل قائم کردی ہے ایسے ہی آج کل کے عقلاء اپنے دلائل کو نہایت مدلل سمجھتے ہیں حالانکہ وہ علماء کے نزدیک "اوھن من بیت العنکبوت" مکڑی کے جالے سے بھی کمزور ہوتے ہیں۔ علماء فضلاء ان پر ہنستے ہیں اور ان بیچاروں کو قابل رحم سمجھتے ہیں اور جس طرح وزن اور تقطیع نہ جاننے کی وجہ سے اس شاعر کو نہیں سمجھا سکتے تھے اسی طرح مانعۃ الجمع اور مانعۃ الخلو نہ جاننے کی وجہ سے ان لوگوں کو بھی نہیں سمجھا سکتے مگر جاننے والوں سے پوچھئے کہ یہ ایک چھوٹا سا لفظ سن کر ان کی کیا حالت ہوئی کہ وجد آنے لگا۔

یطیقونہ کے دو جواب

اسی طرح یطیقونہ کے دو جواب ہیں ایک موقوف ہے عربیت جاننے پر دوسرا اصول جاننے پر مگر ناواقف لوگ دونوں کو زبردستی کا جواب کہتے ہیں۔ اچھا صاحب زبردستی ہی کا جواب سہی لیکن جیسے اس دیہاتی کا علاج حکومت سے ہوگیا ایسے ہی اگر آج یہ بات حاصل ہو تو ہم بھی بتلا دیں کہ ایسے لوگوں کے لیے اصل جواب کیا ہے باقی اس کے سوا تو اگر دفتر کھول کر بھی سامنے رکھ دیجئے تو تسلی نہیں ہوسکتی اس وقت علماء سے فرمائش کی جاتی ہے کہ ایسا جواب دیں جس سے تسلی ہو جائے۔ صاحبو! وہ اسباب بھی تو پیدا کرو جو موجب تسلی ہیں یعنی علوم حاصل کرو، علیٰ ہذا آج ایک یہ مرض بھی عام ہو رہا ہے کہ احکام میں علتیں نکالی جاتی ہیں چنانچہ روزے میں یہ علت نکالی گئی ہے کہ چونکہ ابتداء میں بہیمیت کا غلبہ تھا اس لیے روزہ اس کی کسر کے لیے مشروع ہوا تھا اور اب چونکہ ہم مہذب ہو چکے ہیں اس لیے ہم کو ضرورت نہیں۔ افسوس ہے کہ ہم لوگ تہذیب ہی کو نہیں سمجھتے۔

تہذیب کی حقیقت

صاحبو! تہذیب یہ ہے کہ تمام رزائل نفس کے دور ہو جائیں نہ یہ کہ مزاج میں قدرے نظافت یا تکلف آ جائے ہم لوگوں میں ہرگز تہذیب نفس نہیں ہے ہماری کیفیت یہ ہے کہ ہم میں تواضع تحمل بردباری ایثار کا نام تک نہیں بلکہ خودغرضی غضب چھچھورا پن کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ میں ایک زندہ مثال دیتا ہوں کہ اگر ہم میں سے ایک شخص نے ڈپٹی کلکٹری کی درخواست دے رکھی ہو اور یہ شخص خوش حال فارغ البال ہو اور اسی دوران میں ایک دوسرا شخص بھی اسی عہدے کی درخواست دے جو کہ نمبر درخواست میں اس کے بعد ہو لیکن یہ دوسرا شخص مفلوک الحال غریب

مقروض ہوتو ایسی صورت میں ہم نے کبھی سنا بھی نہیں اس پہلے فارغ البال نے اس کی فلاکت پر ترس کھا کر اپنی درخواست کو واپس لے لیا ہو اور اس کو اپنے سے مقدم کر دیا ہو۔علیٰ ہذا ہر معاملہ میں تو اس کی وجہ کیا ہے۔یہی کہ ہم میں ایثار کی صفت نہیں بلکہ خودغرضی ہے اور اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ اخلاق درست ہیں تو یہ دیکھو کہ اس کا منشاء کیا ہے۔سو تہذیب اخلاق کے دو منشاء ہوتے ہیں کبھی تو مصلحت تمدن کے لیے اپنے اخلاق کو گونہ مہذب کیا جاتا ہے اور کبھی ضرورت دینیہ کے لیے جیسے ایک تاجر اس لیے سچ بولتا ہے کہ اس میں دکان کی بات بنی رہے گی اور لوگ اعتبار کریں گے اور دوسرا اس لیے بولتا ہے کہ خدا خوش ہو تو سمجھئے کہ دنیاوی اور تمدنی مصالح چونکہ ہمیشہ متبدل ہوتے رہتے ہیں اگر اس کو کبھی معلوم ہو کہ اب جھوٹ بولنے میں یہ مصلحت حاصل ہوگی تو وہ فوراً جھوٹ بولے گا اور دین کے مصالح چونکہ متبدل نہیں ہوتے اس لیے اس میں یہ احتمال نہیں ہے اس کا کتنا ہی نقصان ہو تب بھی یہ جھوٹ بولنا گوارا نہ کرے گا کیونکہ جانتا ہے کہ جھوٹ بولنا ہمیشہ مرضی خدا کے خلاف ہے۔خلاصہ یہ ہوا کہ اگر تہذیب اخلاق خدا کے خوف سے ہو تو وہ مستحکم ہے ورنہ نہیں تو اول تو تہذیب کے وجود ہی میں کلام ہے اور اگر وجود مان بھی لیا جائے تو اس کی پائیداری میں کلام ہوگا اور یقیناً وہ بالکل ناکافی ہوگا تو اگر تہذیب نفس ہی نماز روزے کی علت ہوتی تب بھی ہم کو چھوڑنا ناجائز تھا کیونکہ ہم کو تہذیب بھی حاصل نہیں اور بالخصوص جب کہ نماز روزے سے غرض بھی دوسری ہو کہ یہ ثابت ہو کہ یہ کسی کا غلام ہے کہ اس حکم پر سر تسلیم خم کئے ہوئے ہے۔

حکمت اور علت میں فرق

اور اگر کہو کہ بعض نصوص کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ روزے میں شہوت کا انکسار ہوتا ہے تو سمجھ لیجئے کہ یہ حکمت ہے اور میں اس کے حکمت ہونے کی نفی نہیں کرتا بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ یہ امور علت نہیں ہیں جن پر نفیاً اور اثباتاً مدار حکم ہو۔حکمت وہ ہے کہ حکم پر مرتب ہو اور علت وہ ہے کہ اس پر حکم مرتب ہو تو نماز روزے کا وجوب اس کے سبب سے نہیں ہوا بلکہ وجوب محض خدا کے حکم سے ہوا اس پر یہ حکمتیں مرتب ہوئیں اور اگر کوئی امر علت بھی ہو تو جب موجب نے خود اس کو متعین نہیں فرمایا تو ہماری کیا مجال ہے۔کسی بزرگ سے پوچھا کہ معراج میں خدا تعالیٰ سے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا باتیں ہوئی تھیں انہوں نے جواب میں فرمایا کہ

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد زباغبان　　بلبل چہ گفت و گل چہ شنید صبا چہ کرد

(اب کسے ایسا دماغ ہے جو مالی سے پوچھے بلبل نے کیا کہا' پھول نے کیا سنا اور ہوا نے کیا کیا)

حقیقت میں ہمارا کیا منصب ہے کہ ہم پوچھیں کہ اس حکم کی کیا کیا علت ہے اور اس کی کیا حکمت ہے۔ بانیان قوانین سے عام رعایا کو ہرگز یہ مجال نہیں کہ کسی ایک قانون کی وجہ بھی دریافت کرلیں تو خدا تعالیٰ سے باز پرس کرنے کی کیونکر اجازت ہوگی۔ البتہ اگر کوئی مشیر قانون ہو تو اس کو ایسی اجازت ہے تو اگر ہم کو کوئی سرٹیفکیٹ خدا تعالیٰ کے ہاں سے مل گیا ہو تو پیش کریں، کتنی غضب کی بات ہے کہ یہ معترض ایک سلطنت دنیوی کا ممبر تو نہ بن سکے اور خدا کی حکومت میں دخیل ہو جائے۔ صاحبو! خدا تعالیٰ کو تو پارلیمنٹ کی ضرورت بھی نہیں ہے پس ہمارا تو مذہب یہ ہونا چاہیے کہ

زبان تازہ کردن باقرار تو　　　نینگخیتن علت از کار تو

(آپ کا ذکر کرنا چاہیے نہ آپ کے کاموں کی علت)

حق تعالیٰ شانہ سے محبت پیدا کرنے کی ضرورت

دیکھئے خدا تعالیٰ کے تو بہت سے حقوق ہیں حاکم ہونے کا بھی، محبوب ہونے کا بھی۔ فرض کیجئے اگر کسی بازاری عورت سے پوری محبت ہو جائے اور وہ بے ڈھنگے ہی حکم کرے تو ان کو نہایت خوشی سے پورا کرو گے یا نہیں تو اگر خدا تعالیٰ کی طلب ہی نہیں تب تو ایسے لوگوں سے گفتگو ہی نہیں ورنہ یہ حالت ہونی چاہیے کہ

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو　　　جاں شدہ مبتلائے تو ہرچہ کنی رضائے تو

(اگر مجھے زندہ کیجئے تو آپ کی عطاء ہے اگر مجھے مار ڈالئے تو میں آپ پر قربان ہوں، بہرحال روح کو آپ سے تعلق ہے جو چاہیں کر سکتے ہیں)

آج کل لوگوں کی حالت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ سے کچھ بھی محبت ان کو نہیں ہے اگر محبت ہوتی تو کیا اتنا بھی نہ کیا جاتا جتنا ایک بازاری عورت کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود　　　گوی گشتن بہراو اولے بود

(خدا کا عشق لیلیٰ کے تعلق سے کم کیسے ہو سکتا ہے اس کے عشق میں سراپا ذلت بن جانا بہتر ہے)

احکام خداوندی کی ضرورت عظمت کا استحضار

بہرحال محبت کی رو سے دیکھئے یا حکومت کی رو سے دیکھئے ہر طرح سر تسلیم خم کر دینا واجب ہے۔ بعض لوگوں کو تو اس طرح ترقی ہوئی اور بعض لوگ ان سے بھی زیادہ ترقی یافتہ ہوئے۔ یعنی وہ نماز روزے میں شبہات نکالتے ہیں چنانچہ ایک شخص نے کہا کہ روزہ ہے تو اچھی چیز لیکن فروری

کے مہینے میں ہونا چاہیے تھا۔ گویا آپ نے خدا تعالیٰ کو یہ رائے دی۔ افسوس اول تو ہم کو رائے دینے کا حق کیا ہے دوسرے رائے بھی مہمل کیونکہ فروری میں سردی تمہارے ملک میں ہوتی ہے نہ کہ سارے عالم میں' خدا تعالیٰ کی کیا عجب حکمت ہے کہ سارے عالم کو مساوی حالت میں رکھا کہ ایک سال ہندوستان میں سردی میں ہے تو دوسرے ممالک میں گرمی میں ہے اور اگر دوسرے ممالک میں سردی میں ہے تو ہندوستان میں گرمی میں ہے تو اس میں سب کا اوسط برابر ہو گیا جو عین عدل ہے۔ بعض لوگوں نے ایک اور شبہ نکالا ہے کہ جہاں چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات ہوتی ہے وہاں نماز روزہ کیسے کریں گے۔ یہ ساری باتیں اس لیے ہیں کہ احکام خداوندی کی عظمت نہیں۔ دیکھئے قوانین حکومت میں کبھی آپ کو یہ شبہ نہ ہوا کہ ڈاک خانہ کا ٹکٹ لفافے پر لگا دو تو خط بیرنگ نہ ہوگا اور اگر ٹکٹ لفافے پر نہ لگاؤ تو خط بیرنگ ہو جائے گا۔ جو لوگ اس کا راز جانتے ہیں ان کو تو چھوڑیے جو لوگ نہیں جانتے ان کو بھی کبھی شبہ نہیں ہوتا اور اگر شبہ کریں تو احمق بنائے جائیں اور سب ان کو ہنسیں اور یہ ہی جواب دیں کہ قانون یہ ہی ہے۔ جب یہ ہی جواب ہے تو اگر کوئی مولوی بھی آپ کے لغو سوالات کا یہی جواب دے کہ قانون یہی ہے تو یہ جواب زبردستی پر کیوں محمول کیا جاتا ہے اور اس کو قابل سماعت کیوں نہیں سمجھا جاتا اور علماء کو کیوں متعصب کہا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قانون شریعت کی عظمت دل میں نہیں اور قانون حکمت کی عظمت دل میں ہے اور جب قانون شریعت کی عظمت نہیں تو پھر کس منہ سے اپنے کو مسلمان کہتے ہو تو ایسے شبہات اسی وقت دل میں آتے ہیں جب عظمت نہ ہوا ایسا ہی یہ شبہ بھی ہے کہ جہاں چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات ہو تو وہاں کیوں کر نماز پڑھیں اور کیسے روزہ رکھیں۔

حکایت حضرت مولانا احمد حسن صاحب امروہوی رحمہ اللہ

مجھے اس پر ایک واقعہ حضرت مولانا احمد حسن صاحب امروہی رحمۃ اللہ علیہ کا یاد آیا۔ ایک مرتبہ وہ ریل میں انٹر میں سفر کر رہے تھے اور برابر کے درجے میں چند نوجوان آ کر بیٹھے جو وضع سے انگریزی طالب علم معلوم ہوتے تھے ان کے قبل سے ایک معمر شخص سوار تھے جو صورت سے مولوی معلوم ہوتے تھے اور کسی ضرورت سے اس وقت اتر گئے تھے ان نوجوانوں نے ان بیچارے کا اسباب منتشر کر کے اپنا سامان رکھ دیا' وہ مولوی صاحب جو آئے اور معلوم ہوا تو ان پر بہت ملامت کی کہ آپ لوگوں کو اس تحکم کا کیا حق تھا۔ غرض یہ سب شرمندہ ہوئے اور براہ شرارت یہ چاہا کہ ان مولوی صاحب کو بھی کسی بات میں شرمندہ کریں اتنے میں مولوی صاحب نماز پڑھنے لگے تو

ان کو ایک بات ہاتھ آئی' بعد فراغ ان میں سے بعض نے ان مولوی صاحب سے کہا کہ کیا ہم آپ سے کچھ دریافت کر سکتے ہیں' آج کل کی تہذیب میں یہ بھی لازم ہے کہ اگر کچھ پوچھے تو اول اجازت لے۔ چنانچہ ان مولوی صاحب نے اجازت دی اس پر ان لڑکوں نے یہ سوال کیا کہ مولوی صاحب نماز فرض ہے مولوی صاحب نے کہا ہاں کہنے لگے کئے وقت کی فرض ہے' مولوی صاحب نے کہا پانچ وقت کی' کہنے لگے سب پر پانچ وقت کی فرض ہے۔ مولوی صاحب نے کہا ہاں ہر مکلّف پر پانچ وقت کی فرض ہے' کہنے لگے سب جگہ فرض ہے' مولوی صاحب نے کہا ہاں۔ اس پر کہنے لگے کیوں؟ جس مقام پر چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات ہوتی ہے وہاں بھی نماز پانچ ہی وقت فرض ہے اگر یہ ہے تو سال بھر میں پانچ ہی نماز فرض ہوئیں۔ مولوی صاحب نے ایک نہایت دانائی کا جواب دیا کہ تم لوگ وہاں سے آرہے ہو یا وہاں جانے کا قصد ہے' کہنے لگے کہ صاحب! نہ آرہے ہیں نہ جانے کا قصد ہے۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ جب دونوں باتیں نہیں تو یہ سوال قبل از وقت ہے جب اس کی ضرورت پڑے گی اس وقت پوچھنا لیکن ان شریروں نے اس جواب کی قدر نہ کی بلکہ سب ہنس پڑے اور ان مولوی صاحب کو شرمندہ کرنا چاہا' اتفاق سے ان میں ایک شخص پختہ عمر کے بھی بیٹھے تھے جو وضع سے کوئی معزز اہلکار معلوم ہوتے تھے' وہ بھی ہنسنے میں شریک تھے۔ مولانا احمد حسن صاحب کو ان صاحب پر نہایت غصہ آیا کہ یہ تو لڑکے بھی نہیں ان کو کیا شامت سوار ہوئی۔ غرض کوئی اسٹیشن آیا مولوی صاحب اپنے درجے سے ان کے درجے میں پہنچے مگر وہ لڑکے تو اتر گئے اور وہ صاحب موجود رہے۔ انہوں نے نماز کے لیے وضو کیا تب تو مولوی صاحب کو زیادہ غصہ آیا کہ ماشاء اللہ نمازی ہو کر ان کی یہ حالت ہے۔ مولوی صاحب نے ان سے عہدہ اور فرائض عہدہ دریافت کر کے پوچھا کہ آپ کے ذمہ دن رات میں کتنے گھنٹے کام کرنا ہے انہوں نے مثلاً چھ گھنٹے بتلایا' مولانا نے کہا کہ اگر ایسے مقام پر جہاں چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات ہوتی ہے گورنمنٹ کی حکومت ہو جائے اور آپ کی وہاں بدلی ہو جائے تو کیا وہاں بھی رات دن میں چھ گھنٹے کام کرنا ہوگا تو سال بھر میں چھ گھنٹے کام کرنا پڑا' اس کا حساب کس طرح ہوگا' کہنے لگے اندازہ کر لیں گے۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ افسوس دنیوی حکومت کے قانون پر جو اشکال وارد ہو اس کی توجیہ تو اس طرح آسانی سے ہو سکتی ہے اور یہ ہی توجیہ اس اشکال میں نہ ہو سکی بلکہ اس پر تمسخر کرتے ہوئے شرم نہیں آتی' بہت شرمندہ ہوئے اور توبہ کی۔ غرض اس قسم کے شبہات ہونے لگے ہیں۔

ہر مقام کی شب قدر کو فضیلت حاصل ہے

ایک صاحب کہنے لگے کہ شب قدر میں فضیلت ہے تو کہاں کی شب قدر میں ہندوستان کی یا لندن کی کیونکہ غروب ہر جگہ کا مختلف ہے۔ مولانا احمد حسن صاحب نے خوب جواب فرمایا کہ بعض مواسم میں کچہری دس بجے ہوتی ہے تو کہاں کے دس بجے مراد ہوتے ہیں' ہندوستان کے یا لندن کے' جو جواب اس کا ہے وہی اس کا ہے کہ ہر جگہ کی شب قدر میں فضیلت ہے خدا تعالیٰ کے ہاں کیا کمی ہے جب یہاں غروب ہو یہاں کے لیے' جب وہاں غروب ہو وہاں کے لیے' یہ دو چار مثالیں نمونے کے طور پر بیان کر دی ہیں۔ اس قسم کے لغو شبہات بہت سے ہیں اور ان سب کی وجہ یہ ہے کہ احکام شریعت کی عظمت دلوں میں نہیں رہی اور دوسرے یہ کہ ان کی ضرورت نہیں سمجھی گئی کیونکہ انسان جس چیز کو ضروری سمجھا کرتا ہے اس میں شبہات نہیں نکالا کرتا۔ مثلاً اگر کوئی مریض طبیب کے پاس جاوے اور وہ نسخہ لکھ کر دے اور مرض سخت ہو تو اعتماد کے بعد یہ سوال نہیں کرتا کہ آپ نے فلاں دوا کیوں لکھی یا فلاں دوا کا یہ وزن کیوں لکھا' اس کا دونا یا نصف کیوں نہیں لکھا کیونکہ جانتا ہے کہ اگر ذرا بھی بے ڈھنگا پن کیا تو حکیم صاحب خفا ہو کر مطب سے نکال دیں گے اور نسخہ بھی نہ دیں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ میں مروں گا۔ اگر شریعت کو بھی ضروری سمجھتے تو احکام کے بتلانے والوں کا وجود غنیمت سمجھتے جیسے طبیب کا وجود غنیمت سمجھا جاتا ہے ہاں اگر نسخہ پینا ہی نہ ہو تو اس میں جتنے چاہیں عیب نکال دیتے ہیں۔

دین کی طلب نہ ہونے پر اظہار افسوس

صاحبو! واللہ اگر دین کی طلب ہوتی تو غنیمت سمجھتے کہ احکام کے معلوم ہونے کے ذرائع موجود ہیں مگر چونکہ کام کرنا نہیں ہے اس لیے طرح طرح کے شبہات پیدا ہوتے ہیں اور انواع انواع کے بے ڈھنگے سوالات کیے جاتے ہیں۔ ایک شخص نے مجھ سے سوال کیا کہ نماز پانچ وقت کی کیوں مقرر ہوئی' میں نے کہا کہ تمہاری ناک منہ پر کیوں لگی ہے' گدی پر کیوں نہ لگی' کہنے لگے کہ گدی پر اگر لگتی تو بری لگتی' میں نے کہا کہ بری تو جب لگتی کہ صرف تمہاری ناک گدی پر ہوتی اور اگر سب کی گدی پر ہوتی تو ہرگز بری نہ لگتی تو کیا وجہ کہ سب کے ناک گدی پر کیوں نہیں لگی۔ میں کہتا ہوں کہ اول اپنی خبر لیجئے اس کے بعد نماز وغیرہ تک نوبت آئے گی۔ بہت بہتر ہے کہ انسان اپنی دنیا کی تحقیقات میں لگے دین کی تحقیق ہو چکی ہے اس پر عمل کافی ہے دوسرے جب تیرہ سو برس کی

تحقیق آپ کے نزدیک غلط ثابت ہوئی تو تیرہ منٹ کی تحقیق کیوں کر صحیح یقینی ہے۔ صاحبو! سلامتی کی بات یہ ہی ہے کہ شاہراہ پر چل کر سینکڑوں پار ہو گئے اس کو چھوڑ کر ایک غیر مجرب پگڈنڈی کو اختیار نہ کرو' نیز کیا آپ سے قبل کوئی عاقل اور ہمدردان اسلام ہوا ہی نہیں۔

کیا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو دین کا کچھ درد ہی نہ تھا اور کیا ان کو آپ کے برابر بھی عقل نہیں تھی اور اگر عقل نہ تھی تو کیا وجہ کہ ہرقل اور کسرے تک پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے مصاحبین کی گفتگو کا اثر ہوتا تھا۔ ان کی عقلوں کا اندازہ اس سے کرو کہ ان کے پاس نہ نقشے تھے' نہ جغرافیہ اور جب مصر' دمشق' قسطنطنیہ فتح کیا ہے تو ان مقامات پر کس طرح قبلہ رخ نہایت ٹھیک سمت میں مسجدیں بنائیں کہ آج تک آلات ہندسہ سے سب برابر ثابت ہوئیں اور یہ ایک چھوٹی سی بات ہے اس سے بڑی بڑی ہزاروں باتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نہایت درجہ عاقل تھے اور بہت بڑے مدبر تھے۔ دیکھئے ملکی انتظام کس طرح کا کیا پھر ان کو وہ شبہات کیوں نہ پیدا ہوئے۔ وہ اتنے مہذب تھے انہوں نے کیوں نمازیں نہ چھوڑیں کیوں روزہ میں ترمیم نہ کی۔

معلوم ہوا کہ اول کے طریق کو چھوڑ کر دوسرا طریق اختیار کرنا نہایت خطرناک ہے' نابینا کے لیے یہ ہی مناسب ہے کہ کسی بینا کے ساتھ ہو لے اور جدھر کو وہ لے چلے ادھر کو چلے اور اگر کسی موقع پر بینا نے کہا کہ یہاں نالی ہے اور نابینا صاحب لگے دلیل پوچھنے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ہاتھ چھوڑ دے گا اور یہ گر کر مریں گے پھر میں پوچھتا ہوں کہ یہ ترمیمیں جو پیش کی جاتی ہیں ان سے غرض کیا ہے' آیا دنیا کا فائدہ یا دین کا' سو ظاہر ہے کہ دین کا تو کوئی فائدہ نہیں ہاں دنیا کا فائدہ ہے کہ نماز پڑھنے سے بچیں گے پھر وہ نہ رہے گا تو آزادی نصیب ہوگی' سود حلال ہو جائے گا' تو مال میں ترقی ہوگی' ہر مسئلہ طویل الذیل ہے میں اس وقت صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر فرضاً مصلحت نکل سکتی ہے تو صرف یہ ہی نکل سکتی ہے اور فرضاً اس لیے کہا کہ ہنوز اس میں بھی کلام ہے کہ ان کو مصلحت کہنا بھی درست ہے یا نہیں لیکن اگر مان بھی لیا جائے تو میں کہتا ہوں کہ یہ مصالح تو بغیر دین میں کلام کئے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ مثلاً مال میں ترقی اس طرح بھی ہو سکتی ہے کہ سود کو حرام سمجھا جائے اور پھر اس کا مرتکب ہوا جائے کیونکہ ترقی تو فقط سود لینے سے ہے نہ کہ سود کے حلال کہنے سے تو اگر برباد ہی ہونا ہے تو سود ہی لو سود کو حلال تو نہ کرو کہ ایمان بھی جاتا رہے اور سود لینے سے تو فقط تم گنہگار ہو گئے۔ آئندہ نسلیں تو ایمان سے خارج نہ ہوں گی' برخلاف اس کے کہ اگر سود کو حلال کہا تو تم بھی ایمان سے خارج ہوئے اور آئندہ نسلیں بھی۔

پردے سے گھبرانا عجیب بات ہے

علی ہذا پردے سے گھبرانا سو اول تو یہ عجیب بات ہے کہ پردے میں رہیں تو عورتیں اور جی گھبرائے مردوں کا خیر اگر تمہارے نزدیک پردے کا توڑ دینا ہی مصلحت ہے تو پردے کو واجب سمجھ کر ہی توڑ دو بے پردگی کا مقصود تو اس طرح بھی حاصل ہو جائے گا اور تمہارے نزدیک اس واسطے کہا کہ واقع میں پردے کا توڑنا ہرگز مصلحت نہیں ہوسکتا اور یہ جو بعض کہتے ہیں کہ صاحب جب طبائع میں فساد ہوتا ہے تو پردے میں بھی سب کچھ ہو جاتا ہے سو یہ کوتاہی نظر کی دلیل ہے واقع میں جو کچھ خرابیاں ہوئیں وہ بے پردگی یا ادھورے پردے کی وجہ سے ہوئیں۔ بھلا کون عاقل کہہ سکتا ہے کہ مرد کبھی اجنبی عورت کو نہ دیکھے اور عورت کبھی اجنبی مرد کو نہ دیکھے اور پھر ان میں کسی قسم کا فساد ہو سکے اور جب ذرا سی بے پردگی میں اتنے فساد ہوئے تو پوری بے پردگی میں جتنے فساد ہوں کم ہیں اسی طرح اگر نماز کو چھوڑنا ہے تو فرض سمجھ کر بھی چھوڑا جا سکتا ہے اس کی کیا ضرورت ہے کہ فرضیت سے انکار کر کے ایمان بھی برباد کرلو۔ ایک صاحب کہنے لگے کہ اگر سود کو حلال نہ سمجھیں تو قوم ترقی نہیں کرسکتی کیونکہ حرام سمجھنے کی صورت میں کم لوگ سود لیں گے، میں نے کہا کہ اول تو آپ کو دوسروں کی کیا فکر، دوسرے حلال کہہ کر بھی تمام قوم ترقی نہیں کرسکتی کیونکہ جو مسلمان قوت ایمان سے سود کو چھوڑ بیٹھے ہیں وہ تمہارے یا مولویوں کے کہہ دینے سے بھی کبھی نہ لیں گے بلکہ یوں کہیں گے علماء بگڑ گئے تو حلال کہہ کر بھی سود خواروں کی تعداد دس پانچ سے زیادہ نہ ہوگی۔

قربانی کی حکمت

ایک صاحب نے قربانی پر اعتراض کیا کہ اس سے کیا فائدہ کہ ذبح کر کے کھیتوں میں دبا دیا اور وجہ اس فساد کی یہ ہے کہ اپنے خیال میں احکام کا ایک معنی تراش لیا ہے۔ مثلاً قربانی کا معنی یہ تراش لیا ہے کہ مساکین کو نفع ہو اور چونکہ ذبح کر کے کھیتوں میں دبانے سے یہ مقصود حاصل نہیں ہوتا اس لیے اعتراض کیا جاتا ہے۔ اس اعتراض کا جواب صرف اس قدر کافی ہے کہ ع سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجاست میں بیان کرتا ہوں کہ اگر قربانی کر کے ایک حبہ گوشت کا بھی کسی کو نہ دو تو قربانی کا ثواب ملتا ہے تو معلوم ہوا کہ یہ مقصود قربانی کا نہیں کہ لوگوں کو نفع ہو ورنہ صرف ذبح کرنے سے کیوں ثواب ملتا۔ اب رہی یہ بات کہ پھر کیا حکمت ہے تو حکمت یہ ہے کہ بندے کو بہ حیثیت محبّ ہونے کے یہ مناسب تھا کہ اپنی جان فدا کرتا اس کا بدل خدا تعالیٰ نے یہ مقرر فرمایا کہ ایک پیارے جانور کو ذبح کرو اور دلیل تاریخی اس کی یہ ہے کہ اول ابراہیم علیہ السلام کو یہ حکم ہوا تھا کہ

ہماری راہ میں بیٹے کو ذبح کرو' بیٹا اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب اور عزیز ہوتا ہے تو گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جان جاں مانگی گئی تھی اسی کو قرآن شریف میں فرماتے ہیں: "سُنَّةَ اَبِیْکُمْ اِبْرَاهِیْمَ"[1] تمہارے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے تو مقصود یہ تھا کہ اپنی جان دی جائے مگر اس کا بدلہ یہ مقرر فرمادیا کہ جانور کو ذبح کردو اور محبت ایسی چیز ہے کہ موقع پر لوگوں نے اپنی جانیں بھی قربان کردی ہیں۔ ایک وکیل صاحب مجھ سے کہتے تھے کہ ایک بزرگ صاحب حال جن کو لوگ مسخرا سمجھا کرتے تھے حج کرنے کے لیے گئے' جب خانہ کعبہ کے سامنے پہنچے تو مطوف کی زبان سے یہ نکلا کہ یہ کعبہ ہے اس وقت ان پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہوئی اور یہ شعر ان کی زبان سے نکلا:

چورسی بکوئے دلبر بسیار جان مضطر — کہ مباد بار دیگر نرسی بدیں تمنا

(جب محبوب کے کوچہ میں جاؤ تو جان مضطر کو حاضر کردو' ہوسکتا ہے دوبارہ اس تمنا کو نہ پہنچ سکو)

یہ کہتے ہی ایک چیخ ماری اور جاں بحق ہوگئے اور سینکڑوں اولیاء اللہ رحمہم اللہ کی حکایت ہے کہ ایسے اوقات میں ان کی جان نکل گئی۔

حضرت نجم الدین کبری رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت

حضرت نجم الدین کبری رحمہ اللہ کی حکایت ہے کہ ان کے سامنے کسی نے یہ پڑھ دیا۔ (جاں بدہ و جاں بدہ و جاں بدہ) آپ نے فرمایا کہ محبوب جان طلب کررہا ہے مگر افسوس کوئی جان دینے والا نہیں اور پھر فرمایا کہ (جاں دادم و جاں دادم و جاں دادم) اور یہ کہتے ہی جان نکل گئی۔ لیکن پھر بھی ایسے لوگ بہت کم ہیں' فرماتے ہیں:

وَلَوْ اَنَّا کَتَبْنَا عَلَیْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْآ اَنْفُسَکُمْ اَوِاخْرُجُوْا مِنْ دِیَارِکُمْ مَّافَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِیْلٌ مِّنْهُمْ.

اگر ہم ان پر یہ فرض کردیتے کہ تم اپنی جان مارلو یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ تو تھوڑے ہی لوگوں نے ایسا کیا اور اگر سب کے سب ایسے ہی ہوتے بھی تو ایک سال میں سب کے سب ختم ہوجاتے۔ یہ تو رحمت ہے کہ اگر خیر جانور ہی دیدو تو وہ بھی کافی ہے مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی حکم ہے کہ جانور عزیز ہو۔ حدیث میں ہے: "سمنوا ضحایاکم فانها علی الصراط مطایاکم" تم موٹی تازی قربانی کیا کرو' صراط مستقیم پر یہ ہی تمہاری سواریاں ہوں گی۔ حضرت عمر رضی اللہ

[1] (سنن ابن ماجة: ۳۱۲۷' مسند احمد ۴: ۳۶۸)

تعالیٰ عنہ نے جب سورہ بقرہ ختم کی تو ایک اونٹنی ذبح کی تھی جس کی قیمت تین سو اشرفی ملتی تھی۔ الحاصل یہ معلوم ہو گیا کہ حکمت قربانی کی وہ نہیں ہے جو کہ اس وقت لوگوں نے تراش رکھی ہے بلکہ یہ حکمت ہے اور یہ بھی ہم نے تبرعاً بتلا دیا ورنہ اصل مسلک ہمارا یہ ہے کہ

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو ۔۔۔ کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا

(ساقی شراب کی بات کرو گردش ایام کو کچھ نہ کہو اس معمے کو نہ کوئی کھول سکا ہے نہ کھول سکے گا)

تفسیر آیت متلوۃ

خدا تعالیٰ کے اسرار کا احاطہ ہم کیا کر سکتے ہیں اور جب ضرورت ثابت ہو گئی تو ہم کو حکمت یا اسرار کے دیکھنے اور بتلانے کی ضرورت بھی نہیں۔ بہرحال دین میں اختراع نہ کرو بلکہ علم کی تکمیل کرو یا علماء کی تقلید کرو اور بدوں ان دونوں باتوں کے ہمارا مذہب اور دین بالکل ڈانواں ڈول ہے بالخصوص اس آزادی کے زمانے میں اسی ضرورت علم دین کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے: "یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ" اس میں مختلف تفسیریں ہیں میرے خیال میں حکمت سے مراد علوم اجتہادیہ اور کتاب سے مراد علوم منصوصہ اور میں اس وقت اس کی تفصیل نہیں کرتا مگر اس وقت کے رفع اغلاط کے لیے اتنا بتلائے دیتا ہوں کہ اجتہاد ہر شخص کا معتبر نہیں بلکہ اس کا اجتہاد معتبر ہے جس میں سامان اجتہاد بھی ہو اور یہ طے ہو گیا ہے کہ ہم میں قوت اجتہادیہ نہیں ہے۔

فقہاء کے اجتہاد کی مثال کا فرق

اس کے لیے میں ایک مسئلہ مثال کے لیے عرض کرتا ہوں اس سے پورے طور پر سمجھ میں آ جائے گا کہ ہم میں قوت اجتہادیہ بالکل نہیں ہے مسئلہ یہ ہے کہ اگر دو شخص جنگل میں ہوں اور ایک کو غسل کی ضرورت ہو اور دوسرے کو وضو کی ضرورت ہو اور پانی وہاں ہو نہیں اس لیے دونوں نے تیمّم کیا اور یہ دونوں شخص جمیع صفات علمیہ و عملیہ میں مساوی ہوں سوائے اس تفاوت مذکور کے تو اگرچہ امامت دونوں کی جائز ہے لیکن گفتگو اس میں ہے کہ افضل کس کی امامت ہے سو ہمارے اجتہاد سے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جس کو وضو کی ضرورت ہے اس کی امامت افضل ہے کیونکہ اس میں حدث اصغر تھا اور اس لیے نجاست حکمی اس میں کم تھی اور طہارت میں دونوں برابر ہوئے تو وضو والے کی طہارت اکمل ہوئی مگر فقہاء کے اقوال دیکھنے سے معلوم ہوا کہ حکم برعکس ہے اور وجہ یہ ہے کہ تیمّم خلیفہ ہے غسل اور وضو کا اور غسل افضل ہے وضو سے تو افضل کا خلیفہ بھی افضل ہو گا تو غسل کا تیمّم افضل ہو گا وضو کے تیمّم سے۔ اب دیکھئے فقہائے متاخرین کا یہ اجتہاد ہے مگر ہم اس تک بھی نہ پہنچ سکے کیونکہ اجتہاد محض پڑھنے سے نہیں ہوتا بلکہ احادیث کے جمع کرنے اور نعمت پر عبور ہونے

اوراس کے بعد تقویٰ وطہارت کے حاصل ہونے سے ایک خاص ملکہ ہوتا ہے اور جب ہم میں یہ سب باتیں نہیں تو ہم کو سوائے تقلید کے چارہ نہیں۔

علم دین کا ثمرہ

اب میں یہ بتلاتا ہوں کہ مسلمانوں میں علم کیونکر عام ہو کیونکہ یہ تو بہت مشکل ہے کہ سب کے سب مولوی ہو جائیں آج کل لوگ اس سے بھی گھبراتے ہیں کہ علماء اس کی کوشش کرتے ہیں کہ سب کے سب مولوی ہو جائیں، سو میں کہتا ہوں کہ ہم سب کو مولوی نہیں بناتے بلکہ اگر سب بنیں بھی تو ہم روک دیں کیونکہ تجربہ یہ ہے کہ جن لوگوں میں ہمت اور قناعت اور دانائی اور ورع نہ ہو ان کو مقتداء بنادینے سے بہت سی خرابیاں دین میں پیدا ہو جاتی ہیں اور ہمت سے مراد دین کی ہمت ہے نہ کہ دنیا کمانے کی ہمت اور ایسے ہی لالچی لوگ ہیں جنہوں نے دنیاداروں کے سامنے دست طمع دراز کر کے اکثر لوگوں کو علم دین سے متنفر کر دیا ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ علم دین کا ثمرہ یہ ہوتا ہے تو اگر ہماری اولاد پڑھے گی تو ان میں بھی یہ ہی باتیں پیدا ہوں گی لہٰذا ایسے لوگوں کو ہم ہرگز مولوی ہونے کی رائے نہیں دیں گے بلکہ مولوی ہونا اور خدمت دین اس کا کام ہے جس کی یہ حالت ہو۔

اے دل آن بہ کہ خراب ازمے گلگوں باشی   بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی

(اے دل شراب گلگوں سے خراب رہ اور بے مال ودولت قارون کی سینکڑوں عزت پر بھاری رہ)

یہ تو مال میں اس کی حالت ہو اور جاہ میں یہ حالت ہو کہ

در رہ منزل لیلیٰ کہ خطر ہاست بجاں   شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

(لیلیٰ کے گھر جانے کے راستہ میں جان پر بڑے خطرے ہیں تو اولین شرط یہ ہی ہے کہ مجنوں بن جاؤ)

اور یہ حالت ہو کہ صرف ایک کا طالب ہو۔

دلا رامے کہ داری دل دروبند   دگر چشم ازہمہ عالم فروبند

(اگر محبوب رکھتے ہو تو دل اس سے بند رکھو اور تمام دنیا سے آنکھ بند رکھو اور یہ حالت ہو کہ عاشقاں را مذہب وملت جدا است) اب آپ ہی اندازہ کیجئے کہ سب کے سب ایسے کہاں ہیں تو اگر سب کو مولوی بنایا جاوے تو کس قدر خرابیاں پیدا ہوں۔

مولویت کے لیے انتخاب صحیح کی ضرورت

میں نے ایک استفتاء دیکھا کہ اس میں ایک مولوی صاحب نے ساس کو حلال کر دیا تھا اور کیونکر چالاکی سے یعنی یہ لکھا کہ اس شخص کی بیوی بوجہ جہالت کلمات کفر وشرک میں ہمیشہ

سے مبتلا ہے اس لیے اس کا نکاح اس مسلمان سے صحیح نہیں ہوا اور جب نکاح نہیں ہوا تو ساس ساس نہ ہوئی اور حرمت مصاہرۃ حنفیہ کا مذہب ہے ہم پر حجت نہیں پس بیوی کو چھوڑ کر ساس سے نکاح درست ہے' خوب کہا ہے۔

بد گہر را علم و فن اموختن دادن تیغست دست راہزن

(بے اصل کو علم وفن سکھانا ڈاکو کے ہاتھ میں تلوار دینا ہے)

تو اگر اس مذاق کے لوگ مقتداء بنیں گے تو کیا کچھ خرابیاں ہوں گی۔اس لیے مولویت کے لیے انتخاب صحیح ہونا چاہیے سو آپ بھی اپنے بچوں میں سے انتخاب کیجئے اور اگر کہو کہ دیہاتی یا غریب لوگ تو پڑھ رہے ہیں تو سمجھو کہ وہ آپ کے لیے کافی نہیں ہیں کیونکہ وہ آپ کے اندرونی حالات سے واقف نہیں اس لیے وہ آپ کی اصلاح نہیں کر سکتے۔لہٰذا شہر والوں کے لیے شہر والے اور گاؤں والوں کے لیے گاؤں والے مولوی ہونے چاہئیں اور غرباء کے لیے غرباء اور امراء کے لیے امراء کیونکہ غرباء کی وقعت امراء کی نظر میں نہیں' دوسرے اپنے کام میں لگے ہیں اس لیے بھی امراء کو توجہ کرنا نہایت ضروری ہے۔ یہ اپنی اولاد میں سے منتخب کریں لیکن خدا کے لیے ایسا انتخاب نہ کیجئے جیسا کہ اب تک کیا ہے کہ اولاد میں جو سب سے زیادہ بیوقوف ہو اس کو عربی پر متوجہ کر دیا بلکہ زیادہ فطین زیادہ ذکی ہو اس کو عربی کے لیے انتخاب کیجئے اور اس کے اخلاق درست کیجئے۔اس میں تواضع پیدا کیجئے اور سب سے بہتر یہ ہے کہ اپنے سے جدا کر کے کسی صاحب دل کے پاس بھیج دیئے۔ چند روز بھی اگر وہاں رہے گا تو انشاء اللہ انسانیت آجائے گی اس کے بغیر انسانیت نہیں آتی۔دیکھئے انگریز اپنے بچوں کو کتنی تھوڑی عمر سے جدا کر دیتے ہیں۔

ایک بادشاہ کی حکایت لکھی ہے کہ اس نے اپنے لڑکے کو کسی معلم کے سپرد کیا ایک روز دیکھا کہ معلم صاحب گھوڑے پر سوار ہیں اور شہزادہ سائیں کے مثل پیچھے پیچھے چلا جا رہا ہے' بادشاہ کو یہ دیکھ کر سخت ناگوار ہوا لیکن ضبط کر کے معلم سے بہ آہستگی دریافت کیا' معلم نے کہا کہ حضور چند روز میں یہ بادشاہ ہوگا' مخلوق اس کی جلو میں ہوگی' اگر اس وقت پیدل نہ دوڑے گا تو اس وقت کیسے خبر ہوگی کہ پیدل دوڑنے والوں پر کیا گزر رہی ہے اس لیے میں نے اس کو دوڑایا کہ یہ اپنی حالت یاد کر کے دوسروں پر رحم کرے' تو یہ برتاؤ باپ نہیں کر سکتا اور استاد کر سکتا ہے مگر ایسے استاد نہیں جیسے آج کل کے استاد ہیں ظالم اور قصائی جن میں شفقت نام کو نہیں۔ میں نے ایک بچے کو دیکھا کہ چار برس سے زیادہ اس کی عمر نہ ہوگی اور لڑکے اس کو ڈنڈا ڈولی کئے لا رہے ہیں۔(ع پا بدست

دگرے دست بدست دگرے) افسوس ہے کہ اکثر بچے انہی ذابحین کے قبضے میں آتے ہیں اور وہ تباہ و برباد ہوتے ہیں کہ ان کے برتاؤ سے تو طبیعت کند ہو جاتی ہے یا پڑھنا چھوڑ بیٹھتے ہیں اور یہ پرانا مقولہ ہے کہ حافظ جی ہڈی ہماری چمڑا تمہارا۔

صاحبو! استاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ مربی ہو اور اگر ایسا نہ کر سکے تو وہ استاد بننے کے قابل نہیں۔ تو ایک طرف تربیت ہو ایک طرف تعلیم پھر دیکھئے کہ یہ شخص کس شان کا نکلتا ہے۔ البتہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر لڑکوں کو علوم دینیہ پڑھایا جائے تو یہ لوگ کھائیں گے کہاں سے؟ تو اول تو امراء کو یہ سوال ہی کرنا نہ چاہیے اور غرباء کے لیے ساری قوم کو ادھر متوجہ ہو کر اس کے لیے سرمایہ جمع کرنا چاہیے کہ ان کی خدمت کریں میں نے دیکھا ہے کہ اگر بچپن سے امارت میں گزرے تو ان کو روز اول ہی سے استغناء کی عادت ہو جائے' بڑے ہو کر حرص وغیرہ نہیں پیدا ہوتی اور اگر اول ہی سے سوال اور ذلت کا خوگر ہو جیسا آج کل قوم کی بے توجہی سے ہو رہا ہے تو بڑے ہو کر وہی عادت رہے گی۔ پس آج کل جو اکثر طلبہ پر اعتراض کیا جاتا ہے یہ واقع میں اپنے اوپر الزام ہے کیوں یہ نہیں کیا جاتا کہ قوم طالب علموں کو اپنی اولاد کی طرح رکھے۔ مثلاً جس کے چار بچے ہیں وہ ایک طالب کو ملا کر پانچ سمجھے اور اس طالب علم کی ہر طرح امداد کیا کرے۔

عالمگیر کی مدبرانہ رحمدلی

عالمگیر نے یہ کیا تھا تو ایک جماعت کی جماعت جو پریشانی میں مبتلا تھی کیسے آرام سے فارغ ہوئی اور انہوں نے کتنے بڑے بڑے کام کئے لیکن چونکہ عالم گیر رحمدلی کے ساتھ مدبر بھی تھے ترکیب یہ کی تھی کہ طالب علموں کو جو پریشان دیکھا اور بیت المال کو بار سے بچانا چاہا تو صورت یہ کی کہ ایک امیر دربار سے نماز کے فرائض پوچھے تو وہ بالکل کورے تھے۔ عالمگیر نے اس کو بہت ڈانٹا اور کہا کہ اتنے طالب علم شہر میں ہیں تم سے یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ ان سے تھوڑی دیر مسائل سیکھ لیا کرو پھر کیا تھا کہ ہر شخص طالب علموں کا طالب ہو گیا اور اس طرح سب طالب علم طعام ولباس وتنخواہ سے بے فکر ہو گئے مگر یہ سب حکومت کی بدولت تھا کہ حکومت عجب چیز ہے۔ مگر اب اتفاق باہمی بھی اس سے زیادہ عجیب کام کر سکتا ہے جب اس کی ضرورت ثابت ہو چکی ہے تو ضرور اس پر توجہ کرنی چاہیے۔ یہ تدبیر تو مولوی بنانے کی تھی اب رہے وہ لوگ جو کہ مولوی نہ ہوں ان کے لیے ضروریات کی تعلیم ہونی چاہیے خواہ اردو میں ہو یا عربی میں' مگر انگریزی کے قبل ہو کیونکہ پائیدار اثر نقش اول کا ہوتا ہے۔ یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ آنکھ کھولتے ہی انگریزی میں ان کو لگا دیا جائے۔ تو اول تو

قرآن شریف پڑھاؤ اگر پورا نہ ہو تو دس سپارے ہی سہی اور اس کے ساتھ ہی اس کے روزانہ تلاوت کا بھی التزام رکھو اور اس کے بعد کچھ رسالے مسائل دین کے اگرچہ اردو ہی میں ہوں ان کو کسی عالم سے پڑھواؤ اس کے بعد اگر ضرورت معاش مجبور کرے تو انگریزی بھی پڑھاؤ لیکن اس کے ساتھ ہی اگر دین کے خلاف اس میں کوئی بات پیدا ہو تو فوراً اس کو تنبیہ کرو اور اگر باز نہ آئے تو انگریزی چھڑا دو اب رہے وہ لوگ جو کہ بالکل ہی نہیں پڑھے ان کے لیے یہ ترکیب ہے کہ ہر محلے کی مسجد میں ہر ہفتہ میں کم سے کم ایک مرتبہ کسی سے مسائل اور اخلاق کی کتابیں پڑھوا کر ان کو سنوا دیں۔

عورتوں کیلئے طریق تعلیم دین

اور عورتوں کے لیے یہ کیا جائے کہ جو ان میں سے پڑھ سکیں ان کو تو پڑھایا جاوے اور جو نہ پڑھ سکیں ان کو ان کے مرد دینی رسالے سنا دیا کریں اور جن کے مرد پڑھے نہ ہوں وہ خواندہ عورتوں سے سن لیا کریں اور ساتھ ہی جو مسائل پیش آئیں ان کو مرد بلا واسطہ اور عورتیں بواسطہ مردوں کے علماء سے پوچھتی رہیں۔ یہ وہ ترکیب ہے کہ اگر اس پر کاربند ہوا جائے تو چند ہی روز میں ساری جہالت کا خاتمہ ہو جائے گا اور تمام قوم میں دین پھیل جائے گا یہ تو علم کے متعلق تھا اب تیسری چیز یز کی میں عمل میں اگر وہ نہ ہو تو علم کچھ بھی نہیں تو عمل کی تقسیم یہ ہے کہ ایک تو اعمال ظاہری ہیں اور ایک اعمال باطنی اس وقت جو لوگ عمل کرتے ہیں وہ صرف اعمال ظاہری پر متوجہ ہیں ورنہ باطن کی یہ حالت ہے کہ

از بروں چوں گور کافر پر حلل   واندروں قہر خدائے عزوجل
از بروں طعنہ زنی بر بایزید   وز درونت ننگ میدارد یزید

(اوپر سے کافر کی قبر طرح مزین ہو اور نیچے اللہ کا عذاب ہے اوپر سے بایزید پر طنز کرتے ہو اور اندر سے یزید جیسا شخص شرماتا ہے)

کیا معنی کہ باطن اکثر لوگوں کا درست نہیں باطن کی درستی ایک تصحیح عقائد ہے جس کو کم و بیش حاصل بھی کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے تہذیب اخلاق جس کو تصوف کہتے ہیں اور وہ بالکل متروک ہے جس کی دو وجہ ہیں ایک تو بے التفاتی اہل دنیا کی دوسرے بے عنوانی منتسبین الی التصوف کی یعنی آج کل رسوم کا نام تصوف رکھ چھوڑا ہے۔ حقیقت تصوف کی ہے تعمیر الظاہر والباطن۔ ظاہر کا درست کرنا یہ ہے کہ اقوال و افعال سب شریعت کے موافق ہوں اور باطن کی درستی یہ ہے کہ قلب کی حالت درست ہو یعنی ایک تو اخلاق باطنی درست ہوں تو کل ہو شکر ہو رذائل کو دور کیا ہو جیسے

حب دنیا وغیرہ یہ ہے تصوف۔ تو اس وقت لکھے پڑھے بھی صرف ظاہر کو لیے ہوئے اور جنہوں نے باطن کو لیا انہوں نے ظاہر کو چھوڑ دیا تو گویا تقسیم کر لیا ہے کہ جو ظاہر کو لیں وہ باطن کو چھوڑ دیں اور جو باطن کو لیں وہ ظاہر کو چھوڑ دیں اور بعض نے دونوں کو چھوڑ دیا وہ نہ نماز روزہ کریں نہ تصفیہ باطن بلکہ حب دنیا میں حب جاہ میں غرق ہیں اور یہ تینوں قسم کے لوگ تصوف سے بمراحل دور ہیں۔

تصوف کی حقیقت

غرض تصوف اصلاح ظاہر و باطن کا نام ہے نہ کہ رسوم کا بلکہ احوال متعارفہ کا نام بھی نہیں یہ احوال اگر نہ بھی ہوں تو نسبت مع اللہ پیدا ہو سکتی ہے جس کا اثر یہ ہے کہ طاعت میں سہولت ہو اور دوام ذکر پر توفیق ہو رہی رسوم کہ قبر پر کپڑے چڑھانا' عرس کرنا' کپڑے رنگین پہننا سماع سننا۔ سو اس کو کوئی تعلق تصوف سے نہیں ہے اور احوال اگرچہ کبھی مقامات پر مترتب ہو جاتے ہیں لیکن وہ تصوف کے اجزاء یا اس کے لوازم نہیں اب لوگوں کی یہ حالت ہے کہ اگر ذکر میں کبھی ان کو وجد وغیرہ ہونے لگے تو سمجھتے ہیں کہ اصل مقصود حاصل ہو گیا اور اگر نہ ہو تو سمجھتے ہیں کہ کچھ فائدہ ہی نہیں ہوا حالانکہ ذکر سے مقصود یہ نہیں بلکہ حقیقی مقصود یہ ہے کہ حکم ہے ''فَاذْكُرُونِیْ اَذْكُرْكُمْ'' تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا جس کا ظہور آخرت میں ہوگا اور عاجل مقصود یہ ہے کہ کثرت ذکر سے نسبت مع اللہ ہو جائے اور اس سے سہولت فی الطاعۃ ہو تو یہ ایک غلطی تو متصوفین کو ہوئی دوسری غلطی منکرین کو ہوئی کہ انہوں نے صوفیاء کو خشک دماغ بتلایا حالانکہ وجد وغیرہ کا سبب یہ نہیں اگرچہ اس میں بھی شک نہیں کہ کبھی اس میں تھوڑا دخل احوال طبعہ کو بھی ہوتا ہے غرض ان کو عین تصوف سمجھنا بھی غلطی ہے اور بالکل مبائن خارج سمجھنا بھی غلطی ہے' فیصلہ یہ ہے کہ داخل تو نہیں مگر متعلق ہے اور ایک درستی قلب کی یہ ہے کہ عقائد درست ہوں اس کو مفصل بیان کر چکا ہوں جس کے اعادے کی ضرورت نہیں ہاں رہا عمل ظاہر تو وہ ظاہر ہی ہے پس یہ آیت علم و عمل کی تمام شاخوں کو جامع ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آئیں گے اور وہ یہ اہتمام کریں گے۔ اب آپ کو اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ یہ تینوں چیزیں کیسی ضروری ہیں دوسرے یہ کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیسے شفیق تھے کہ ایسی باتیں بتلائیں کہ اگر ان کو چھوڑا جائے تو دین اور دنیا سب بگڑ جائے۔ دین کا بگڑنا تو ظاہر ہے اور دنیا اس لیے کہ مسلمانوں کے ساتھ خدا کا یہ معاملہ ہے کہ جب یہ دین چھوڑتے ہیں تو دنیا بھی ان سے رخصت ہو جاتی ہے۔ دوسرے دنیا نام ہے راحت کا اور دین کو چھوڑ کر راحت نصیب نہیں ہوتی تو جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اتنی بڑی رحمت ہیں تو اب یہ دیکھئے کہ آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حق کیا ادا کیا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق

دیکھو! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تین حق ہیں ایک یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت ہو دوسرے یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت قلب میں ہو تیسرے یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت کی جائے اس وقت بعض نے عظمت کو تو لیا مگر محبت اور متابعت دونوں کو بالکل چھوڑ دیا تو بعض نے متابعت تو کی مگر محبت اور عظمت کو چھوڑ دیا اور بعض نے محبت و عظمت دونوں کو لیا مگر متابعت چھوڑ دی۔ میں نے اس مضمون کو القاسم میں لکھ دیا ہے یہ ایک ماہواری رسالہ ہے جو کہ بہت ہی مفید ہے۔ میں یہ بھی رائے دیتا ہوں کہ لوگ اس کو خریدیں اس میں اختلافی مسائل نہیں ہیں بلکہ محض متفق علیہ اصلاح ہے۔ بہر حال یہ حقوق ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی بڑی نعمت ہیں اور نعمت کی قدر یہ ہے کہ اس کے حقوق ادا کریں اور وہ ابھی مذکور ہوئے ہیں۔

اب میں ختم کرتا اور خدا تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ ہم سب کو توفیق نیک عطا فرمائیں۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمدللّٰہ رب العالمین. وصلی اللّٰہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین.

تفاضل الاعمال

بمقام تھانہ بھون ۱۴ صفر ۱۳۳۰ھ کو ہوا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلاَھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَاشَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارِکۡ وَسَلِّمۡ.اَمَّابَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ. بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ.

قال اللّٰہ تبارک و تعالٰی اَجَعَلۡتُمۡ سِقَایَۃَ الۡحَآجِّ وَعِمَارَۃَ الۡمَسۡجِدِالۡحَرَامِ کَمَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَجَاھَدَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ لَایَسۡتَوٗنَ عِنۡدَاللّٰہِ وَاللّٰہُ لَایَھۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ.

”خدا تعالٰی نے فرمایا کیا تم نے حجاج کے پانی پلانے اور مسجد حرام کی تعمیر کرنے والوں کو ایسے لوگوں کے برابر ٹھہرادیا جو ایمان لائے اللہ پر اور آخرت پر اور خدا کے راستہ پر جہاد بھی کیا' خدا کے نزدیک وہ لوگ برابر نہیں ہوسکتے اور اللہ تعالٰی ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتے۔“

ایک ضروری مسئلہ

میں آج ایک ضروری مسئلہ بیان کرتا ہوں جس کی طرف اس کے قبل کبھی التفات نہ ہوا تھا اور غالباً اور لوگوں کے خیال میں بھی یہ بات کم آئی ہوگی لیکن مسئلہ نہایت ضروری اور منصوص ہے اور چونکہ مسئلہ مختصر ہے لہٰذا اس وقت کا بیان بھی مختصر ہی ہوگا اور آج اس کے بیان کرنے کی ضرور علاوہ مسئلے کے ضروری الاظہار ہونے کے ایک یہ بھی ہے کہ پہلے جمعہ کو جو مضمون بیان کیا گیا تھا اس سے ایک شبہ پیدا ہوسکتا ہے اور اس مسئلے کے ذہن میں آجانے کے بعد وہ شبہ مندفع ہوجائے گا تو اس حیثیت سے یہ مضمون سابق مضمون سے بھی مرتبط ہوگا اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آیت کا ترجمہ کرنے سے پیشتر مستقلاً اس مسئلے کو بیان کردوں تاکہ تفصیل ذہن نشین کرکے کے بعد آیت کے ترجمے ہی سے معلوم ہوجائے گا کہ وہ مسئلہ اس آیت میں بیان ہوا ہے۔

حسنات باہم تفاضل ہیں

یہ بات تو ہر خواص وعوام کو معلوم ہے کہ جس قدر بھی نیک کام ہیں سب کے سب ایک درجے اور ایک پایہ کے نہیں بلکہ متفاوت ہیں۔ مثلاً نماز پڑھنا' روزہ رکھنا' مسجد بنوانا' حج کرنا' مظلوم کی مدد کرنا وغیرہ وغیرہ بہت سے نیک کام ہیں لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ جو ثواب نماز پڑھنے میں ملتا ہے اسی قدر مسجد بنوانے میں بھی ملتا ہے یا حج کا ثواب ایک پیسہ خیرات کرنے میں بھی اس کے برابر ہے۔ علیٰ ہذا گناہ بھی سب برابر نہیں۔ چوری' ڈکیتی' زنا' قتل' شراب خوری کبائر ہیں اور آپس میں متفاوت اسی طرح بہت سے صغائر ہیں لیکن کوئی بہت ہلکا ہے کوئی اس سے زائد۔ نیز یہ تفاوت حسنات میں منصوص بھی ہے حدیث میں ہے کہ

الایمان بضع وسبعون شعبة افضلها قول لااله الا اللّٰه وادنها اماطة الاذی والحیاء شعبة من الایمان۔[1]

''ایمان کے کچھ اوپر ستر درجے ہیں سب سے افضل کلمہ لا الہ الا اللہ ہے اور سب سے کم مرتبہ موذی چیز کو راستہ سے ہٹا دینا ہے اور شرم وحیا بھی ایمان ہی کا ایک درجہ ہے۔''

یعنی ایمان کے متعلق بہت سی شاخیں ہیں جن میں سب سے زیادہ کامل تو لا الہ الا اللہ ہے اور سب سے ادنیٰ درجے کا کام یہ ہے کہ راستے سے تکلف وہ چیزوں کو ہٹا دے۔ مثلاً راستہ میں کانٹے پڑے ہوں یا کوئی بڑی لکڑی پڑی ہو جیسا کہ اکثر لوگوں کی عادت ہے کہ وہ سڑک پر ایسی چیزیں ڈال دیتے ہیں یا چھوڑ دیتے ہیں جن سے راستہ چلنے والوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ مثلاً بعض لوگ بہلی یا چھکڑے رستے میں کھڑے کر دیتے ہیں' بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی نابینا شخص وہاں سے گزرتا ہے اور اس سے ٹکر کھا جاتا ہے ہاں اگر کسی ایک کنارے پر ہو تو مضائقہ نہیں لوگوں کو اس کا خیال رکھنا چاہیے اور نہ سمجھنا چاہیے کہ شریعت نے ان باتوں کے متعلق کوئی قانون مقرر ہی نہیں کیا۔ صاحبو! ہر کام کے لیے شریعت میں ایک حکم موجود ہے۔ دیکھو جب اماطۃ الاذی کو شعبہ ایمان قرار دیا ہے تو اس کے خلاف گناہ ہوگا یا نہیں یہ مسئلہ اس حدیث سے مستنبط ہوتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ قریب بصراحت ہے۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بصراحت بتلا دیا کہ حسنات باہم متفاضل ہیں ایمان اعلیٰ ہے حیا اس سے کم ہے اماطۃ الاذی اس سے کم ہے۔

---

[1] (الصحیح لمسلم کتاب الایمان :۵۷' سنن النسائی ۸: ۱۱۰)

افضل کی تعیین میں غلطی

بلکہ اگر عادات ناس میں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اور لوگ بھی عملاً اعمال کو متفاوت مان رہے ہیں دیکھئے اگر کسی شخص کے پاس دس روپیہ ہوں اور وہ ان کو کسی مصرف خیر میں لگانا چاہتا ہے تو اول اس کی تحقیق کرتا ہے کہ سب مصارف میں بہتر مصرف کون ہے اور اگر خود معلوم نہیں ہوتا تو علماء سے رجوع کرتا اور ان کے بتلائے ہوئے کے مطابق عمل کرتا ہے۔ اگر وہ مدرسے میں خرچ کرنے کو افضل بتاتے ہیں تو مدرسے میں خرچ کرتا ہے اور مسجد میں خرچ کو افضل بتاتے ہیں تو مسجد میں دیتا ہے۔ پس اگر اس متجسس (جستجو کرنے والا) کو معتقد تفاضل نہ مانا جائے تو اس کی چھان بین کیوں ہے پس ہر طرح سے تفاضل بین الحسنات متیقن ہے دلیل سے بھی تسلیم ناس سے بھی یہ تو اجمالی مسئلہ ہے اور یہ بالکل مطابق واقع کے ہے لیکن اس کی تفاصیل میں اکثر نے غلطی کی ہے عوام نے بھی اور علماء نے بھی۔ اس لیے اس کے تحقیق کرنے کی ضرورت ہے وہ غلطی یہ ہے کہ لوگ افضل کی تعیین اپنی رائے سے کرتے ہیں یا اگر بعض لوگ کسی دلیل شرعی سے تعین کرتے ہیں تو وہ لوگ اس دلیل شرعی میں غور نہیں کرتے کہ یہ دلیل اس دعوے کے لیے کافی ہوگی یا نہیں اور انطباق ہوا یا نہیں ہوا چنانچہ عوام الناس جب تفاضل کی تحقیق کرتے ہیں اول تو اکثر اپنی رائے سے کرتے ہیں اور اس تفاضل کا معیار بھی ایک مقرر کرلیا ہے کیونکہ ہر تفاضل کے لیے کوئی نہ کوئی معیار تو ضرور ہونا چاہیے۔ ایک چاندی کو دوسری چاندی پر یا ایک کپڑے کو دوسرے کپڑے پر اگر ترجیح دیں تو اس ترجیح کا کوئی معیار ضرور ہوگا۔

پس اسی بناء پر عوام نے بھی اس تفاضل کے لیے ایک معیار مقرر کرلیا ہے کہ جس عمل کو وہ صورتاً عبادت سے زیادہ تلبیس دیکھتے ہیں اس کو افضل سمجھتے ہیں تفصیل اس کی یہ ہے کہ اعمال دو قسم کے ہیں ایک وہ ہیں کہ جس طرح وہ واقع میں عبادت ہیں اسی طرح صورۃً بھی وہ عبادت ہیں یا عبادت سے ان کو تلبیس ہے۔ مثلاً نماز پڑھنا کہ حقیقتاً اور صورتاً دونوں طرح عبادت ہے یا مسجد تیار کرانا کہ اس کو صورتاً عبادت سے تلبیس ہے۔ دوسرے وہ اعمال ہیں کہ واقع میں وہ عبادت ہیں لیکن ان کی ظاہری صورت عبادت نہیں معلوم ہوتی نہ ان کو کسی عبادت سے ایسا ظاہری تلبس ہے کہ ہر شخص کی نظر میں آجائے جیسے کسی طالب علم کی مدد کرنا کھانے یا کپڑے سے (کوئی یہ نہ سمجھے کہ مجھے کسی طالب علم کا کھانا مقرر کرانا ہے ہرگز نہیں) کیونکہ طالب علم کا کھانا مقرر کرنا جو عبادت ہے تو اس لیے کہ یہ خدمت دین ہے اور اس کا خدمت دین ہونا اس وقت سمجھ میں آسکتا ہے کہ جب طالب علم فارغ ہوکر خدمت دین میں مصروف ہو تو یہ دونوں قسم کے اعمال عبادت ہیں لیکن دونوں میں تفاوت یہ ہے

کہ مسجد کی تعمیر صورتاً بھی عبادت ہے کہ اس کے ساتھ عبادت کو تلبس ظاہر ہے یعنی اس میں لوگ نماز پڑھتے ہیں اور تلبس بھی بلاواسطہ ہے اور اسی وجہ سے یہ تلبس بہت ظاہر ہے اور عبادت بھی ایسی کہ وہ بصورتہا عبادت ہے یعنی اس کا عبادت ہونا نظری نہیں ہر شخص جانتا ہے کہ نماز پڑھنا عبادت ہے لہٰذا اس کو یوں سمجھا جاتا ہے کہ بناء مسجد یا اس میں تیل بتی دینا بہت بڑی عبادت ہے۔

تقرر طعام طالب علم کی فضیلت

برخلاف تقرر طعام طالب علم کے کہ یہ جس سے متلبس ہے اول تو وہ ایسی ظاہر عبادت نہیں کہ عوام بھی فوراً سمجھ لیں دوسرے اطعام کو اس عبادت سے تلبس بھی بوسائط ہے کیونکہ امداد طلبہ میں علم دین کی مدد ہے اور وہ اتنی ظاہر عبادت نہیں کیونکہ اگر ایک شخص میزان الصرف یا درس کی کوئی کتاب بالخصوص فلسفہ یا ہیئت پڑھتا ہے تو کوئی یہ نہیں سمجھتا کہ یہ عبادت کر رہا ہے اس لیے کہ اس کا عبادت ہونا مآل اور انجام کے اعتبار سے ہے یعنی اگر دس برس تک یہ شخص مثلاً اسی میں لگا رہے اور فراغت حاصل کرے تو وہ اس قابل ہوگا کہ دین کی خدمت کر سکے اور خدمت دین افضل العبادات ہے۔

اسی خدمت دین کی بدولت شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو دوسرے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے افضل کہا جاتا ہے ورنہ عبادت کی کثرت اور قلت کسی کی مدون نہیں اور اگر کسی نے ظاہری فضائل کی چھان بین کی بھی ہے تو اس کو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کثیر الفضائل ہونا معلوم ہوا ہے۔ محدثین رحمہم اللہ نے اس کی تصریح کی ہے یہ یا تو دوسرے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اس قسم کے فضائل اس قدر مدون کم ہوئے ہیں یا فی الواقع حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایسے فضائل میں دوسرے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے زائد ہوں لیکن پھر بھی محققین اور اہل نظر یہی کہتے ہیں کہ شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما جمیع صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے افضل ہیں اور اس نظر کی تائید حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات عالم شہادت اور برزخ دونوں سے ہوتی ہے سو احادیث تو سب کے پیش نظر ہیں اور نہ ہوں تو وہ مدون ہیں ہر ایک دیکھ سکتا ہے۔ ہاں برزخی اقوال سے ایک قول نقل کرتا ہوں۔

دربار رسالت صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کو تین امور کا حکم

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے تین باتوں کا حکم فرمایا اور یہ تینوں باتیں میری مرضی کے خلاف ہیں مگر ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے میں نے اپنی مرضی کو چھوڑ دیا۔

ایک تو یہ کہ میرا رجحان حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تفضیل کی طرف تھا لیکن حضور صلی اللہ

علیہ وسلم نے فرمایا کہ شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو افضل الصحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سمجھو۔

دوسرے میرا میلان ترک تقلید کی جانب تھا ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہوا کہ مذاہب اربعہ سے باہر نہ ہو۔

تیسرے میں ترک اسباب کو پسند کرتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے روک کی تشبث بالاسباب کا حکم فرمایا۔

ان تینوں حکموں میں بہت سے راز ہیں لیکن یہ وقت ان کی تفصیل کا نہیں لہٰذا اس کو یہیں چھوڑا جاتا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ عالم برزخ میں بھی ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم یہی معلوم ہوا کہ شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے افضل سمجھو۔ غرض حدیث سے کشف سے محققین کی رائے سے ہر طرح شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی فضیلت ثابت ہوتی ہے اور اگر کسی کو اس مسئلے کی زیادہ تحقیق منظور ہو تو ازالۃ الخفاء کا مطالعہ کرے۔ وہ انشاء اللہ تعالیٰ خاص اسی متن کی پوری شرح ہوگی۔ خلاصہ سب کا یہ ہے کہ ان دونوں کے ہاتھ سے اسلام کی خدمت بہت زیادہ ہوئی۔ پس علم کی افضیلت کی تو یہ حالت لیکن باوجود افضل العبادات ہونے کے اس کی صورت عبادت کی نہیں ہے پھر اطعام کو جو اس سے تلبس ہے وہ تلبس بلاواسطہ نہیں بلکہ بوسائط ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں کس قدر ثواب ہے۔ مثلاً آپ نے ایک طالب علم کو کھانا کھلایا جس نے بدل ما یتحلل کا کام دیا اور اس نے مطالعہ و حفظ سبق کی قوت پیدا کی اور اس قوت سے اس نے کام لے کر ایک سبق یاد کیا اور اسی طرح مسلسل سات آٹھ برس تک یہ کرتا رہا اور اس مدت میں فراغ حاصل کر کے اس قابل ہو گیا کہ دین کی خدمت کرے اور اس نے دین کی خدمت شروع کر دی۔ پس یہ خدمت دین اسی مدد اور اطعام کی بدولت ہے جو آٹھ برس تک اس کو پہنچتی رہی اور اس خدمت کا ثواب ان سب لوگوں کو ملے گا جو اس کی امداد میں شریک رہے ہیں لیکن عوام الناس اس کو نہیں سمجھتے اور اس لیے ان کے پاس جب کچھ روپیہ جمع ہو جاتا ہے اور ان کو خدا کی راہ میں دینے کا کچھ خیال پیدا ہوتا ہے تو مسجد بنواتے ہیں اکثر ایسے لوگ ہیں کہ ان کے پاس وافر روپیہ ہے اور وارث ایک بھی نہیں یا وارث بھی ہیں مگر ان کو اس کی دنیا کی احتیاج نہیں تو اول تدبیر ان کی سمجھ میں یہی آتی ہے کہ اپنے گھر کی مسجد بنا دیں' آخر مسجد بنا کر اپنی زندگی بھر اس کے حجرے میں رہتے ہیں اور چھوڑ کر مر جاتے ہیں ایسے لوگ یہ نہیں سوچتے کہ اس جدید مسجد میں جو نمازی آئیں گے وہ دوسری قدیم مسجد کے جانے والے اور وہاں کی جماعت کے ہوں گے اور

جب قدیم مسجد کے لوگ یہاں آنے لگیں گے تو اس مسجد کی جماعت میں قلت ہو جائے گی ہم نے اسی قصبے میں دیکھا ہے کہ چار پانچ مسجدیں بالکل ہی قریب قریب بنی ہیں ایسی کہ اگر ایک ہی وقت میں سب جگہ نماز شروع ہو تو ایک مسجد کا امام دوسری مسجد کے امام کی قرأت پوری طرح سن سکتا ہے بلکہ عجب نہیں کہ سب آوازیں مختلط ہونے کے سبب کسی کو بھول بھی ہو جائے۔

تعمیر مساجد میں نیت تفاخر

اس میں بعضے لوگوں کی نیت تو تفاخر کی ہوتی ہے ایسے لوگ تو کسی شمار ہی میں نہیں لیکن بعض مخلص بھی ہوتے ہیں اگر چہ وہ ثواب میں مفلس ہی ہوتے ہیں۔ (لطیفہ عوام الناس ان اطراف میں مفلس کو مخلص کہتے ہیں میرے پاس ایک دیہاتی دوست آئے میں نے تذکرے میں کہا کہ تم بہت مخلص ہو کہنے لگے نہیں تمہاری دعا سے میرے پاس سب کچھ ہے' میں مخلص نہیں یعنی مفلس نہیں غرض ایسے لوگوں کو باوجود اخلاص نیت کے کچھ ثواب نہیں ملتا بلکہ الٹا ضرر ہوتا ہے لیکن ایسی مسجد کو مسجد ضرار نہیں کہہ سکتے کیونکہ ان لوگوں کی نیت خراب نہیں ہوتی آج کل اکثر مستفتی چالاکی کرتے ہیں کہ صورت سوال ایسی بناتے ہیں جس میں مجیب کو خواہ مخواہ مسجد ضرار ہی کہنا پڑے اور اکثر مجیب بھی بالکل سائل کے تابع ہو کر جواب دے دیتے ہیں۔ صاحبو! کسی مسجد کا مسجد ضرار ہونا آسان نہیں کیونکہ مسجد ضرار ہونے کے لیے نیت کا خراب ہونا شرط ہے۔ پس ممکن ہے کہ بانی کی نیت اچھی ہو اگر چہ اس کو غلطی ہوگئی ہو اور اگر فرض بھی کیا جائے کہ بانی کی نیت خراب ہی تھی تو اس مستفتی کو اس کا علم کیونکر ہوسکتا ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ ایسی مسجد بنانی جائز ہے۔ مقصود یہ ہے کہ سائل کو اصل نیت کا پتہ کیسے لگ سکتا ہے کہ اس پر مسجد ضرار کا اطلاق کر دیا جائے۔ اس کے سوا ممنوعات بھی ایک درجے کے نہیں ہوتے تو زیادہ سے زیادہ مسجد ضرار کی مثل ہو جائے گی لیکن مسجد ضرار نہیں کہہ سکتے اگر کوئی مسلمان کافروں کی سی حرکت کرنے لگے تو اس کو مشتبہ بالکفار کہیں گے لیکن کافر نہیں کہہ سکتے۔ الحاصل ایسی مسجد بنانا ناپسندیدہ ہے تو عوام کو ایک تو اس کا بہت شوق ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی صورت عبادت کی ہے۔

اور اسی بناء پر قرآن کے وقف کرنے کو بہت ثواب سمجھتے ہیں ہدایہ وقف کرنے کو کوئی ثواب نہیں سمجھتا۔ اگر چہ لینے والا قرآن کو پڑھے بھی نہ کیونکہ قرآن اس قدر طبع ہو گئے ہیں کہ کوئی ان کو پڑھتا بھی نہیں۔ اسی طرح جب کوئی مرتا ہے تو اس کے ترکہ میں سے قرآن وقف کرتے ہیں۔ اگر چہ وہ اتنا غلط ہو کہ کوئی پڑھ بھی نہ سکے۔ ایک مرتبہ ایک شخص بہت سے قرآن مسجد میں لایا کہ

میں ان کو وقف کرتا ہوں، دیکھا گیا تو سب غلط تھے۔ آخر میں نے ان کو دفن کرایا تو ایسے قرآن وقف کرنے سے کیا نتیجہ ہاں کوئی اوراق ہی کے وقف کرنے میں وقف قرآن کا ثواب سمجھے تو دوسری بات ہے۔ پس ایک معیار تو عوام کے ذہن میں یہ ہے۔

دوسرا معیار یہ ہے کہ جس کام کا نفع فوراً ظاہر ہو اس میں زیادہ ثواب سمجھتے ہیں اور جس کا نفع بدیر ہو اس میں اتنا ثواب نہیں سمجھتے۔ اسی بناء پر پانی پلانے کا ثواب زیادہ سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ اگر کسی شخص کا ارادہ کنواں بنوانے کا ہو اور اس سے کہا جائے کہ مسجد کا ایک حجرہ شکستہ ہو رہا ہے اس کو بنوا دو تو وہ کنویں کو ترجیح دے گا۔

تیسرا معیار عوام کے نزدیک یہ ہے کہ جس چیز کا نفع عام ہو اس میں زیادہ ثواب ہوتا ہے۔ چنانچہ کنواں بنوانا اس کی بھی مثال ہے یہ نمونہ کے طور پر عوام الناس کے تجویز کردہ معیاروں کا ذکر تھا جو ان کے حالات میں غور کرنے کے سے سمجھ میں آئے کہ نفع عاجل ہو اور نفع عام ہو اور اس کام کی صورت عبادت کی ہے اور عوام الناس جس طرح اپنے لیے ان تین معیاروں سے کاموں کی تجویز کرتے ہیں۔

عبدیت کا مفہوم

اسی طرح بزرگوں میں بھی موازنہ انہی تین معیاروں سے کرتے ہیں۔ مثلاً اگر ایک شخص تمام رات جاگتا ہے کسی سے بات بھی بہت کم کرتا ہے اور ایک دوسرا شخص ہے جو کہ فرائض واجبات اور سنن ادا کرتا ہے رات کو گھنٹہ دو گھنٹہ جاگ لیتا ہے حفاظت دماغ کی تدبیر بھی کرتا ہے نصیحت و پند بھی کرتا ہے خلق اللہ کی دلجوئی کے لیے لوگوں سے ملتا بھی ہے، بچوں سے مزاح بھی کر لیتا ہے تو عوام الناس اس کے مقابلے میں پہلے شخص کو زیادہ کامل سمجھیں گے۔ چنانچہ اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص بڑا عابد ہے بلکہ عابد کی جگہ معبد کہتے ہیں خدا جانے یہ لغت کہاں سے ایجاد کیا اور دوسرے شخص کو چونکہ دیکھتے ہیں کہ زیادہ عبادت نہیں کرتا اس لیے اس کو زیادہ کامل نہیں سمجھتے حالانکہ ممکن ہے کہ عابد واقع میں یہی شخص ہو کیونکہ عبادت عبد بننے کو کہتے ہیں اور عبدیت بجا آوری احکام کا نام ہے جس وقت بھی جو کلمہ ہو پس اختلاط خلق اغراض صالحہ سے نیز عبادت میں داخل ہے۔

تخلیق انسان کا مقصد اعظم

اس کے متعلق حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک تحقیق بیان کرتا ہوں، فرمایا کہ قرآن شریف میں ارشاد ہے: "مَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ" (میں نے جنوں اور انسانوں کو محض عبادت کے لیے پیدا کیا ہے) تو باوجود اس کے کہ ملائکہ اور حیوانات جمادات سے نباتات جواہر و

اعراض سب کے سب عبادت میں مصروف ہیں۔ جیسا کہ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کے بارے میں ارشاد ہے: "یُسَبِّحُوْنَ الَّیْلَ وَالنَّھَارَ لَایَفْتُرُوْنَ" (پاکی بیان کرتے ہیں رات اوردن اور اس سے نہیں تھکتے) حیوانات وغیرہ کے بارے میں فرماتے ہیں: "اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰکِنْ لَّاتَفْقَھُوْنَ تَسْبِیْحَھُمْ" (کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہے کہ اللہ کی حمد وتعریف نہ کرتی ہو لیکن ان کی تسبیح کو تم لوگ نہیں سمجھتے) ان کے علاوہ اور متعدد آیات سے ہر ایک چیز کا عبادت میں مشغول ہونا معلوم ہوتا ہے پھر انسان اور جن کی تخصیص عبدیت میں کیوں فرمائی گئی فرمایا کہ وجہ یہ ہے کہ ایک تو نوکر ہوتا ہے ایک غلام ہوتا ہے، نوکر کی خدمات ہمیشہ معین ہوا کرتی ہیں یعنی اگر چہ کتنے بھی مختلف کام نوکر سے لئے جائیں لیکن کوئی کام ایسا ضرور ہوتا ہے کہ جس میں نوکر عذر کر دے اور کہہ دے کہ میں اس کام کے لیے نہیں ہوں، مثلاً اگر کوئی شخص اپنے نوکر سے کہنے لگے کہ تو مہتر کا کام بھی کیا کر تو وہ ہرگز نہ منظور کرے گا اور عذر کر دے گا علیٰ ہذا اور بہت سے کام ایسے نکلیں گے جن میں نوکر کی جانب سے عذر ہوگا بلکہ اولاد بھی جس پر نوکر سے زیادہ قبضہ اور تسلط ہوتا ہے بعض کاموں میں انکار کر دیتی ہے۔ چنانچہ ہمارے ایک خاندانی سید اور معزز دوست نے ایک ایسے موقع پر کہ سقوں نے پانی بھرنا چھوڑ دیا تھا اپنے لڑکے کو کہا کہ بھائی سقوں نے تو پانی بھرنے سے جواب دیدیا ہے اہل محلّہ کو سخت تکلیف ہوتی ہے تم ہی لوگوں کے یہاں پانی بھر آیا کرو۔ وہ لڑکا بہت خفا ہوا برخلاف غلام کے کہ اس کا کوئی خاص مقرر کام نہیں ہوتا بلکہ اس کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ایک وقت آقا کی نیابت کرتا اور زرق برق لباس میں ہوتا ہے اور دوسرے وقت آقا کے نجس کپڑوں کو صاف کرتا ہے، ایک وقت بھنگی کا کام کرتا ہے تو دوسرے وقت سفارت کا کام کرتا ہے۔ پس غلام نوکر بھی ہے مہتر بھی ہے سفیر بھی ہے خلیفہ بھی ہے پس انسان اور جن تو بمنزلہ غلام کے ہیں اور دوسری مخلوقات مثل نوکر کے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ دوسری مخلوقات کی عبادت کو تسبیح وتقدیس وسجدہ وغیرہ الفاظ سے فرمایا اور انسان اور جن کی عبادت کو بلفظ عبدیت فرمایا اور جب انسان اور جن عبد اور غلام ہیں تو ان کی کوئی خاص خدمت نہ ہوگی بلکہ ایک وقت نماز روزہ کرنا عبادت ہوگا تو دوسرے وقت سونا قضائے حاجت کرنا لوگوں سے ملنا وغیرہ وغیرہ کام عبادت ہوں گے۔ چنانچہ حدیث میں ہے: "نھی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم ان یصلی حاقنا او کما قال"[1] (قضا حاجت کی شدت کے وقت نماز ادا کرنے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا) کہ جس وقت پیشاب پاخانہ کا دباؤ ہو اس وقت نماز پڑھنے کی ممانعت ہے اور دفع فضلہ واجب ہے، دیکھئے ایک وقت انسان کے لیے ایسا نکلا کہ اس کو مسجد جانا حرام اور بیت الخلاء جانا واجب ہوا۔

---

[1] (سنن ابن ماجة: ٦١٧)

انتظار نماز میں ثواب

اسی طرح اگر کوئی شخص اول وقت نماز پڑھنا چاہے اور اس کو شدت سے بھوک لگی ہو تو شریعت حکم کرے گی کہ نماز کو مؤخر کرو اور کھانا کھاؤ۔ اسی راز کو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نہایت پاکیزہ الفاظ میں فرماتے ہیں: "لان یکون اکلی کلہ صلوۃ خیر من ان یکون صلوتی کلھا اکلا" (کھانا کھاتے رہنا اور خیال نماز کی طرف رہنا یہ بہتر ہے اس بات سے کہ نماز پڑھتا رہے اور نیت کھانے کی طرف رہے) کیونکہ جب کھانا کھانے میں نماز کا برابر خیال رہا تو یہ سارا وقت انتظار صلوٰۃ میں گزرا اور انتظار صلوٰۃ میں صلوٰۃ کا ثواب ملتا ہے۔ برخلاف اس کے اگر بھوک میں نماز شروع کردی جائے تو جوارح تو نماز میں مشغول ہوں گے اور دل کھانے میں پڑا ہوگا تو نماز کھانے کی نذر ہوگی اور یہی فہم ہے جس کی بدولت ان حضرات کو فقیہ اور مجتہد کہا جاتا ہے آج یہ فہم مفقود ہے، ہم لوگ کتابیں ان سے زیادہ پڑھتے ہیں مگر وہ بات حاصل نہیں۔

نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند

(ہر وہ شخص جو آئینہ رکھتا ہے ضروری نہیں کہ سکندری فن سے واقف ہو)

ہر عمل کی غایت

اور اسی راز کی بناء پر ہمارے حضرت حاجی امداداللہ صاحب قبلہ نوراللہ مرقدہم فرمایا کرتے تھے کہ اگر جسم ہند میں رہے اور دل مکہ میں تو یہ اس سے بہتر ہے کہ جسم مکہ میں رہے اور دل ہندوستان میں۔ غرض انسان کے لیے کوئی خاص عبادت مقرر نہیں کیونکہ اس کی شان عبدکی ہے اور جب یہ ہے تو ایک تو وہ شخص ہے کہ نماز پڑھ کر کسی دیہاتی سے باتوں میں مشغول ہے اور کھیتی باڑی کے حالات پوچھ رہا ہے اور دوسرا شخص لاالہ الا اللہ کی تسبیح میں مصروف ہے تو بظاہر یہ دوسرا شخص افضل اور اکمل معلوم ہوتا ہے لیکن غور کریں تو معلوم ہو کہ اگر پہلے شخص کی نیت درست ہے مثلاً مسافر کے انبساط خاطر کے لیے ایسا کر رہا ہے یا کوئی دوسری ایسی ہی نیت ہے تو یہ باتیں زیادہ افضل اور مقبول ہیں کیونکہ ہر عمل اپنے آثار اور غایت کے اعتبار سے افضل ہوتا ہے تو ہر عمل کی غایت دیکھنا چاہیے لیکن عوام الناس اس کو نہیں سمجھتے۔

دوستوں کا دل خوش کرنا بھی عبادت ہے

حضرت مولانا فتح محمد صاحب حضرت حاجی امداداللہ صاحب کی حکایت بیان فرماتے تھے کہ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا بہت دیر تک بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ ہاں آخر جب

بہت دیر ہوگئی تو میں اٹھا اور عرض کیا کہ حضرت آج میں نے آپ کی عبادت میں بہت حرج کیا' حضرت فرمانے لگے کہ مولانا یہ کیا فرمایا کیا نماز روزہ ہی عبادت ہے اور دوستوں کا جی خوش کرنا عبادت نہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ساتھ بیٹھتے تھے اور حد جواز تک جس قسم کی باتیں صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم فرماتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ شریک رہتے مگر عوام الناس کیا سمجھیں۔

درنیابد حال پختہ ہیچ خام پس سخن کوتاہ باید والسلام

(تجربہ کار آدمی کی حالت کو غیر تجربہ کار آدمی نہیں سمجھ سکتا۔ لہٰذا بات کو طول نہ دے' بڑوں کی شان میں اعتراض کرنے سے اپنی زبان کو تھامے رکھ اسی میں بھلائی وخیریت ہے)

عوام الناس کی حالت اور مذاق پر مجھے ایک حکایت یاد آتی ہے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ جب شیخ نہال احمد رئیس دیوبند کا نکاح ان کے والد نے کیا تو چماروں کو بھی زردہ پلاؤ فیرینی وغیرہ کھلائی اور کھانے تو انہوں نے جس طرح ہوا کھائے مگر جب فیرینی سامنے آئی تو اس کو چکھ کر ان میں سے ایک شخص کیا کہتا ہے کہ یہ تھوک سا کیسا ہے یعنی کیا ہے' واقعی جس نے ہمیشہ گڑ اور شیرا کھایا ہو وہ کیا جانے کہ قند میں کیا مزا ہے اور فیرینی کیسی ہوتی ہے۔ اسی طرح معانی کی عوام الناس کو خبر نہیں ہوتی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول تھا کہ کھانے پینے حتیٰ کہ ایام جاہلیت کے تذکروں میں بھی صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ساتھ شامل رہتے تھے اور ان لوگوں کے تذکروں کو سن کر آپ تبسم فرماتے تھے اور آپ کا ہنسنا تبسم سے زیادہ نہ ہوتا تھا اور کبھی کسی نے آپ کی آواز قہقہہ کی نہیں سنی اور وجہ اسکی یہ ہے کہ تجربہ ہے کہ جب کسی وجہ سے غم کا غلبہ ہوتا ہے تو ہنسی کی آواز نہیں نکلتی۔ اگرچہ کم وبیش تبسم کی حالت ہوجائے۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا جو تجربہ سے ثابت ہے اور ایک مقدمہ شمائل ترمذی سے ملائی شمائل میں ہے۔ "کان دائم الفکرۃ متواصل الاحزان"[1] (حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ فکرمند رہتے اور آپ پر غم یکے بعد دیگرے آتے رہے) اور وجہ اس کی خود ہی ارشاد فرماتے ہیں: کہ میں کیونکر چین سے رہوں حالانکہ صاحب صور تیار کھڑا ہے کہ اب حکم ہو اور صور پھونک دوں گویا یہ حالت تھی کہ

مرا در منزل جاناں چہ امن وعیش چوں ہر دم جرس فریاد میدارد کہ بربندید محملہا

---

[1] (اتحاف السادۃ المتقین۷:۱۵۸)

(مجھے محبوب کے گھر پہنچ کر بھی امن وعیش نہیں ملا وجہ یہ ہے کہ گھنٹہ ہر وقت کوچ کی خبر دے رہا ہے)

ہنسی تو ان لوگوں کو آ سکتی ہے جو بالکل بے فکر ہوں، سو اللہ والوں کو بے فکری کہاں البتہ دوسروں کی خاطر سے کبھی کچھ ہنس دیتے ہیں۔

حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی حکایت

اس کے مناسب حکایت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے حضرت یحییٰ علیہ السلام کثیر البکا تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اے یحییٰ کیا تم خدا تعالیٰ کی رحمت سے بالکل ناامید ہو گئے ہو کہ کسی وقت تمہارا رونا ختم ہی نہیں ہوتا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اے عیسیٰ علیہ السلام کیا تم خدا تعالیٰ کے قہر سے بالکل مامون ہو کہ تم کو ہر وقت ہنسی ہی آتی رہتی ہے آخر ایک فرشتہ آیا اور کہا کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم تم دونوں میں فیصلہ کرتے ہیں کہ اے عیسیٰ علیہ السلام جلوت میں تو ایسے ہی رہو جیسے اب رہتے ہو لیکن خلوت میں یحییٰ کی طرح گریہ وزاری کیا کرو اور اے یحییٰ خلوت میں تو ایسے ہی رہو جیسے اب ہو لیکن لوگوں کے سامنے کچھ تبسم بھی کر لیا کرو کہ لوگوں کو میری رحمت سے مایوسی نہ ہو جائے کہ جب نبی کا یہ حال ہے تو ہم کو نجات کی کیا امید ہے۔

تبسم سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم میں حکمت

اور یہ حکایت اس لیے بیان کی گئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تبسم جو کچھ تھا وہ محض اس لیے تھا کہ آپ کے ساتھ مصالح خلق کے وابستہ تھے اگر یہ بات نہ ہوتی تو شاید تبسم بھی نہ ہوتا۔ غرض جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم باتوں میں ہنسی میں مشغول ہوتے تھے اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمال کی عام کو کیا خبر ہوتی ہوگی۔ اسی لیے کافر کہتے تھے: "**مَالِهٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْاَسْوَاقِ**" یہ کیسا رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہے کہ کھانا بھی کھاتا ہے (ان کے زعم میں یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کے خلاف تھا اور بازار میں بھی چلتا ہے) مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد　　کم کسے زابدالِ حق آگاہ شد

(تمام عالم اسی سبب سے گمراہ ہو گیا کہ بہت کم لوگ خدا کے نیک بندوں سے مطلع ہوتے ہیں)

ہمسری باانبیاء برداشتند　　اولیاء راہمچو خود پنداشتند

(اپنے کو انبیاء علیہم السلام کو برابر رکھتے ہیں اور اولیاء اللہ کو اپنی ہی طرح سمجھتے ہیں)

گفت اینک مابشر ایشاں بشر　　ماؤ ایشاں بستہ خوابیم و خور

(کہتے ہیں کہ ہم بھی انسان اور یہ بھی انسان ہم اور وہ دونوں خواب اور کھانے میں فطرۃً مجبور ہیں)

ایں نداستند ایشاں از عمی درمیاں فرقے بود بے منتہا

(یہ ان کو عدم بصیرت کی وجہ سے پہچان ہی نہیں سکتے جبکہ دونوں میں بے انتہا فرق ہے)

ایں خورد گردد پلیدی زو جدا واں خورد گردد وہمہ نور خدا

(یہ جو کچھ کھاتا ہے سب پلیدگی اور گندگی ہو جاتا ہے اور اللہ سے جدا ہو جاتا ہے اور وہ جو کچھ کھاتے ہیں سب خدا کا نور بنتا ہے)

کہ ایک کھاتا ہے تو اس سے پلیدی نکلتی ہے دوسرا کھاتا ہے تو اس سے نور خدا نکلتا ہے۔

حضرت عارف رومی کے ایک شعر کا مفہوم

میں جب حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے مثنوی پڑھا کرتا تھا تو اس شعر میں مجھے خیال ہوا کہ یہ فرض محض شاعرانہ طور پر مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمادیا ہے کیونکہ واقعی فرق تو اس وقت ہوسکتا ہے کہ جب اہل اللہ کے پیٹ سے فضلہ نہ نکلتا جب سبق شروع ہوا تو حضرت قبلہ نے کیا خوب فرمایا کہ پلیدی سے مراد اخلاق ذمیمہ ہیں اور نور خدا سے مراد اخلاق حسنہ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اہل اللہ کھاتے ہیں تو ان کو اخلاق حمیدہ میں مدد ملتی ہے اور دوسرے لوگ کھاتے ہیں تو ان کو اخلاق ذمیمہ میں مدد ملتی ہے تو باوجود اس ورق عظیم کے کفار نے نہ سمجھا اور انبیاء کو اپنی مثل کہا کیونکہ ان میں کوئی انوکھی بات نہ تھی' کھانا بھی کھاتے تھے' پانی بھی پیتے تھے۔

آج کل بھی ایسے لوگوں کو جو کھانا چھوڑ دیں بہت بزرگ سمجھا جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر پانی کی یا کھانے کے چھوڑنے پر بزرگی کا مدار ہے تو سرسری اور سانڈا اور سمند جو جانور ہیں بہت بزرگ ہیں کیونکہ سرسری پانی بالکل نہیں پیتی اور سانڈا نہ کھانا کھاتا ہے نہ پانی پیتا ہے صرف ہوا اس کی غذا ہے۔

بزرگی کی حقیقت

صاحبو! بزرگی تو وہ چیز ہے کہ

میان عاشق و معشوق رمزیست کراما کاتبین راہم خبر نیست

(عاشق اور معشوق کے درمیان بعض راز ایسے پنہا ہوتے ہیں کہ کرام کاتبین دو فرشتے ہیں جو نیکی اور بدی لکھتے ہیں کو بھی خبر نہیں ہوتی)

یعنی بزرگی نسبت مع اللہ کا نام ہے جس کی پوری حقیقت کا بعض دفعہ فرشتوں کو بھی پتہ نہیں لگتا۔ البتہ اس کی ظاہری علامت یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمام افعال اقوال حرکات میں زیادہ تشبہ ہو یعنی جس طرح نماز ادا کرنے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری متابعت کی کوشش کی جائے اسی

طرح آپس کے برتاؤ روزمرہ کی باتوں میں سونے میں جاگنے میں غرض ہر ہر بات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی کوشش کی جائے اور یہ اتباع عادت ہو جائے کہ بے تکلف سنت کے موافق افعال صادر ہونے لگیں اور عادات کو اس عموم میں اس لیے داخل کیا گیا کہ حدیث میں **ما انا علیہ و اصحابی** (جس راستے پر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور میرے صحابہ ہیں) آیا ہے اور ما عام ہے عبادت اور عادت دونوں کو تو بزرگی اور نسبت کی علامت یہ ہے اور کم کھانے یا کم پینے کو اس میں کچھ دخل نہیں۔

کم کھانا بزرگی کی علامت نہیں

دوسرے کسی شخص کی نسبت یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ بہت کھاتا ہے یا کم کھاتا ہے تو قطع نظر بزرگی کی علامت ہونے سے خود اس کا حکم بھی مشکل ہے کیونکہ کم کھانا یہ ہے کہ بھوک سے کم کھائے تو ممکن ہے کہ جس کو تم بہت کھانے والا سمجھے ہو اس کی بھوک اس خوراک سے دونی ہو تو وہ تو کم کھانے والا ہوا۔ ایک شیخ سے ان کے مریدوں نے ایک دوسرے مرید کی شکایت کی کہ حضرت یہ بہت کھاتا ہے چالیس پچاس روٹیاں کھا جاتا ہے۔ شیخ نے اس کو بلا کر کہا کہ بھائی اتنا نہیں کھایا کرتے۔ (**خیر الامور اوسطھا**) ''تمام کاموں میں میانہ روی بہتر ہے'' اس مرید نے کہا کہ حضرت ہر ایک کا اوسط الگ ہے یہ صحیح ہے کہ میں اتنی مقدار کھا جاتا ہوں لیکن یہ غلط ہے کہ میں زیادہ کھاتا ہوں کیونکہ اصلی خوراک میری اس سے بہت زیادہ ہے جب تک مرید نہ ہوا تھا اس سے دونی کھایا کرتا تھا تو اس حکایت سے معلوم ہوا ہوگا کہ بعض آدمیوں کی خوراک ہی بہت زیادہ ہوتی ہے اور اصلی خوراک کے اعتبار سے وہ بہت کم کھاتے ہیں تو یہ معیار صحیح نہیں ہے۔

اگر کسی کو شبہ ہو کہ بزرگوں نے قلتہ الطعام اور قلتہ المنام کا حکم فرمایا ہے تو سمجھو کہ اول تو ہر ایک کی قلت جدا ہے جیسا حکایت بالا سے معلوم ہوا دوسرے ہر ایک کے لیے قلت کو تجویز بھی نہیں کیا جاتا بلکہ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان کے لیے کسی بڑے مفسدے کے دفع کرنے کے لیے کسی خفیف مکروہ کے ارتکاب کو بھی جائز رکھا جاتا ہے جبکہ اس کے ذریعے سے کسی کو گناہ کبیرہ سے بچانا منظور ہو۔

مراتب کو سمجھنے کے لیے بصیرت کی ضرورت

چنانچہ ایک چور کسی بزرگ سے بیعت ہوا اور چوری کرنے سے توبہ کی لیکن چونکہ مدت کی عادت پڑی ہوئی تھی اس لیے ہر شب چوری کرنے کا سخت تقاضا طبیعت میں پیدا ہوتا اور اس کو دبانے کے لیے وہ یہ کرتا کہ تمام ذاکرین کے جوتے اٹھا کر گڑبڑ کر دیتا اس کے جوتے کے ساتھ اس کا اور اس

کے جوتے کے ساتھ اس کا غرض کسی ایک کا جوتا بھی اپنے ٹھکانے نہ ملتا۔ آخر لوگوں نے دق ہو کر ایک شب بیدار رہ کر دیکھا' معلوم ہوا کہ یہ نوگرفتار ہیں' صبح ہوئی تو شیخ سے شکایت کی انہوں نے بلا کر اس سے دریافت کیا اس نے کہا کہ حضور میں بیشک ایسا کرتا ہوں لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ مدت سے مجھے چوری کرنے کی عادت تھی اب میں نے توبہ کر لی ہے لیکن رہ رہ کر طبیعت میں تقاضا پیدا ہوتا ہے جس کو میں یوں پورا کرتا ہوں اب اگر آپ مجھے اس سے منع فرمائیں گے تو میں اضطراراً پھر چوری کروں گا۔ غرض میں نے چوری سے توبہ کی ہے ہیرا پھیری سے توبہ نہیں کی۔ شیخ نے کہا کہ بھائی تجھ کو اس کی اجازت ہے تم ہیرا پھیری کر لیا کرو۔ ان مراتب کو سمجھنا بڑی بصیرت پر موقوف ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نام کی برکت

ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ترک ملازمت اور قطع تعلقات کی ہرگز اجازت نہ دیتے تھے' فرمایا کرتے تھے کہ اب تو صرف ایک بلا میں گرفتار ہے چھوڑ دے گا تو خدا جانے کیا کچھ کرے گا اور کس قسم کی آفات کا شکار ہوگا تو اتنی بلاؤں سے ایک ہی بلا اچھی ہے۔ اب لوگ اس سے خوش ہوتے ہیں کہ پیر صاحب لنگوٹہ بندھوا دیں اور بیوی بچوں کو چھڑا دیں' ایسے لوگوں کو تنخواہ پیر صاحب تو دینے سے رہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے اور ہونا چاہیے کہ جب حوائج ضروری پوری نہیں ہو سکتی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں رہتا تو جھوٹی شہادتیں دینا جھوٹے مقدمے لڑانا قرض لے کر دبا لینا' غرض اسی طرح کے صدہا آفات میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ملازمت ترک کرانے کی کیا ضرورت خدا تعالیٰ کا نام جب دل میں جگہ کرے گا وہ خود ہی چھڑا دے گا۔ کیونکہ

عشق آن شعلہ است کوچوں بر فروخت　　ہر کہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

(عشق وہ شعلہ ہے جب بھڑک گیا معشوق کے سوا باقی سب کا سب جلا دیتا ہے)

تیغ لا در قتل غیر حق براند　　درنگر آخر کہ بعد لاچہ ماند

(لا الہ کی تلوار غیر حق والوں کے قتل کرنے میں چلتی ہے' پھر دیکھو لا کے بعد کیا رہ جاتا ہے)

ماند الا اللہ و باقی جملہ رفت　　مرحبا ای عشق شرکت سوز زفت

(صرف الا اللہ رہ گیا اور باقی تمام کا تمام ختم ہو گیا' اے عشق اے سب شرکتوں کے جلا دینے والے تجھے شاباش)

ذکر اللہ کے لیے ترک ملازمت کی ضرورت نہیں

مشہور ہے کہ آب آمد و تیمم برخاست۔ تو آب تو آنے دو تیمم خود ہی جاتا رہے گا یہی راز تھا جس کے لیے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ چھوڑانے کی کیا ضرورت ہے وقت پر خود ہی چھوٹ جائے گا اور یہ حکم ایسے شخص کے لیے تھا جس کے کھانے پینے کی کوئی سبیل نہ ہو کہ ایں بلا دفع بلاہائے بزرگ۔

یہ مصیبت بڑی مصیبتوں کو دور کرتی ہے

اور اگر کسی کے پاس کوئی ایسا ذریعہ موجود ہو تو اس کو یہی مناسب ہے کہ اس پر قناعت کرے اور یاد خدا میں مشغول ہو۔ مولانا نظام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

خوشا روز گارے کہ دارد کسے کہ بازار حرصش نباشد بسے

(جو کام کسی شخص کو مل گیا ہے وہ اچھا ہے اس سے یہ فائدہ ہوا کہ اس کی حرص وہوس محدود ہو جائے گی)

بقدر ضرورت یسارے بود کند کارے امرد کارے بود

(پھر بقدر ضرورت آسانی ہوگی پھر اگر وہ کام کا آدمی ہے تو بھلا کام بھی مل جائے گا)

یعنی اگر ضرورت کے لائق موجود ہو اور اس پر قناعت کر کے کام میں مشغول ہو جائے تو یہ بہت اچھا ہے تو اس فرق کو دریافت کرنا اور لوگوں کے حالات اور طبائع کا انداز کرنا یہ کامل ہی کا کام ہے۔

شان مشیخت

اور یہی شان مشیخت ہے ورنہ کسی بزرگ کے ملفوظات یاد کر لینے یا تصوف کے مسائل ازبر ہونے سے شیخ نہیں ہوتا۔ مولانا فرماتے ہیں:

حرف درویشاں بدزد و مرد دوں تا کہ پیش جاہلاں خواند فسوں

(درویشوں کا کلام چراتا ہے دنیا دار کمینہ آدمی تا کہ جاہلوں کے سامنے جادو جیسا بیان کر کے انہیں اپنا گرویدہ کرے)

باتوں کے یاد کر لینے سے کچھ نتیجہ نہیں۔ اگر ایک شخص کو بہت سی مٹھائیوں کے نام یاد ہوں اور نصیب ایک بھی نہ ہو تو اس حفظ اسماء سے کوئی فائدہ بھی نہیں لیکن اگر نام ایک کا بھی یاد نہ ہو اور کھانے کو دونوں وقت ملتی ہوں تو سب کچھ حاصل ہے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

میم و واؤ و میم و نون تشریف نیست لفظ مومن جزپئے تعریف نیست

(لفظ میم اور واؤ اور میم اور نون ان کے اندر خود بزرگی نہیں ہے یعنی لفظ مومن تو صرف پہچان کے لیے ہے)

کہ نام تو صرف پہچان کے لیے ورنہ اس میں کیا رکھا ہے۔ اصل چیز معنی ہے اور وہ اس سے بفراسخ دور۔ آج یہ حالت ہے کہ دو چار تعویذ گنڈے یاد کر لئے کچھ جھاڑ پھونک سیکھ لی اور شیخ وقت بن گئے۔ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اے بے خبر بکوش کہ صاحب خبر شوی　　تاراہ بین نباشی کے راہ برشوی

(اے بے خبر کوشش کرتا کہ خبر والا ہو تو' جب تک راہ دیکھنے والا نہ ہو تو رہبر کیسے ہو سکتا ہے)

در مکتب حقائق پیش ادیب عشق　　ہاں اے پسر بکوش کہ روزی پدر شوی

(اور حقائق کے مدرسہ میں عشق سکھانے والے استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرتا کہ ایک دن تو بھی استاد کا درجہ پانے کے قابل ہو جائے)

تو پہلے پسر تو بن لیں اس کے بعد پدر بننے کی نوبت آئے گی۔ یہ تو پیروں کی حالت ہے۔

مریدوں کی یہ حالت ہے کہ انہوں نے انتخاب کی معیار عجیب وغریب اختراع کر رکھی ہیں جس میں ذرا ہو حق پاتے ہیں اس کو بزرگ سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ یہ محض گرمی طبع سے ہونے لگتا ہے۔

ایک شخص حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آیا اور عرض کیا کہ حضرت میرا قلب جاری ہو گیا۔ آپ نے حاضرین سے فرمایا کہ دل کے دھڑ کنے کو قلب کا جاری ہونا نہیں کہتے قلب کا جاری ہونا یہ ہے کہ ہر وقت خدا تعالیٰ کی یاد دل پر حاضر رہے۔

اکثر لوگ کہا کرتے ہیں فلاں بزرگ کی بوٹیاں تھرکتی ہیں۔ یہ بہت کامل ہیں اور جن لوگوں میں یہ بات نہیں ہوتی ان کی نسبت کہتے ہیں کہ نیک بخت ہیں یعنی ان میں کمالات باطنی نہیں حالانکہ کمالات باطنی بالکل مخفی ہیں اور ان کو بوٹیوں کے تھرکنے سے کچھ بھی تعلق نہیں۔

اور وہ کمالات یہ ہیں کہ فن میں ماہر ہو۔ امت کے لیے حکیم ہو شریعت کا پورا پابند ہو یہ باتیں نہ ہوں تو ہزار مجاہدہ ریاضت ہو کچھ نہیں۔ جفاکش کہیں گے محنتی کہیں گے لیکن بزرگی سے کوئی علاقہ نہیں۔ بہر حال عوام الناس اپنے اعمال میں بھی غلط معیار پر چلتے ہیں اور انتخاب بھی غلط معیار سے کرتے ہیں کہ ان کی بدولت اکثر حقوق واجبہ بھی تلف اور ضائع ہو جاتے ہیں۔

ایک سرحدی عابد کی حکایت

ایک سرحدی عابد کی نسبت سنا ہے کہ آخر شب میں تہجد ادا کرنے کے لیے مسجد میں آئے اتفاق سے اس روز مسجد میں کوئی مسافر بھی سو رہا تھا آپ نے نماز شروع کی لیکن مسافر کے خراٹوں کے سبب نماز میں مرضی کے موافق یکسوئی اور اجتماع خیالات نہ ہو سکا آپ نے نماز توڑ دی اور مسافر

کو خواب سے جگا دیا کہ ہماری نماز میں خلل پڑتا ہے اس کے بعد پھر آ کر نیت باندھ لی' مسافر چونکہ تکان سے بہت خستہ ہو رہا تھا' تھوڑی دیر میں پھر سو گیا اور خراٹوں کی آواز پھر شروع ہوئی آپ نے پھر نماز توڑ کر اس کو بیدار کیا اور اس کے بعد نماز شروع کی۔ تیسری بار پھر ایسا ہی ہوا تو آپ کو بہت غصہ آیا اور چھری لے کر اس غریب مسافر کو شہید کر دیا اور پھر بفراغت نماز پڑھی۔ صبح کو نماز کے لیے لوگ جمع ہوئے تو مسجد میں لاش کو دیکھا' تعجب سے پوچھا کہ اس شخص کو کس نے قتل کیا تو عابد صاحب فرماتے ہیں کہ اس نے ہماری نماز میں خلل ڈالا اس لیے ہم نے قتل کر ڈالا' یہ تو بالکل کھلی حماقت تھی اس لیے سب نے اس پر نفریں کی ہوگی لیکن آج کل اس سے بہت بڑی بڑی حماقتیں لوگ کرتے ہیں اور ان کی طرف ذرا التفات نہیں ہوتا کیونکہ وہ اس سے غامض ہوتی ہیں۔

افسوس ہے کہ آج دین کی سمجھ بالکل مفقود ہے ناواقفی سے ہم لوگوں کی بعض اوقات وہ حالت ہوتی ہے جیسے ایک سرحدی کی نسبت سنا ہے کہ وہ ہندوستان میں آیا ہوا تھا اتفاقاً' کسی نے موقع پر اس کو زخمی کر دیا' ایک شخص نے اس پر رحم کھا کر اس کا علاج کرایا' چند روز میں اس کو آرام ہو گیا' جب اپنے وطن جانے لگا تو اس شخص سے کہا کہ اگر تم کبھی ہمارے دیس میں آؤ گے تو ہم تمہارے احسان کی مکافات کریں گے۔ چنانچہ ایک مرتبہ کسی ذریعے سے وہ شخص اس کے وطن گیا اور یاد آیا کہ اپنے دوست سے ملے۔ دریافت کرتا ہوا اس کے گھر پہنچا' ملاقات ہوئی' نہایت عزت سے پیش آیا اور اپنے گھر پر لے گیا اور اس سے کہا کہ تم بیٹھو میں ابھی آتا ہوں' اس کے جانے کے بعد گھر والوں نے اس شخص سے پوچھا کہ تم کون ہو' کہاں سے آئے ہو' اس نے سارا قصہ ان سے بیان کیا۔ انہوں نے کہا کہ خدا کے لیے تم فوراً یہاں سے بھاگو ورنہ وہ تم کو ہلاک کر دے گا کیونکہ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر کبھی ہمارا دوست ہمارے وطن آئے تو ہم اس کے احسان کی مکافات کریں گے اس طرح کہ اول اس کو اسی قدر زخمی کریں گے جتنے ہم ہوئے تھے اور پھر اس کا علاج کر کے اس کو تندرست کریں گے۔ چنانچہ وہ ابھی چرا لے کر آئے گا اور تم کو زخمی کرے گا' یہ غریب وہاں سے بھاگا اور اس طرح اس کی جان بچی۔

کیفیات کو مطلوب سمجھنا غلطی ہے

تو بہت لوگوں کی عبادت ایسی ہوتی ہے جیسی اس کی مکافات تھی لیکن لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا۔ مثلاً بعض لوگوں کو مراقبہ کا ایسا شوق ہوتا ہے کہ اگر حالت مراقبہ میں کوئی شخص ان کے پاس آ کر نماز کے متعلق مسئلہ دریافت کرے اور نماز کا وقت نکلا جاتا ہو اور کوئی دوسرا آدمی مسئلہ بتانے

والا بھی نہ ہو تو یہ ہرگز مراقبہ سے سر نہ اٹھائیں گے حالانکہ ایسے وقت میں فرض ہے کہ مراقبہ چھوڑ کر مسئلہ بتلا دیں۔ میں نے خود ایسے لوگ دیکھے ہیں کہ ہر وقت تسبیح ہاتھ میں ہے لیکن نہ بیوی کی خبر ہے نہ بچے کی گویا ماسوی اللہ کو چھوڑ دیا اور سبب اس غلطی کا یہ ہے کہ لوگ کیفیات کو مطلوب سمجھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اگر ہم خدا کے مقبول نہ ہوتے تو ہم پر یہ کیفیات کیونکر طاری ہوتیں حالانکہ یہ کفار پر بھی ہوتی ہیں۔ اس کی حقیقت ایک واقعہ سے سمجھ میں آئے گی۔

ایک سجادہ نشین نے مجلس عرس میں کلکٹر اور صاحب جج کو مدعو کیا وہ چونکہ خلیق تھے شریک ہو گئے' آخر تن تن شروع ہوئی اور قوالوں نے گانا شروع کیا' کچھ ایسا سماں بندھا کہ صاحب جج پر محویت کے آثار طاری ہونے لگے اور وہ بے اختیار ہو کر گرنے لگے' تھوڑی دیر تو تحمل کیا جب نہ سنبھل سکے تو صاحب کلکٹر نے کہا کہ میری بھی یہی حالت ہے آخر دونوں وہاں سے اٹھ گئے اور چل دیئے۔ تو صاحبو! کیا یہ صاحب کلکٹر اور صاحب جج بھی بزرگ تھے' معلوم ہوا کہ کیفیات کا مدار قبول اور بزرگی نہیں وہ ایک انفعال ہے جو اکثر ذکر و شغل سے اور دوسرے اسباب سے بھی پیدا ہونے لگتا ہے۔ اسی طرح بعض اشغال سے ذکر میں یکسوئی بھی زیادہ ہوتی ہے اور خطرات کم ہونے لگتے ہیں کیونکہ ان اشغال سے رطوبات کم ہو جاتی ہیں تو سب اسباب طبعیہ کے دخل سے ہوتی ہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ کیفیات محض بے کار ہیں ہرگز نہیں' کیفیات نافع بھی ہیں لیکن مقصود یہ ہے کہ ان میں زیادہ دخل اسباب طبعیہ کو ہے۔

ایک بزرگ کو دیکھا گیا کہ وہ اپنے بڑھاپے میں روتے تھے سبب پوچھا گیا تو کہنے لگے کہ جوانی میں نماز میں لذت زیادہ ہوتی تھی میں سمجھتا تھا کہ یہ نسبت کا اثر ہے لیکن اب وہ حالت نہیں رہی۔ معلوم ہوا کہ وہ سب جوانی کا نشاط تھا اب چونکہ وہ نہیں رہی اس لیے وہ کیفیت بھی نہیں رہی اور نسبت کی گرمی بڑھاپے میں جا کر اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔

خود قوی تر میشود خمر کہن   خاصہ آں خمرے کہ باشد من لدن

(پرانی شراب خود بخود زیادہ تر قوی ہو جاتی ہے خاص کر وہ شراب جو میرے ساقی کے ہاتھ آئے) دوسرے بزرگ کہتے ہیں:

ہر چند پیرو خستہ و بس ناتواں شدم   ہرگہ نظر بروی تو کردم جواں شدم

(اگرچہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور کمزور و ناتواں ہو گیا ہوں مگر پھر بھی جب تیرے (پرکیف) چہرے پر نگاہ ڈالتا ہوں جوان ہو جاتا ہوں)

غرض یہ نفسانی کیفیات نہ محمود ہیں نہ مذموم ہیں البتہ اگر یہ آلہ مقصود کا بن جائیں تو پھر محمود ہو جاتی ہیں ورنہ ہیچ مثلاً بعض کیفیات کہ بیوی بچوں کو چھوڑ کر بھی باقی رہتی ہیں اوراس لیے لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم مقبول اور خاصان خدا ہیں لیکن یاد رکھو کہ وہ مذموم ہیں اور یہ عقیدہ یہودیوں کا تھا کہ مخالفت احکام پر بھی دعوے مقبولیت کا کرتے تھے چنانچہ وہ کہا کرتے تھے "نَحْنُ اَبْنٰٓءُ اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ" (ہم خدا کے بیٹے اوراس کے محبوب ہیں) یعنی ہم مثل بیٹے کے ہیں کہ جس طرح باپ اپنے بیٹے کو ہر حال میں چاہتا ہے اسی طرح خدا تعالیٰ ہم کو ہر حال میں چاہتے ہیں۔ خدا تعالیٰ ان کے اس خیال کا رد فرماتے ہیں کہ "قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ" (آپ فرمادیجئے کہ پھر کیوں وہ تم کو تمہارے گناہوں کی وجہ سے تم کو عذاب دیتا ہے) تو اس اُمت میں بھی بعض لوگ اس خیال کے موجود ہیں مگر سمجھ لینا چاہیے کہ قیامت میں ایسے لوگوں کی گردن ناپی جائے گی ان اعمال کی وہاں کچھ بھی قدر نہ ہوگی کیونکہ مقصود عبادات ہیں مجاہدات و ریاضت مقصود نہیں۔ لیکن چونکہ ہم لوگوں کی عبادات میں وہ خلوص مطلوب پیدا نہیں ہوتا اس لیے یہ مجاہدات کئے جاتے ہیں کہ ہماری نمازوں اور نیز دوسری عبادات میں صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی شان پیدا ہو جائے۔ پس یہ ریاضت مقصود الغیر ہوئی لکھا ہے کہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کو کسی نے خواب میں دیکھا' پوچھا کہ حضرت وہ تصوف کے نکات جو زندگی میں بیان ہوتے تھے یہاں بھی کچھ کام آئے' فرمایا کہ سب فنا ہو گئے ہاں کچھ نماز اخیر شب میں پڑھ لیتا تھا' وہ البتہ کام آئی۔ "مانفعنا الا رکیعات فی جوف اللیل" (نہیں نفع دیا ہم کو لیکن نیم شبی کی چند رکعتوں نے لوگ' خدا جانے ان کیفیات کو کیا کچھ سمجھے ہوئے ہیں)

خواجہ پندارد کہ دارد حاصلے حاصل خواجہ بجز پندار نیست

(سردار گمان کرتا ہے کہ وہ مقصود حاصل کر چکا ہے حالانکہ خواجہ کا حاصل سوائے گمان کے اور کچھ نہیں)

لیکن اس کا مطلب کوئی یہ نہ سمجھے کہ محض ظاہری اعمال کافی ہیں اور مجاہدات کی مطلق ضرورت نہیں کیونکہ ظاہری اعمال میں خلوص شرط ہے اور آج وہ مفقود ہے اور یہ مجاہدات اس خلوص کا مقدمہ ہیں اور مقدمہ واجب کا واجب ہوتا ہے جیسے وضو مقدمہ ہے' صلوٰۃ کا خود مطلوب بالذات نہیں لہٰذا بدون ان مجاہدات کے نرے اعمال اکثر کافی نہیں یہاں تک عوام الناس کے مقرر کردہ معیاروں اور ان کے آثار کا بیان تھا۔

اعلائے کلمۃ اللہ کی رفعت

اب مناسب ہے کہ اصلی اور صحیح معیار بیان کر دیا جائے۔ خدا تعالیٰ فرماتے ہیں:

اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجَاهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ۝

''کیا تم نے حجاج کے پانی پلانے کو اور مسجد حرام کی تعمیر کرنے والوں کو ان لوگوں کے برابر کیا ہے جو اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔''

اس کی شان نزول میں مختلف قصے آئے ہیں جن کی تفصیل اس وقت مستحضر نہیں اتنی قدر مشترک ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بعض لوگوں میں گفتگو ہوگئی تھی کہ ایک جماعت اپنے اعمال کی وجہ سے اپنے کو افضل سمجھتی تھی دوسری جماعت اپنے تئیں۔ خدا تعالیٰ اس آیت میں فضیلت اعمال کا فیصلہ کرتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ کونسی جماعت افضل ہے۔ ترجمہ آیت کا یہ ہے:

کیا تم حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد کی تعمیر کرنے کو اس شخص کے اعمال کے برابر کرتے ہو جو خدا پر اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہو اور اس نے دین کو نفع پہنچایا ہو یہ دونوں جماعتیں ہرگز برابر نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عمارت مسجد اور سقایۃ حاج ایمان باللہ واعلائے کلمۃ اللہ کی برابر نہیں ہے کیونکہ جعلتم کا مفعول سقایۃ کو قرار دیا ہے جو کہ عمل ہے تو مقصود اعمال کا تفاضل بیان کرنا ہے۔ رہی یہ بات کہ ایک جانب میں تو جعلتم کا مفعول اعمال کو بنایا اور دوسری جانب میں کاف کا مدخول مومنین کی ذات کو قرار دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے جو ابھی ذہن میں آئی کہ جو لوگ معمرین مسجد تھے وہ اس وقت تک کافر تھے اور عمل ان کا نیک تھا۔ اگرچہ خصوصیت محل کی وجہ سے اس پر کوئی ثمرہ مرتب نہیں تھا تو اس جانب میں اعمال کا ذکر کر کے یہ بتلا دیا کہ اب بوجہ عامل کے مومن نہ ہونے کے یہ اعمال مقبول ہی نہیں لیکن اگر اس سے قطع نظر بھی کی جائے اور نفس اعمال کو دیکھا جائے۔ تب بھی اپنے مقابل اعمال سے کم ہیں اور دوسری جانب میں ذات کو کاف کا مدخول بنا کر یہ بتلا دیا کہ ان اعمال کی یہ حالت ہے کہ ان کے اختیار کرنے سے خود عمل کرنے والا بھی مقبول ہو جاتا ہے۔

الغرض اس آیت میں افضلیت سقایۃ وعمارۃ کے دعوے کی تغلیط ہے اور مبنی اس دعوے کا وہی تھا جو آج کل عوام الناس میں ہے یعنی عمل کا نفع عاجل ہو اور عام ہو اور عمل کی صورت عبادت کی سی ہو۔ سقایۃ الحاج میں تو نفع عام اور نفع عاجل تھا اور تعمیر مسجد کی صورت عبادت کی تھی اس لیے ظاہراً معنیٰ فضیلت کے اس میں زیادہ تھے اور اس کی تغلیط کر کے خدا تعالیٰ بتلاتے ہیں کہ فضیلت فلاں فلاں عمل میں ہے لیکن اس میں یہ بات غور کرنے کے قابل ہے کہ جن اعمال کو اللہ تعالیٰ نے افضل بتایا ہے ان میں وجہ اس افضلیت کی کیا ہے اور اس میں غور کرنے سے یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا کہ نفع لازم سے نفع متعدی افضل ہے یا نہیں اور تعدیہ یا لزوم پر افضلیت کی بناء ہو سکتی ہے یا نہیں۔

فضیلت ایمان

تو آیت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وجہ افضلیت کی اور اس کا معیار ایمان ہے یعنی جس چیز کو ایمان سے زیادہ تلبس ہوگا وہ زیادہ افضل ہوگی اور اسی وجہ سے ایمان کے ساتھ ایک دوسری صفت یعنی جاهد فی سبیل الله (اللہ کے راستے میں اس نے جہاد کیا) کو بھی ذکر کر دیا کیونکہ وہ اعلاء کلمۃ اللہ کا باعث اور اسلام کے پھیلانے میں معین ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ کوئی عمل ایسا نہیں کہ بدوں اس کے دوسرے عمل بالکل مقبول نہ ہوں مثلاً ایسا نہیں کہ نماز بدون زکوٰۃ کے قبول نہ ہو اور زکوٰۃ بدون حج کے بجز ایمان کے کہ اس پر تمام اعمال موقوف ہیں۔ پس اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ متعدی کو من کل الوجوہ افضل کہنا غلطی ہے۔ چنانچہ ایمان عمل متعدی نہیں اور پھر سب سے افضل ہے اور یہیں سے یعنی ایمان کے افضل الاعمال ہونے سے ان لوگوں کی غلطی بھی معلوم ہوگئی جو کہ غیر اہل ایمان کو اہل ایمان پر فضیلت دیتے ہیں اور کہا کرتے ہیں کہ مسلمانوں سے فلاں قوم اچھی ہے۔ البتہ اگر ایسے مضامین سے مسلمانوں کو غیرت دلانا مقصود ہو تو مضائقہ نہیں' بعض لوگ بے دھڑک کہہ دیتے ہیں کہ فلاں شخص مسلمان ہو کر بھی فلاں عیب کو نہیں چھوڑتا۔ اس سے تو مسلمان ہی نہ ہوتا تو بہتر تھا یہ سخت غلطی اور جہل ہے ایک شخص مجھ سے کہنے لگے کہ رنڈیوں کو مسلمان نہ کرنا چاہیے اسلام کو ایسے مسلمانوں سے عیب لگتا ہے میں نے کہا کہ اگر اسلام ایسے مسلمانوں کو نکالے تو تم کو ان سے پیشتر نکال دے گا' تمہارے اعمال کہاں کے اچھے ہیں۔ بعضے لوگ چمار بھنگی کے مسلمان ہونے کو بوجہ تحقیر کے پسند نہیں کرتے مگر یاد رکھو جب قیامت کا دن ہوگا اس روز معلوم ہو جائے گا کہ ہم جن کو ذلیل سمجھتے تھے ان کی کیا حالت ہے اور ہماری کیا گت۔

فسوف ترى اذا انكشف الغبار　افرس تحت رجلك ام حمار

(پس عنقریب تو اے مخاطب دیکھ لے گا جس وقت کہ غبار ختم ہو جائے گا کہ آیا تیرے پیروں کے نیچے گھوڑا ہے یا کہ گدھا میدان جنگ میں کس قسم کے سوار پر فتح پائی ہے۔ اسی طرح دنیا کی زندگی ایک قسم کا غبار جب موت واقع ہوگی اور دنیاوی پردہ ختم ہو جائے گا اس وقت حقیقت حال ظاہر ہو جائے گی)

ایمان کی عجیب مثال

اسی طرح مومن عیب دار کو کافر باکمال کے مقابلے میں آپ دیکھیں گے کہ ایک شخص جو صرف ایمان لایا تھا اور کوئی عمل اس نے اچھا نہیں کیا اس کو تھوڑی مدت کے بعد عذاب سے نجات ملے گی اور

کہا جائے گا: "اُدْخُلُوا الجَنَّۃَ لاَ خَوفٌ عَلَیْکُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ" (جنت میں داخل ہو جاؤ اب نہ تمہیں کوئی خوف ہوگا نہ کسی کا غم) اور اس کے مقابلے میں ایک ایسا شخص جو کہ دنیا میں بڑا خلیق مہربان با کمال تھا لیکن دولت ایمان سے محروم تھا وہ ابدالاباد جہنم میں رہے گا اور کبھی اس کو نکلنا نصیب نہ ہوگا۔

اس کو واضح طور سے یوں سمجھو کہ اگر گورنمنٹ کی رعایا میں دو شخص ارتکاب جرم کریں ایک تو چوری میں ماخوذ ہو اور دوسرا بغاوت میں تو اگرچہ سزا دونوں کو دی جائے گی لیکن چور کی سزا محدود اور کم ہوگی ایک دن ایسا ضرور ہوگا کہ وہ سزا بھگت کر پھر اپنے گھر آئے اور چین سے بسر کرے پر وہ باغی کبھی عذاب سے نجات نہ پائے گا اور زندگی بھر سزا کی تکالیف میں رہے گا یا فوراً پھانسی کا حکم ہوگا کہ زندگی ہی کا خاتمہ ہو جائے گو وہ کتنا ہی بڑا لائق فائق ہو اور وہ چور بالکل جاہل کندہ ناتراش ہو۔

صاحبو! ایمان ایک آفتاب ہے اگر ہزاروں بدلی کے ٹکڑے اس پر حائل ہوں تب بھی اس کا نور فائض ہو کر رہے گا اور جھلک جھلک کر روشنی پڑے گی اور کفر کی خوش اخلاقی آئینہ کی سی چمک ہے جو کہ بالکل عارضی ہے۔

مسلمان کے افضل ہونے کی عجیب مثال

دوسری مثال لیجئے اگر ایک گلاب کی شاخیں کسی گملہ میں لگادی جائیں اور اس کے مقابل کاغذ کے ویسے ہی پھول بنا کر رکھ دیئے جائیں تو اگرچہ اس وقت کاغذ کے پھولوں میں زیادہ رونق اور شادابی ہے۔ اصل گلاب کی وہ حالت نہیں لیکن ایک چھینٹا بارش ہو جائے پھر دیکھئے کہ گلاب کیا رنگ لاتا ہے اور کاغذ کے پھول کیسے بدرنگ ہوتے ہیں پس مسلمان اگرچہ دنیا میں کسی حالت میں ہو لیکن قیامت میں جب ابر رحمت برسے گا تو دیکھنا کہ اس کا اصلی رنگ کیسا کچھ نکھرتا ہے اور کافر کی زرق برق حالت پر کیا پانی پڑتا ہے۔ صاحبو! غیرت آنی چاہیے کہ مسلمان ہو کر اسلام کی حقیقت جان کر اپنے منہ سے کافر کو مسلمان پر فضیلت دو اور مسلمان کی مذمت اور کافر کی تعریف کرو۔ جب معلوم ہوا کہ ایمان ایسی بڑی چیز ہے تو اس کے ساتھ جن چیزوں کو زیادہ تلبس ہوگا وہ افضل ہوں گی لیکن تلبس بالایمان کو سمجھنا ذرا دشوار ہے کیونکہ بعض ایسے اعمال ہیں کہ وہ خود اسلام کا مبنی ہیں بعض ایسے ہیں کہ وہ اسلام پر مبنی ہیں۔

تو معیار وہ اعمال ہیں جو کہ مبنی ہوں اسلام کا چنانچہ آیت میں ایمان کے ساتھ اسی عمل کو ذکر کیا گیا ہے جس سے اسلام کو قوت پہنچتی ہے اور مسجد حرام کی تعمیر خود اسلام پر مبنی ہے۔ پس یہاں سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ مسجد کی خدمت سے دین کی مدد اور اس کو قوی بنانا زیادہ افضل ہے۔ اسی طرح اور جس قدر اعمال ہیں سب میں یہی دیکھنا چاہیے جیسے تعلیم و تعلم وعظ ارشاد یعنی اصلاح خلق۔

اصلاح خلق کی فضیلت

پس وظیفہ وظائف سے اصلاح خلق میں زیادہ فضیلت ہوگی کیونکہ یہ مبنی ہے ایمان کی تکمیل کا مگر یہ افضلیت باعتبار معیار مذکور کے فی نفسہ ہے ورنہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو عمل فی نفسہ افضل نہیں وہ کسی عارض کی وجہ سے زیادہ قابل توجہ ہو جائے اور کسی خاص وقت میں اس کی طرف توجہ کرنا زیادہ افضل ہو جیسے وضو کہ نماز سے افضل نہیں لیکن بعض اوقات بوجہ شرطیت نماز کے زیادہ ضروری ہو جاتی ہے یا مثلاً وعظ کہنا کہ فی نفسہ تخلیہ للعبادۃ سے افضل ہے۔

لیکن جب کہ وعظ پر مقصود بقدر ضرورت مرتب ہو چکے تو بلا ضرورت ہر وقت اس میں مشغول رہنے سے یہ بہتر ہوگا کہ کسی وقت عبادت کے لیے تخلیہ بھی اختیار کرے اور کسی وقت اپنی بھی فکر کرے اور خدا کی یاد میں لگے اور اسی کی طرف اشارہ اس آیت میں ہے: ”فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ“ کہ ایک وقت ایسا بھی نکالئے کہ صرف خدا ہی کی یاد میں اس وقت مشغول ہوں کوئی دوسرا کام نہ ہو۔

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روے　　بہ ازانکہ چتر شاہی ہمہ روز ہاؤ ہوئے

(ایک زمانہ فراغ دلی کے ساتھ نظر کرنا اس خوبصورت کی طرف بہتر ہے چتر شاہی سے اور تمام دن کی ہاؤ ہو سے)

خوش وقتے و خرم روز گارے　　کہ یارے برخورد از وصل یارے

(مبارک ہے وہ وقت اور وہ گھڑیاں جب ایک محب اپنے محبوب کے وصل سے سرفراز ہو)

نسبت کے بقاء کا سبب

اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر شے کے بقاء کے لیے ایک سبب ہوتا ہے اور نسبت جس کی بدولت وعظ بھی مؤثر ہو گیا ہے اس کی بقاء کا سبب یہ ہے کہ کسی وقت صرف شغل مع اللہ رہے اور یہاں سے ان لوگوں کی غلطی بھی معلوم ہو گئی ہوگی جو کہ مشیخت تک پہنچ کر اپنا کام بالکل چھوڑ دیتے ہیں اس سے ان کی نسبت ضعیف ہو جاتی ہے اور فیض بند ہو جاتا ہے۔

خلاصہ وعظ

خلاصہ یہ ہے کہ جو اعمال اسلام کا مبنی ہوں وہ افضل ہوں گے اس قاعدہ کو محفوظ کر کے اعمال میں فیصلہ کر لینا چاہیے اور جس کو اس قدرت قوت نہ ہو کہ خود

فیصلہ کر سکے وہ کسی عالم سے پوچھ لے کیونکہ ہر شخص کچھ نہ کچھ عمل کرتا تو ضرور ہے اور ہر شخص کو اس کی تمیز نہیں ہو سکتی جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ بعض اوقات اعمال غیر فاضلہ بھی کسی عارض کی وجہ سے افضل ہو جاتے ہیں تو ایسے مواقع پر دریافت کر لینا چاہیے۔البتہ اگر کوئی عمل ایسا ہو کہ اس کی ضرورت محسوس ہو اور کوئی دوسرا عمل اس وقت اس کے مقابلے میں ایسا ضروری نہ ہو تو اگر چہ یہ مفضول ہی ہو اس کو کرنا چاہیے۔مثلاً ایک آباد مسجد گر گئی اور نمازی پریشان ہیں یا عید گاہ گر گئی تو ایسے موقع پر اس کا کرنا زیادہ ضروری ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن اعمال کی ضرورت متعین ہو اور وہ معلوم بھی ہو جائے وہاں تو اس کو کر لینا چاہیے۔اگر چہ مفضول ہو اور جہاں ضرورت نہ ہو وہاں اپنی رائے سے ایک عمل کو دوسرے عمل پر ترجیح نہ دینا چاہیے بلکہ کسی عالم سے استفتاء کرنا چاہیے جیسے مثلاً بخاری شریف کا وقف کرنا یا کسی غریب کو کھانا کھلا دینا۔اب اس کے مقابلے کے لیے یہ بھی بیان کر دینا مناسب ہے کہ جس طرح حسنات میں تفاضل ہے اسی طرح گناہوں میں بھی تفاوت ہے۔

سیئات میں استفتاء کی ضرورت

لیکن جس طرح حسنات میں استفتاء کرنے کی ضرورت ہے کہ کس عمل کو کیا جائے اور کس کو چھوڑا جائے اسی طرح سیئات میں استفتاء کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ سب کو چھوڑ دینا چاہیے کیونکہ چھوٹے بڑے گناہ سب گناہ ہیں اور حرام ہیں۔اکثر لوگ پوچھا کرتے ہیں کیا فلاں کام بہت ہی گناہ ہے مطلب یہ ہوا کہ اگر چھوٹا ہو تو ہم کر لیں۔یاد رکھو اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی ایک چنگاری کی نسبت پوچھے کہ کیا یہ چنگاری بہت بڑی ہے یا انگارا تو صاحبو! جس طرح ایک بڑا انگارا مکان بھر کو پھونک دے گا۔اسی طرح ایک چنگاری بھی گھر بھر کو پھونک دے گی تو ایمان کے قصر کو ایک چھوٹا گناہ بھی ویسا ہی برباد کر دے گا جس طرح بہت بڑا گناہ تو سب سے بچنا چاہیے' بعض لوگ پوچھا کرتے ہیں کہ رشوت لینا زیادہ گناہ ہے یا سود کھانا۔میں کہتا ہوں کہ یہ کیوں نہ پوچھا جاتا کہ پیشاب زیادہ گندہ ہوتا ہے یا پاخانہ تا کہ جو کم گندہ ہو اس کو تناول فرمائیں۔غرض یہ ہے کہ حسنات میں تو تفاضل کو دریافت کرو اور گناہ سب چھوڑ دو۔

صرف تذکیر مطلوب ہے

اب میں اس وعظ کا ربط سابق وعظ سے بیان کرتا ہوں کہ عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ سے شبہ ہوتا تھا کہ شاید دوسرے کو نفع پہنچانے کی اجازت نہیں تو آج کے بیان سے یہ شبہ جاتا رہا کیونکہ اس بیان سے اس کی فضیلت بھی ثابت ہوئی پس وہ آیت نفع پہنچانے کے معارض نہیں ہے البتہ کسی کے پیچھے نہ پڑو کہہ کر ختم کر دو۔ مثلاً اس وقت میں نے وعظ کہا ہے یہاں تک تو مناسب ہے اب اگر میں ایک ایک کے درپے ہوں اور تحقیق کرتا پھروں کہ کس نے عمل کیا اور کس نے نہیں کیا اور پھر اس کی فکر و تدبیر میں لگو یہ اکثر اوقات مضر ہے۔ دیکھو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہے: "فَذَکِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَکِّرٌ" (اور آپ نصیحت فرمایئے اس لیے آپ نصیحت کرنے والے ہیں) اور دوسرے موقع پر یہ بھی ارشاد ہے کہ "اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی...... فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی" (اور جو شخص آپ سے بے پروائی اختیار کرتا ہے تو آپ اس کے درپے ہو جاتے ہیں) تو تذکیر تو مطلوب ہے مگر پیچھے پڑنا بیکار ہے اپنی پوری ہی ہو وہاں ضروری ہے جیسے اپنی اولاد یا شاگرد اور کیونکہ اصل مضمون تو معلوم ہو گیا گو آج معلوم ہوا یہ مضمون دس بارہ دن سے میرے ذہن میں تھا' درمیان میں ذہول بھی ہو گیا تھا' اللہ کا شکر ہے کہ آج یہ بیان ہو گیا یہ بالکل نیا مضمون ہے اس سے اپنے اعمال میں بھی تفاضل سمجھنے کا طریقہ بآسانی معلوم ہو سکتا ہے اور انتخاب بھی اس معیار سے ممکن ہے۔ اب خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمدللّٰہ رب العالمین.

وصلی اللّٰہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقه محمد

وآله واصحابه اجمعین.

دعوات عبدیت کا چوتھا وعظ ملقب بہ

بفضل العظیم

بمقام ریاست رام پور چرخ والی مسجد' ۲۳ صفر المظفر ۱۳۳۱ھ یوم جمعہ' ۲ گھنٹہ ۱۴ منٹ بیٹھ کر یہ وعظ ارشاد فرمایا۔ مولوی سعید احمد تھانوی صاحب نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَاشَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارِکۡ وَسَلِّمۡ. اَمَّابَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ. بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ.

وَاَنۡزَلَ اللّٰہُ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَۃَ وَعَلَّمَکَ مَالَمۡ تَکُنۡ تَعۡلَمُ وَکَانَ فَضۡلُ اللّٰہِ عَلَیۡکَ عَظِیۡمًا○

''اور اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب اور علم کی باتیں نازل فرمائیں اور آپ کو وہ باتیں بتلائیں جو آپ نہ جانتے تھے اور آپ پر اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے۔''

فضیلت علم

یہ ایک آیت کا جزو ہے اس میں حق سبحانہ وتعالیٰ نے علم کے عطا کرنے کا امتنان (نعمت دینا واحسان رکھنا) جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پر ظاہر فرمایا ہے جس سے علم کی فضیلت معلوم ہوتی ہے تو علم کی فضیلت اس آیت میں مذکور ہے اور اس وقت اس کے بیان کرنے کی دو ضرورتیں ہیں ایک خاص اور ایک عام۔ خاص ضرورت تو یہ ہے کہ آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ اس وقت تک مدرسہ کا جلسہ اور عام ضرورت یہ ہے کہ واقع میں مسلمانوں کو کسی وقت علم سے استغناء نہیں ہے اور باوجود اس کے آج کل اس کی طرف سے عام بے توجہی ہے تو اس لیے بھی اس کی ضرورت ہے تاکہ اس بیان کو سن کر لوگ ادھر متوجہ ہوجاویں اور علم دین کی احتیاج ظاہر ہے۔

قانون الٰہی کی وسعت

کیونکہ علم دین جملہ قوانین الٰہیہ کے جاننے کا نام ہے اور خداوند تعالیٰ کے ساتھ ہمارا جو تعلق ہے وہ ظاہر ہے کہ وہ ہمارے مالک اور ہم ان کے مملوک اور مطیع ہیں تو حق تعالیٰ کو ہر طرح کا اختیار

ہے جو چاہیں کریں تو یہ بھی اختیار ہے کہ احکام جاری کریں چنانچہ جاری کیے تو جیسا کہ کوئی کسی کے حکم امتناعی میں رہ کر اس کے قوانین کو ضرور مانتا ہے ایسا ہی ہم کو بھی خداوند تعالیٰ کے احکام ماننے ضرور ہوں گے اور حق تعالیٰ کے قوانین ایسے محیط ہیں کہ دنیوی دینی سب حرکات واعمال کے ساتھ ایک ایک قانون متعلق ہے خواہ یجوز (یہ جائز ہے) خواہ لا یجوز (یہ ناجائز ہے) ایسا کوئی فعل نہیں جس کے متعلق جائز یا ناجائز کا کوئی فتویٰ نہ ہو اور ظاہر ہے کہ افعال کس قدر کثرت سے ہیں ان کے اندر کتنی وسعت ہے تو وہ قانون بھی ایسا ہی وسیع ہوگا تو جو شخص اس قانون کو نہ جانے گا اس سے بہت قریب ہے کہ اس قانون کے خلاف عمل درآمد ہو جاوے اس لیے اس کا جاننا ضروری ہوا۔ البتہ اگر نہ جاننے کا عذر معتبر ہوتا تب بھی غنیمت ہوتا مگر کسی سلطنت میں بھی نہ جاننا عذر نہیں ہے بالخصوص جبکہ جاننے کے ذرائع بھی موجود ہوں گو خدا تعالیٰ کے یہاں ایسے لوگ جن کے پاس خدائی قانون کے جاننے کے اسباب نہ ہوں کسی درجہ میں معذور ہیں لیکن جہاں اسباب موجود ہوں کہ کہنے سننے والے موجود ہوں اور یہ معلوم ہو گیا ہو کہ حق تعالیٰ کی طرف سے کچھ احکام ہیں تو اس وقت نہ جاننا تو کسی طرح بھی عذر نہیں' لوگ سمجھتے ہیں کہ جان کر عمل نہ کرنا زیادہ سخت ہے۔

قانون خداوندی کو جاننے کی ضرورت

ہاں ایک اعتبار سے یہ بھی صحیح ہے "ویل للعالم سبع مرات"[1] (عالم کے لیے سات گنی خرابی ہے) مگر دوسری طرف نظر کی جاوے تو یہ پھر بھی ایک ہی جرم ہے یعنی صرف عمل تو نہ کرنے کا مگر جاہل سے تو یہ بھی سوال ہوگا کہ علم کیوں نہیں' حاصل کیا تو اس نے دو جرم کئے تو لوگوں کا یہ خیال کہ پڑھ کر کیا ہوگا' اگر پڑھ کر عمل نہ کریں گے تو اور زیادہ گناہ ہوگا۔ محض غلط ہے کیونکہ جاہل رہنا دہرا جرم ہے تو قوانین خداوندی کا جاننا ضروری ہوا کیونکہ جو شخص نہیں جانے گا وہ عمل کیا کرے گا بلکہ اگر امید عمل نہ ہو تو بھی جاننا ضروری ہے کیونکہ جاننے میں اول تو یہ فائدہ ہے کہ جہل کے جرم سے بچا۔ دوسرے ممکن ہے کہ کبھی عمل کی توفیق ہو تو اس وقت جاننے سے یہ فائدہ تو ہوگا کہ عمل تو کر سکے گا اور اگر اس وقت جانتا بھی نہ ہوگا تو عمل کیسے کرے گا' جیسے اگر کسی کو خارشت کا نسخہ بھی معلوم نہ ہو تو اگر کسی وقت اس کا علاج کرنا چاہے گا بھی تو کیا کرے گا۔ اسی طرح اگر کسی کو علم ہی نہیں تو اگر چاہے گا بھی تو عمل کیسے کرے گا اور اگر کہے کہ جب عمل کرنے کا ارادہ ہوگا اسی وقت جان لیں گے تو یہ خیال غلط ہے کہ اس وقت علم حاصل کر لیں گے۔ عین وقت پر علم حاصل کرنا بہت

---

[1] (اتحاف السادة المتقين ۲: ۷، ۳۲۲' المغنی عن حمل الاسفار ۱: ۱۹۲۲' بلفظ آخر)

دشوار ہے کیونکہ ہمیشہ اس کے اسباب مہیا نہیں ہوتے ممکن ہے کہ اس وقت کوئی بتلانے والا ہی نہ ملے نیز ایک دم سے تمام باتوں کا علم حاصل کرنا نفس پر شاق بھی ہوتا ہے۔ دیکھئے عمل کے اندر بھی شریعت نے اس کی رعایت کی ہے کہ ایک دم سے بار نہیں ڈالا۔

سات برس کی عمر میں حکم نماز کی حکمت

چنانچہ ارشاد ہے کہ جب بچہ سات برس کا ہو جاوے اس وقت اس سے نماز پڑھنے کے لیے کہو اور جب دس برس کا ہو جاوے تو مار کر نماز پڑھاؤ حالانکہ دس برس کا لڑکا بالغ نہیں ہوتا اور سات برس کی لڑکی بھی بالغ نہیں ہوتی تو سات ہی برس سے جبکہ دونوں نابالغ ہیں نماز پڑھانے کا حکم ہے۔ غرض سات برس یا دس برس ہر حالت میں نابالغ ہیں۔ سات برس کی عمر میں تو سب ہی نابالغ ہوتے ہیں اور دس برس کی عمر میں اکثر مگر پھر بھی نماز پڑھانے کا حکم ہے۔ ایک بچہ مجھ سے کہنے لگا کہ میں تو بالغ نہیں ہوں تو مجھ پر نماز واجب نہیں، میں نے کہا کہ تم پر تو واجب نہیں لیکن ہم پر تو واجب ہے کہ تم کو جبراً پڑھائیں تو شریعت میں آخر یہ کیوں رکھا گیا کہ بلوغ سے بھی پہلے ہی ان سے نماز پڑھوائی جائے۔ اس لیے کہ اگر بلوغ کی حالت میں دفعۃً اس کو کہا جاوے گا تو بہت مشکل ہے کہ اول ہی تاریخ میں پانچ وقت کے مقید ہو سکے اس کے متعلق ایک نکتہ یاد آیا کہ سات برس کی تخصیص کیوں ہے حالانکہ اس کے قبل بھی نماز پڑھائی جا سکتی ہے۔ مجھے ایک مرتبہ یہ خیال ہوا کہ سات برس کی تخصیص مقصود نہیں ہے۔ یہ محض اس لیے ہے کہ سات برس میں بچہ کو اکثر نماز کی سمجھ ہو جاتی ہے لیکن اگر اس عمر سے کم ہی میں اتنی سمجھ ہو جاوے کہ نماز پڑھ سکے تو اسی وقت اس کو نماز پڑھوانا چاہیے۔ بس میں نے یہ خیال کر کے مدرسہ میں پانچ برس کے بچوں کو بھی کھڑا کر دیا۔ عصر کا وقت تھا بعد نماز کے معلوم ہوا کہ ایک بچہ نے نماز میں پیشاب کر دیا ہے اس وقت حکم شریعت کی معلوم ہوئی کہ سات برس کی تخصیص میں یہ حکمت ہے کہ اس سے کم ایسی باتوں کی تمیز نہیں آتی۔ خلاصہ یہ کہ سات ہی برس کی عمر سے بچوں کو نماز پڑھوانے کا حکم ہے جبکہ بالغ بھی نہیں ہوتے تو حکمت اس کی وہی ہے کہ پہلے سے عادت پڑے اب جبکہ بالغ ہوگا اور نماز پڑھنا پڑے گی تو اس وقت دشواری نہیں ہوگی جیسے ایک دم سے عمل کرنا دشوار ہے اسی طرح علم حاصل کرنا بھی دشوار ہے۔

زیادت علم کے لیے دستور العمل

اس لیے ضرورت ہے اس کی کہ قبل وقوع ضرورت علوم ضروریہ کو جمع کر لیں اور جمع کرنے کے وقت یہ نہ سمجھو کہ فلاں عمل میرے ذمہ تو ہے نہیں اس کا علم ابھی سے کیوں حاصل کروں۔ جب ذمہ

ہوگا اس وقت جان لوں گا کیونکہ بعض اوقات عین وقت پر علم حاصل کرنا دشوار ہے تو پہلے ہی سے جان رکھنا چاہیے۔ مثلاً نماز کے مسئلے پہلے ہی سے سیکھ لینا چاہیے یا مثلاً دکان شروع کی تو چونکہ بہت سی معاملہ کی صورتیں ناجائز ہیں تو اس کو قبل شروع ہی جان لینا چاہیے۔ غرض علم چونکہ دفعۃً واحدۃ حاصل ہونا مشکل ہے لہٰذا کم ازکم ایک مسئلہ ہر روز سیکھتے رہنا چاہیے تو یہ اتنی ضرورت کی چیز ہے جب تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ امر ہے "قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا" یعنی آپ کہیے کہ آپ اے رب میرے علم کو زیادہ کیجئے کیونکہ آپ کے لیے تو علم کی زیادتی کا یہی طریقہ تھا کہ حق تعالیٰ بذریعہ وحی کے علم بڑھادیں اس لیے آپ کو یہی طریقہ بتلایا گیا مگر دوسرے لوگوں کے لیے یہ کافی نہیں ان کو جاننے والوں سے معلوم کرنا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ اس کو یہ حکم ہے کہ "فَاسْئَلُوْآ اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ" یعنی اگر تم کو علم نہیں ہے تو علم والوں سے پوچھ لو۔ ہاں اس کے ساتھ یہ دعا بھی ضروری ہے "رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا" (اے رب میرے علم کو زیادہ کیجئے) کیونکہ اسباب بدون اعانت الٰہی کافی اور مفید نہیں ہوتے تو ضروری دعا بھی ہے مگر کافی نہیں بلکہ دعا کے ساتھ علماء کی صحبت کتاب دیکھنا وغیرہ بھی ضروری ہے اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہر ایک کو اصطلاحی عالم بننا ضروری ہے اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ علماء کا مطلب یہی ہے کہ ہر شخص درسیات پڑھے اور پھر اس پر شبہ کیا جاتا ہے کہ ہم کیونکر درسیات حاصل کریں ہم کو دنیا کے کاروبار سے اتنی فرصت کہاں ہے۔ بس اپنے کو غیر قادر سمجھ کر مطلق تحصیل علم سے معذور سمجھ لیتے ہیں اور پھر قدر ضرورت بھی حاصل نہیں کرتے تو صاحبو! علم کے معنی جاننے کے ہیں اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ کتابیں پڑھیں اور اس کا نفع متعدی (دوسروں تک پہنچنے والا) ہوتا ہے کیونکہ ایسے علم سے عام لوگوں کو نفع پہنچتا ہے اور ایک وہ طریقہ ہے کہ علماء کی صحبت اختیار کریں اور ان سے مسائل دریافت کر کے سیکھیں اور اس کا نفع متعدی نہ ہوگا یعنی یہ شخص عام تعلیم کا اہل نہ ہوگا گو کہ اپنے اہل کو خاص تعلیم کرنا اس کے بھی ذمہ ہوگا۔

اہل علم کی شان

جس کو اس آیت میں فرماتے ہیں:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔

"اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونا ضروری ہے کہ خیر کی طرف بلایا کریں اور نیک کام کرنے کو کہا کریں اور برے کاموں سے روکا کریں۔"

اس آیت میں یدعون (بلاویں) کا مفعول ذکر نہیں فرمایا' یہ ذکر نہ کرنا مشیر (اشارہ کرنے والا) ہے اس کے عموم کی طرف مطلب یہ ہے کہ یدعون الناس یعنی عام لوگوں کو خیر کی طرف بلاویں تو یہ شان اہل علم کی ہے یعنی ان لوگوں کی جنہوں نے سب علوم کا بقدر ضرورت احاطہ کیا اور فرض یہ بھی ہے مگر فرض علی الکفایہ ہے کہ اُمت میں کچھ لوگ ایسے ضرور ہونا چاہئیں کہ جن سے عوام اُمت کا کام چلے اسی لیے محققین نے من کو اس آیت میں تبعیضیہ کہا ہے یعنی تم میں بعض ایسے ہونے چاہئیں۔اس کی عرفی مثال ایسی ہے جیسے طب کا حاصل کرنا کہ ہر ایک کو طبیب ہونا ضروری نہیں مگر ایک تو یہ ضروری ہے کہ کچھ طبیب ہوں۔دوسرے یہ کہ ہر ایک کے لیے ضروری ہے کہ ہر مرض میں طبیب سے رائے لے یا ہر مقدمے میں وکیل سے پوچھے گو ہر شخص وکیل نہ ہو۔اسی طرح مولوی ہونا ہر ایک کے لیے ضروری نہیں لیکن ایک کو تو کچھ مولوی ہونا مجموعہ کے ذمہ اور ایک مولویوں سے جو کہ روحانی طبیب اور قانون الٰہی کے جاننے والے ہیں رائے لینا یہ ہر شخص کے ذمہ ضروری ہے۔اگر کوئی ظاہری امراض اور ظاہر مقدمات پر نظر کر کے کہے کہ ہم کو تو خدا کے ہاں نہ کوئی مقدمہ پیش آتا ہے نہ کوئی ایسا مرض لاحق ہوتا ہے جس کے لیے علماء سے پوچھنے کی ضرورت ہو تو یہ غلطی ہے۔آپ ہر وقت مرض میں مبتلا ہیں۔آپ صرف دردسر ہی کو مرض سمجھتے ہیں حالانکہ اصل مرض وہ ہے کہ جس کا انجام "لَایَمُوْتُ فِیْھَا وَلَا یَحْییٰ" (یعنی نہ تو اس آتش دوزخ میں مر ہی جاوے گا نہ آرام کی زندگی جئے گا) ہے مرض نام ہے اعتدال سے خروج کا تو جیسے جسم کا خروج اعتدال سے جسم کا مرض ہے اسی طرح روح کا خروج اعتدال سے روح کا مرض ہے بلکہ روح کا مرض تو جسم کے مرض سے بھی شدید ہے کیونکہ اس کا انجام تو لایحی (نہ زندہ رہے گا) ہے اور روحانی مرض کا انجام ہے **لایموت ولایحی** (نہ مرے ہی گا اور نہ زندہ رہے گا) اور وہ مرض روحانی گناہ ہے) دیکھ لیجئے ایسا کون ہے کہ ہر وقت وہ کسی نہ کسی گناہ میں یا احتمال گناہ میں مبتلا نہیں تو اگر مرض یعنی گناہ میں مبتلا ہے تو اس کا تو علاج کرنا چاہیے اور اگر احتمال مرض ہے یعنی گناہ میں مبتلا ہونے کا احتمال ہے تو حفظ ماتقدم (یعنی گناہ میں واقع ہونے سے پہلے حفاظت کرنے) کے طور پر کچھ کرنا ضروری ہے اسی طرح ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ہم کو خدا کے ہاں مقدمات ہی کیا پیش آتے ہیں۔صاحبو آپ کا تو ہر وقت ایک مقدمہ درپیش ہے مگر افسوس ہے کہ ہم اس کو مقدمہ نہیں سمجھتے۔جب یہ ہے تو آپ کو ہر وقت تفتیش اور احکام پوچھنے کی ضرورت ہے تو علماء کو طبیب کہئے یا وکیل' بہر حال ان کی آپ کو ہر وقت ضرورت ہے اور یہاں یہ بھی سمجھو کہ جیسے کوئی شخص طبیب سے

دوا پوچھ کر حکیم نہیں ہو جاتا یا وکیل سے کوئی رائے لے کر قانون داں نہیں ہو جاتا اسی طرح علماء سے کوئی مسئلہ پوچھ کر کوئی شخص مولوی نہیں ہو جائے گا اور بعض کے مولوی ہونے کی ضرورت اوپر مذکور ہو چکی ہے اس لیے بعض کا درسیات پڑھنا بھی ضروری ہوا تاکہ وہ مولویت کا کام انجام دیں ایسا مولوی ہونا ہر ایک کو ضروری نہیں ہے بلکہ ترقی کر کے کہتا ہوں کہ مولوی ہونا ہر ایک کو مناسب بھی نہیں کیونکہ اگر سب کے سب تعلیم و تعلم ہی میں مشغول ہوں تو اسباب معاش بالکل بند ہو جائیں اور یہ گناہ ہے اس لیے اس فرض کفایہ کے ادا کے لیے ہر شہر میں دو چار علماء ہونا کافی ہیں کہ وہاں کی دینی ضرورت رفع ہوتی رہے اور ساتھ ہی اس کا سلسلہ جاری رہنا بھی ضروری ہے ورنہ جب سب ختم ہو جاویں گے پھر کوئی مولوی نہ رہے گا اور اس فرض کفایہ کے ترک سے سب گنہگار ہوں گے۔

علم دین اور فرض کفایہ

پس اس سلسلہ کے جاری رہنے کے لیے خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دل میں یہ بات ڈال دی ہے کہ وہ اس میں مشغول ہیں چنانچہ طلبہ پڑھتے ہیں اور علماء پڑھاتے ہیں اور یہ درجہ کفایہ کا ہے اور دوسرا درجہ فرض عین ہے یعنی اپنی ضروریات دین کو جاننا سو یہ ہر مسلمان پر فرض ہے اور اس کا ایک طریقہ تو وہ تھا جو پہلے بیان کیا گیا کہ علماء کی صحبت اختیار کریں اور ان سے مسائل دریافت کرتے رہا کریں اور ایک دوسرا طریقہ بھی ہے اور وہ بہت ہی سہل ہے اس کو بھی عرض کرتا ہوں تاکہ لوگوں کو تحصیل علم سے توحش نہ رہے اور وہ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ایک تو یہ التزام کر لیجئے کہ جو لوگ کچھ پڑھے ہوئے ہیں وہ تو کوئی دین کی معتبر کتاب لے کر دو چار ورق ہر روز پڑھ لیا کریں اس میں کوئی زیادہ وقت بھی صرف نہ ہوگا اور پڑھنے کے ساتھ یہ بھی کریں کہ جہاں شبہ ہو وہاں نشان کر دیا کریں اور پھر کسی معتبر عالم سے ان مقامات کو سمجھ کر اپنا شبہ رفع کر لیں۔ یہ تو ان لوگوں کے لیے ہے جو پڑھے ہوئے ہوں اور جو لوگ پڑھے ہوئے نہ ہوں وہ یہ کریں کہ کسی کے پاس جا کر منت خوشامد کر کے اس سے دو چار ورق روزانہ اس کتاب کے سن لیا کریں اور سمجھ لیا کریں یا یہ کریں کہ ہر محلّہ کی مسجد میں ہفتہ میں دو بار یا ایک بار لوگ جمع ہو کر کسی سے کوئی کتاب سن لیا کریں اور کوئی ایسی مل جاوے جو حسبۃً للہ پڑھ کر سنا دیا کرے تو خیر ورنہ چند آدمی مل کر اس کی کچھ تنخواہ مقرر کر دیں۔ یہ تو تفصیل ہے پڑھے ہوئے اور بے پڑھے لوگوں میں اور ایک امر دونوں میں مشترک ہے کہ اس کو دونوں اختیار کریں کہ جب کوئی نیا کام کرنا چاہیں تو علماء سے جا کر پوچھ لیا کریں کہ یہ جائز ہے یا نہیں، خواہ کوئی تجارت ہو یا شادی ہو یا غمی ہو۔

غرض جو کچھ بھی کرنا ہو کسی عالم سے پوچھ لیا کریں اور اس میں آپ کا خرچ ہی کیا ہوتا ہے بلکہ اگر عمل کی بھی ہمت نہ ہو تب بھی پوچھ لیں، پوچھنے میں کیا خرچ ہوتا ہے ممکن ہے کہ کبھی عمل کی توفیق ہو جاوے۔ دوسرے پوچھ لینے میں یہ فائدہ ہے کہ اگر احکام معلوم ہوں گے تو عقیدہ تو درست ہو جائے گا۔ اس وقت تو اکثر گناہوں کو گناہ بھی نہیں سمجھتے۔ حلال کو حرام، حرام کو حلال سمجھ رہے ہیں اور اگر کوئی شبہ ہوا کرے تو اس کو چھپایا نہ کریں بلکہ جا کر فوراً کسی عالم سے پوچھ لیا کریں اور اس میں شرمائیں نہیں کیونکہ جو مریض اپنے مرض کو چھپائے گا اس کو صحت نہیں ہو سکتی بلکہ مرض بڑھتے بڑھتے مہلک ہو جاوے گا۔ میں کان پور میں قرآن مجید کا بیان بالترتیب کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے واقعہ نکاح کو بیان کیا اور ذرا تفصیل سے بیان کیا بعد بیان کے ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ آج آپ کے بیان سے اتنے برس کا شبہ جاتا رہا جو حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے نکاح کے متعلق ایک پادری کی کتاب دیکھ کر پیدا ہو گیا تھا مگر شرم کے مارے کسی سے کہتا نہ تھا، میں نے سمجھا دیا کہ آئندہ ایک تو آپ ایسی کتابیں نہ دیکھا کیجئے۔ دیکھئے چھپانے کا نتیجہ ہوا کہ کتنے برس تک شبہ میں مبتلا رہے غرض جب شبہ واقع ہو فوراً صاف کر لیا کیجئے اور اگر ایک سے پوچھنے پر تسلی نہ ہو دوسرے سے پوچھئے جیسے کہ آپ مرض کے لیے ایک طبیب سے رجوع کرتے ہیں۔ جب اس سے شفاء نہیں ہوتی تو دوسرے سے رجوع کرتے ہیں اسی طرح جب تک تسلی نہ ہو جائے اس وقت تک سوال کا سلسلہ جاری برابر رکھنا چاہیے اور اگر کوئی عالم سامنے نہ ہو تو ایک جوابی کارڈ یا ایک لفافہ میں کام چلتا ہے۔ بس جو بات پوچھنی ہو لکھ کر کسی عالم کے پاس بھیج دیجئے اور اگر کوئی عالم وہاں ہو تو کارڈ خرچ کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔

حضرات علماء سے ضروری مسائل پوچھنے کی ضرورت

غرض جس طرح ہو سوالوں کا سلسلہ برابر جاری رکھئے مگر فضول بات نہ پوچھئے جیسے کہ اختلافی مسائل کو علماء سے محض اس امتحان کے لیے دریافت کیا جاتا ہے کہ یہ کس فرقہ کا ہے آپ کو امتحان لینے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر کہے کہ اس لیے دریافت کرتے ہیں تا کہ معلوم ہو کہ وہ خوش عقیدہ ہے یا نہیں تو میں کہتا ہوں کہ ایسے محتمل میں کیوں پڑے جس سے پختہ اعتقاد ہو اس سے پوچھئے اور اس سے بھی فضول بات نہ پوچھئے۔ حدیث میں ہے: "**من حسن اسلام المرء ترکه مالا یعنیه**"[1] (یعنی آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے بے فائدہ باتوں کو ترک کرنا)

---

[1] (کنز العمال ۳: ۲۸۹۱، مسند احمد ۱: ۲۰)

اب لوگ ضروری باتیں تو پوچھتے نہیں بس یا تو اختلافی مسائل کو دریافت کرتے ہیں یا ایسی باتیں پوچھتے ہیں جن کا کبھی وقوع ہی نہیں ہوتا جیسے کہ ایک صاحب نے پوچھا تھا کہ ایک عورت چلی جارہی تھی اس کے ساتھ ایک تو اس کا خاوند تھا اور ایک اس کا بھائی راستہ میں ڈاکوؤں نے دونوں کو قتل کرڈالا' عورت نے ان پر رونا پیٹنا شروع کیا' اتفاق سے ادھر ایک بزرگ کا گزر ہوا انہیں اس کے رونے پر رحم آیا اور فرمایا کہ تو دونوں کے سروں کو دونوں دھڑوں کے ساتھ لگا دے' میں دعا کئے دیتا ہوں دونوں زندہ ہو جائیں گے۔

اس نے سروں کو دھڑ کے ساتھ لگا دیا' مگر اس سے غلطی یہ ہوئی کہ ہر ایک دھڑ کے ساتھ دوسرے کا سر جوڑ دیا تو اب وہ عورت کو کس کے نکاح میں رہنا چاہیے۔

میں نے کہا بھائی جب سے دنیا ہوئی نہ تو ایسا واقعہ کبھی ہوا اور نہ امید ہے کہ جب تک کبھی ہو پھر اس کے جاننے کی کیا ضرورت اور اگر کبھی ضرورت ہوگی تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فرمانے کے موافق کوئی نہ کوئی جاننے والا بھی ضرور مل جائے گا۔ اسی طرح ایک اور صاحب نے پوچھا تھا کہ ایک شخص تھا اور اس کے پاس ایک بکری تھی' رات کو اس کے یہاں چور آ گئے اور اس شخص کو اور اس بکری کو دونوں کو قتل کر گئے اس کی بیوی نے رونا شروع کیا ایک بزرگ آئے اور انہوں نے اس سے کہا کہ سر جوڑ دے میں دعا کئے دیتا ہوں۔ اس نے اندھیرے میں بکری کا سر آدمی کے لگا دیا اور آدمی کا سر بکری کے تو وہ بکری دودھ بھی دیتی تھی اور بات چیت بھی کرتی تھی اس کا دودھ جائز ہے یا نہیں۔ تو آج کل امتحان لینے کے لیے محض فرضی مسئلے پوچھتے ہیں۔

عورتوں کو دیندار بنانے کا طریقہ

حدیث میں ہے "نھی عن الاغلوطات"[۱] یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غلطی میں ڈالنے والی باتوں کے دریافت کرنے سے منع فرمایا تو ان سوالوں سے کیا فائدہ' کام کی بات پوچھو' نماز' حج' زکوٰۃ' میراث یہ سب باتیں پوچھو۔ غرض ضروری مسائل کے متعلق اگر سلسلہ سوالوں کا برابر جاری رکھئے تو ایک وقت میں علم کا بڑا ذخیرہ آپ کے پاس جمع ہو جائے گا۔ یہ تو مردوں کے لیے ہے اور عورتوں کی تعلیم مردوں کے ذمہ ہے۔ جب گھر میں جاویں ایک آدھ مسئلہ بتلا دیا کریں اور جب کوئی نیا مسئلہ سنیں جا کر ان سے کہہ دیا کریں یہ تو وہ لوگ کریں جو پڑھے لکھے نہ ہوں اور جو پڑھے لکھے ہیں وہ جا کر گھر میں کتاب بھی سنا دیا کریں مجھ سے بہت لوگوں نے شکایت کی عورتوں کی

۱ (المعجم الکبیر للطبرانی ۱۹ : ۳۸۹)

کہ ان میں دینداری نہیں۔ میں نے سب کو یہ رائے دی کہ دینی کتابیں ان کو سناؤ کیونکہ ساری خرابیوں کی جڑ جہل ہے۔ جب وعدے وعیدوں کا ان کو علم ہوگا تو آخر مسلمان ہیں کب تک اثر نہ ہوگا۔ یقیناً ہوگا اور جہاں ایسا کیا گیا وہاں نفع ہوا۔ مگر اس کو کریں تو یہ کیا غضب کی بات ہے کہ گھر جا کر یہ تو پوچھیں گے کہ روٹی تیار ہوئی لیکن یہ کبھی نہ پوچھیں گے کہ نماز بھی پڑھی۔ صاحبو! کم سے کم ان کی نماز تو سن لینی چاہیے۔ الحمد صحیح ہے یا نہیں، دعائیں یاد ہیں یا نہیں، ارکان ٹھیک ادا ہوتے ہیں یا نہیں، یہ تو سب مردوں کے ذمے ہے، مردوں کو چاہیے کہ عورتوں کی تعلیم کا خیال رکھیں اور یہ وہ طریقہ ہے کہ اس میں کوئی بھی دشواری نہیں اور اس طریقہ سے سب مرد وعورت عالم ہو جاویں گے۔

علم دین کی ضرورت

تو ہر مسلمان کو چاہیے کہ اس کی پابندی کریں اور اگر اس طریقے کو اختیار نہ کیا اور یہی جہل رہا تو خلاف قانون الٰہی عملدرآمد ہوا کرے گا، پھر اس پر باز پرس ہوگی۔ پس علم کی ضرورت وہ ضرورت ہے کہ ہر مسلمان کو عام ہے۔ اس لیے بھی میں نے اس آیت کو اختیار کیا۔ کسی خاص مدرسے کی ضرورت سے ایسا نہیں کیا بلکہ مدرسے کی غرض بھی یہی ہے کہ عام مسلمانوں کو فائدہ ہو تو حق سبحانہ وتعالیٰ نے اس ٹکڑے میں فضیلت علم دین بیان فرمائی ہے اور علم میں دین کی قید میں نے اس لیے لگائی کہ اس وقت ہماری بدقسمتی سے علم معاش کو بھی علم کہنے لگے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ آج کل زمانہ ہے علمی ترقی کا کہ فلاحت زراعت کی تعلیم ہوتی ہے۔ صاحبو! یہ علم کی فہرست ہے اور ہم اصطلاح میں مناقشہ نہیں کرتے مگر اس کو ذرا وسیع کرنا چاہتے ہیں۔ جب آپ صناعت کو بھی علوم میں شمار کرتے ہیں تو کفش دوزی کو بھی علم کہئے اور اگر علم اسی کا نام ہے جو شریف ہے تو جیسے کفش دوزی علم نہ ہوگا اسی طرح یہ چیزیں بھی علم نہ ہوں گی کیونکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ شرف علم کا کس چیز سے ہے تو ظاہر ہے کہ شرف علم کا موضوع کے شرف سے ہے۔ اب دیکھئے کہ ان سب کا موضوع کیا ہے وہی دنیا اب دنیا کو ذرا ملاحظہ کیجئے کہ اس کی کیا قدر ہے۔

دنیا کی مذمت

حدیث میں ہے کہ "لو کانت الدنیا تعدل عند اللّٰہ جناح بعوضة ماسقی کافرا منھا شربة ماء"[1] یعنی اگر دنیا خدا تعالیٰ کے نزدیک اتنی بھی قدر رکھتی جیسا کہ مچھر کا پر تو کافر کو اس سے ایک گھونٹ پانی بھی نہ پلاتے اور وجہ یہ ہے کہ کفار مبغوض ہیں اور دشمن کو کوئی پیاری چیز

---

[1] (مجمع الزوائد ۱۰: ۲۸۸)

نہیں دیتا تو اس حدیث سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ دنیا کتنی پیاری ہے اور قرآن میں ارشاد ہے:
"وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ"، یعنی اگر اس بات کا اندیشہ نہ ہوتا کہ تمام آدمی ایک ہی طریقہ پر ہو جاویں گے تو کفار کو اتنا دیتے کہ ان کے گھروں کی چھت اور زینے چاندی کے ہوتے مگر ایسا اس لیے نہیں کیا کہ تمام لوگ بچل جاتے۔ الا ماشاء اللہ تو دنیا حق تعالیٰ کے نزدیک ایسی ذلیل چیز ہے کہ اگر مسلمانوں کے بگڑ جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو کفار کو حالت موجودہ سے بھی اور زیادہ دیتے اور اہل ایمان کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جس سے خدا کو محبت ہوتی ہے اس کو دنیا سے ایسا بچاتے ہیں جیسا کہ جلندر کے مریض کو پانی سے بچاتے ہیں مگر افسوس کہ مسلمانوں کو آج کل اس کمی سے شکایت پیدا ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ○

یعنی کافر کی یہ حالت ہے کہ اگر اس کو مال و دولت دیا جاتا ہے تو کہتا ہے کہ میرے رب نے میری قدر کی اور اگر اس پر رزق تنگ کر دیا جاتا ہے کہ بس معلوم ہوتا ہے کہ میری انکے یہاں بڑی بے قدری ہے تو کفار دنیا کے ہونے کو تو مقبولیت سمجھتے ہیں اور نہ ہونے کو مردودیت آج کل مسلمان بھی بوجہ بے خبری کے ایسا سمجھنے لگے ہیں۔ سو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ اپنے مقبولین کو دنیا سے اس طرح بچاتے ہیں کہ جیسے تم جلندر کے مریض کو پانی سے بچاتے ہو اور اس کو نہیں دیتے تو کیا تم اس مریض کے بدخواہ ہو کیا یہ پانی نہ دینا دشمنی کی وجہ سے ہے ہرگز نہیں بلکہ اس کا سبب محض خیر خواہی اور محبت ہے۔ اسی طرح حق سبحانہ وتعالیٰ کو جس سے محبت ہوتی ہے اس کو دنیا سے ایسا ہی بچاتے ہیں سو جس کو انہوں نے دنیا نہیں دی اس کو دنیا کے جھگڑوں اور مضرتوں سے بچایا ہے تو واقع میں دنیا کسی مسلمان کے لائق نہیں بس کفار ہی کے لائق ہے۔ اب اس سے سمجھ لو کہ اس کی کیا قدر ہے۔ پس اس کا علم کیا علم ہوا تو اس اصطلاح کو بدلنا چاہیے اور ضرورت تبدیل کی وجہ یہ ہے کہ اگر دنیا کے علم کو بھی علم کہا جاوے تو علوم کی جو فضیلت سنی جاتی ہے علم دنیا کو بھی اس میں داخل سمجھیں گے۔ حالانکہ یہ اس میں داخل نہیں تو اس اصطلاح کو چھوڑ دیئے اور ان کو صنعت کہیے حرفت کہیے مگر علم نہ کہیے۔ علم تو وہی ہے جس کو فرماتے ہیں "اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا"، یعنی علم وہ ہے جس سے خدا تعالیٰ کا خوف پیدا

ہو اور اگر دوسرا کوئی علم کہلاتا ہے وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: "**ان من العلم لجھلاء**[1]، کہ بعض علم حقیقت میں جہل ہیں اور کہا

علمے کہ راہ بحق ننماید جہالت ست

(یعنی جس علم سے معرفت الٰہی حاصل نہ ہو وہ واقع میں جہل ہے)

حتیٰ کہ محققین تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر علم دین بھی ہو اور عمل نہ ہو تو وہ بھی جہل ہے تو دوسرے دنیوی علوم تو کیسے علم ہو سکتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کی اجازت کسی خاص ضرورت سے ہو جاوے جیسے پاخانہ کی اجازت ہو جاتی ہے تو اجازت ہو جانے سے پاخانہ کوئی فضیلت کی چیز تو ہو نہیں گیا۔ اسی طرح یہ فنون علم تو نہیں ہاں ضرورت کی وجہ سے ان کی اجازت ہے تو ان فنون کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ جو چیز بدون محنت کے میسر نہیں آتی اور اس کی ضرورت واقع ہوتی ہے تو اس کے لیے کچھ محنت کرتے ہیں سو اس میں حیوانات بھی شریک ہیں وہ بھی کھانے پینے کی تدابیر کرتے ہیں رہا کپڑا تو اگر ان کو کپڑے کی ضرورت ہوتی تو وہ کپڑا بھی ایجاد کر لیتے اور اگر کہو کہ وہ کپڑا نہ ایجاد کر سکتے تو اس کو اس سے سمجھ لو کہ بعضے جانور ایسا عجیب گھر بناتے ہیں کہ دیکھو حیرت ہوتی ہے اگر ان کو کپڑے کی ضرورت ہوتی تو اسی طرح کپڑے بھی بنا لیا کرتے، میں نے بعض جانوروں کو دیکھا وہ ذخیرہ بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ کا قصہ ہے کہ میں ایک گاؤں کے نزدیک کھانا کھانے بیٹھا وہاں ایک کتے کا بچہ بھی آ گیا میں نے اس کو ٹکڑا دیا اس نے اس کو کھایا نہیں بلکہ اٹھا کر بھوسہ کی کوپ میں رکھ آیا۔ دوسری مرتبہ پھر ٹکڑا ڈالا تو اسے بھی وہاں ہی رکھ آیا کئی مرتبہ اس نے ایسا ہی کیا اس تماشا کو دیکھ کر بہت ہی تعجب ہوا کہ ایسا قصہ آج ہی دیکھنے میں آیا ہے تو یہ سب کام تو جانور بھی کر لیتے ہیں تو اگر انسان نے وہ کام کر لیا جو ایک جانور بھی کر لیتا ہے تو کونسا بڑا کام کیا، میں اس کو ناجائز نہیں کہتا۔ جائز تو ہے مگر اس قابل نہیں کہ اس کو علم کہا جاوے مگر چونکہ اب اصطلاح مشترک ہو گئی ہے اور ان سب امور کو بھی علم کہنے لگے ہیں اس لیے مجھے علم کے ساتھ دین کی قید لگانے کی ضرورت ہوئی تو اس آیت میں علم دین کی فضیلت فرماتے ہیں: "**وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ**" آپ پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی "**وَعَلَّمَکَ مَالَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ**" اور وہ امور سکھلائے جو آپ کو معلوم نہ تھے۔ "**وَکَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْکَ عَظِیْمًا**" اور ہے اللہ تعالیٰ کا فضل آپ پر بہت بڑا۔ اس جملہ میں اول تو احسان

---

[1] (سنن ابی داؤد: ۵۰۱۲، فتح الباری ۱۰: ۵۴۰)

جتلایا کہ ہم نے آپ کو علم دین عطا فرمایا کیونکہ فرماتے ہیں کہ ہم نے آپ کو کتاب دی تو اس سے علم دین کا مراد ہونا اچھی طرح ظاہر ہو گیا کیونکہ کتاب اللہ یقیناً علم دین ہے اور حکمت بھی علم دین ہی ہے اور "مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ" (وہ باتیں سکھلائیں جن کو تم نہ جانتے تھے) بھی علم دین ہے جیسا کہ معلوم ہوگا۔ تو اب خلاصہ اس آیت کا یہ ہوا کہ آپ کو علم دین مرحمت فرمایا، اول علم دین کے دینے کو فرمایا اور پھر اس کے بعد فرمایا "وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا" آپ پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے۔ پس مطلب یہ ہوا کہ چونکہ آپ پر خدا تعالیٰ کا فضل اور عنایت ہے اس لیے آپ کو علم دین عطا کیا گیا۔ اس سے اول تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت معلوم ہوئی کہ آپ حق تعالیٰ کے محبوب ہیں کیونکہ آپ پر خدا تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے۔ پس آپ محبوب ہوئے اور پھر محبوب بھی کیسے کہ آپ کے برابر کوئی بھی نہیں نہ کوئی انسان نہ کوئی فرشتہ۔ پھر اس سے علم کی بھی فضیلت معلوم ہوئی کیونکہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم محبوب کامل ہیں اور محبوب کامل کو وہی چیز دی جاتی ہے جو کہ سب سے بڑی چیز ہو تو علم کی فضیلت ثابت ہونے میں کیا شبہ رہا۔

مال اور علم میں فرق

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو خوب سمجھا۔ فرماتے ہیں:

رضینا قسمة الجبار فینا　　لنا علم وللجھال مال

فان المال یفنی عن قریب　　ان العلم باقی لایزال

کہ ہم خدا کی تقسیم پر راضی ہیں کہ ہم کو علم دیا اور جاہلوں کو مال دیا کیونکہ مال تو بہت جلد فنا ہو جاوے گا اور علم ہمیشہ باقی رہنے والی دولت ہے کبھی فنا نہ ہوگی تو علم اور مال میں یہ فرق ہے کہ مال اکثر تو دنیا ہی میں مفارقت کر جاتا ہے اور اگر مال نے مفارقت نہ کی تو آپ اس کو چھوڑ کر چل دیتے ہیں۔ مثلاً اس وقت ہم یہاں بیٹھے ہیں اور مال ہمارا مکان میں ہے اگر کوئی چور آ کر مال لے جاوے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ لیجئے دنیا ہی میں الگ ہو گیا ورنہ ہم تو ایک دن اس کو چھوڑ کر مریں ہی گے تو مال ایسی ناپائیدار اور ایسی بے وفا چیز ہے بخلاف علم کے کہ وہ ہر وقت آپ کے پاس ہے۔ اس کی یہ شان ہے: "وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ" کہ ہر وقت اس کو ساتھ ساتھ لئے پھرتا ہے تو علم ہر وقت اس کے ساتھ رہتا ہے یہاں تک کہ آپ سو رہتے ہیں مگر اس وقت بھی وہ آپ کے ساتھ ہے۔ چنانچہ آپ اس کو بھولتے نہیں جب آپ سو کر اٹھتے ہیں تو وہ سب علم آپ کا محفوظ ہوتا ہے۔ تو ہر حال میں وہ آپ کے ساتھ ہے وہ کسی آفت کی وجہ سے فنا نہیں

ہوتا۔ یہ تو آپ کی زندگی میں علم کی حالت ہے اور جب آپ مر جاویں گے وہ اس وقت بھی جدا نہ
ہوگا۔ سب کچھ دنیا میں رہ جاوے گا۔ آپ اس کو چھوڑ کر چل دیں گے مگر علم آپ کے ساتھ جاوے
گا۔ اس لیے حضرت علیؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: رضينا قسمة الجبار فينا (ہم اللہ تعالیٰ کی
تقسیم پر راضی ہیں) مجھے ایک لطیفہ یاد آیا: کان پور میں مدرسہ کا جلسہ تھا، اس کے اشتہار میں میں
نے یہ اشعار لکھے، عبدالرحمٰن خان صاحب مالک مطبع نظامی نے اس کو دیکھ کر بطور تفاؤل کے کہا کہ
آپ نے اشتہار میں یہ اشعار لکھے ہیں۔ دیکھ لیجئے گا مدرسہ میں چندہ بالکل نہیں آئے گا۔

علم اور دنیا

غرض یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دینا نہ دینا اور علم دینا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علم کیا چیز ہے
اور دنیا کیا چیز ہے۔ اب لوگ دین کو غارت کر کے دنیا کے پیچھے پڑے ہیں۔ پہلے لوگوں میں بے
خبری تھی مگر انکار نہ تھا اس وقت تو غضب یہ ہے کہ باوجود خبر کے دین میں اپنی رائے لگاتے ہیں۔
یہ حالت ہے کہ ایک پرانے بیرسٹر نے ایک مولوی صاحب سے کہا کہ مولوی صاحب کفار سود سے
بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ مولوی لوگ اگر سود کو حلال کر دیں تو مسلمانوں کو بھی اس سے ترقی ہو۔
مولوی صاحب نے کہا کہ توبہ کرو مولویوں کو اس کا کیا اختیار ہے سود کی حرمت تو قرآن شریف میں
منصوص ہے۔ یہ سن کر تو وہ چونک اٹھے اور اپنے منہ پر طمانچے مارے اور توبہ توبہ کر کے کہنے لگے کہ
مولوی صاحب کیا قرآن میں اس کو منع لکھا ہے میں تو یہ سمجھتا تھا کہ مولویوں کا بنایا ہوا مسئلہ ہے مگر
میں کہتا ہوں کہ پھر غنیمت تھا کہ نادم تو ہوئے یہ بھی فقط اس کی بدولت کی برائی آنکھیں دیکھی
تھیں۔ اس لیے تجربہ کاروں نے کہا ہے کہ

دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

اس وقت تو غضب یہ ہے کہ لوگوں نے اللہ والوں کو بھی چھوڑ دیا۔ صاحبو! کچھ بھی کرو مگر ان
والوں کو نہ چھوڑو، ان حضرات سے اگر تعلق رہے گا تو عملی حالت خراب ہو مگر سرکشی تو نہ ہوگی۔ دین کا
اف (ہلکا سمجھنا) تو نہ ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ اب لوگوں نے دنیا کو ایسا مقصود بنا رکھا ہے کہ اس کی وجہ
ین کو بھی غارت کر دیتے ہیں اور زیادہ تر سبب اس کا یہ ہے کہ علم دین کی ضرورت وفضیلت سے
ہیں علم دین کو بالکل بے کار سمجھتے ہیں اور فقط یہی نہیں کہ علم دین کو بے سود سمجھتے ہیں بلکہ مضر سمجھتے
یہ علم مانع ترقی ہے اور طلبہ کو احدیوں میں سمجھتے ہیں سو ان کے نزدیک دنیا اس قدر محبوب ہے
ا گر کوئی محبوب چیز ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ضرور ملتی کیونکہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم

محبوب تھے حق سبحانہ وتعالیٰ کے، بالخصوص اس حالت میں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی ضرر بھی نہ تھا
کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دنیا کا ہونا ایسا تھا جیسا کہ کوئی منتر جاننے والا سانپ کو پکڑے تو
جیسے منتر جاننے والے کو سانپ کے پکڑنے سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ
وسلم کو دنیا سے کوئی ضرر نہیں تھا کیونکہ آپ کے پاس تو دنیا کا منتر موجود تھا یعنی حق تعالیٰ کی محبت کا غلبہ
پھر آپ کو دنیا سے کیا ضرر ہوتا۔ جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام کو دنیا سے کچھ ضرر نہیں ہوا اسی طرح اور
بھی اہل اللہ ایسے ہوئے ہیں کہ ان کو دنیا سے کچھ ضرر نہیں ہوا آج کل لوگوں نے ان نظیروں کو بھی لیا
ہے کہ ان حضرات کے پاس بھی دنیا تھی اگر دنیا مذموم ہوتی تو ان حضرات کے پاس کیوں ہوتی لیکن
فرق نہیں دیکھتے آخر فرق بھی تو دیکھو کہ ہم میں اور ان بزرگوں میں کتنا فرق ہے۔ خوب کہا ہے۔ آنچہ
مردم میکند بوزینہ ہم (جو کچھ لوگ کرتے ہیں بندر بھی اس کی نقل کرتا ہے) مشہور ہے کہ کسی بندر نے
ایک بڑھئی کی نقل کی تھی، بڑھئی آرہ سے لکڑی چیر رہا تھا، وہ اٹھ کر کسی کام کو گیا، بس بندر صاحب آن
موجود ہوئے اور اس طرح بیٹھے کہ آپ کے بیضے اس لکڑی کے اندر ہو گئے اور آپ نے کیا کیا کہ اس
لکڑی کے درمیان میں ایک کھونٹی لگی ہوئی تھی اس کو ہلا کر نکال لیا اس کا نکلنا تھا کہ آپ کے بیضے لکڑی
کے اندر رہ گئے بس آپ وہیں کے وہیں رہ گئے۔ بڑھئی نے آکر خوب خبر لی تو صاحبو! آدمی جب تک
ان حضرات جیسا نہ ہو جاوے اس وقت تک ان کی نقل کیوں کرے۔ ایک نقل ہے کہ ایک بندر استرا
لے کر بھاگ گیا تھا، نائی نے بہت کوشش کی مگر اس نے نہ چھوڑا، آخر نائی نے یہ کیا کہ ایک استرا لے کر
آہستہ سے اپنی ناک پر پھیرنا شروع کیا۔ بندر نے جو اس کو ناک پر استرا پھیرتے دیکھا تو آپ بھی
اپنی ناک پر استرا پھیرنے لگے، بس ان کی ناک کٹ گئی اور استرا پھینک کر بھاگے تو اس احمق بندر نے
نقل تو کی مگر یہ نہ دیکھا کہ اس کا طریقہ کیا ہے اسی طرح ہم لوگ بزرگوں کی نقل تو کرتے ہیں مگر طریقہ
نہیں جانتے ہم نے تو دنیا کا استرا پھیر کر ناک کاٹ لی۔ تو خوب سمجھئے کہ کار پاکاں را قیاس از خود۔
بزرگوں کو اپنے اوپر قیاس نہ کرو یعنی نہ تو اپنے اوپر بزرگوں کو قیاس کرکے ان سے بد اعتقاد ہو کہ اپنی
طرح ان کو بھی دنیا دار سمجھنے لگو اور نہ اپنے کو ان کے اوپر قیاس کرکے خود بزرگ بن بیٹھو کہ جیسے وہ باوجود
مال و دولت اور سب کچھ ہونے کے دیندار تھے ایسے ہی ہم بھی ہیں۔ غرض یہ ہے کہ جب اولیاء اللہ ک
دنیا سے ضرر نہیں ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا سے کیا ضرر ہوتا۔ خاص کر جبکہ حق تعالیٰ نے فر
بھی کہ اگر کہئے تو جبل احد کو سونا بنا دیا جاوے۔ اگر دنیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ضرر دینے والی ہو
حق تعالیٰ آپ کے سامنے اس کو کیوں پیش کرتے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیا سے احتیاط

حاصل یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا سے کچھ ضرر نہ تھا مگر اس پر بھی آپ اس سے اس قدر بچتے تھے کہ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عصر کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئے اور پھر آپ فوراً کھڑے ہوگئے اور جلدی کی وجہ سے آدمیوں کی گردنیں پھلانگتے ہوئے مکان تشریف لے گئے۔ جب آپ وہاں سے تشریف لائے تو دیکھا کہ لوگ آپ کی جلدی کرنے سے متعجب ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے ایک سونے کا ٹکڑا یاد آ گیا تھا کہ وہ ہمارے یہاں رکھا ہوا ہے، مجھ کو یہ پسند نہ آیا کہ وہ رات کو ہمارے پاس رہے تو میں اس لیے گیا تھا کہ اس کو تقسیم کرادوں۔ آپ دنیا سے اس قدر بچتے تھے حالانکہ آپ کو دنیا سے کچھ بھی ضرر نہ تھا تو بات کیا تھی آپ جانتے تھے کہ میری اُمت ضعیف ہے اور میری سنت پر عمل کرے گی تو اگر میں دنیا جمع کروں گا تو میری اُمت کے لوگ اس کو بھی سنت سمجھ کر جمع کریں گے اور ضعیف ہونے کی وجہ سے غارت ہوں گے۔ اس لیے آپ خود بھی اس سے بچے غرض دنیا سے تو آپ کو ایسا بچالیا گیا اور علم اس طرح سے دیا گیا اور پھر باوجود اس کے اس میں زیادتی کی طلب کرنے کو فرمایا گیا: "**قل رب زدنی علمًا**" (آپ کہیے اے میرے رب میرے علم کو زیادہ کیجیے) تو دنیا اول تو دی نہ گئی تھی اور دی گئی تو اس میں زیادتی کی طلب کے لیے نہیں فرمایا گیا اور علم دین جتنا دیا گیا اس کے ساتھ اور زیادتی کی طلب کے لیے فرمایا گیا تو علم دین ایسی چیز ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے: "**الانبیاء لم یورثوا دینارا و درهمًا انما ورثوا العلم فمن اخذه اخذ بحظ وافر**"[۱] یعنی دینار و درہم میراث میں نہیں چھوڑ گئے وہ تو علم میراث میں چھوڑ گئے ہیں۔ پس جس نے اس کو لیا اس نے کامل حصہ لیا تو علم کی یہ فضیلت ہے اور خوب سمجھ لیجیے کہ یہ فضیلت اصطلاحی علم یعنی مولویت کے ساتھ خاص نہیں بلکہ جس کو علم کا جتنا بھی حصہ عطا ہوگا اتنی فضیلت عطا ہوگی۔ غرض علم دین کی یہ فضیلت ہے کہ اب اسی لیے فرماتے ہیں: "**وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا**" کہ آپ پر اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل تھا اس لیے آپ کو کتاب اور حکمت دی گئی اور جو باتیں آپ کو معلوم نہ تھیں وہ سکھلائیں۔ اب سمجھئے کہ کتاب کیا ہے اور حکمت کیا ہے تو گو اس میں مفسرین نے مختلف تفسیریں کی ہیں مگر اقرب تفسیر یہ ہے کہ کتاب سے مراد احکام منصوصہ ہیں اور حکمت سے مراد احکام اجتہادیہ اور "**مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ**" (وہ باتیں جن کو آپ نہ جانتے تھے) اشارہ ہے علم واقعات کی طرف تو علم کی تین قسمیں کی ہیں۔

---

[۱] (اتحاف السادة المتقين ۸: ۲۱۳)

شان نزول

اس کے واسطے پہلے ایک قصہ مختصراً بیان کر دینا مناسب ہے جو اس آیت کا شان نزول ہے۔ خلاصہ اس قصہ کا یہ ہے کہ مدینے میں ایک جماعت تھی منافقوں کی، وہ ہمیشہ مسلمانوں کو ستایا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ ان منافقوں نے چوری کی اور چوری کا الزام ایک بے قصور مسلمان کے ذمہ لگا دیا اور کچھ ایسے اسباب جمع کر دیئے کہ اول وہلہ میں شبہ اس بے قصور پر ہو جاوے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس واقعہ کی خبر ہوئی تو آپ متردد ہوئے اور پھر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ اس کی تفسیر میں اکثر لوگوں کو اشکال بھی ہوا ہے اور اکثر کتب تفاسیر میں اس سے تعرض بھی کیا ہے مگر ان جوابات سے شفا نہیں ہوئی مثلاً یہ آیات ہیں: "وَلَاتَکُنْ لِلْخَآئِنِیْنَ خَصِیْمًا" (آپ خائن لوگوں کی طرف داری نہ کیجئے) اور "وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِیْنَ یَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَھُمْ اِنَّ اللّٰہَ لَایُحِبُّ مَنْ کَانَ خَوَّانًا اَثِیْمًا" (ان لوگوں کی طرف سے جواب دہی کی بات نہ کیجئے جو کہ اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں، تحقیق اللہ ایسے شخص کو پسند نہیں کرتے جو بڑا خیانت کرنے والا بڑا گنہگار ہے) ان سے ظاہری نظر میں یہ شبہ ہوتا ہے کہ آپ سے خائنین کی طرفداری صادر ہوئی تھی جس کی وجہ سے آپ کو اس سے نہی کی گئی مگر سب کا عمدہ جواب یہ ہے کہ نہی اور امر میں زمانہ استقبال کا ہوتا ہے ماضی اور حال کا نہیں ہوتا تو "وَلَاتَکُنْ لِلْخَآئِنِیْنَ خَصِیْمًا" کے معنی یہ ہیں کہ آپ آئندہ کبھی ان کے طرفدار نہ ہوں جیسے کہ اب تک میں ہوئے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ طرفدار ہوئے ہوں بلکہ معنی اس کے یہ ہیں کہ جیسے آج تک نہیں ہوئے آئندہ بھی یہی طرز رکھئے اس کی ایسی مثال ہے کہ "وَلَاتَکُنْ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ" (آپ شبہ کرنے والوں میں نہ ہوں) فرمایا ہے تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ نعوذ باللہ آپ کو کچھ شبہ تھا اور آپ سے منہیات کے صادر نہ ہونے کی صاف دلیل یہ ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عصمت

ایک جگہ فرماتے ہیں: "وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰکَ لَقَدْ کِدتَّ تَرْکَنُ اِلَیْھِمْ شَیْئًا قَلِیْلًا" یعنی اگر ہم آپ کو نہ سنبھالے رکھتے تو قریب تھا کہ آپ ان کی طرف کسی قدر مائل ہو جاتے تو اس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو غیر حق کی طرف کبھی میلان نہیں ہوا تو اب کیا شبہ رہا۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عصمت میں کبھی ذرا بھی فتور نہیں پڑا، اس وقت مختصراً میں نے بیان کر دیا ہے اپنی تفسیر میں میں نے اس کو مفصل لکھا ہے۔ یہ تو پہلا رکوع ہے اور دوسرا رکوع ہے "وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکَ وَرَحْمَتُہٗ لَھَمَّتْ طَّآئِفَۃٌ مِّنْھُمْ اَنْ یُّضِلُّوْکَ" (اگر آپ پر اللہ تعالیٰ کا

فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ آپ کو غلطی میں ڈالنے کا ارادہ کرتا) اس سے بھی آپکی عصمت میں شبہ نہ ہونا چاہیے کیونکہ "وَلَوْلاَ فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکَ وَرَحْمَتُہٗ لَھَمَّتْ" فرماتے ہیں یعنی اگر حق تعالیٰ کا آپ پر فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ارادہ کرتا ایک گروہ یہ کہ آپ کو غلطی میں ڈال دے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ارادہ کا مرتبہ بھی نہیں ہوا کیونکہ ہم اس کو کہتے ہیں جس کے بعد صدور فعل کا ہو جاوے اور وہ مرتبہ عزم کا ہے اور بعض نے ہم کو عزم سے قبل کہا ہے اور وجہ اس کی یہ ہوئی کہ قرآن میں "وَلَقَدْھَمَّتْ بِہٖ وَھَمَّ بِھَا" (اس عورت کے دل میں تو ان کا خیال عزم کے درجہ میں جم رہا تھا اور ان کو بھی اس عورت کا خیال ہو چلا تھا) بھی ہے تو حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے ھم بالمراۃ (آپ کے دل میں اس عورت کا خیال ہو چلا تھا) اور انبیاء چونکہ معصوم ہوتے ہیں اس لیے عزت معصیت ان سے محقق نہیں ہو سکتا اس لیے وہ اس کے قائل ہو گئے کہ ہم عزم سے پہلے ہوتا ہے۔

قرآن پاک کے ایک مشکل مقام کی تفسیر

مگر محققین نے کہا ہے کہ اس کے قائل ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ آگے "لَوْلَا اَنْ رَّاٰی بُرْھَانَ رَبِّہٖ" (اگر اپنے رب کی دلیل کو انہوں نے نہ دیکھا ہوتا) ہے جو شرط مؤخر ہے ھم بھا کی یعنی اگر برہان رب نہ دیکھتے تو ارادہ کر لیتے تو یہاں ھم کا اثبات ہی نہیں جو اس کی ضرورت ہو کہ ھم کو عزم سے قبل مانا جاوے بلکہ ھم کی نفی مقصود ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ آگے فرماتے ہیں: "کَذٰلِکَ لِنَصْرِفَ عَنْہُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ" (اسی طرح ہم نے ان کو علم دیا تا کہ ہم ان سے صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کو دور رکھیں) تو اس میں ان سے صغائر اور کبائر کی نفی فرما رہے ہیں۔ یہ قرینہ ہے اس کا کہ ھم کی یہاں نفی کی جا رہی ہے نہ کہ اثبات اور گو بعض نے کہا کہ لَوْلَا کی جزا مقدم نہیں ہوتی لیکن اول تو اس میں اختلاف ہے دوسرے اگر مان بھی لیں کہ لَوْلَا کی جزا مقدم نہیں ہوتی تو یہ "لَوْلَآ اَنْ رَّاٰی بُرْھَانَ رَبِّہٖ" (اگر اپنے رب کی دلیل کو انہوں نے نہ دیکھا ہوتا) "دال علی الشرط" (شرط پر دلالت کرنے والا) ہوگا اور شرط محذوف مقدم ہوگی۔ بہرحال یہاں ھم کا اثبات نہیں اس لیے ہم کو عزم سے قبل ماننے کی بھی ضرورت نہیں۔ غرض ھم کا مرتبہ اکثر علماء کے نزدیک وہ ہے جس کے بعد فعل کا صدور ہوتا ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اس کی تحقیق نہیں ہوئی کیونکہ یہ فرمایا جا رہا ہے کہ اگر خدا تعالیٰ کا آپ پر فضل نہ ہوتا تو ایک جماعت ان میں سے ایسا ارادہ کر لیتی تو حق تعالیٰ کا فضل مانع ہے پھر مجال ہی کیا ہے کہ کوئی ایسا ارادہ کر سکے اور اگر کسی مفسر نے اس کے خلاف کہا

ہے تو ہم قرآن کے مقابلہ میں اس کا اعتبار نہ کریں گے۔ بعض تفاسیر میں بعض باتیں بلاسند نقل ہوگئی ہیں وہ قابل اعتبار نہیں اسی طرح افک کے قصہ میں بھی بعض تفاسیر محض بے سند نقل ہوگئی ہیں۔ چند مقامات قرآن شریف میں مشکل ہیں ان میں سے ایک یہ مقام بھی۔ چنانچہ اس مقام پر جو اشکال تھا وہ رفع ہوگیا۔ غرض ان آیات میں ان منافقین کی شرارت اور ان کی تدابیر کا بے سود ہونا بیان کیا گیا ہے۔ آگے اس کی تتمیم ہے::"وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ" الایۃ یعنی وہ آپ کو غلطی میں کیسے ڈال سکتے ہیں۔ آپ پر اللہ تعالیٰ نے کتاب اور حکمت نازل کی ہے اور ایسی ایسی باتیں سکھلائی ہیں جن کو آپ نہیں جانتے تھے اور اس آیت میں جو تین چیزوں کا علم دینا مذکور ہے کتاب اور حکمت اور "مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ" (اور باتیں جن کا آپ کو علم نہ تھا) سمجھ میں یوں آتا ہے کہ علوم تین قسم کے ہیں ایک کا نام کتاب رکھا اور ایک کا حکمت اور ایک کو "مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ" (وہ باتیں جن کا آپ کو علم نہ تھا) اسے تعبیر فرمایا

علم کی دو قسمیں

تفصیل اس کی یہ ہے کہ علم کی اصل میں دو قسمیں ہیں ایک علم احکام اور ایک علم واقعات اور یہ تقسیم خصوصاً جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں تامل کرنے سے بہت زیادہ سمجھ میں آجاوے گی کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صاحب سلطنت بھی تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دو قسم کے علم کی ضرورت تھی ایک حکم کے علم کی اور ایک واقعات کے علم کی جیسے حکام کو دونوں باتوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے کیونکہ اگر واقعہ نہ معلوم ہو تو نرے قانون سے کیا ہوتا ہے یا اس کا عکس ہو کہ قانون نہ معلوم ہو تو صرف واقعہ معلوم ہو جانے سے کیا ہوتا ہے' فیصلے میں دونوں ہی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ واقعہ کا بھی علم ہو اور اس کے حکم کا بھی علم ہو اور یہیں سے اس کی وجہ بھی سمجھ میں آگئی ہوگی جو حدیث میں آیا ہے کہ حاکم تین قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ کہ علم دین رکھتا ہے اور اس کے موافق فیصلہ کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ فیصلہ کے معنے یہی ہیں کہ کسی جزئی کو کسی کلی پر منطبق کرنا اور وہ موقوف ہے اس جزئی کے علم پر اور وہی واقعہ ہے۔ پس اس فیصلہ بحث سے علم تحقیق واقعہ کی ضرورت ثابت ہوگئی یہ تو جنت میں ہے ایک وہ جو علم دین ہی نہیں رکھتا ایک وہ جو علم دین رکھتا ہے مگر اس کے موافق فیصلہ نہیں کرتا' یہ دونوں جہنم میں ہیں تو اس سے صاف معلوم ہوگیا کہ ان دونوں چیزوں کے علم کی ضرورت ہے پس جس نے واقعہ کا علم تلاش نہیں کیا یا واقعہ کا علم تو حاصل کیا مگر حکم کا علم نہیں ہے یہ دونوں جہنم میں ہوں گے اور جس کو دونوں کا علم ہوگا اور اسی کے موافق فیصلہ کرے گا

وہ جنت میں ہوگا۔ اب اس حدیث کو سن کر ان لوگوں کو ذرا آنکھیں کھولنی چاہئیں جو آج کل بڑے عہدوں پر ہیں یا محلّہ کے سردار ہیں کیونکہ وہ اکثر واقعات کی تحقیق تو زیادہ کرتے ہیں مگر فیصلہ جو کرتے ہیں وہ اکثر اپنی رائے سے کرتے ہیں علم دین سے نہیں کرتے تو اب یہ لوگ کیا کریں یا تو فیصلہ کرنا چھوڑ دیں، یہ صورت تو مجھے پسند نہیں بلکہ یہ کریں کہ فیصلہ تو کریں مگر اس طرح کہ واقعات کی تحقیق کر کے ایک مثل تیار کریں اور کسی عالم کے پاس وہ مثل لے جاویں جو کچھ وہ عالم جواب لکھ دے پس اسی کے موافق فیصلہ کر دیا کریں۔ غرض یہ ہے کہ حاکم کو دو چیزوں کی ضرورت ہوئی ہے ایک تو احکام جاننے کی اور دوسری واقعات کے علم کی۔

احکام کی دو قسمیں

پھر احکام کی دو قسمیں ہیں ایک تو منصوص اور ایک اجتہادی تو اب علم ضروری کی تین قسمیں نکلیں ایک احکام منصوصہ کا علم ایک احکام اجتہادیہ کا علم ایک واقعات کا علم تو اس قصہ پر نظر کر کے اس کی تفاسیر میں سب سے اقرب تفسیر یہ ہے کہ اس قصہ میں آپ پر احکام منصوصہ بھی نازل فرمائے اور حکمت بھی نازل کی یعنی نور فہم عطا فرمایا جس سے اجتہاد میں اعانت ہو اور واقعات بھی بتلا دیئے یعنی جو باتیں معلوم نہ تھیں کہ کون شخص ان میں بری ہے اور کون مجرم یہ بھی بتلا دیا لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر واقعہ کا علم وحی سے عطا ہوا۔ خاص خاص ضروری واقعات کا علم دینا مراد جیسے یہاں اس واقعہ کا علم ہے جس میں منافقوں نے چوری کا الزام بے قصور پر لگایا تھا۔ تمام واقعات کا علم مراد نہیں ہے چنانچہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے:

فلعل بعضکم یکون الحن بحجته من بعض فاذا امرت لاحدھم بشیٔ فانما اقطع له بقطعته من نار

"یعنی شاید تم سے بعض لوگ بعضوں سے اپنی حجت اور دلیل کی اچھی تقریر کرنے والے ہوں اگر میں کسی کے حق میں اس کی چرب زبانی کو سن کر کسی ایسی چیز کا حکم دوں جو واقعہ میں اس کی نہ تھی تو اس کو چاہیے کہ اس کو نہ لیوے، پس سوائے اس کے نہیں کہ میں اس کے لیے ایک دوزخ کا ٹکڑا قطع کرتا ہوں۔"

پس آپ کو تمام واقعات کا علم نہیں دیا گیا تھا لیکن واقعات غیر معلومہ کا علم قطعی نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اجتہاد سے جو رائے واقعہ کی صورت سمجھ کر فیصلہ فرما دیا ہو وہ رائے محمود نہ ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس کا وہی اثر نہ ہو جو اس واقعہ معلوم

بالوحی کے علم کا تھا یعنی ثواباً آگے فرماتے ہیں: "وَکَانَ فَضۡلُ اللّٰہِ عَلَیۡکَ عَظِیۡمًا" حق تعالیٰ کا آپ پر بڑا فضل ہے تو جتنی ضروری باتیں تھیں سب کا آپ کو علم دے دیا۔ کوئی ضروری بات چھوڑی نہیں اس میں علم احکام کا علم دین ہونا تو ظاہر ہے۔

علم واقعات بھی علم دین ہے

رہا علم واقعات سو وہ بھی علم دین ہے جبکہ اس سے دین کا کام لیا جائے کیونکہ واقعات کی تحقیق ایک عبادت کے ادا کرنے کے لیے کی جاتی ہے کہ بری کو بری کریں۔ صاحب حق کو اس کا حق دلوائیں تو جو اس کا موقوف علیہ ہے یعنی علم واقعات وہ بھی عبادت ہوگا تو حاصل یہ ہوا کہ فیصلہ کے لیے دو قسم کی چیزیں ضروری ہوں گی ایک صغریٰ وہ تو واقعات ہیں مثلاً زید نے ایسا کیا یہ تو صغریٰ ہے اور ایک کبریٰ ہوگا اور وہ قوانین اور احکام ہیں مثلاً جو شخص ایسا کرے اس کا یہ حکم ہے کہ کبریات تو احکام اور حکمت ہیں اور صغریات ہیں "مَالَمۡ تَکُنۡ تَعۡلَمُ" (یعنی وہ باتیں سکھلائی جن کا آپ کو علم نہ تھا) اور عجب نہیں کہ اس لیے "مَالَمۡ تَکُنۡ تَعۡلَمُ" کو کوئی لقب نہ دیا ہو کیونکہ واقعات کا علم مقصود بالذات نہیں۔ غرض یہ احکام اور واقعات کے علم دینے کو فضل فرماتے ہیں: "وَکَانَ فَضۡلُ اللّٰہِ عَلَیۡکَ عَظِیۡمًا" (آپ پر اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے) اس سے یہ مسئلہ بھی ثابت ہوا کہ واقعات کا علم بھی اگر ذریعہ دین کا ہو تو دین ہے۔ اب فقہاء کے قول کو سنئے کہ "من لم یعرف اھل زمانہ فھو جاھل" یعنی جو شخص اپنے اہل زمانہ کی کم وبیش واقفیت ہونی چاہیے کہ آج کل لوگوں کی کیا عادت ہے کیا رسوم ہیں اور ان کو معلوم کر کے پھر ان کو اپنے دین کی کلیات میں داخل کرلے ورنہ غلطی کرے گا۔ مثلاً ایک شخص نے آ کر پوچھا کہ رہن رکھنا کیسا ہے تو اگر یہ عادت معلوم نہ ہو کہ آج کل رہن نفع کے ساتھ رکھتے ہیں تو وہ جواز فی نفسہ پر نظر کر کے جائز بتلادے گا اور اس سے سائل غلطی میں پڑے گا کہ وہ اس کو بحالت موجودہ جائز سمجھے گا حالانکہ وہ بحالت موجودہ ناجائز ہے اس لیے عالم کو چاہیے کہ اس کی اطلاع حاصل کرے تو اب اگر کوئی پوچھے گا کہ جائز ہے یا نہیں تو یہ بھی اختیار ہے کہ بلا تفصیل ناجائز کہہ دے۔

واقعات جاننے کی ضرورت

اور اس کی مثال ایسی ہے جیسا حدیث میں ہے "لیس من البر الصیام فی السفر"[۱] (سفر میں (جبکہ اس میں ناقابل برداشت تکلیف ہو) روزہ رکھنا ثواب کی بات نہیں) تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر میں روزہ رکھنے سے بلا کسی قید کے ممانعت فرمادی حالانکہ روزہ سفر کے اندر

---

[۱] (سنن ابی داؤد ب: ۴۳، سنن النسائی ۴: ۱۷۶)

بالا طلاق تو ممنوع نہیں ہے بلکہ خاص اسی حالت میں ممانعت ہے جبکہ روزہ رکھنے سے نا قابل برداشت تکلیف ہو جیسا کہ سبب ورود حدیث میں واقعہ پیش آیا تھا تو اس حدیث کے یہ معنی ہوں گے کہ اس سفر میں جو حالت ہے ایسی میں روزہ رکھنا کوئی ثواب کی بات نہیں۔

اسی طرح اگر وہ رہن کو ناجائز کہہ دے گا تو یہ مطلب ہوگا کہ جو رہن رواج میں ہے نفع کے ساتھ ہو وہ جائز نہیں اور اگر زیادہ احتیاط کرے تو سائل سے واقعہ کی تحقیقات کرے اس رہن کی حالت اور شرائط کیا ہیں مگر شقیق نہ کرے کہ اگر اس طرح ہو تو جائز ہے اور اس طرح ہو تو ناجائز ہے۔

علماء کو اپنے زمانے کے طبائع اور واقعات کا علم ضروری ہے

علامہ شامی نے لکھا ہے ورنہ وہ اپنے کام کی بات نکال لیتے ہیں تو اس سے یہ کہے کہ تم اس مکان میں رہتے بھی ہو اگر وہ کہے کہ ہاں رہتا ہوں تو کہہ دے کہ ناجائز ہے۔ خلاصہ یہ کہ واقعات کے جاننے کی بھی بہت ضرورت ہے۔ حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام اور انہیں کی اور اولاد کو خلیفہ بنایا' فرشتوں کو نہ بنایا کیونکہ اصلاح وہی کرے گا جو کہ خواص طبائع پر محیط ہو اور یہ علم ہے واقعات کا اور طبائع پر محیط وہ ہوگا جو کہ ہم طبع ہو مثلاً ایک شخص بھوکا مر رہا ہے تو ایسے شخص کو انسان تو مردار کھانے کی اجازت دے دے گا کیونکہ انسان کو بھوک کی حقیقت معلوم ہے وہ اس کی تکلیف کا اندازہ کرسکتا ہے اور فرشتہ اندازہ نہ کرسکتا وہ کلیہ بتلا سکتا۔ کہ حالت اضطرار میں مردار کھانا ناجائز ہے لیکن یہ نہ بتلا سکتا کہ یہ حالت اضطرار ہے۔ اگر کوئی کہے کہ جب اصلاح کے لیے ہم طبع ہونا شرط ہے تو انسان جنوں کو ہدایت کیونکر کرتا ہے تو سمجھو کہ جنوں میں جو خواص ہیں انسان اس کا بھی جامع ہے اس لیے انسان کو اس کی اصلاح کوئی مشکل بات نہیں۔ غرض علماء کے لیے اپنے زمانہ کے طبائع اور واقعات جاننا ازبس ضروری ہیں جو شخص واقعات وطبائع زمانہ سے واقف ہوگا ذرا دھوکہ میں کم آوے گا۔

چنانچہ ایک مرتبہ کا قصہ ہے کہ ایک شخص نے مجھ سے مسئلہ پوچھا کہ میری توند بڑھ گئی ہے اور زیرناف کا بدن نظر نہیں آتا تو بال کس طرح صفا کروں۔ میں نے کہا کہ ہڑتال اور چونہ سے صاف کرلیا کرو' وہ یہ سن کر بہت دعائیں دینے لگا اور ایک بڑے عالم کا نام لے کر کہا کہ میں نے ان سے دریافت کیا تھا انہوں نے یہ فرمایا کہ بیوی سے صاف کرالیا کرو' میں نہایت پریشان تھا' آپ نے مجھ کو بڑی پریشانی سے نجات دی تو وہ بڑے بھاری عالم تھے مگر چونہ اور ہڑتال کے خواص وطبائع سے جو کہ واقعات میں سے ہے ناواقف ہونے کی وجہ سے ایسی غلطی کی بھلا بیوی اس لیے ہے کہ اس سے یہ کام لیا جائے' طبیعت اس کو کس طرح گوارا کرسکتی ہے۔

اب اور غضب سنئے کہ بعض رئیسوں کو سنا ہے کہ وہ زیر ناف بال نائی سے اترواتے ہیں کچھ ٹھکانا ہے اس بے حیائی کا‘ غرض عالم اگر خواص وطبائع سے واقف ہو تو اس سے اس قسم کی غلطی پھر نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ضرورت ہے ہر عالم کو کہ بقدر ضرورت واقعات وخواص طبائع سے واقف ہو مگر اس کی ضرورت نہیں کہ امریکہ بھی جاوے اور انجن بھی چلانا جانے۔

حضرات فقہاء کی وسیع النظر فی

فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر امام جانے کی تراویح میں لوگ قرآن نہیں سن سکتے تو اس کو پورا قرآن پڑھنا مناسب نہیں۔ بس الم ترکیف سے تراویح پڑھ پڑھا دیا کرے۔ تھانہ بھون کے قریب ایک گاؤں میں ایک حافظ صاحب نے گاؤں کے لوگوں سے کہا کہ کم بخت سب جگہ قرآن ہوتا ہے (نعوذ باللہ) تمہارے اوپر کیا خدا کی مار ہے تم بھی تو ہمت کر کے سن لیا کرو کہنے لگے کہ قرآن پڑھنے میں تو بڑی دیر لگتی ہے ہم سے اتنی دیر کہاں کھڑا ہوا جاتا ہے۔ حافظ صاحب نے کہا کہ دیر کچھ نہیں لگتی بس ایک پارہ پڑھ دیا کروں گا۔ ایک پارہ تو ذرا سی دیر میں ہو جائے گا کہنے لگے کہ ایک روز پڑھ کر دکھلا دو۔ غرض حافظ صاحب مصلے پر پڑھنے کھڑے ہوئے اور وہ حقہ لے لے کر آن بیٹھے‘ یہ حقہ پیتے رہے اور حافظ صاحب قرآن شریف پڑھتے رہے۔ جب تراویح پوری ہو گئیں تو حافظ صاحب نے کہا کہ دیکھا تم نے‘ کتنی دیر لگی کہنے لگے کہ ہاں جی ہاں کچھ ایسی دیر نہیں لگتی اب سے سنا کریں گے تو فقہاء نے ایسے موقع پر تشدد نہیں کیا کیونکہ تشدد سے اصل کام بھی رہ جاتا ہے جیسے کہ مولوی صاحب نے ایک دیہاتی کو نیت روزہ کی سکھلائی تھی ”وبصوم غد نویت“ (کل کے دن کے روزہ کی میں نے نیت کی) دوسرے روز اسے دیکھا تو حقہ پی رہا ہے۔ مولوی صاحب نے کہا ارے روزہ نہیں رکھا‘ کہنے لگا کہ ابھی نیت یاد نہیں ہوئی جب یاد ہو جائے گی تب رکھوں گا تو سختی کرنے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے اس لیے میں کہتا ہوں کہ زیادہ سختی کرنا بہتر نہیں بلکہ نرمی سے کام لینا چاہیے مگر وہ نرمی دین کے لیے ہو یعنی نفع دینی کے لیے ہو اور روپیہ کے لیے نہ ہو کہ بمبئی میں جا کر سود لینے کا وعظ کہہ دیا کہ لوگ خوش ہوں گے تو ہماری مٹھی گرم ہوگی۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس لیے نرمی کرے کہ وہ دین کی طرف آویں گھبرا نہ جاویں تو اس مقام پر کہ تراویح الم ترکیف ہی سے پڑھنے کی اجازت لکھی ہے یہ بھی کہا ہے کہ ”من لم یعرف اھل زمانه فھو جاھل“ (یعنی جو شخص اپنے زمانہ کے لوگوں کے طبائع اور عادات اور واقعات سے ناواقف ہے وہ جاہل ہے)

ایک امام صاحب تھے رڑکی میں ان کو لمبی سورتیں پڑھنے کا شوق تھا کہ حتیٰ کہ گرمیوں میں جمعہ کی نماز میں اکثر سورہ ق پڑھتے تھے‘ لوگوں نے کہا کہ ایسی گرمی میں آپ اتنی لمبی سورتیں پڑھتے ہیں‘ کہنے لگے کہ جب تم سے یہیں کی گرمی برداشت نہیں ہوتی تو دوزخ کی گرمی کیسے برداشت کرو گے‘ تو یہ ساری خرابی کاہے کی تھی واقعات اور طبائع سے ناواقف ہونے کی۔ فقہاء نے واقعی دین کو پورا پورا سمجھا ہے وہ فرماتے ہیں ”**من لم یعرف اهل زمانه فهو جاهل**“ (یعنی جو اپنے زمانہ کے لوگوں کی طبائع وواقعات سے ناواقف ہے وہ جاہل ہے) مولانا فرماتے ہیں۔

چارپارا قدر طاقت بار نہ   برضیفاں قدر ہمت کار نہ

(یعنی چار پایہ پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ مت رکھو اور کمزوروں سے ان کی ہمت کے موافق کام لو)

طفل راگرناں دہی برجائے شیر   طفل مسکین را ازاں نان مردہ گیر

(اگر ذرا سے بچے کو بجائے دودھ کے روٹی دی جاوے تو سمجھو کہ مرے گا)

اجتہاد ہر ایک کے بس کی بات نہیں

ابھی میرے پاس اسی سفر میں خط آیا تھا کہ ایک نصرانی مع اپنے گھربار کے مسلمان ہوا ہے لوگ اس کو مجبور کرتے ہیں کہ ختنہ کراؤ لیکن اگر زیادہ مجبور کیا گیا تو اندیشہ ہے دین سے پھر جانے کا‘ میں نے جواب میں لکھ دیا ہے کہ ختنہ کرانا اسلام کا رکن نہیں ہے‘ اول تو فقہاء نے لکھا ہے کہ جس کو تحمل نہ ہو اس کو اس کا ترک جائز ہے۔ دوسرے وہ ختنہ نہ کرانے سے زیادہ سے زیادہ گنہگار رہے گا‘ مرتد تو نہ ہوگا۔ غرض واقعات کا جاننا ضروری ہے مثلاً کوئی شخص بیع وشرا کا مسئلہ پوچھتا ہے تو اول ہم سمجھ تو لیں کہ اس کی کیا صورت ہے۔ اگر سمجھیں گے ہی نہیں تو فتویٰ کیا دیں گے اور سمجھنے کے لیے واقعات سے مناسبت کی ضرورت ہے ایک شخص مجھ سے ملے عامل بالحدیث واکثر مجھ سے زمینداری کے مسئلے پوچھا کرتے تھے وہ کہتے تھے کہ ہمارے علماء تو بس آمین بالجہر اور رفع یدین ہی کے مسئلے جانتے ہیں اور معاملات کو تو سمجھتے بھی نہیں‘ حکم بتلانا تو درکنار‘ غرض واقعات جب سمجھ میں نہ آویں گے تو فتویٰ کیا دیں گے تو ان کا جاننا بھی لواحق علم سے ہے اور انہیں علم واقعات کے ذیل میں بعض قانون انگریزی کی کتابیں بھی داخل ہیں کیونکہ بہت سے احکام شرعیہ پر عمل کرنا قانون کے جاننے پر موقوف ہے۔ مثلاً ڈاک کے قواعد یا ریل کے قواعد وبعضے قوانین کے جاننے سے اپنی حفاظت ہے‘ ایک مسئلہ تو اس آیت سے یہ ثابت ہوا اور دوسرا مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ جیسے منصوصات

کا جاننا علم دین ہے، مجتہدات کا جاننا بھی علم دین ہے تو جنہوں نے اجتہاد کا انکار کیا ہے انہوں نے غلطی کی۔ اسی طرح جنہوں نے اجتہاد کو ایسا عام کیا ہے کہ آپ اور میں سب مجتہد ہیں یہ بھی غلطی ہے۔ اجتہاد بس اسی کا حق ہے جس کو حکمت یعنی نور فہم دیا گیا ہو اور یہ حکمت ایسی چیز ہے کہ امام بخاری روایت کرتے ہیں کہ کسی نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کہ کیا خصوصیت کے ساتھ تم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ بتلایا ہے جو اوروں کو نہیں بتلایا' آپ نے فرمایا کہ "مااختصنا بشیٔ الا فیما اوتیه الرجل فی القرآن" کہ ہم کو کسی بات کے ساتھ خاص نہیں کیا ہاں ہمارے پاس ایک فہم ہے جو کہ قرآن کے اندر آدمی کو دیا جاتا ہے تو اس فہم کا نام حکمت ہے۔ پس معلوم ہوا کہ علوم اجتہادیہ ایسے ہیں کہ ہر شخص نہیں سمجھتا۔ اب جو یہ لوگ اجتہاد کو ہر شخص کے لیے عام سمجھتے ہیں اور استدلال کرتے ہیں: "وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّکْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ" (ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے آسان کر دیا ہے سو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے) سے ان کی رائے کا بطلان اس سے ظاہر ہو گیا۔ رہا ان کا استدلال اس آیت سے سو للاجتہاد (اجتہاد کے لیے) نہیں فرماتا بلکہ للذکر فرماتے ہیں تو ذکر کے لیے آسان ہے اجتہاد کے لیے ہر ایک کو آسان نہیں اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ واقعات جو کہ احکام کی برابر غامض (باریک) نہیں ان کے باب میں فرماتے ہیں:

وَاِذَا جَآءَ هُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِالْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَی الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓی اُوْلِی الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ۝

منافقین کی یہ عادت تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب کہیں لشکر بھیجتے اور وہاں سے کوئی خبر آتی تو وہ اس کو مشہور کر دیتے اس پر یہ آیت نازل ہوئی یعنی جب ان کے پاس کوئی خبر امن کی یا ڈر کی پہنچتی ہے تو اس کو مشہور کر دیتے ہیں اور اگر اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اپنے اہل حکومت کے حوالے کرتے تو اہل تحقیق ان میں سے اس کی تحقیق کر لیتے (کہ یہ خبر قابل اشاعت ہے یا نہیں) پس جبکہ معمولی خبروں میں قوت استنباطیہ کی ضرورت ہے اور ہر شخص اس کا اہل نہیں تو احکام جو کہ غامض (باریک) اور دقیق ہیں ان میں کیسے ہو سکتا ہے کہ ہر شخص ان کو سمجھ لے۔ اب یہ سمجھنا کیا کوئی آسان بات ہے کہ قرآن شریف میں مہاجرین کی نسبت جنہوں نے مکہ سے مدینے کو ہجرت کی تھی فقراء کا لفظ وارد ہوا تھا: "لِلْفُقَرَآءِ الْمُهَاجِرِیْنَ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ" (ان حاجت مندوں مہاجرین کا حق ہے جو اپنے گھروں اور اپنے مالوں سے جدا کر دیئے گئے ہیں) اس سے فقہاء نے استنباط کیا کہ استیلا (غالب آنا) کفار سبب ہوتا ہے اس کی

ملک کا کیونکہ مہاجرین کے اموال اہل مکہ کے پاس رہ گئے تھے تو اگر وہ ان کی ملک نہ ہوجاتے بلکہ انہیں کی ملک میں رہتے تو ان کو فقراء کیوں کہا جاتا۔ فقیر تو اسی کو کہتے ہیں جس کی ملک میں کچھ نہ ہو یہ ایک جزئی مثال کے طور پر ہے ورنہ ہر ایک سمجھ سکتا ہے کہ اجتہاد اور استنباط بہت مشکل ہے۔ غرض علوم اجتہادیہ بھی علم دین ہیں اور اس سے ایک مسئلہ یہ بھی ثابت ہوا کہ علوم اجتہادیہ بھی نازل من اللہ (اللہ کی طرف سے اترے ہیں اور اس کی شرح فقہاء کے اس ارشاد سے ہوتی ہے) کہ "**القیاس مظهر لا مثبت**" (اللہ کی طرف سے نازل کیا ہوا) (قیاس حکم شرعی کو ظاہر کر دیتا ہے اس کے لیے مثبت نہیں (تو یہ بھی منزل سے من اللہ ہے اور ایک اور مسئلہ اس سے مستنبط ہوتا ہے کہ فرماتے ہیں: "**وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ**" (یعنی اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت آپ پر نہ ہوتی تو ایک گروہ ان میں سے آپ کو غلطی میں ڈالنے کا ارادہ کرتا) تو گمراہی سے بچانے والا فضل کو فرمایا اور اس آیت سے کہ "**وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا**" (آپ پر اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے) معلوم ہوا کہ فضل علم دین ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا تو ثابت ہوا کہ علم دین میں یہ خاصیت ہے کہ وہ گمراہی سے بچاتا ہے اور جو علم دین جان کر بھی عملی غلطی کرے تو اس کو صاحب علم نہ کہا جاوے گا۔

علم دین سے دین و دنیا کا نفع

اور ایک مسئلہ یہ مستنبط ہوا کہ علم دین سے دین اور دنیا دونوں کو نفع ہوتا ہے اور یہ اس طرح کہ اول آپ کو اس واقعہ میں علم دینے کا ذکر فرمایا اور پھر اس کے لیے دو لفظ فرمائے' ایک فضل اور ایک رحمۃ' چنانچہ ارشاد ہے: "**وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ**" الخ اور نصوص کے تتبع سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فضل کا استعمال تو اکثر منافع دنیویہ میں آیا ہے اور رحمت کا استعمال منافع آخرت ہیں۔ چنانچہ مسجد میں داخل ہونے کا وقت جو کہ منافع آخرت حاصل کرنے کا ہے اس کا ذکر رحمت کے لفظ میں وارد ہے: "**اللهم انی اسئلک من رحمتک**"[1] (یعنی اے اللہ آپ سے آپ کی رحمت کی درخواست کرتا ہوں) اور مسجد سے نکلنے کا وقت جو کہ منافع دنیوی حاصل کرنے کا ہے اس کا ذکر لفظ فضل سے ہے۔ "**اللهم انی اسئلک من فضلک**"[2] (اے اللہ آپ سے آپ کا فضل مانگتا ہوں) اور ارشاد ہے: "**فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ**" (پھر جب نماز جمعہ پوری ہو چکے تو اس وقت اجازت ہے

---

[1] (الصحیح لمسلم: ۷۱۳' سنن ابن ماجۃ : ۷۷۲)
[2] (الصحیح لمسلم: ۷۱۳' سنن ابن ماجۃ : ۷۷۲)

کہ تم زمین پر چلو پھرو اور خدا کی روزی تلاش کرو) اور "لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلاً مِّنْ رَّبِّكُمْ" (تم کو اس میں ذرا بھی گناہ نہیں کہ معاش کی تلاش کرو جو تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے) تو جب فضل سے مراد منافع دنیوی ہونے اور رحمت سے مراد منافع اخروی اور علم دین کے لیے دونوں لفظ لائے گئے تو معلوم ہوا کہ علم دین سے دین اور دنیا دونوں کو نفع ہوتا ہے مگر اس میں ایک غلطی ہوتی ہے اس کو میں ذکر کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ لوگ ان منافع دنیا کو بھی احکام کا ثمرہ مقصودہ سمجھتے ہیں۔ یہ غلط ہے اور اگر اس سے شبہ ہو کہ بعض علماء نے کہا ہے کہ احکام کے اندر منافع دنیویہ بھی ہیں تو سمجھ لو کہ ان کی یہ غرض نہیں ہے کہ احکام سے دنیا کے منافع مقصود ہیں ہرگز نہیں بلکہ مقصود تو احکام سے صرف حق تعالیٰ کی رضا اور جنت ہی ہے ہاں دنیا کے منافع بھی بطور خاصیت کے خود بخود اس سے حاصل ہو جاتے ہیں۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے سفر حج سے بمبئی کا سفر لازم آ جاتا ہے لیکن مقصود تو سفر کعبہ کا ہوتا ہے تبعاً بمبئی کا بھی مشاہدہ ہو جاتا ہے تو بمبئی سفر حج سے مقصود تو نہیں لیکن مرتب یہ بھی ہو جاتا ہے اسی طرح احکام کی غرض اور مقصود تو صرف حق تعالیٰ کی رضا جوئی اور جنت ہے لیکن دنیاوی فلاح بھی بلا قصد اس پر مرتب ہو جاتی ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے احکام کو اس طرح مقرر فرمایا ہے کہ منافع دنیویہ کا بھی اس میں خاصہ رکھ دیا ہے تو منافع دنیویہ چونکہ احکام کے لیے بمنزلہ خاصیت اور لازم کے ہیں اس لیے وہ احکام پر بلا قصد بھی مرتب ہو جاتے ہیں ان کے حصول کے لیے قصد کی ضرورت نہیں۔ پس وہ احکام سے مقصود نہیں بلکہ اگر کسی شخص کا احکام کے اندر منافع دنیویہ کا قصد ہوگا تو وہ حق تعالیٰ کے یہاں مقبول نہ ہوگا کیونکہ حدیث میں ہے: "انما الاعمال بالنیات[1]" (یعنی اعمال کا ثواب نیت پر موقوف ہے)

نماز با جماعت کا خاصہ

مثلاً نماز جماعت کا یہ خاصہ ہے کہ اس سے قوت اتفاقی بڑھتی ہے لیکن یہ جماعت سے مقصود نہیں ہے۔ مقصود تو محض حق تعالیٰ کی رضا ہے تو اگر کوئی شخص نماز اس قصد سے پڑھے کہ قوت اتفاقی بڑھے تو ثواب کچھ نہیں ملے گا اور اگر رضائے خداوندی کے قصد سے پڑھے تو ثواب بھی ملے گا اور اتفاق بھی حاصل ہوگا۔ اب جو بعض تعلیم یافتہ لوگوں نے نماز کے یہ مصالح بیان کیے ہیں غلط بھی ہیں اور صحیح بھی، اگر اس کو مقصود سمجھیں تو غلط ورنہ صحیح۔

---

[1] (الصحیح للبخاری ۱:۲، سنن الترمذی: ۱۶۴۷)

غرض یہ ہے کہ علم دین کے لیے چونکہ فضل اور رحمت دونوں لفظ فرمائے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ اس کے اندر دنیا اور دین دونوں کا نفع ہے۔

علم کی قسمیں

اب رہی یہ بات کہ "وَ کَانَ فَضۡلُ اللّٰہِ عَلَیۡکَ عَظِیۡمًا" (آپ پر اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے) میں صرف ایک لفظ کیوں فرمایا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں اس کو عام لے لیا ہے جو شامل ہے۔ دونوں کو اب میں ایک بات کہہ کر ختم کرتا ہوں کہ علم کی تقسیم جو تین قسموں کی طرف فرمائی ہے تو اصل مقصود تو یہی علم ہیں لیکن ان کی تکمیل موقوف ہے کچھ اور چیزوں پر بھی۔ اس لیے ان کے موقوف علیہ بھی ضروری ہوں گے۔ اب اگر اہل علم غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اور جتنے علوم ہیں وہ کتاب اور حکمت ہی کے متعلقات ہیں۔

مثلاً علم معقول کہ وہ حکمت کا معین ہے اسی طرح اصول فقہ اور علم کلام اور علم کلام میں چونکہ رد ہے فلاسفہ کا اس لیے قدرے فلسفہ کی بھی ضرورت ہوگی اور کتاب اللہ عام ہے۔ حدیث کو بھی کیونکہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے آپ سے درخواست یہ کی تھی کہ "اقض بیننا بکتاب اللّٰہ" (یعنی ہمارے درمیان کتاب اللہ کی رو سے فیصلہ کر دیجئے) اور فیصلہ ہوا تھا حدیث سے پس معلوم ہوا کہ حدیث بھی کتاب اللہ میں داخل ہے اور تصوف بھی چونکہ قرآن و حدیث ہی سے ثابت ہے۔ اس لیے وہ بھی کتاب اللہ میں داخل ہے۔ آج کل بعض لوگ علوم تو پڑھتے ہیں مگر اس میں یہ خرابی کر رکھی ہے کہ جو غیر مقصود تھے ان کو مقصود قرار دے کر اصل مقصود کو چھوڑ دیا ہے یا چھوڑا نہیں لیکن بعضے علوم میں تو بہت ہی کوتاہی کرتے ہیں۔

مثلاً تفسیر کہ اس کو بہت کم پڑھتے ہیں۔ اگر ایک رکوع کسی فارغ التحصیل کو دے دیا جاوے اور اس سے کہا جاوے کہ اس کو حل کر دو تو وہ کبھی اس پر قادر نہ ہوگا۔ اس لیے میں نے یہ تجویز کیا ہے کہ تفسیر سے پہلے مع‍ّر اقرآن ترجمہ سے پڑھیں اور تفسیر بھی کم سے کم مدارک ضرور پڑھیں یا اس کا مطالعہ کریں۔ خیر تفسیر تو کچھ پڑھتے بھی ہیں اور ایک چیز تو بالکل نہیں یعنی علم تجوید یعنی قرآن شریف کو صحیح پڑھنا کہ اس کا کہیں پتہ ہی نہیں۔ افسوس ہے کہ بعضے پرانے مدرس ہیں مگر قرآن شریف غلط پڑھتے ہیں لوگ کہتے ہیں کہ تجوید سیکھ کر کیا ہم عاصم بنیں گے۔ میں کہتا ہوں تو کیا مسائل سیکھ کر ابو حنیفہ بن گئے جس طرح مسائل سیکھے جاتے ہیں اسی طرح اسے بھی سیکھنا چاہیے بلکہ اگر مدرسوں میں تجوید جاننے کی شرط لگا دی جاوے تو بہتر ہے۔ مہتممان مدارس کو اس کا انتظام

چاہیے۔غرض تجوید کا بالکل انتظام نہیں اور اگر کہیں انتظام کرتے بھی ہیں تو صرف بچوں کے لیے۔

اور ایک فن ہے قرأت سبعہ اس کو بھی چھوڑ رکھا ہے۔اس میں قرآن کی روایت جمع کی گئی ہیں۔دیکھئے حدیث میں تو بخاری و مسلم وغیرہ سب کتابیں پڑھتے ہیں تو جب روایات حدیث جمع کرتے ہو تو روایات قرآن کیوں نہیں جمع کرتے۔

کتب سلوک داخل نصاب کرنے کی ضرورت

دوسرے آج کل علم تصوف بالکل ہی متروک ہو رہا ہے۔یعنی علم سلوک و اخلاق حالانکہ یہ ایک نہایت ضروری چیز ہے اس فن کی کتابیں بھی درس میں ضرور داخل ہونی چاہئیں۔جیسے احیاء العلوم، قوت القلوب، آج کل تصوف کو ایک فضول چیز سمجھتے ہیں اسی لیے ہم کو اخلاق کی حقیقت تک معلوم نہیں، نہ ان کا علاج معلوم ہے۔حالانکہ یہ بھی فقہ ہے۔امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فقہ کی تعریف یہی کی ہے کہ "**معرفة النفس مالها وما عليها**"(غرض تصوف بھی کتاب اللہ میں داخل ہے اس کا بھی التزام کرنا چاہیے)

خلاصہ وعظ

اب میں ختم کر چکا ہوں۔خلاصہ سارے وعظ کا یہ ہے کہ علم دین بہت ضروری ہے تو سب لوگ علم دین کی طرف متوجہ ہو جاویں اور علم دین کو حاصل کریں جس کا سہل طریقہ میں نے عرض کیا۔اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو علم دین حاصل کرنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرماویں۔

وصلی اللّٰہ تعالیٰ علٰی خیر خلقه

محمد وآله واصحابه اجمعین.

تنبیہات وعظ

پھر وعظ کے بعد تنبیہات ذیل فرمائیں:

تنبیہ اول

"عَلَّمَکَ مَالَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ" (جو باتیں آپ نہ جانتے تھے ان کا بھی اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم عطا کر دیا) میں بعض نے لفظ ما کو عام لیا ہے کہ تمام مجہولات کا آپ کو علم دیدیا تو اول تو آیت میں کوئی دلیل نہیں عموم کی۔ رہا لفظ ما کا کلمات عموم میں سے ہوتا تو اس کا جواب یہ ہے کہ عموم اس کے لیے لازم نہیں ہے۔ ما مخصوص میں بھی مستعمل ہوا ہے جیسے "یُعَلِّمُکُمْ مَّالَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ" (اور اللہ تعالیٰ نے تم کو ان باتوں کا علم دیا جن کو تم نہ جانتے تھے) اور "عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ" (یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو ان چیزوں کی تعلیم دی جن کو وہ نہ جانتا تھا) دوسرے اگر لفظ ما یہاں عام بھی ہو تو عموم ان ہی امور کا ہوگا جو اس مقام کے مناسب ہیں۔ مثلاً امور متعلقہ نبوت وسیاست

تنبیہ ثانی

علم کو فضل فرمانا، اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ علم میں محض اکتساب ہی کافی نہیں فضل خداوندی کی بھی ضرورت ہے۔

تنبیہ ثالث

"وَمِنْ اٰیٰتِہٖ مَنَامُکُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّھَارِ وَابْتِغَآؤُکُمْ" (اسی کی نشانیوں میں سے تمہارا سونا لیٹنا ہے رات میں اور دن میں اور اسی کی روزی کو تمہارا تلاش کرنا ہے) میں بعض لوگوں نے باللیل کو منامکم کے ساتھ اور والنھار کو وابتغاء کم کے ساتھ متعلق کیا ہے۔ گویا اصل میں اس طرح تھا "منامکم وابتغاء کم باللیل والنھار" (تمہارا سونا اور تمہارا روزی تلاش کرنا دن اور رات میں) فرمایا کہ اس سے بہتر یہ ہے کہ منام کو عام لیا جاوے۔ مطلق لیٹنے کو بھی اور وابتغاء کم من فضلہ سے بھی عام مراد لیا جاوے کہ گو بعض حصہ میں ہو تو اس تقدیر پر باللیل والنھار دونوں کا تعلق ہر ایک کے ساتھ ہو جاوے گا۔

سلسلہ التبلیغ کا وعظ نمبر ۱۵۵ مسمی بہ

اشرف العلوم

بمقام مدرسہ اشرف العلوم قلی بازار کان پور ۲۲ رجب المرجب ۱۳۴۱ھ یوم یکشنبہ بعد فجر ۴ گھنٹہ تخت پر بیٹھ کر یہ وعظ ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد ۱۵۰۰ تھی۔ مولوی احمد عبدالحلیم صاحب نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَاشَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارِکۡ وَسَلِّمۡ. اَمَّابَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ. بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ.

وَاَنۡزَلَ اللّٰہُ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَۃَ وَعَلَّمَکَ مَالَمۡ تَکُنۡ تَعۡلَمُ وَکَانَ فَضۡلُ اللّٰہِ عَلَیۡکَ عَظِیۡمًا۝

”اور اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کتاب اور علم کی باتیں نازل فرمائیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ باتیں بتلائیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ جانتے تھے اور آپ پر اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے۔“

یہ ایک بڑی آیت کا ٹکڑا ہے اس میں حق تعالیٰ نے اپنا ایک احسان جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم پر ذکر فرمایا ہے اور اس احسان کی ایک صفت یعنی عظیم ارشاد فرمائی ہے یعنی وہ بڑا احسان ہے اس کی تعیین ترجمہ سے ہوگی اور اس سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ وہ واقع میں کتنی بڑی نعمت ہے جس سے ہم غافل ہیں اور اس سے متمتع نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے اس آیت کے اختیار کرنے کی کہ تا کہ ہمیں اپنی ایک بڑی کوتاہی محسوس ہو جاوے اور پھر اس کی تلافی اور تدارک کی فکر ہو کیونکہ حاصل اصلاح کا یہی ہے کہ اپنی غلطی اور کوتاہی معلوم ہو جانے کے بعد اس کے تدارک کا اہتمام کیا جاوے اور یہی زیادہ تر مطمح نظر ہوتا ہے تمام بیانوں کا کیونکر بیان میں اسی کی ضرورت ہے کہ مخاطب کو کوتاہی کا تدارک بتلا دیا جاوے اس واسطے کہ ایک تو فضائل کا حاصل کرنا ہے اور ایک مضار کا دفع کرنا تو ان دونوں میں مضار کا دفع کرنا جلب رسالہ البلاغ نمبر ۲ ج ۷ منافع و تحصیل فضائل سے زیادہ ضروری ہے اور خاص کر ایسا امر جو مشتمل ہو جلب منفعت اور دفع مضرت دونوں پر اس کی اہمیت تو بہت ہی زیادہ ہو جائے گی چنانچہ یہ مضمون جس کا حاصل ایک نافع چیز پر توجہ دلانا ہے اس کی تحصیل

دفع یہی ہے۔ایک مضرت کا اس لیے اس کی اہمیت وضرورت کو بدرجہ اتم ثابت کہا جاوے گا اسی لیے اس وقت بیان کے لیے اس کو اختیار کیا گیا ہے۔ ہر چند کہ یہ سوال ہوسکتا ہے کہ ایسے امور اور بھی بہت ہیں جو دونوں کو مشتمل ہیں پھر اس مضمون کی تخصیص کی کیا ضرورت ہوئی تو وجہ تخصیص کی یہ ہے کہ وہ مضمون علم کے متعلق ہے اور یہ تقریب بھی ایک علمی مجمع کے متعلق ہے جس میں اس کا کارنامہ ظاہر کرنا زیادہ مقصود ہے مسلمانوں پر اور گو اس مجلس سے زیادہ تر یہی مقصود ہے کہ سب کو اس علمی جماعت کی کارگزاری پر اطلاع ہو جاوے اور جو خدمت دین کی انہوں نے کی ہے اس کا ٹھکانے لگ جانا معلوم ہو جاوے اور یہ خود بھی تحدث بالنعمۃ کی فرد ہونے کی وجہ سے مستحسن ہے مگر محض اس پر اکتفا کرنا چنداں نافع نہیں ہے۔ضرورت اس کی یہی ہے کہ مسلمان عموماً بھی اس نعمت کے حصول سے محروم وغافل نہ رہیں جس کی بدولت یہ مجمع ہے ورنہ فرض چھوڑ کر محض تطوعات پر اکتفا کرنا لازم آئے گا اس لیے ایسے موقع پر اس کے متعلق کوتاہیوں پر بھی متنبہ کر دیا جاوے تو زیادہ بہتر ہے تاکہ ان کی اصلاح ہونے سے وہ فرض ادا ہو جاوے اب سمجھئے کہ اس باب میں کوتاہیاں دو وجہ سے ہوتی ہیں یا تو علم نہ ہونے سے یا عمل نہ ہونے سے اور علم وعمل پر متوجہ نہ ہونے کی مضرت ظاہر ہے اور وہ ضرر کچھ دین کے ساتھ خاص نہیں بلکہ دنیا کا خسارہ بھی ہمیشہ اسی سے ہوتا ہے کہ یا علم میں کوتاہی ہے یا عمل میں کیونکہ ہر خسارہ کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ یا تو کامیابی کا طریقہ نہیں معلوم یا طریقہ تو معلوم ہے مگر اس کی تحصیل کا اہتمام نہیں۔ یہ قاعدہ کلیہ ہے اس طرح دین کی کوتاہیوں کا بھی حاصل یہی ہے کہ یا تو فلاح کے اسباب پر اطلاع نہیں یا اطلاع ہے مگر ان کے حصول کا اہتمام نہیں پھر ان دونوں کوتاہیوں میں علمی کوتاہی عملی کوتاہی سے زیادہ مضر ہوتی ہے اس لیے اس کا اہتمام بھی زیادہ ضروری ہوگا۔ وجہ یہ کہ غور کرنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ علمی کوتاہی ہی مستلزم ہے عملی کوتاہی کو مگر اس کا عکس نہیں ہے کہ عملی کوتاہی مستلزم ہو علمی کوتاہی کو کیونکہ علمی کوتاہی کو تو یہ لازم نہیں ہے کہ وہ علم میں بھی کوشش نہ کرے اور ایسا ہوسکتا ہے کہ ایک شخص عالم ہو مگر وہ سستی سے عمل نہ کرے۔ مثلاً ایک شخص کو نماز پڑھنا معلوم ہے مگر سستی کرتا ہے اور نہیں پڑھتا تو ان کے لیے ممکن تو ہے نماز پڑھنا اور ایک شخص وہ ہے جو پڑھنا جانتا ہی نہیں تو اس کے لیے نماز پڑھانا ناممکن ہے یا مثلاً ایک شخص کو خارش کا نسخہ معلوم ہے مگر سستی کی وجہ سے استعمال نہیں کرتا مگر ممکن ہے کہ سستی دور ہونے کے بعد استعمال کر لے اور ایک شخص کو نسخہ ہی نہیں معلوم تو اس کے لیے استعمال ہی ناممکن ہے کیونکہ عمل کا مسبوق بالعلم ہونا لازم ہے غرض جب علمی کوتاہی کا تحقق ہوگا تو عملی کوتاہی کا بھی ضرور تحقق ہوگا تو یہ مجموعہ ہوگا علمی اور عملی ہر قسم کی کوتاہی کا۔

بہر حال جب یہ مجموعہ ہوگا دونوں کوتاہیوں کا تو یہ کل ہوگا اور الکل اعظم من الجزء اور جب یہ اعظم ہوگا تو اس کا اہتمام بھی زیادہ ضروری ہوگا اس لیے اس وقت علمی کوتاہی کے متعلق بیان کرنا مقصود ہے۔ چنانچہ اس آیت میں اسی کی بحث ہے اور اس میں عجیب عنوان سے حق تعالیٰ نے علم کا فضل عظیم ہونا بیان فرمایا ہے اور جب یہ فضل عظیم ہے تو اس سے محروم رہنا کتنا بڑا احرمان ہوگا۔ اب دیکھ لیجئے کہ ہم لوگ اس کوتاہی کا ارتکاب کر رہے ہیں یا نہیں۔ سو حالت یہ ہے کہ ہم کو نماز تک کے مسائل معلوم نہیں حالانکہ نماز ایسی عبادت ہے کہ جو کسی حال میں معاف نہیں اور عبادات میں یہ بات نہیں ہے کہ جو ان کا مکلّف ہو ہر حال میں وہ عبادت اس پر فرض ہو۔ مثلاً حج، زکوٰۃ، روزہ ہر حال میں فرض نہیں ہوتے۔ مثلاً روزہ کہ بعض حالتوں میں فرض ہی نہیں ہوتا گو پھر قضا واجب ہو یا نہ ہو۔ خواہ مخواہ سقوط ہو یا تاخر ہو بہر حال اس وقت تو فرض نہیں ہوتا۔ مثلاً سفر میں بیماری میں یا نساء کو ناپاکی کی حالت میں کہ ان حالات میں روزہ مؤخر ہو جاتا ہے باوجود عاقل بالغ ہونے کے اور مثلاً ایک شخص بہت ضعیف اور سخت بیمار ہے کہ اچھے ہو جانے کی امید نہیں تو اس کے اوپر نہ رمضان میں روزہ فرض ہوا اور نہ بعد رمضان کے قضا واجب ہوئی۔ ہاں اس کا بدل یعنی فدیہ واجب ہوا یہ تو روزہ کی حالت ہے اب زکوٰۃ کو لیجئے کہ بعض کے ذمہ فرض ہی نہیں مثلاً جن کے پاس بقدر نصاب مال ہی نہیں ان پر زکوٰۃ فرض ہی نہیں یہاں سقوط محض ہے اگرچہ وہ مکلّف عاقل بالغ ہو یہاں تک کہ اب مال کا مالک بنے تو بھی پچھلے سالوں کی زکوٰۃ کی قضا اس کے ذمہ نہیں ہے۔

اسی طرح حج ہے کہ جس کے پاس بقدر زادراہ مال نہ ہو اس پر فرض ہی نہیں۔ بخلاف نماز کے کہ یہ کسی حالت میں معاف نہیں اور اس کا سقوط ہے اور نہ اس کا کوئی بدل ہے جیسا روزہ میں فدیہ تھا بشرطیکہ عقل سالم رہے یعنی حکم یہ ہے کہ بیمار اگر کھڑے ہو کر نہ پڑھ سکے تو بیٹھ کر پڑھ لے، بیٹھ کر نہ پڑھ سکے تو لیٹ کر پڑھ لے اور یہ بھی نہ ہو سکے تو اشاروں ہی سے پڑھ لے۔ ہاں ایک دن ایک رات کی مسلسل غشی میں نماز ساقط ہو جاتی ہے تو یہ حالت شاذ ہے یہاں تو عقل ہی سالم نہیں رہتی اور گفتگو اس صورت میں ہے کہ عقل بھی سالم ہو، اہلیت بھی باقی ہو اور با ایں ہمہ نماز ساقط یا مؤخر ہو جاوے تو نماز میں ایسا نہیں ہے ہاں اگر شاذ طور پر کسی کو ایسی مسلسل بیہوشی ہو جائے تو نماز معاف ہو جائے گی۔ اس سے شریعت کی وسعت اور احاطہ کا پتہ چلتا ہے کہ شاذ حالت کو بھی مہمل نہیں چھوڑا اس کا بھی حکم بتلا دیا، باقی حالات میں نہ سقوط ہے نہ تاخر باقی رہے، ایام حیض و نفاس تو وہاں فرضیت ہی نہیں تو اس کا بدل بھی نہیں کیونکہ وہ ایسی منافی حالت ہے کہ

اس کے ہوتے ہوئے نماز ہو ہی نہیں سکتی اگر کوئی پڑھ لے گی تو اس پر یہ حکم ہوگا کہ لم تصح یعنی نماز صحیح نہیں ہوئی نہ فرض نہ نفل کیونکہ شرط اہلیت نہیں پائی گئی بخلاف حج وزکوۃ کے کہ اگر کوئی عدم اہلیت کے ساتھ ان کو ادا کردے تو ان پر عدم صحت کا حکم نہ ہوگا بلکہ وہ نافلہ ادا ہو جائیں گے۔ غرض نماز کے متعلق کوئی صورت ایسی نہیں کہ اہلیت ہو اور پھر سقوط ہو جائے کہ فرض ہی نہ ہو تو باوجود یہ کہ نماز کی فرضیت اتنی اہم ہے اور پھر وہ سب سے زائد کثیر الوقوع بھی ہے مگر پھر بھی ہم کو اس کے مسائل یاد نہیں پھر طرہ یہ کہ نماز کے متعلق ہم کو رات دن بعض واقعات پیش آتے ہیں مگر خود ہی ان کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔ یہ شبہ بھی نہیں ہوتا کہ شاید غلطی ہو گئی ہو۔ چنانچہ میرے ایک عزیز سالہا سال تک سنت کے آخر کی دو رکعتوں میں بھی محض سورہ فاتحہ ہی پڑھا کرتے اور سورت نہیں ملائی وہ یوں سمجھے کہ جب فرض نماز اسی طرح پڑھتے ہیں تو سنتیں بھی یوں ہی ہوں گی حالانکہ بہت آسان تھا کہ بجائے قیاس کے علماء سے پوچھ لیتے۔ بس اب تو خود رو نماز ہے کہ جس طرح چاہا ادا کر لی حالانکہ ادنیٰ سے ادنیٰ پیشہ بھی بغیر استاد کے نہیں آتا مگر نماز سب کو اپنی رائے سے آجاتی ہے کچھ خبر نہیں جائز ناجائز کی جب اس میں بے توجہی کی یہ حالت ہے تو جو عبادات کثیر الوقوع بھی نہیں ہیں ان کی حالت کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں ہے یہ تو عبادات کا حال تھا ایسے ہی معاملات میں بھی مسلمان یہ جانتے ہی نہیں کہ بیع کی کتنی قسمیں ہیں اور کون سی جائز ہیں اور کون سی ناجائز ہیں نہ یہ خبر ہے کہ کون سی بیع باطل ہے اور کون سی فاسد غرض کچھ بھی خبر نہیں ہے یہاں تک کہ بے توجہی ہے کہ بہت سے مسلمانوں کو یہ بھی خبر نہیں کہ معاملات کو دین سے بھی تعلق ہے یا نہیں، بہت لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ دنیا کے معاملات ہیں جس طرح مناسب ہو کر لینا چاہیے۔ چنانچہ بیع نامہ وغیرہ وکلاء کو دکھانا تو ضروری سمجھتے ہیں مگر علماء کو کوئی نہیں دکھلاتا، میں کہتا ہوں کہ میرا یہ مطلب نہیں کہ وکلاء کو نہ دکھایا جاوے کیونکہ قانونی تکمیل بھی ضروری ہے تا کہ بائع و مشتری پر حجت ہو سکے مگر اس کے سوا اور بھی تو کچھ ضروری ہے۔

صاحبو! یہ تو دیکھ لیا کرو کہ وہ شریعت کے قواعد پر بھی منطبق ہے یا نہیں۔ آخر شریعت پر منطبق ہونے کی بھی تو ضرورت ہے مگر دیکھ لیجئے لاکھوں جائیدادوں کے بیع نامے اور رہن نامے ہو گئے مگر ایک جگہ بھی کہیں کسی عالم کو نہیں دکھلایا گیا ہاں وقف نامہ تو کبھی کبھی دکھلا لیتے ہیں کیونکہ اسے دین کا کام سمجھتے ہیں اور بیع نامہ وغیرہ کو سمجھتے ہیں کہ مولوی تو ان کو سمجھنے کے بھی نہیں انہیں دکھانے سے کیا فائدہ۔ گویا علماء کو جاہل سمجھتے ہیں۔ خدانخواستہ وہ جاہل کیوں ہونے لگے مگر انہیں اپنے جہل کا عکس

ان کے اندر نظر آتا ہے۔ یہ حالت ہے ہمارے معاملات کی یہاں تک کہ بعض تو ناجائز کو جائز سمجھنے لگے ہیں۔ مثلاً سود کو اب رہی معاشرت واخلاق کی حالت اس کا تو ذہن میں یہی پتہ نہیں کہ اس کا کچھ تعلق دین سے ہے چنانچہ بہت لوگوں کو اس کا پتہ نہیں کہ اخلاق دینی مصلحت سے ضروری ہیں یا دنیاوی مصلحت سے۔ بس جیسا رواج ہو گیا اسی کو اخلاق سمجھ لیا اور اس میں اپنی رائے کو مختار سمجھتے ہیں چنانچہ آج کل کے رواج کے مطابق اخلاق کا خلاصہ یہ ہے کہ ذرا نرمی سے بولنا' جھک کر سلام کر لینا' عطر پان حقہ پیش کر دینا' اچھی جگہ بٹھانا وغیرہ۔ سبحان اللہ کیا خلاصہ نکالا ہے' اخلاق کا جیسے ایک گاڑی بان نے اپنا قصہ مجھ سے بیان کیا کہ وہ بچپن میں مکتب میں کریما پڑھتا تھا' اس کا یہ سبق تھا' درصفت تواضع استاد نے سبق خوب سمجھا دیا' اگلے دن سبق سننے بیٹھے تو پوچھا تواضع کسے کہتے ہیں اس نے کہا یہی حقہ بھر دینا پان کھلا دینا وغیرہ یہ سن کر استاد نے تچی تواضع کرنا شروع کر دی یہ بھاگا اور پھر مکتب نہیں گیا اور گاڑی چلانے لگا۔ ایک مرتبہ ان ہی کے صاحب نے پوچھا ارے تواضع بھی یاد ہے' کہنے لگا کہ مولوی صاحب خوب یاد ہے۔ اسی تواضع کی بدولت مجھ کو گاڑی کے جوے پر بیٹھنا پڑا مگر اتفاقاً اس کو تو بے سمجھے ہی تواضع نصیب ہو گئی۔ گاڑی ہانکنا بھی تواضع کی ایک فرد تو ضرور ہے اسی طرح ایک درزی نے ایک فارسی شعر کے عجیب معنی گھڑے تھے اس نے شادی کی تھی اس کی بیوی بھی گو درزن ہی تھی مگر کچھ فارسی اردو پڑھی ہوئی تھی۔ جب رخصت ہو کر آئی اور تکلف رخصت ہوا اور دونوں میں بے تکلفی ہو گئی تو بیوی نے میاں سے پوچھا کہ کچھ فارسی بھی پڑھے ہو اس نے کچھ پڑھا تو تھا نہیں مگر اس خیال سے کہ بیوی کے دل میں انکار سے وقعت نہ ہو گی کہہ دیا کہ ہاں پڑھی ہے اس نے کہا اچھا بتاؤ اس شعر کے معنی کیا ہیں:

الا یا ایہا الساقی ادرکا ساوناولہا کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا

(اے ساقی (مرشد) شراب صحبت کے جام کا دور شروع کیجئے اور اس کو دیجئے کہ شروع میں عشق آسان معلوم ہوتا ہے لیکن پھر بہت مشکلات پیش آتی ہیں)

اس نے کہا بی اس کے یہ معنی ہیں کہ تم میرے پاس رہو گی نہیں واقعی کہا تو ٹھیک کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے آسان سمجھ کر اگرچہ نکاح تو کر لیا مگر نباہ کیسے ہو گا۔ یہ سخت مشکل ہے شعر سے بھی اتفاقاً یہ مطلب کچھ کچھ سمجھا جاتا ہے گو اس نے یہ سمجھ کر جواب نہ دیا تھا تو جیسے تواضع کے معنی گاڑی بان نے اس شعر کے معنی درزی نے سمجھے ویسے ہی آج کل لوگوں نے اخلاق کو سمجھ رکھا ہے کہ نرم اور شیریں الفاظ سے بول لو خواہ دل میں کینہ بھرا ہو' حسد ہو' تفاخر ہو' ایذاء رسانی کی پروانہ

ہو' یہ کچھ خلاف اخلاق نہیں بس نرمی سے بولو اور جھک کر سلام کرلو' سو اہ یہ سب باتیں پالیسی ہی سے ہوں مگر اس کی وہی مثال ہوگی:

از بروں چوں گور کافر پر حلل واندروں قہر خدائے عزوجل
از بروں طعنہ زنی بر بایزید واز درونت ننگ میدارد یزید

(ظاہری حالت تو تمہاری گور کافروں کی طرح آراستہ وپیراستہ ہے اور اس کے اندر خدائے عزوجل کا قہر وغضب نازل ہے۔ ظاہر سے تو تم حضرت بایزید پر طعنہ زنی کرتے ہو اور باہر سے تمہاری باطنی حالت یہ ہے)

یہ حالت ہے ہمارے اخلاق کی ہمارے حضرت استاد رحمۃ اللہ علیہ نے تواضع کی یہ تعریف کی ہے کہ دل میں اپنے کو پست سمجھے اور یہ بھی فرمایا کہ اکثر جو لوگ تواضع کرتے ہیں تو اس لیے نہیں کہ شرعاً یہ پستی مطلوب ہے بلکہ اس لیے کہ وہ عرفاً محمود ہے لوگوں میں اس سے وقعت ہوتی ہے تو واقع میں یہ تواضع کبر ہے کیونکہ اس نے بڑا بننے کے واسطے تواضع کو اختیار کیا ہے۔ غرض اخلاق کو لوگوں نے دین سے ایسا علیحدہ کر دیا ہے جیسے کھانے سے مکھی اور بال کو نکال دیتے ہیں اور جس حالت میں اخلاق ہیں اس کے قریب قریب معاشرت ہے یعنی اٹھنا بیٹھنا کھانا پینا' ملنا ملانا اس کو بھی دین سے خارج سمجھ رکھا ہے۔ غرض ہر شعبہ سے بے خبری ہے اور اس پر توجہ نہیں کہ شاید ہماری یہ حالت واجب الاصلاح ہو پھر بتائیے کہ جس نے علم دین کی تحصیل میں کوتاہی کی جو کہ فضل عظیم ہے اور اس سے اس طرح بے پرواہ رہا اس سے بڑھ کر اور کون محروم ہوگا۔

تفسیر آیت متلوہ

اس آیت میں معلوم ہوگا کہ علم کتنی بڑی دولت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی فضل عظیم عطا ہونا ارشاد کیا گیا ہے:

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ وَعَلَّمَکَ مَالَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ وَکَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْکَ عَظِیْمًا○

ترجمہ: ''اور نازل کی حق تعالیٰ نے آپ پر کتاب اور حکمت اور وہ چیزیں بتائیں جن کی آپ کو خبر نہ تھی اور حق تعالیٰ کا آپ پر بڑا فضل ہے' و کان فضل اللہ الخ یہ تذئیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا بڑا فضل ہے کہ آپ پر کتاب وحکمت نازل فرمائی۔ یہی کتاب وحکمت فضل ہے حق تعالیٰ کا یعنی انزل اللہ سے والحکمۃ تک پر علمک سے تعلم تک کا عطف تفسیری

ہے اگر چہ **علمک** میں مادہ علم کا ہے اور علم ہی کے لیے نزول بھی ہوا تو واقع میں **علمک مالم تکن تعلم** عطف تفسیری ہے کہ جو معنی اور جو مقصود **"اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْکَ الْكِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ"** (اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کتاب وحکمت نازل فرمائی) سے ہے وہی اس سے بھی مقصود ہے۔ گواس میں اور اقوال بھی ہیں یعنی بعض لوگوں نے یہاں واؤ کو عطف تفسیری کے لیے نہیں مانا ہے بلکہ تغائر کے لیے لیا ہے اور کہا ہے کہ نازل کی اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب وحکمت اور وہ علوم جن کی آپ کو خبر نہ تھی۔ یعنی تین چیزیں نازل فرمائیں (۱) کتاب (۲) حکمت (۳) علوم غیر معلومہ اور یہ تیسری چیز جو **مالم تکن تعلم** میں مذکور ہے وہ تصوف ہے۔ کوئی پوچھے کہ کیا اس کی کوئی دلیل ہے کہ مراد اس سے تصوف ہے اگر کوئی دلیل ہے تو کیا ہے؟ اور اگر نری رائے ہے تو تفسیر تو رائے سے جائز نہیں غرض اس کی بنا کیا ہے۔ بس بناء وہی ہے جس کو بناء الفاسد علی الفاسد کہا جائے گا یعنی یہ کہ تصوف کو لوگوں نے مغائر بمعنی منافی سمجھا ہے' کتاب وسنت سے کہ محض رموز واسرار کا علم ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ رموز واسرار کوئی چیز نہیں مگر یہ ضرور کہتا ہوں کہ وہ مقاصد میں سے نہیں ہیں اور یہاں مقاصد کا ذکر ہے اسی لیے یہ تفسیر کسی طرح صحیح نہیں ہے اب رہی یہ بات کہ وہ رموز اسرار کیا چیز ہیں۔ سو خلاف شریعت امور کو رموز اسرار بنایا ہے حالانکہ جو علوم شریعت کے خلاف ہیں وہ ہرگز اس قابل نہیں کہ طریقت بن سکیں کیونکہ وہ تو معارض ہیں کتاب وسنت کے وہ تو علم کی قسم بھی نہیں وہ تو جہل ہوگا۔ پھر ان اسرار ورموز میں چند مدارج بنائے ہیں۔ بعض نے تو یہاں تک حماقت کی ہے کہ ان اسرار ورموز میں ایسی سخت تحریف کی ہے کہ باوجود معارض شریعت ہونے کے عربیت پر بھی اس کا انطباق نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایک حکایت خود مجھ سے صاحب معاملہ نے بیان کی کہ ایک جماعت جاہل درویشوں کی ایک موقع پر جمع تھی انہوں نے ان کو دیکھ کر پکارا اے اومرغے' اول تو ان کے خیال ہی میں نہ آیا کہ یہ مجھے پکارتے ہوں گے کیونکہ وہ بے چارے مرغا تو نہ تھا پھر وہاں کسی سے ایسی بے تکلفی نہ تھی مگر پھر بھی احتمال بعید پر انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا' جب مڑ کر دیکھا تو انہوں نے کہا اے تجھی کو تو پکارتے ہیں آتا کیوں نہیں' یہ بے چارے چلے گئے تو وہ فقیر کہنے لگا بیٹھ تجھے مرشدوں کا نکتہ بتائیں۔ کہا دیکھ جب اللہ تعالیٰ نے عالم ارواح میں روحوں کو جمع کر کے احکام بتلائے تو مولوی لوگ دوسری صف میں تھے اور ہم لوگ پہلی صف میں' اللہ تعالیٰ نے بتایا بنگ بوزہ مولوی لوگ سمجھے نماز روزہ' نعوذ باللہ اول تو ان سے پوچھے کہ اللہ تعالیٰ میں صوت ولحن تھا' پھر اگر بفرض محال ایسا ہو تو وہ آواز ایسی پست تھی کہ کسی نے کچھ سنا کسی نے کچھ سمجھا (نعوذ

باللہ) حق تعالیٰ کے کلام کا صوت ولحن سے مبرا ہونا حضرت شیخ عطار پند نامہ میں فرماتے ہیں اور یہ اتنے بڑے محقق ہیں جن کے بارے میں مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے:

ہفت شہر عشق را عطار گشت ماہنوز اندر خم یک کوچہ ایم

(حضرت عطار نے عشق کے سات شہر طے کئے ہم ابھی عشق کے کوچہ کے پیچ وخم میں ہیں)

تو جس شخص کی تعریف میں مولانا رومی یہ فرماتے ہیں سمجھ لیجئے وہ کس پایہ کا محقق ہے۔ سو وہ پند نامہ میں فرماتے ہیں:

قول او را لحن نے آواز نے

(اس کے قول میں لحن اور آواز نہیں) اور شیخ عطار کا یہ قول صوفیاء پر تو ضرور حجت ہے لہٰذا کسی صوفی کی مجال نہیں کہ کلام الٰہی میں صوت ولحن کا قائل ہو سکے۔ اول تو ظالم نے حق تعالیٰ کو صاحب آواز قرار دیا اور پھر اس پر طرہ یہ کہ آواز بھی اتنی پست مانی جسے دوسری صف والے بھی نہ سن سکے۔ ایسے ہی ایک اور بانوا درویش نے میرے ماموں صاحب سے پوچھا کہ بتا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بڑے ہیں یا رزق بڑا ہے۔ انہوں نے کہا اول تو یہ کوئی دینی مسئلہ نہیں جس کے جواب کی ضرورت ہو اور اگر ہو بھی تو بظاہر محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی بڑے ہیں کہ اشرف المخلوقات ہیں اور رزق بھی مخلوقات میں داخل ہے، کہنے لگا جا تجھے کچھ بھی خبر نہیں' ارے رزق کا مرتبہ بڑا ہے اور سر پر ڈنڈا گھما کر کہا دیکھ **اشھدان محمدًا رسول اللہ** میں ان پہلے آیا محمد پیچھے آئے (ان ہندی میں اناج کو کہتے ہیں) اس احمق سے کوئی پوچھے کہ ان بمعنی اناج یہ ہندی لغت ہے یا عربی ظاہر ہے کہ ہندی ہے پھر اس کو عربی کلام سے کیا واسطہ پھر اس حساب سے تو اشھد کی ضمیر سب سے بڑی ہوئی کہ وہ ان سے پہلے بھی ہے اسی طرح ہمارے وطن میں ایک صوفی صاحب نے اس آیت کا **واللیل اذا سجی** کا یہ ترجمہ کیا کہ اے نفس تیری یہی سجا (سزا) شاید الیل سے نفس اس لیے سمجھا کہ لیل کہتے ہیں رات کو تو جس طرح رات کالی ہے اسی طرح نفس بھی کالا کالا ہے اور سجا کو دیہاتی زبان میں بمعنی سزا سمجھ لیا۔ بس آج کل اس کا نام رموز واسرار ہے اور ان پر مگن ہیں مست ہیں اور چیلے چانٹوں سے کہا جاتا ہے کہ مولویوں کے پاس نہ پھٹکنا اب اصلاح ہو تو کیسے ہو خیر یہ درجہ تو کھلا جہل ہے ان اسرار ورموز کا ایک دوسرا درجہ بھی ہے اور وہ بھی حقیقت سے دور ہے مگر اس میں بعض نہ کہے پڑھوں کو بھی دھوکہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً ''اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى'' کی صحیح تفسیر تو یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو خطاب ہے کہ فرعون کی طرف (تبلیغ کے لیے) جائے کہ اس نے نافرمانی کی ہے مگر اس ایک کی تفسیر یہ گھڑی جاتی

ہے کہ یہ خطاب روح کو ہے اور فرعون سے مراد نفس ہے کہ امرائے روح نفس کے پاس جا کہ اس نے نافرمانی کی ہے اور بڑا دھوکہ ہوگا اس میں یہ ہوگیا ہے کہ اس قسم کی تفسیر بعض ثقات صوفیاء کے رسالوں میں موجود ہے اس سے بعض لوگوں کو دھوکہ ہوگیا کہ قرآن کے حقائق اور ہیں اور ظواہر اور ظواہر تو وہ ہیں جو علماء کہتے ہیں اور حقائق وہ ہیں جو صوفیاء کہتے ہیں اسی طرح حدیث میں ہے کہ "**لاتدخل الملئکة بیتاً فیه کلب**"[1] کہ ملائکہ اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا ہو اس کی تفسیر یہ کرلی گئی کہ بیت سے مراد قلب قالب ہے اور قلب سے مراد صفات سبعیہ اور ملائکہ سے مراد انوار ہیں اب معنی یہ ہوئے کہ جس قلب میں صفات سبعیہ ہوں اس میں نور ملکوتی نہیں آتی۔ پھر جب حدیث کی تفسیر تحریف کردی تو کتا پالنے کی اجازت دیدی۔ اس جہل کی بنا کیا وہی تفسیر بالرائے غرض بعض جو علوم مقصودہ سے بے خبر ہیں وہ بزرگوں کے کلام سے دھوکہ میں پڑ جاتے ہیں۔ یاد رکھو کہ بدون صحبت محققین کے ان رموز کا درجہ معلوم نہیں ہوسکتا کیونکہ ان کی بعض ایسی اصطلاحیں ہوتی ہیں جنہیں عوام تو عوام اہل علم بھی نہیں سمجھتے جیسے طب کی اصطلاحیں محض کتابیں دیکھ کر نہیں سمجھ میں آتیں بلکہ طبیب کی صحبت میں حل ہوتی ہیں چنانچہ ہمارے یہاں ایک طبیب تھے' کتابیں ہی دیکھ کر طبیب بن گئے تھے۔ انہوں نے ایک نسخہ لکھا اس میں کئی دواؤں کے ساتھ مکد بھی چار ماشہ لکھا' خیر وہ نسخہ عطار کے یہاں بندھنے کے لیے لے گیا۔ عطار کہتا ہے کہ مکد ہمارے یہاں نہیں ہے وہ بے چارہ اور جگہ گیا جب مکد کا پتہ نہ لگا تو حکیم صاحب کے پاس واپس آیا کہ مکد تو کہیں ملتا نہیں' آپ کہنے لگے اجی یہ دوا چھوٹے شہروں میں نہیں ملتی' لکھنؤ دہلی میں ملتی ہے میں کہتا ہوں یہ تو انشاء اللہ یونان میں بھی نہیں ملے گی۔ واقعہ یہ ہے کہ اطباء مصنفین کی عادت ہے کہ جس نسخہ میں کچھ اجزاء مساوی الوزن ہوتے ہیں تو ان کے اخیر میں مکد اور وزن لکھ دیتے ہیں یہ مکد مخفف ہے من کل واحد کا کہ من کا میم کل کا کاف واحد کا دال لے کر تخفیف کیلئے مکد لکھ دیتے ہیں اور مقصود یہ ہوتا ہے کہ سب اجزاء ہم وزن ہوں وہ بے چارے یہ سمجھے کہ مکد بھی کوئی دوا ہوگی تو اگر وہ کسی طبیب سے طب پڑھے ہوتے تو ایسی غلطی نہ کرتے کسی محقق نے اسی واسطے کہا ہے:

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خودرا　　عیسیٰ نتواں گشت بتصدیق خرے چند

(اپنے جوہر کو کسی صاحب کمال کو دکھلاؤ کیونکہ چند احمقوں کی سنے تم حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہیں بن سکتے)

---

[1] (الصحیح للبخاری ۴: ۱۳۸' کنز العمال: ۴۱۵۷۰)

کسی صاحب کمال کے سامنے اپنے نکتے پیش کرو اگر وہ تصدیق کردے تو ٹھیک ہے ورنہ بیکار جیسا کسی کو عالم مفسر محدث طبیب اس وقت تک نہیں سمجھتے جب تک اس فن کے کاملین اس کے کمال کی تصدیق نہ کردیں تو ایسے ہی صوفی کو بھی سمجھو اور اس جہل کا منشاء یہ ہے کہ "**حفظت شیئا وغابت عنک اشیاء**" یعنی ان لوگوں نے ایک مقام کو دیکھ لیا دوسرا نہیں دیکھا جس سے پہلے مقام کی تحقیق ہوجاتی وہ یہ کہ فقہاء نے اختاری کو کنایات طلاق میں سے لکھا ہے اور کنایات کا حکم یہ ہے کہ نیت سے یا قرینہ سے یا مذاکرہ سے طلاق پڑ جاتی ہے۔ اب بعض لوگوں نے صرف اتنا مسئلہ دیکھ لیا کہ اگر اختاری کہا نیت طلاق کی کرلی تو طلاق واقع ہوجاتی ہے اور صرف یہ دیکھ کر بعض متبحرین نے اس صورت میں وقوع طلاق کا فتویٰ بھی دے دیا حالانکہ یہ بالکل غلط ہے کیونکہ اس میں ایک اور شرط بھی ہے اور وہ ہے دوسرے باب سے معلوم ہوتی ہے یعنی باب تفویض الطلاق سے وہ شرط یہ ہے کہ اس کے بعد زوجہ نے اخترت بھی کہا ہو تب طلاق ہوگی ورنہ نہیں۔ علامہ شامی نے اپنے زمانہ کا واقعہ نقل کیا ہے کہ ان کے زمانہ میں بھی کسی نے یہ غلط فتویٰ دیا تھا تو بات کیا ہے کہ ان لوگوں نے ایک باب کو تو دیکھ لیا' دوسرے کی خبر نہیں۔ یہیں کان پور ہی میں مدرسہ جامع العلوم میں ایک شافعی طالب علم سورت کی طرف کے رہنے والے تھے۔

مجھ سے کہا کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنے مذہب کے علوم کی تکمیل بھی یہیں کرلوں۔ اس لیے تم مجھے فقہ شافعی بھی پڑھا دو' میں نے کہا کہ اگر محض کتابوں کا ترجمہ کرادوں تو کچھ نفع نہیں اور اگر سمجھا کر پڑھادوں تو اس میں خود مجھ سے غلطی ہوجانے کا احتمال ہے کیونکہ ممکن ہے کہ کوئی ایسا مسئلہ تمہارے یہاں بھی ہو جیسے ہمارے یہاں اختاری یا اسی کے مثل ہیں کہ ایک جگہ اس کو اطلاق کے ساتھ بیان کیا گیا ہو اور دوسری جگہ مقید کیا گیا ہو چونکہ فقہ شافعی پر میری نظر کافی نہیں ہے اس لیے غالب یہ ہے کہ میں اس مطلق کو اطلاق ہی کے ساتھ بیان کروں گا' قید کی مجھ کو خبر نہ ہوگی پھر تم بھی ابھی اپنے مذہب کے ماہر نہیں کہ غلطی کا پتہ چلے۔ اس صورت میں تم عمر بھر غلطی میں پڑے رہو گے اس لیے مناسب یہ ہے کہ تم کسی محقق شافعی عالم سے فقہ شافعی پڑھو۔ چنانچہ ریاست رام پور میں ایک مولوی طیب صاحب شافعی تھے' میں نے ان کا پتہ بتلایا۔ غرض کسی چیز پر بغیر ماہر فن کے بتائے ہوئے اعتماد نہیں کرنا چاہیے کیونکہ نامعلوم اپنے سمجھنے میں کتنی کوتاہیاں ہوجاویں چنانچہ یہاں بھی یہی غلطی ہوئی کہ ان لوگوں نے ایک جگہ تو اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى کی تفسیر بالروح النفس دیکھی اور دوسرے مقامات کو دیکھا نہیں جس میں صوفیاء محققین نے تصریح کی ہے کہ یہ قرآن کی تفسیر نہیں بلکہ علم اعتبار کا

ایک نکتہ ہے یعنی وہ قصص و امثال کو بطور عبرت کے اپنے اوپر منطبق کر لیتے ہیں اسی طرح مثنوی مولانا رومی میں بعض مقامات سے لوگ گمراہ ہو جاتے ہیں۔ محض اس لیے کہ وہ اسی پر اکتفا کرتے ہیں، دوسرے مقامات کو نہیں دیکھتے۔ مثلاً ایک جگہ توحید کے باب میں فرماتے ہیں:

انت کالریح ونحن کالغبار یختفی الریح و غبراہا جہار
انت کالماء ونحن کالرحی یاخفی الذات بخوس العطا

(اے اللہ آپ میرے وہم وخیال اور قیل وقال سے پاک ہیں اور تمثیل پر خاک پڑے)

یعنی آپ مثل ہوا کے ہیں اور ہم مثل غبار کے اور آپ مثل پانی کے ہیں اور ہم مثلاً پن چکی کے۔ اب کوئی ناقص الفہم جو اصول کا احاطہ کئے ہوئے نہ ہو وہ اس سے یہ سمجھ لے گا کہ تشبیہ من کل الوجوہ ہے کہ جس طرح ہوا اور پانی کو غبار اور چکی سے اتصال ہے جو سبب ہے ان کی حرکت کا اسی طرح نعوذ باللہ خدا میں بھی ہوگا مگر یہ غلطی ایک ہی مقام کے مطالعہ پر اکتفا کرنے سے ہوگی۔ مولانا بڑے محقق ہیں وہ دوسرے مقام پر خود ہی اس کا تدارک فرماتے ہیں:

اے بروں از وہم وقال و قیل من خاک برفرق من و تمثیل من

(اے اللہ آپ ہمارے خیال، قیاس، گمان اور وہم سے بلند ہیں، میرے سر اور تمثیل پر خاک پڑے)

آپ مثل ہوا کے ہیں اور ہم غبار کے ہوا پوشیدہ ہے اور اس کا غبار ظاہر ہے اے اللہ آپ کی ذات خفی ہیں اور آپ کے عطا ظاہر آپ مثل پانی کے اور ہم مثل چکی کے ہیں

کہ آپ سب مثالوں سے پاک ہیں جن میں یہ مذکورہ مثالیں بھی آ گئیں پھر آگے اس کا جواب دیتے ہیں کہ جب وہ مثالیں پاک ہیں تو پھر یہ مثالیں کیوں دی گئیں۔ سو فرماتے ہیں:

بندہ تشکیبد ز تصویر خوشت ہر دست گوید کہ جانم مفرشت

(بندہ کو بغیر تمثیل کے صبر نہیں آتا، اس لیے وہ آپ کے ہی ہے اچھی سے اچھی تمثیل بیان کر کے اپنی تسلی کرتا ہے)

کہ بدون تمثیل کے بندہ کو صبر نہیں آتا، پھر اس کے صبر کے مغلوب ہونے کا درجہ بیان فرماتے ہیں:

گہ ترا گویدز مستی بوالحسن یا صغیر السن یا رطب البدن

(اگر تم خدا کو بوالحسن عارف صغیر السن اور رب البدن کہتا ہے تو مستی کی حالت میں کہتا ہے)

سالک ایسے ایسے الفاظ حالت سکر میں کہہ ڈالتا ہے جیسے ہمارے محاورہ میں ننھے اور منے

وغیرہ پیار سے کہا کرتے ہیں۔ پس بوالحسن سے مراد عارف ہے مگر عارف صاحی نہیں بلکہ سکران کیونکہ حق تعالیٰ سن اور بدن وغیرہ سب سے پاک ہیں بلکہ وہ تو ہمارے تمام تصورات سے بھی منزہ ہیں مگر بندہ کچھ نہ کچھ تصور ضرور کئے ہوئے ہے مگر ہمارا وہ مدرک عین حق ہرگز نہیں بلکہ وہ اس سے بھی وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے۔ اس کی شان سب سے ارفع ہے اسی لیے عارفین فرماتے ہیں: ''**کل ما خطر ببالک فهو هالک والله اجل من ذلک**'' کہ جو کچھ تمہارے قلب میں آوے وہ فانی ہے اور حق تعالیٰ فنا سے منزہ ہیں۔ بہر حال وہ وراء الوراء ثم وراء الوراء ہیں۔

اے برادر بے نہایت درگیست ہرچہ بروے میرسی بروے مایست

(اے بھائی اس کے دربار کی کوئی انتہا ہی نہیں کونسی جگہ پہنچ کر کوئی کہہ دے کہ میں منزل پر پہنچ چکا ہوں اگر تو کسی منزل پر پہنچ جاتا ہے تو اس کے اوپر ایک اور منزل ہے)

یعنی انہیں تم جیسا بھی سمجھو وہ اس سے منزہ ہیں وہاں معرفت کی ترقی سے اتنا فرق ہوتا رہے گا کہ ابتدائی تصور بہت سافل تھا ترقی کے بعد جو تصور نصیب ہوگا وہ اس سے عالی ہوگا۔ اسی واسطے کسی پھکڑ نے کہا ہے (اور واقعی بعضے صوفی پھکڑ ہی ہوتے ہیں ان کو اپنے فتویٰ لگوانے کا کچھ شوق ہی ہوتا ہے اور بعضے اخفائے حال کے لیے پھکڑ بن جاتے ہیں سو ایسے ہی ایک پھکڑ کا شعر ہے:

بے زارم ازاں کہنہ خدا ہے کہ تو داری ہر روز مرا تازہ خدائے دگری ہست

(میں تیری اس پرانی خدائی سے جو تو رکھتا ہے بیزار ہوں میرے لیے روزانہ تازہ خدا ہونے چاہئیں)

گویا محبوب کو چڑاتا ہے کہ تیرا خدا تو پرانا ہے اور میرا ہر دن نیا خدا ہے۔ یہ شخص گو زبان کا پھوڑ ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ جو زبان کا پھوڑ ہو وہ دل کا بھی پھوڑ ہو جیسے دہلی میں ایک شخص کہہ رہا تھا کہ میں تیرا بندہ نہیں تو میرا خدا نہیں، پھر میں تیرا کہنا کیوں مانوں، لوگوں نے کہنا شروع کیا کافر ہے کافر ہے، اسے قاضی کے ہاں پکڑ کر لے گئے۔ قاضی نے پوچھا شاہ صاحب کسے کہتے ہو کہا الحمدللہ دہلی میں ایک کو تو عقل ہے خدا تعالیٰ کو نہیں کہتا بلکہ میرا نفس صبح سے کھیر کا تقاضا کر رہا تھا اس سے میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں تیرا بندہ نہیں الخ مگر میں نے **یا ایتها النفس** نہیں کہا تھا، اتنی کسر رہ گئی تھی بس لوگ میرے پیچھے پڑ گئے۔ قاضی نے کہا شاہ صاحب ایسی باتیں ذرا چپکے سے کہا کرو جس میں لوگ نہ سنیں۔ اسی طرح یہ شعر ہے کہ ظاہر میں تو کفر معلوم ہوتا ہے کہ تعدد الٰہ کا قائل ہے مگر واقع میں کچھ بھی نہیں اس کا مخاطب وہ شخص ہے جس کی معرفت میں ترقی نہیں اس کو جیسا علم حق تعالیٰ کا آج ہے ویسا ہی کل ہے اور عارفین کو فکر رہتی ہے ''**رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا**'' (اے اللہ میرے

علم میں ترقی دے) کی ان کو روزانہ ترقی ہوتی رہتی ہے ان کا تصور حق تعالیٰ کے ساتھ ایک حال پر قائم نہیں رہتا بلکہ دن بدن ان کا تصور عالی ہوتا جاتا ہے۔ اسے آج جیسا سمجھا تھا کل علم و معرفت بڑھی تو اور شان سے سمجھا۔ اسی طرح اگلے روز ایک اور شان سے سمجھا جس سے ہر دن وہ یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے جو کچھ سمجھا تھا وہ غلط تھا' آج ٹھیک ہے تو وہ ہر دن تصور سابق سے توبہ و استغفار کرتے ہیں اور برات ظاہر کرتے ہیں اسی کو شاعر کہتا ہے:

بیزارم ازاں کہنہ خدائے کہ تو داری　　　ہر روز مرا تازہ خدائے دگرے ہست

(میں تیری اس پرانی خدائی سے جو تو رکھتا ہے بیزار ہوں میرے لیے روزانہ تازہ خدا ہونا چاہیے)

تو اس میں کیا کفر ہے مگر ہے بے حد پھوڑ پنا۔ اسی کو عربی میں کہہ دیا ہوتا تو رموز و اسرار میں شمار ہو جاتا۔ غرض یہ سب مقالات اسی پر مبنی ہیں کہ حق تعالیٰ کو انسان طبعاً ایک خاص ہیئت میں فرض کر لیتا ہے اور اس سے کوئی خالی نہیں پھر جیسا کہ صبر نہیں آتا' بدون خاص تصور کے بعضوں پر ایسا غلبہ ہوتا ہے کہ جس طرح ان کے ذہن کو صبر نہیں ہوتا ان کے ذہن کو بھی نہیں ہوتا۔ اسی کو کہتے ہیں:

بندہ　نشکیبد ز تصویر　خوشت　　　ہر دمست　گوید　کہ　جانم　مفرشت

(بندہ کو بغیر تمثیل کے صبر نہیں آتا اس لیے وہ آپ کے واسطے احباب اچھی تمثیل بیان کر کے تسلی حاصل کرتا)

جیسے شبان موسیٰ علیہ السلام کا قصہ ہے کہ اس نے زبان سے بھی کیا کیا کہا مگر واقعہ یہی ہے کہ حق تعالیٰ ان تمام تمثیلوں سے منزہ ہیں اسی لئے دیکھئے مولانا نے دوسرے مقام پر یوں بھی کہہ دیا کہ:

اے بروں ازوہم وقال و قیل من　　　خاک برفرق من و تمثیل من

(اے اللہ آپ ہمارے خیال قیاس گمان وہم سے بلند ہیں' میرے سر اور تمثیل پر خاک پڑے) اسی کو شیخ شیراز کہتے ہیں:

اے برتر از خیال و قیاس و گمان ووہم　　　وز ہر گفتہ اند و شنیدیم وخواندہ ایم

دفتر تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر　　　ماہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

(آپ ہمارے خیال قیاس گمان وہم سے بلند ہیں اور ہر چیز سے جسے ہم بولتے سنتے پڑھتے ہیں ہم نے تمام دفتر پوری عمر میں چھان مارا لیکن جس طرح ہم پہلے وصف میں اول تھے)

یعنی آپ سب سے پاک ہیں جو کچھ کسی کے وہم اور خیال میں ہے سب غیر ہے تو جیسا مولانا کے کلام میں سب مقامات کے سمجھ لینے کے بعد غلطی نہیں ہوتی اسی طرح اور صوفیاء کے

کلام میں بھی جب اس کی حقیقت کاملین اور محققین سے معلوم ہوگی پھر غلطی نہیں ہوگی۔ چنانچہ سنئے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں ایک تو ہوتی ہے تفسیر اور ایک ہے تعبیر یا اعتبار تفسیر وہ ہے جو مدلول قرآن وحدیث عربیت کے قاعدہ سے ہے اور تعبیر یا اعتبار وہ ہے جو حکم قیاسی کے مشابہ ہو یعنی اشتراک علت کی وجہ سے مدلول کے حکم کے غیر مدلول کے طرف متعدی کر لیتے ہیں۔ تمثیلاً و تشبیہاً جس سے عامی کو شبہ ہوجاتا ہے کہ تفسیر یہی ہے۔ مثلاً حدیث مذکور کی تفسیر تو یہی ہے کہ جس گھر میں کتا ہوتا ہے اس میں ملائکہ نہیں آتے اور اس سے عبرت کے واسطے سالک کو متوجہ کیا ہے کہ دیکھو کتا چونکہ ناپاک ہے اور ملائکہ پاک ہیں اس لیے پاک اور ناپاک جمع نہیں ہوتے تو اے شخص تیرے اندر بھی ایک ناپاک چیز ہے یعنی قلب جس میں صفات سبعیہ کلیہ ہوں پس ایسے قلب میں انوار نہیں آتے، پہلے اسے ان صفات سے پاک کر پھر اس میں نورانیت دکھائی دے گی۔ یہ علم اعتبار ہے جو قیاس فقہی کے مشابہ ہے اور مشابہ اس لئے کہا کہ یہ عین قیاس فقہی نہیں اس کی نسبت تو فقہاء نے فرمایا کہ القیاس مظہر لا مثبت یعنی اس حکم کا مثبت بھی نص ہی ہے جس کا قیاس سے ظہور ہوگیا اور یہاں ایسا نہیں یہاں وہ مسئلہ اس نص سے ثابت ہی نہیں ہے بلکہ وہ ثابت کسی اور دلیل سے ہوتا ہے یہ تعبیر اس کے لیے محض مثال بن جاتی ہے اسی لیے یہ تعبیر قیاس فقہی سے بھی درجہ میں کم ہے اسی لیے اس کو قیاس فقہی کے درجہ میں بھی نہیں کہہ سکتے۔ ہاں تشبیہ کہہ سکتے ہیں کیونکہ قیاس میں تو علت جو مؤثر فی الحکم ہے مشترک ہوتی ہے اور یہاں محض تشبیہ ہے کہ وجہ جامع مؤثر فی الحکم نہیں حتیٰ کہ اگر حکم شبہ کے باب میں نص نہ ہوتی تو مشبہ بہ کے حکم کو اس کے لیے ثابت ماننا جائز نہ ہوتا سو روح و نفس کو فرعون و موسیٰ سے تعبیر کرنا یہ بھی واقع میں تشبیہ ہے تفسیر نہیں ہے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں:

موسیٰ و فرعون در ہستی تست

(یعنی موسیٰ وفرعون کے واقعہ سے عبرت پکڑو)

جو قرآن میں ہے کہ "اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى" کہ جیسا موسیٰ علیہ السلام سے فرعون نے مقابلہ کیا ایسا ہی تمہاری حالت بھی اس واقعہ کے مشابہ ہے کہ نفس اور روح کا مقابلہ ہے مگر وہ اس کی یہ تفصیل صاف لفظوں میں نہیں کرتے انہیں کیا خبر تھی کہ ایک زمانہ میں پریس کی کثرت ہوجائے گی اور اردو کتابیں دیکھ دیکھ کر لوگ علماء سے مستغنی ہوجائیں گے۔ ان کا خیال تھا کہ ہماری کتابیں وہی لوگ دیکھیں گے جو اس کے اہل ہیں، نااہل کا ان کتابوں کو دیکھنا خود انہوں

نے حرام فرمایا ہے۔ یہ حقیقت ہے ان چیزوں کی جن کو رموز و اسرار کہا جاتا ہے حالانکہ یہ رموز و اسرار بھی نہیں محض نکات ولطائف ہیں ہاں ایک اور درجہ ہے علوم میں وہ البتہ رموز واسرار ہیں ان کو علوم مکاشفہ بھی کہا جاتا ہے مگر تصوف وہ بھی نہیں۔ ان رموز و اسرار کو بھی تصوف کہنا غلطی کی بات ہے مثلاً تجدد امثال۔ توحید وجودی تنزلات ستہ یہ علوم مکاشفہ ہیں جن کی حقیقت یہ ہے کہ جب قلب پر سے حجابات مرتفع ہوتے ہیں حسب استعداد بعضے ایسے امور قلب پر وارد ہوتے ہیں جو منقول نہیں محض ذوقی ہیں مگر انہیں بھی خواہ اس شخص کے اعتبار سے علوم ظنیہ کہہ دیں جس پر یہ وارد ہوئے ہیں مگر دوسرے کے اعتبار سے یہ علوم ظنیہ بھی نہیں محض محتملہ ہیں اور وہ بھی جب کہ یہ مصادمت نہ کریں شریعت کے ساتھ قواعد شرعیہ انہیں رد نہ کریں، محض مسکوت عنہ ہوں اس حالت میں بھی ان کا اصل قاعدہ یہ ہوگا کہ **لانصدق ولانکذب** کہ نہ ہم ان کی تصدیق کرتے ہیں نہ تکذیب۔ پس یہ ایسے مکاشفات ہیں کہ ان کو رموز و اسرار کہا جاسکتا ہے مگر مقصود یہ بھی نہیں غرض تصوف میں دو چیزیں مدون ہیں ایک مکاشفات ایک معاملات ان میں مقصود صرف علم معاملہ ہے باقی علم مکاشفہ محض غیر مقصود ہے کیونکہ حضرات انبیاء علیہم السلام جس کے لیے شریعت لائے وہ علم معاملہ ہے نہ کہ علم مکاشفہ اسی لیے ہر شخص علم معاملہ کا تو مکلف ہے مگر مکاشفہ کا کوئی مکلّف نہیں ہے بلکہ نااہل کو اس کی تبلیغ بھی جائز نہیں اور اہل میں بھی ہر اہل کو جائز نہیں۔

اہل کی دو قسمیں

کیونکہ اہل بھی دو قسم کے ہوتے ہیں ایک اہل تو وہ کہ ان کے قلب پر ایسے واردات طاری ہوتے ہیں ایک وہ ہیں کہ ان کے قلب پر ایسے واردات طاری نہیں ہوتے جس پر ایسے واردات طاری ہوتے ہیں اس پر اظہار جائز بلکہ بعض اوقات ضروری ہے تاکہ وہ اپنے واردات کو اکابر کے واردات پر منطبق کر کے دیکھے اور غلطی سے بچے بس خاص ایسے شخص پر ان کا کشف جائز ہے اور یہی مصلحت ہے اکابر کی۔ ان علوم ذوقیہ کی تدوین میں تاکہ اہل کشف کے پاس اپنے کشف کے قبول ورد کا ایک معیار موجود ہو ورنہ درجہ مقصودیت میں نہ ان کی تدوین جائز بھی نہ ان کا نشر جائز ہے اگرچہ وہ اہل ہی ہو اسی طرح متکلم میں بھی اہلیت شرط ہے اسی کے بارے میں مولانا وصیت فرماتے ہیں:

لقمہ و نکتہ است کامل را حلال — تو نہ کامل مخور میباش لال

(لقمہ اور نکتہ کا ظاہر کرنا کامل کو جائز ہے جب تم کامل نہیں ہو مت کھاؤ اور گونگے بنے رہو)

کہ نکتہ کا ظاہر کرنا کامل کو جائز ہے کہ وہ احاطہ تمام رعایتوں کا کرسکتا ہو تم اگر کامل نہیں ہو تو
تمہارے نام تمام نکات بیان کرنے سے لوگوں کے غلطی میں پڑنے کا اندیشہ ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے:

نکتہ ہاچوں تیغ پولادست تیز   چوں نداری تو سپر واپس

(بہت سے نکتے تلوار کی طرح تیز ہیں اور سپر سے مراد فہم ہے اپنی اگر فہم نہ ہو تو دور نہ ہو)

پیش ایں الماس بے اسپر میا   کز بریدن تیغ رانبود حیا

(اس کے سامنے بغیر سپر کے نہ آؤ کیونکہ ایمان اگر سامنے پڑے گا تو وہ اس کو قطع کردے گا)
اس پر سے مراد فہم سلیم ہے مطلب یہ ہے کہ ان رموز کو ذہن ہی میں مت لاؤ۔ جب تک کہ
فہم کامل نہ ہو کیونکہ تلوار کاٹنے سے نہیں شرماتی، اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ واردات بدفہم کے ایمان کو قطع
کردیتے ہیں اور ایک مقام پر مولانا ان لوگوں کو لتاڑتے ہیں جنہوں نے ان واردات کو نااہل پر
ظاہر کردیا۔ فرماتے ہیں:

ظالم آں قومیکہ چشماں دوختند   ازسخن ہا عالمے راسوختند

(بڑے ظالم تھے وہ لوگ جنہوں نے آنکھیں بند کرکے ایسی باتوں سے ایک عالم کو ویران
کردیا، یعنی ظالم ہیں وہ لوگ جنہوں نے ایسی باتیں کیں جن سے عالم میں ایک آگ لگ گئی)
ایک جگہ ان کی نسبت فرماتے ہیں:

حرف درویشاں بدزدد مرددوں   تا بہ پیش جاہلاں خواند فسوں

(درویشوں کی باتیں چوروں اور کمینہ ٹولیوں کے سامنے ایسی ہیں جیسے جاہلوں کے سامنے
عملیات کا پڑھنا)
یعنی جاہلوں کے پھنسانے کے لیے درویشوں کی باتیں چراتے ہیں جس سے مقصد محض
نقل کرنا اور مجلس گرم کرنا ہوتا ہے غرض ان اسرار کو عام طور پر نقل کرنا جائز نہیں جب نقل کرنا جائز
نہیں تو یہ علوم مقصودہ بھی نہیں کیونکہ علوم مقصودہ کا تو نشر واجب ہے۔ بہرحال اس وقت رموز و
اسرار کیا جاوے گو مقصود وہ بھی نہیں تو **علم مالم تکن تعلم** کی جو تصوف کے خاص شعبہ اسرار
سے یہی درجے ذہن میں آئے ہیں جنہیں میں نے اچھی طرح بیان کردیا ہے اور ان میں سے
صرف آخر کا درجہ اس قابل ہے کہ اس کو رموز واسرار سے تفسیر کی گئی ہے وہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اب تو
قواعد سے معلوم ہوگیا کہ اس سے وہ علوم مراد ہیں جو مقصود ہیں شریعت کے۔ چنانچہ حق تعالیٰ رسول
مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے ہیں: "وَاَنْزَلَ اللّٰہُ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ

وَعَلَّمَکَ مَالَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ" ظاہر ہے کہ انزال سے مقصود ان علوم کا سکھانا ہے جو کتاب وحکمت میں موجود ہیں۔ پس مالم تکن تعلم میں اسی کتاب وحکمت کے متعلق اس کا بیان ہے کہ یہ آپ کو پہلے سے معلوم نہ تھا بلکہ انزال کے بعد معلوم ہوا۔ اسی طرح ایک مقام پر اُمت کو خطاب ہے:

کَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْکُمْ رَسُوْلاً مِّنْکُمْ یَتْلُوْا عَلَیْکُمْ اٰیٰتِنَا وَیُزَکِّیْکُمْ وَ یُعَلِّمُکُمُ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَةَ وَیُعَلِّمُکُمْ مَالَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ٥

"یعنی اے امتیو تمہیں سکھاتے ہیں وہ باتیں جو تم نہیں جانتے تھے۔" عنوان دونوں کا ایک ہی ہے اور مضمون و مدلول بھی دونوں کا ایک ہی ہے اور جس طرح وہاں عَلَّمَکَ مَالَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ کو بعض نے تصوف پر محمول کیا ہے یہاں بھی یُعَلِّمُکُمْ مَالَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ (تم کو وہ سکھاتے ہیں جو تم نہیں جانتے) کو تصوف پر محمول کیا ہے مگر واقع میں وہاں بھی عملک سے علم مکاشفہ مراد نہیں کیونکہ وہ مقصود نہیں بلکہ ایسا علم مراد ہے جس کی اشاعت کا اور نشر کا اہتمام واجب ہے اور یہاں بھی یعلمکم سے یہی علوم مقصودہ مراد ہیں۔ اب معلوم ہو گیا کہ علوم معاملہ کے گو علوم مقصودہ محمودہ میں سے ہے کیونکہ یہ بھی نص کا مدلول ہے جیسا اہل فن جانتے ہیں مگر ان لوگوں نے غلطی یہ کی کہ تصوف کی جو حقیقت یہ سمجھے ہیں یعنی علوم مکاشفہ و اسرار وہ نہ نص کا مدلول ہے اور نہ تصوف کا بھی اور اسی لیے ان لوگوں کی بھی ہمت نہ ہوئی کہ اس کو کتاب وحکمت میں داخل کرتے تو انہوں نے کہا لاؤ اسے مالم تکن تعلم میں داخل کر دؤ اب اس کا حاصل ان ہی کی تسلیم پر یہ ہوا کہ تصوف کتاب وحکمت میں بلاواسطہ بھی داخل نہیں اور بواسطہ بھی ان کا مدلول نہیں حالانکہ تصوف میں جو اصل چیز ہے یعنی علم معاملہ وہ یقیناً کتاب وحکمت کا مدلول ہے کیونکہ تصوف کے علم معاملہ کے سب مسائل اور احکام اور آداب اور قواعد یہ سب قرآن وحدیث ہی سے معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً اپنے معاملہ کو حق تعالیٰ کے ساتھ درست کرنا تعمیر الظاہر والباطن یعنی اپنے ظاہر و باطن کی اصلاح کرنا بلکہ درحقیقت یہ سب فقہ ہی میں داخل ہیں جس کا کتاب وحکمت میں داخل ہونا معلوم و مسلم ہے۔

فقہ کی تعریف

چنانچہ امام ابوحنیفہ نے فقہ کی تعریف یہی کی ہے کہ معرفۃ النفس مالہا وعلیہا کہ نفس کا یہ پہچاننا کہ اس کے لیے کیا چیزیں نافع ہیں' کیا چیزیں مضر ہیں۔ سو یہ تعریف ظاہر و باطن دونوں قسم کے احکام کو عام ہے۔ البتہ علم مکاشفہ نہ تو نافع ہے نہ مضر مثلاً اگر کسی کو تجدد امثال توحید وجودی تنزلات ستہ وغیرہ منکشف نہ ہوں تو یہ ذرا بھی قرب الی اللہ میں مانع نہیں لیکن اگر معاملہ درست نہ ہو تو

قرب حاصل نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کو کسی نے خواب میں دیکھا پوچھا کیا گزری فرمایا کہ "**فتت الرموز والاشارات ونفدت الحقائق والعبارات وما نفعنا الا رکیعات فی جوف اللیل**" یعنی حقائق ومعارف متعارفہ سب فنا ہوگئے صرف چند رکعتیں جو پچھلی رات میں پڑھ لیا کرتا تھا وہ کام آئیں اور علمی تحقیقات کچھ کام نہیں آئیں حالانکہ ان کے پاس کتنے بڑے علوم تھے مگر وہ فقہ نہیں تھے بلکہ علوم مکاشفہ تھے جو کچھ بھی کارآمد نہیں ہوئے۔

علوم مکاشفہ اور علوم معاملہ کی مثال

علوم مکاشفہ اور علوم معاملہ کی ایسی مثال ہے جیسے دیوار کے پیچھے ایک بادشاہ ہے اور کسی طریقہ سے ہماری نگاہ دیوار توڑ کے اس تک جاسکتی ہے جیسے اس زمانہ میں بجلی کے ذریعے سے بکس کے اندر کا پرکار نظر آتا ہے اور بکس نظر نہیں آتا۔ بجلی شعاع کو اجسام ثقیلہ کے پار کردیتی ہے اس لیے درمیانی چیز نہیں دکھائی دیتی اور جو اس کے آگے ہے وہ نظر آنے لگتی ہے۔ چنانچہ یوں ہی کسی طریقہ سے دیوار کے پیچھے بادشاہ نظر آنے لگا اور ایک شخص وہ ہے جسے بادشاہ نظر تو نہیں آتا مگر وہ خالی نام سن کر اطاعت کرتا ہے اور وہ پہلا شخص بادشاہ کو دیکھ کر اطاعت کرتا ہے تو ان دونوں میں بتلایئے کون زیادہ مقبول ہوگا' آیا وہ جو بے دیکھے اطاعت کرتا ہے یا وہ جو دیکھ کر اطاعت کرتا ہے۔

صاحبو! بادشاہ کو دیکھنے سے گو حظ تو زیادہ ہوگا مگر قرب نہیں بڑھے گا کیونکہ قرب دو قسم کا ہوتا ہے ایک رضا ومقبولیت کا دوسرا معاینہ ومشاہدہ کا سو یہ دوسرا درجہ خود مقصود بالتحصیل ہی نہیں کیونکہ یہ اس کا فعل نہیں ہے بلکہ اس کے قبضہ واختیار سے باہر ہے گو اس کے بعض افراد جو موہوب محض ہیں بدلالت نصوص سب درجات مکسوبہ سے افضل ہوں جیسے نبوت ولایت موہوبہ مگر مامور بہ وہ بھی نہیں اور یہ مکلّف ہے امور اختیاریہ کا ہاں اسے ایک اصطلاح پر وصول کہہ سکتے ہیں تحصیل نہیں کہہ سکتے اور مامور بہ تحصیل ہے وصول مامور بہ نہیں اور جو قرب بمعنی مقبولیت واجبۃ التحصیل ہے وہ اس تحصیل مامور بہ پر مرتب ہوتا ہے سو دنیا میں حق تعالیٰ کی ذات وصفات کے اسرار کا منکشف ہوجانا یہ قرب مقصود نہیں نہ اس پر ثمرہ مرتب ہوگا جو قرب مقصود ومامور بہ ہے اور اطاعت واعمال سے ہوتا ہے اور ان کا ثمرہ آخرت میں مرتب ہوگا غرض قرب کی اس قسم میں مقصودیت بالکل نہیں ہے کیونکہ مقصود تو وہ شے ہے جس کی تحصیل کے لیے کوئی طریقہ شرعاً وضع کیا گیا ہو اور اس کی تحصیل کے لیے کوئی طریقہ وضع نہیں کیا گیا اس لیے یہ مقصود نہیں ہوسکتا اور اگر یہ مکاشفہ مقصود ہوتا تو عالم ملکوت صرف مومنین کو نظر آتا' نافرمانوں کو نظر نہ آتا حالانکہ حدیث شریف میں ہے کہ جنگ بدر میں شیطان بہ شکل

انسان آیا اور اس نے کفار کو بہکایا لیکن "فَلَمَّا تَرَآءَ تِ الْفِئَتَانِ نَكَصَ عَلٰی عَقِبَيْهِ" یعنی جب دونوں جماعتیں آمنے سامنے ہوئیں اور شیطان نے فرشتوں کو دیکھا تو بھاگا کہ اِنِّیْ اَرٰی مَالَا تَرَوْنَ میں وہ شئی دیکھ رہا ہوں جو تمہیں دکھائی نہیں دیتی۔ تو دیکھئے ملائکہ کے منکشف ہونے سے ابوبکرؓ و عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی محروم رہے اور شیطان لعین کو یہ مکاشفہ حاصل ہوا اس سے معلوم ہوا کہ کشف مقصود نہیں اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ قیامت میں کفار پر حقائق منکشف ہو جاویں گے اور قیامت میں وہ خوب آنکھوں والے ہو جائیں گے۔ چنانچہ ارشاد ہے: "اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْيَوْمَ فِیْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ" اگر مکاشفات مقصود ہوتے تو مسلمانوں کو خوب ہوا کرتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مقصود صرف اعمال ظاہری و باطنی یعنی نماز روزہ وغیرہ اور توکل رضا وغیرہ ہیں کہ قلب کو اعمال باطنہ سے اور جوارح کو اعمال ظاہرہ سے آراستہ کیا جاوے۔ بس اسی کا نام تصوف ہے۔ گو بعض نے اپنی اصطلاح وعرف میں تصوف صرف فن اصلاح باطن کا نام رکھ لیا ہے جیسا فقہ صرف علم احکام ظاہرہ کا مگر خیر۔ اس میں بھی کچھ حرج نہیں کیونکہ یہ معلوم نہیں ہے شریعت سے۔ غرض جب یہ علوم معاملہ کتاب و سنت کے مدلول ہیں کیونکہ یہ سب قرآن و حدیث میں موجود ہیں مثلاً: "اَلَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ (وہ لوگ جو دکھلاوا کرتے ہیں) اور اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ" (بلاشبہ اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتے) میں ریا اور کبر کی مذمت کی گئی ہے۔ وعلیٰ ہذا تمام اصلاح باطن کے طرق و احکام کتاب و سنت کا مدلول ہے تو پھر کیا ضرورت ہے کہ اس کو کتاب و سنت کا مقابل بنا کر مالم تکن تعلم میں داخل کرو۔ پھر اس میں تصوف کی بھی تو بے وقعتی ہوتی ہے کیونکہ تم نے اس کو کتاب و سنت سے تو خارج کر دیا اور مالم تکن تعلم میں داخل ہونا مشکوک و محتمل ہے۔ "واذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال" تو اب تصوف کہیں کا نہ رہا تو ہمیں کیا ضرورت ہے کہ خواہ مخواہ ایسے مبہم عنوان میں داخل کریں جس کی تفسیر خود محتمل ہو یہ تو وہ چیز ہے کہ ہم اس کے متعلق علی الاعلان کہیں گے کہ تصوف خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مامور بہ ہے اور کتاب و سنت میں داخل ہے۔ بہرحال یہ ثابت ہو گیا کہ یہاں پر واؤ عطف تفسیر کے لیے ہے کہ آپ پر حق تعالیٰ نے وہ کتاب و حکمت نازل کی جس کی آپ کو خبر نہ تھی اول تو یہ واقعہ ہے جو مشاہدہ سے ثابت ہے کہ آپ پر ایک وقت ایسا بھی آیا ہے جس میں بعضے ضروری علوم بھی آپ سے مخفی تھے پھر اس کے ساتھ قرآن مجید میں خود بھی اس کی تصریح موجود ہے۔

"مَاكُنْتَ تَدْرِیْ مَاالْكِتٰبُ وَلَاالْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا"

ترجمہ: ’’آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ یہ خبر تھی کہ کتاب (اللہ) کیا چیز ہے اور نہ یہ خبر تھی کہ ایمان (کا انتہائی کمال) کیا ہے لیکن ہم نے قرآن کو ایک نور بنایا جس کے ذریعے سے ہم اپنے بندوں کو جس کو چاہیں ہدایت دیں۔‘‘

اور اس میں کوئی تنقیص جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی نہیں ہے بلکہ اور زیادہ واضح دلیل ہے آپ کے کمال کی کیونکہ ممکن کا بڑا شرف یہ ہے کہ اس کو حق تعالیٰ سے زیادہ تعلق ہو اور علم عطائی زیادہ تعلق کی دلیل ہے کیونکہ اس سے معلوم ہوگا کہ آپ پر بڑی عنایت ہے کہ اتنے بڑے بڑے کمالات وعلوم اپنی محبت سے آپ کو عطا فرما دیئے ہیں اور ہر وقت عطا فرماتے رہتے ہیں اس لیے مالم تکن تعلم (جس کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر نہ تھی) میں کوئی نقص نہیں ہے اور اگر فرضاً یہ نقص ہے جیسے بعض غلاۃ کا خیال ہے تو تصوف کو بھی اس کا مدلول بنانے سے یہ نقص رفع نہیں ہوگا کیونکہ یہی محذور اس میں بھی ہے بہرحال مالم تکن تعلم سے کتاب وحکمت ہی مراد ہے اور دو لقب سے اس کی دو صفتوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جیسے قرآن کے باب میں ایک جگہ ارشاد ہے: ’’تِلْکَ اٰیَاتُ الْکِتَابِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِیْنٍ‘‘ (یہ آیتیں ہیں کتاب (کامل) اور واضح قرآن کی) ظاہر ہے کہ آیات الکتاب اور قرآن مبین دونوں کا مطلب ایک ہی ہے صرف لقب دو ہیں اور نکتہ دو عنوانوں کے اختیار کرنے میں یہ ہے کہ اس سے قرآن کا دو صفوں کے لیے جامع ہونا ثابت ہوتا ہے ایک وصف کتاب ایک وصف قرآن۔

حاصل یہ کہ قرآن میں دو حیثیتیں ہیں ایک تو یہ ہے کہ وہ مکتوب ہونے کے قابل ہے جس پر لفظ کتاب دلالت کر رہا ہے اور دوسری یہ کہ وہ مقرّ ہونے کے قابل ہے جس پر لفظ کتاب قرآن دلالت کر رہا ہے اور لفظ کتاب میں یہ بھی اشارہ ہے کہ اس کو اپنے پاس لکھ کر رکھو تا کہ عمل کے لیے محفوظ رہے اور لفظ قرآن میں یہ اشارہ ہے کہ اس کو پڑھا بھی کرو تا کہ اس کے استحضار سے عمل کا اہتمام کیا جاوے۔ خالی چھپوا کر یا لکھ کر رکھ لینا کافی نہیں ہے۔ یہاں استطراداً ایک مضمون یاد آ گیا کہ قرآن مجید اصل میں تو عمل کے لیے تھا مگر آج کل قرآن شریف سے عجیب وغریب کام لیے جاتے ہیں کہ بچہ بیمار ہوا تو قرآن کی ہوا دیتے ہیں یا کوئی مر جاوے تو مسجد میں بیٹھ کر ایک ایک پارہ پڑھ لیتے ہیں خواہ وہ محض اہل میت کا گلہ ٹالنے کے لیے ہی کیوں نہ ہو یا قرآن سے فال دیکھتے ہیں۔ کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو نام نکالتے ہیں جس کا طریقہ یہ نکال رکھا ہے کہ بچہ والے ماش وغیرہ لاتے ہیں پھر پیر جی صاحب قرآن لے کر بیٹھے اسے کھولا، ساتویں سطر میں پہلے لفظ کا پہلا

حرف دیکھا مثلاً خیر نکلا اب لوگ پوچھتے ہیں کیا نام نکلا' فال دیکھنے والا خ کی بناء پر کہتا ہے' خدا بخش نکلا نہ معلوم یہ خدا بخش کہاں سے نکلا جو نہ بیسویں پارہ میں ہے نہ تیسویں پارہ میں ہے یہ لفظ تو فارسی ہے اور قرآن فارسی کہاں ہے یہ دعویٰ تو ایسا ہی ہوا جیسے ایک شخص نے سود کی حلت میں ایک رسالہ لکھا ہے اور اس میں یہ لکھا ہے کہ "لَا تَاْکُلُوْا الرِّبٰوا" میں ربا کی تفسیر سود نہیں بلکہ یہ لفظ ربا ہے بضم الراء جس کے معنی اچک لینے کے ہیں تو یہ معنی ہوئے کہ لوٹ مار کر کے کسی کا مال مت کھاؤ کسی نے پوچھا کہ اجی قرآن میں تو ربا زیر کے ساتھ ہے اور اچکنے کے معنی یہ ربا ہے اس کے اوپر تو پیش ہے تو اس کا جواب یہ دیا کہ بھائی یہ زیر زبر پیش تو بعد میں مولویوں نے لگائے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کے یہاں سے تھوڑا ہی نازل ہوئے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ان کور باطنوں کو یہ نہ سوجھا کہ جنھوں نے زیر زبر لگائے وہ تو اس مدعی سے پہلے تھے ان کا زمانہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ قریب تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح پڑھا تھا اس کا علم تو ان کو زیادہ ہو سکتا ہے پھر اسے پیش کہاں سے مل گیا جو جھٹ سے پیش کر دیا اور پھر فارسی سے جو ربا فارسی سے ہے اور اس کا اسم فاعل ترکیبی سماعی دلربا ہوشربا وغیرہ استعمال ہوتا ہے۔ یہ لاتاکلوا کے مفعول کیسے بن گیا اس کا حاصل مصدر بھی تو نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ اپنے مطلب کے آگے نہ فارسی کے قواعد کی کچھ پروا ہے نہ عربی کی اس کا حاصل مصدر بھی ربودگی آتا ہے اسی طرح فال والوں نے بھی کیا ہے کہ قرآن کو فارسی کر لیا ہے کہ کیا نام نکلا خدا بخش' ارے بھئی خدا بخش کہاں سے نکلا خیر کی خ سے اگر ایسا ہی نکلتا ہے تو یہ بھی احتمال ہے کہ شاید کہ خ سے خناس یا خنزیر نکلا ہو۔ بہر حال یہ کھانے کمانے والوں کی ترکیبیں ہیں جنھوں نے قرآن کو مکسبہ بنا لیا ہے اسی طرح اس سے ایک اور کام بھی لیا ہے کہ جائز ناجائز سے قطع نظر تعویذ گنڈوں میں کام لیا جاتا ہے۔

عملیات کے مؤثر ہونے کے لیے شرط اجازت نہیں

ایک شخص نے دہلی میں میرے ترجمہ کی حمائل شریف چھاپی۔ اس میں حاشیہ پر آیات کے متعلق عملیات بھی چھاپ دیئے۔ گو عملیات میں میری ایک علیحدہ کتاب ہے مگر اس حمائل پر جو عملیات چھپے ہیں اس کی مجھے خبر نہیں کہ وہ کہاں سے چھاپے اب لوگوں کے خطوط میرے پاس بکثرت آتے ہیں کہ ان عملیات کی اجازت دیدیجئے' میں لکھ دیتا ہوں کہ مجھے خود کسی نے اجازت نہیں دی' کیا ایسے شخص کی اجازت مفید ہو سکتی ہے میں کہتا ہوں اس اہتمام کے ساتھ یہ اجازت کا قصہ بھی محض ایک فضول حرکت ہے کیونکہ اس سے تسلسل لازم آئے گا کہ ہر اجازت دینے والے

کے لیے اجازت دینے والا لازم آئے گا کہ کہو کہ منتہا سب کے حضور ہیں اور حضور کو حق تعالیٰ نے اجازت دی، بس سلسلہ ختم ہوگیا تو خود یہ دعویٰ غلط ہے کیونکہ عمل اور تعویذ گنڈے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تو منقول نہیں تو سب سے اول عمل والے کو کس نے اجازت دی تھی اگر اس کے عمل بے اجازت مؤثر ہوئے تو معلوم ہوگا کہ عملیات کے مؤثر ہونے کے لیے اجازت شرط نہیں یہ سب کھانے کمانے والوں کی ترکیبیں ہیں کہ لوگ خود تعویذ نہ لکھ سکیں، ہمارے محتاج رہیں اسی طرح اس کی بھی کیا ضرورت ہے کہ ایصال ثواب کے لیے کھانے پر پنج آیت بھی ضرور پڑھی جاوے جس میں جاہل لوگ ان پیر جیوں کے محتاج رہیں۔

فاتحہ صرف کھانے پینے کی چیزوں پر دیتے ہیں

مجھے یہاں کان پور میں جامع العلوم کو جاتے ہوئے راستہ میں ایک شخص جلیبیوں کا دونا لئے ہوئے ملا جو دوڑا دوڑا پھر رہا تھا، مجھ سے بھی کہا کہ اس پر نیاز دے دو میں نے کہا بھائی اس پریشانی سے کیا فائدہ، تم جلیبیاں کسی کو کھلا دو کہ یہ مستقل عمل ہے اور اس کا ثواب الگ ہے پھر جب کوئی پڑھا لکھا مل جاوے گا اس سے الحمد للہ اور قل ہو اللہ بھی پڑھوا لینا مگر وہ راضی نہ ہوا اور اس فاتحہ میں ایک بات یہ بھی عجیب ہے کہ یہ فاتحہ کی تخصیص محض کھانے ہی کے لیے ہے کپڑے یا روپے پیسے کے لیے کوئی فاتحہ نہیں دلواتا پھر ان سب سے قطع نظر تم بھی تو اس رسم کو پورا کر سکتے ہو جس طرح اوروں سے پڑھواتے ہو خود کیوں نہیں پڑھ لیتے مگر کیونکر پڑھ لیں پیر جی کی اجازت نہیں۔ بہرحال اسے ان اہل پیشہ نے اپنے کھانے کمانے کے لیے ایجاد کر رکھا ہے اور اگر کوئی منع کرے تو اس کو وہابیت سے بدنام کرتے ہیں میں تو کہا کرتا ہوں کہ بجائے منع کرنے کے اگر لوگ ایک کام کریں تو یہ طریقہ ہی گم ہو جاوے جو مقصود ہے ممانعت کا وہ یہ ہے کہ فاتحہ تو دلا دیں انہیں پیر جیوں سے مگر انہیں ایک جلیبی بھی نہ دی جاوے، بس پھر یہ لوگ بھی کہنے لگیں گے کہ یوں ہی تقسیم کر دو فاتحہ دلانے کی کیا ضرورت ہے مگر اب چونکہ ہر موقع پر ان کا بھی حصہ لگتا ہے اس لیے ان رسوم کا لوگوں کو پابند کر رکھا ہے بس یہ ترکیب آمدنی کی ہے اور اسی آمدنی کے لیے صدہا ترکیبیں گھڑنا پڑتی ہیں اسی پر ایک قصہ یاد آ گیا ایک بزرگ حکایت فرماتے تھے کہ ایک مقام پر مسجد میں ایک بڑھیا کھانا لائی، وہاں اس وقت اتفاق سے ملا نہیں تھا، ایک اور مسکین مسافر بیٹھا تھا، اس نے کہا کہ آج اسی کو دے دو ملا تو نہیں ہے مطلب تو ثواب سے ہے وہ مسافر کو کھانا دے کر واپس جا رہی تھی کہ راستہ میں ملا ملا، اس نے کہا بڑی بی کہاں سے آ رہی ہو اس نے کہا کہ میں کھانا لے گئی تھی تم ملے نہیں تو

ایک اور مسکین کو دے کر چلی آئی' ملانے دل میں کہا کہ یہ تو بڑا بیڈھب راستہ نکلا' اب تو روز ایسا ہی ہوا کرے گا' اس کا انسداد کرنا چاہیے۔ بس مسجد میں جا کر ایک لٹھ ہاتھ میں لے کر اچھلنا کودنا شروع کیا اور چاروں طرف لاٹھیاں مارنا شروع کیا' کبھی فرش پر' کبھی دیواروں پر اور خوب اودھم مچایا اور اخیر میں دھڑام سے گر پڑا' محلّہ کے سب لوگ شوروغل سن کر جمع ہو گئے جب اس کو ہوش آیا پوچھا ارے بھئی کیا ہوا' کہا تمہیں کیا جو کچھ ہوا وہ ہوا' ارے بھئی کچھ تو کہو کیا کہوں' آج بڑی بی نے کھانا کسی اور کو دے دیا' بے چارہ تمہارے مردوں کو پہچانتا نہ تھا' خدا جانے کس کس کو دے دیا' اب یہ سارے مردے مجھ سے لڑنے لگے کیونکہ ہمیشہ میرے ہی ہاتھ سے ان کو ملتا تھا' پہلے تو میں نے ان کو مارا پیٹا بھگایا مگر کہاں تک میں اکیلا اور وہ سینکڑوں' آخر میں ہی ہارا بھی' میں تو یہاں سے جاتا ہوں کیونکہ روز روز کی مار پیٹ کون سہے' لوگوں نے خوشامد کی کہ نہیں تم جاؤ نہیں ہم آج سے عہد کرتے ہیں کہ سوائے تمہارے کسی اور کو کبھی نہ دیں گے اس آمدنی کی خاطر یہ سب کرنا پڑا۔ غرض بعض لوگوں نے قرآن کو ان اغراض کا آلہ بنا رکھا ہے اس کام میں مخصوص کر لیا ہے اسی طرح ایسے ہی اغراض کے لیے تعویذ گنڈوں میں عاملوں نے اپنی دُکان کی حفاظت کے لیے یہ مسئلہ بنا رکھا ہے کہ جب تک اجازت نہ ہو عمل چلتا ہی نہیں تو یہ سب مہمل باتیں ہیں ان کی کچھ اصل نہیں ہے کہ اجازت ہو تو عمل کا اثر ہو اور غضب یہ ہے کہ اب تو اس رسم کا یہاں تک اثر ہو گیا ہے کہ لوگ دین میں بھی اجازت لیتے ہیں مثلاً مناجات مقبول پڑھنے کی اجازت مانگتے ہیں اس میں تمام ادعیہ ماثورہ جمع کر دی گئی ہیں اور دعا خود مامور بہ ہے۔ چنانچہ **ادعونی** میں بصیغہ امر فرمایا گیا ہے کہ دعا کرو اسی طرح دلائل الخیرات کی اجازت چاہتے ہیں حالانکہ وہ درود کی کتاب ہے اور درود پڑھنا بھی مامور بہ ہے۔ چنانچہ صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا میں اسی کا امر ہے تو امر خالق کے سامنے امر مخلوق کی کیا ضرورت رہی یعنی اس کی ایک توجیہ کرتے ہیں کہ اجازت سے برکت ہوتی ہے عمل میں چنانچہ جس سے اجازت لیتے ہیں اگر وہ یوں دعا کر دے کہ اے اللہ اس کے پڑھنے میں برکت دے دے تو حالانکہ جتنی برکت اس دعا میں ہوگی اس اجازت میں ہرگز نہ ہوگی۔

اوراد و وظائف سے متعلق عوام کا اعتقاد

مگر باوجود اس کے آپ دیکھ لیجئے کہ اس سے ہرگز تسلی نہیں ہوتی کیونکہ اجازت تو دی ہی نہیں تو معلوم ہوا کہ یہ توجیہ بھی غلط ہے اور اعتقاد عوام کا بھی ہے کہ بدون اجازت کے اثر نہیں ہوتا اور اس کی کوئی شرعی دلیل نہیں۔ غور کرنے سے اس رسم کی بنیاد صرف دو سبب معلوم ہوتے ہیں ایک

سبب تو اوارد و وظائف میں جس میں سن کر اجازت دی جاوے اس اجازت کی یہ حکمت معلوم ہوتی ہے کہ اجازت کے بہانہ سے اول سے آخر تک وہ حزب مثلاً حزب البحر یا دلائل الخیرات پڑھ کر کسی بزرگ کو سنادی تو غلطی نکل جائے گی یہ تو اس اجازت کی حکمت ہوئی جو سن کر دی جائے اور جو بے سنے اجازت دی جائے یا فن عملیات و عزائم میں اجازت دی جاتی ہے اس کے سبب کا تعلق مسمریزم (قوت خیالیہ) سے ہے کہ اجازت سے عامل کی قوت خیالیہ معمول کی قوت خیالیہ سے منضم ہو کر اثر کرتی ہے سو اس اثر میں کچھ دین کی بھی قید نہیں بلکہ اس اجازت کے بعد بھی اس عمل کا جو درجہ پہلے سے تھا وہی ہوگا' اس اجازت سے اس میں کوئی طاعت کے معنی پیدا نہیں ہو جائیں گے چونکہ اس مقام پر عملیات کا ذکر آ گیا' اس کے متعلق ایک ضروری فائدہ بتلاتا ہوں وہ یہ کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعائیں پڑھتے تھے تعویذ وغیرہ آج کل کی طرح نہ لکھتے تھے۔ پس اصل تو ان الفاظ کا پڑھنا ہے اور تعویذ جو کہ نقوش ہیں یہ دال ہیں انہیں الفاظ پر اور مدلول کا درجہ دال سے بڑھا ہوا ہوتا ہے تو سبحان اللہ کا نقش لکھ دینا اور اس کا تکلف یعنی پڑھنا برابر نہیں ہو سکتے۔ ہاں لکھنے میں بھی برکت ہوتی ہے اور علاوہ دلیل کے عرفاً بھی سب چیزوں کا لکھ کر رکھ لینا اور زبان سے کہنا برابر نہیں سمجھا جاتا جیسے کوئی شخص زید کے سلام کے جواب میں السلام علیکم ورحمۃ اللہ یا زید لکھ کر حوالہ کر دے تو کیا عرفاً وہ جواب سلام ہو گیا عرفاً بھی یہ سلام نہیں ہوا تاوقتیکہ زبان سے نہ کہے۔

تعویذ کے بارے میں عوام کا غلو

جیسے کسی نے ایک قصہ گھڑا ہے اس میں یہ بھی ایک جزو ہے کہ ملا دو پیازہ ایک قاضی کے پاس گئے قاضی صاحب کا معمول تھا کہ جب انہیں کوئی السلام علیکم کہتا تو وہ اس کے جواب میں بجائے وعلیکم السلام کے ڈھیلا مار دیتے تھے۔ چنانچہ ملا صاحب نے بھی سلام کیا تو قاضی صاحب نے جواب میں ڈھیلا مار دیا' پوچھا یہ کیا کہنے لگے کہ میں نے اس پر وعلیکم السلام پڑھ کر دم کر لیا ہے کیونکہ بہت لوگ آتے ہیں اب میں کہاں تک سب سے وعلیکم السلام کہوں' ڈھیلا مار دیا جواب ہو گیا' ان ڈھیلے پر یاد آیا کہ بعض جگہ مردے کے ساتھ قل ھو اللّٰہ کے دم کئے ہوئے ڈھیلے رکھتے ہیں بہرحال روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل عملیات میں زبان سے کہنا ہے لیکن جو بچہ وغیرہ پڑھنے پر قادر نہ ہو اس کے واسطے روایات ہی میں ایک صحابی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ "کتبھا فی صک و علقھا فی عنقه" یعنی لکھ کر گلے میں ڈال لیتے ہیں' سمجھداروں کے

واسطے کہیں کسی روایت سے ثابت نہیں کہ تعویذ اس کے گلے میں لٹکایا گیا ہو میں اس کے جواز کا انکار نہیں کرتا۔ مقصود میرا یہ بتلانا ہے کہ سلف میں نقش تعویذ کا کیا درجہ ہے اور اب کیا ہو گا چنانچہ اب تو لوگوں کا یہ اعتقاد ہے کہ جو بات تعویذ سے ہوگی وہ پڑھنے سے بھی نہ ہوگی کیونکہ لکھا ہوا تو کسی بزرگ کا ہے ان کے لکھنے کی وجہ سے برکت زیادہ ہوگی اور پڑھا ہوا ہمارا ہم میں وہ برکت کہاں ارے بھئی بس انہیں بزرگ ہی سے تعویذ لکھوالو حالانکہ اس کی کوئی دلیل نہیں مگر رواج اس کا اس قدر عام ہے کہ اپنے پڑھنے پر دوسرے سے لکھوانے کو ترجیح دی جاتی ہے میرے خیال میں تو اس کا راز یہ ہے کہ لوگ یوں چاہتے ہیں کہ محنت نہ کرنا پڑے، بس جو کام ہو وہ بزرگوں کے تعویذ ہی سے نکل جائے خود کچھ نہ کرنا پڑے اس لیے فرمائش کی جاتی ہے کہ طاعون کا تعویذ لکھ دو اگر ان لوگوں سے یہ کہا جاوے کہ میاں تعویذ سے کیا ہوگا، استغفار پڑھا کرو تو جواب میں یوں کہیں گے کہ اجی ہم نے تعویذ لکھوالیا ہم تو مطمئن ہو گئے۔ یاد رکھو کہ یہ تعویذ صرف بچوں کے لیے ہیں جو خود پڑھنے اور لکھنے سے قاصر اور معذور اور تعویذ لکھنے کا طریقہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہیں ثابت نہیں۔ البتہ آپ کا معمول تھا کہ آپ پڑھ کر دم فرمادیا کرتے تھے، تو دم بھی تو کردیا کرو، محض تعویذ پر اکتفا نہ کیا کرو، پھر اگر صاحب حاجت سمجھ دار ہے تو خود بھی پڑھے اور پڑھوا کر دم بھی کرالے اور خیر ایسا ہی جی چاہے تو تعویذ بھی لکھوالے، غرض ان تین چیزوں کو جمع کرے، صرف ایک تعویذ ہی پر اکتفا نہ کرے اب تو تعویذ کی ایسی رسم ہوگئی ہے کہ بوڑھے بوڑھے تعویذ مانگتے ہیں یا آگے ترقی ....

دعا کرنے کا شیطانی وسوسہ

تو دعا منگواتے ہیں مگر خود کچھ نہیں کرتے ایک شخص میرے پاس آئے کہ اجی میں تو قرض دار ہو گیا ہوں دعا کرو، میں نے کہا تم بھی کرو، کہنے لگا اجی ہماری زبان میں اثر کہاں۔ میں نے کہا یہ بتاؤ کلمہ پڑھتے ہو یا نہیں؟ کہا ہاں پڑھتے ہیں۔ میں نے کہا کیوں پڑھتے ہو جب تمہاری زبان میں اثر نہیں ہے اسی طرح نماز کیوں پڑھتے ہو۔ یاد رکھو یہ شیطانی وسوسہ ہے وہ چاہتا ہے کہ بندہ خدا کے سامنے گریہ وزاری نہ کرے، شیطان ایسا دشمن ہے کہ وہ نیک کام دیکھ نہیں سکتا اس لیے یہ خیال جمایا کہ تمہاری زبان میں کیا اثر جو اصل میں تواضع کا اعتقاد ہے جو کہ عبادت سے اور واقع میں سعادت سے محروم کرنا ہے اس کی عداوت کا یہی رنگ ہے کہ خیر خواہی کی صورت میں بدخواہی کرتا ہے۔ چنانچہ اسی کی نظیر کا ایک قصہ یاد آیا کہ ایک شخص کا معمول تھا کہ وہ ایک ہزار مرتبہ تسبیح لے کر لعنة الله على الشيطان (شیطان پر اللہ کی لعنت) پڑھا کرتے تھے، ایک مرتبہ دیوار کے

نیچے یہ شخص سو رہا تھا کہ ایک شخص نے آ کر جگایا اور کہا کہ اس کے نیچے سے ہٹ جاؤ وہ ہٹا اور فوراً دیوار گر پڑی، یہ سمجھا کہ یہ تو کوئی بڑا مخلص معلوم ہوتا ہے، پوچھا ارے بھئی تم کون ہو، کہا میں وہی ہوں جس پر تم ہزار بار لعنت بھیجتے ہو، اس نے کہا ارے بھئی تم تو بڑے خیر خواہ نکلے، اس نے کہا خیر خواہ نہیں ہوں میں نے یہ خیال کیا کہ اگر دیوار کے نیچے دب کر مر گیا تو شہید ہوگا اور درجات بڑھیں گے اس لیے ہٹا دیا کہ درجات سے محروم ہو جاؤ تو حضرت یہ شیطان اس قدر شریر و بدخواہ ہے کہ اعتقاد تواضع کے پردہ میں دعا کی برکات سے محروم کرنا چاہتا ہے بعض طبائع پر اس کا یہاں تک اثر ہو گیا کہ وہ دعا ہی کو بیکار سمجھنے لگے کہ ہماری زبان کی نحوست سے قبول تو ہوتی نہیں پھر کیا دعا کریں میں کہتا ہوں اس کی کیا دلیل ہے کہ قبول نہیں ہوتی تم یہ کہو کہ سو روپے مانگے تھے وہ نہیں ملے بس یہی ہے دلیل جلیل۔ میں کہتا ہوں کہ کوئی سائل ایسا پیسہ مانگے اور اس کو ایک روپیہ دیں تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس کا سوال پورا نہیں ہوا، البتہ کوئی ناحقیقت شناس ممکن ہے کہ اس کو سوال کا پورا نہ ہونا سمجھ لے، جیسے ایک شخص کا قصہ سنا ہے کہ ان سے ان کی ماں نے ترکاری منگائی، انہوں نے کہا پیسہ کی کتنی ملے گی، ماں نے کہا سیر بھر ملے گی، بازار گئے تو کنجڑن نے پیسہ کی سوا سیر بتائی، کہنے لگا ہم سوا سیر نہیں لیں گے ہماری ماں نے تو سیر بھر بتائی ہے مگر یہ ناحقیقت شناس تھی۔

وکیل کی مخالفت الی الشر کی اجازت نہیں

اس واسطے فقہاء نے کہا ہے کہ وکیل کی مخالفت الی الشر اپنے مؤکل کی جائز نہیں ہاں مخالفت الی الخیر جائز ہے جیسے کسی نے قلمدان بیچنے کو دیا کہ اسے ایک روپیہ کو بیچنا تو سوا روپیہ کو بیچنا تو بدرجہ اولیٰ جائز ہے کیونکہ سوا روپیہ میں تو ایک روپیہ بھی ہے اور بارہ آنہ کو بیچنا جائز نہیں۔ اسی طرح اگر فقیر نے ایک پیسہ مانگا اور تم نے ایک روپیہ دیدیا تو اس کے سوال کو رد کیا یا کہ اور زیادہ قبول کر لیا، اب آپ سو روپے کی دعا کر کے اثر یہ ثابت کر دیجئے کہ نہ آپ کو سو روپے ملے نہ اس کی اچھی چیز ملی تو عدم قبول کا دعویٰ صحیح ہو سکتا ہے لیکن اگر آپ کو بجائے سو روپیہ کے دو رکعت نماز نفل کی توفیق ہو گئی تو کیا پھر بھی عدم قبول کا دعویٰ کر سکتے ہو۔ کیا نماز بھی سو روپے سے زیادہ اچھی چیز نہیں، کیا روزہ اس سے اچھا نہیں ہے؟ اگر سو روپے نہیں ملے اور نماز روزہ کی توفیق ہو گئی تو یہ قبول ہی تو ہے بلکہ اور زیادہ قبول ہے کہ ایسی چیز مل گئی جس کا اجر سو روپے سے بدر جہا زائد قیمتی ہے تو بعضا قبول خفی ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ اگر آج دعا نہ کرتے تو پارہ اور نماز پڑھنے کی توفیق ہی نہ ہوتی۔ ایسی سستی نفس میں پیدا ہو جاتی کہ کچھ بھی نہ ہو سکتا یا مثلاً آپ نے دعا کی کہ صحت ہو جائے اور صحت نہیں

ہوئی مگر ممکن ہے کہ اگر دعا نہ کرتے بیماری بڑھتی' دعا کی برکت سے وہ نہیں بڑھی تو کیا قبول نہیں۔
اب اگر کوئی شبہ کرے کہ قرآن مجید میں ہے کہ "اُجِیْبُ دَعْوَةَالدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ" کہ میں دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں اس سے متبادر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص جو دعا کرتا ہے وہ ضرور ہی مستجاب ہوتی ہے تو ایک جواب تو وہی ہے جو مذکور ہوا کہ مطلوب سے زیادہ اچھی چیز مل جانا یہ بھی مطلوب ہی کا ملنا ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اجابت کے معنی منظور کردن ہیں عطا کردن نہیں ہیں۔ عطا کرنا قبول کر کے بعد کا درجہ ہے اس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی کلکٹر کو درخواست دے کہ مجھے تحصیلدار کردو اس کا جواب آجائے کہ تمہاری درخواست منظور کر لی گئی ہے تو اگر یہ شخص دو چار مہینہ کے بعد کہیں تحصیلداری پر بھیجا جائے فوراً نہ بھیجا جائے تو کیا اس کے یہ معنی ہوئے کہ وہ درخواست مردود ہوگئی؟ نہیں وہ منظور ہوگئی۔ تو پھر اللہ کے فعل میں کیوں انتظار نہیں کرتے' کیا خدا کے فعل کی اتنی بھی قدر نہیں۔ وہاں یہ چاہتے ہو کہ فوراً ہو جاوے کسی نے کہا شام کو دعوت ہے تم نے منظور کر لی تو اب اجابت کے معنی یہ ہونا چاہئیں کہ قبول کرتے ہی فوراً کھانا کھالو شام کا انتظار نہ کرو اگر اجابت کے یہی معنی ہیں کہ فوراً ہی اس کا وقوع ہو تو تم نے اس صورت میں کھانا تو کھایا ہی نہیں پھر اس پر قبول دعوت کیسے صادق آیا۔

قبولیت دعا کا مفہوم

اسی طرح سمجھو کہ اجیب دعوة الداع کے معنی یہ ہیں کہ میں منظور تو فوراً کر لیتا ہوں پھر موقع پر دے دیتا ہوں کبھی تو اسی شکل میں جیسا کہ مانگا ہے اور کبھی شکل بدل کر اور کبھی فوراً کبھی توقف سے کبھی دنیا میں کبھی آخرت میں۔ دیکھو موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے فرعون کے حق میں بددعا کی تھی جس پر ارشاد ہوا: "قَدْ اُجِیْبَتْ دَعْوَتُکُمَا" تمہاری دعا منظور کر لی گئی پھر اسی کے متعلق فرماتے ہیں فَاسْتَقِیْمَا اس کی تفسیر میں لکھا ہے کہ لاتستعجلا جلدی نہ کرنا انتظار کرنا ہم جب چاہیں گے پورا کر دیں گے تو دیکھئے یہ موسیٰ علیہ السلام کی دعا ہے اور سیر سے معلوم ہوتا ہے کہ چالیس برس کے بعد اس کی قبولیت کا ظہور ہوا۔ پھر آپ تو ان کے مقابلہ میں موسا بھی (یعنی بال برابر بھی) نہیں تو آپ کی اتنی عجلت کیوں ہے۔ بہرحال دعا کے متعلق جو وساوس ہیں ان کو نکالو جن میں ایک وسوسہ یہ بھی ہے کہ ہماری زبان میں کیا اثر اور دعا کیا کروں ایسے ہی تعویذ گنڈوں میں بھی اصل پڑھنا ہے۔ اس میں بھی یہ وسوسہ نہ کرو کہ ہماری زبان میں کیا اثر بلکہ خوب پڑھا کرو مگر خیر بجز و معذوری کے درجہ میں لکھنا بھی مؤثر ہے۔ اسی طرح یہ وسوسہ مت کرو کہ بے

اجازت کیا اثر ہوگا تم کو معلوم ہوگیا کہ یہ اجازت لینا کہیں کسی دلیل سے ثابت نہیں مگر لوگوں نے ان عملیات میں ایسی شرطیں لگالیں جن سے وہ محض رقیہ ماثورہ نہیں رہا بلکہ ایک دوسرا فن ہوگیا کیونکہ حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے تو صرف اتنا ہی ثابت ہے کہ پڑھ لیا اور دم کردیا اور یہ رقیہ ہے مگر اب اس کو دوسرا فن بنالیا گیا جس میں آگے پھر دو فن ہوگئے ان میں سے ایک تو نامشروع ہے اور وہ نجوم ہے کہ فلاں عمل تو چندی جمعرات کو سورج نکلنے پر مؤثر ہوگا مثلاً اور یہ احکام نجوم اب اسے لوازم میں سے ہوگئے کہ بعض اہل کمال بھی اس میں مبتلا ہوگئے۔ اہل نجوم چونکہ کواکب کو مؤثر مانتے ہیں اس لیے عملیات میں اثر بڑھانے کے واسطے انہوں نے یہ قیدیں لگادی ہیں مگر یہ جائز نہیں ہے میں نے تو جتنے عملیات میرے علم میں تھے ان سے یہ قیدیں سب حذف کردیں مگر باوجود اس کے اللہ تعالیٰ برکت دیتا ہے اور دوسرا فن مسمریزم کا ہے جو فی نفسہ نامشروع نہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ نفس کو یکسو کر کے فاعل بتاتے ہیں جس کو لغۃ ہمت اور توجہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ اس بناء پر عملیات میں ایسے سامان جمع کئے گئے ہیں کہ عامل و معمول کو یقین ہوتا ہے تاثیر کا کیونکہ قاعدہ ہے کہ جتنی قیدیں زیادہ ہوں گی طبعاً یہ یقین ہوگا کہ ضرور اثر ہوگا۔ مثلاً فقط پانچ پیسے کے بتاشے کے کم نہ ہوں نہ زائد اور عود ولوبان کی دھونی یہ سب اسی طرح کی قیدیں ہیں اور اجازت کا بھی یہی قصہ ہے جیسا اوپر مذکور ہوا۔

غور کرنے سے اجازت کے رواج کی تاریخ بھی سمجھ میں آتی ہے۔ کسی عامل نے یوں کہا ہوگا کہ ہم نے اس نقش کی زکوٰۃ دی ہے اور اس کے بعد مشق کی ہے تو ہم تمہیں اس عمل کی اجازت دیتے ہیں اس سے مجاز کے خیال کو قوت ہوگئی اور نفع ہونا شروع ہوگیا۔ سو یہ محض قوت خیال و مسمریزم ہے۔ غرض اجازت محض ذریعہ تقویت خیال کا ہے عملیات میں اصل مؤثر خیال ہے۔ چنانچہ جاڑے بخار کا ایک عمل ہے کہ جنگل میں جاوے اور زمین کھودے اور یہ کہہ کر چلا آوے کہ اے جاڑے بخار میں نے تجھے اس میں دفن کردیا ہے تو اس ترکیب میں اثر ہوجاتا ہے محض اس لیے کہ خیال قوی ہوگیا تو ان عملیات میں اصل مؤثر خیال ہے اور قیود واجازت سے اسے قوت پہنچانا مقصود ہے۔ چنانچہ حاضرات کی بھی بناء یہی ہے کہ انگوٹھی پر سیاہی لگا کر اسے گھورتے ہیں مگر اصل کے نہ جاننے سے آج اکثر عامل بھی دھوکے میں ہیں کہ اب شاہ جن آوے گا اور معمول کے ذہن میں بھی اثر ڈالا اور پکھنڈ یہ کیا کہ پہلے سیاہی لگادی کیونکہ سیاہ رنگ اپنی جانب نگاہ کی شعاعوں کو گھسیٹتی ہے چنانچہ کتب منطق میں جو یہ مثال دی جاتی ہے کہ الجسم مفرق للبصر بشرط کونہ

ابیض تو یہ مثال گھڑی ہوئی نہیں بلکہ واقعی یہی ہے کہ انوار کو سیاہ چیز زیادہ گھسیٹتی ہے۔ اسی لیے بجلی سیاہ چیز پر زیادہ گرتی ہے تو سیاہی ناخن پر لگا دیتے ہیں جس سے شعاعیں سمٹ کر ایک جگہ جمع ہو جاتی ہیں کیونکہ انتشار نظر سے انتشار قلب اور اجتماع نظر سے اجتماع قلب واقع ہوتا ہے چنانچہ صوفیاء نے جو نظر بقدم کا شغل تجویز کیا ہے وہ اسی اصل کے ماتحت اور محض علوم طبعیہ سے ہے اسے تصوف سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ تصوف علم معاملہ ہے یہ اشغال تصوف نہیں غرض سیاہی لگا کر جو تصور کرتے ہیں اس سے دماغ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ انگوٹھا غائب ہو گیا اور ایک میدان نمودار ہوا پھر اس میں سقہ آیا' اس نے پانی چھڑک دیا' بھنگی آیا وہ جھاڑو دے گیا۔ پھر فراش نے آ کر فرش بچھا دیا اور پھر شاہ جن کی سواری آ گئی تو یہ سب آپ کے دماغ میں ہے اور واقع میں کچھ بھی نہیں۔ چنانچہ میرے ایک دوست یہاں کانپور میں میرے پاس پڑھتے تھے ان کے سامنے ایک عامل نے کسی سے کہا کہ آؤ میں تمہارے دوست کا مشاہدہ کرلوں' انہوں نے کہا کہ اچھا وہ عالم زور لگاتا رہا اور یہ چپکے چپکے پڑھتے رہے۔ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ (اے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرمادیں کہ حق غالب آیا اور باطل مٹ گیا) اب عامل صاحب معمول سے پوچھتے ہیں کیا نظر آیا اس نے کہا کچھ بھی نہیں' وہ معمول کہنے لگا اجی یہ لونڈا چپکے چپکے کچھ پڑھ رہا ہے غرض عامل صاحب بہت کھسیانے ہوئے اور ان کا عمل بالکل مؤثر نہ ہوا۔ یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اچھا پھر آنا۔ اب انہوں نے جو اس آیت کو پڑھا محض اپنی رائے سے پڑھا تھا مگر انہوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اس کے پڑھنے سے اثر نہ ہوگا۔ چنانچہ نہیں ہوا اگر کسی کے خیال میں قوت ہو تو عامل کے تصرفات سب دفع ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ یہیں کانپور میں ایک مرتبہ تین عامل آئے تھے عصر سے مغرب تک انہوں نے یہ عمل کیا ان کی توجہ سے میز کا پایہ اٹھ جاتا تھا اور وہ اس دھوکہ میں تھے کہ تجمل حسین کی روح آئی اور اس نے اٹھایا۔ میں نے یہ عمل دیکھا اور اس پر غور کرتا رہا' مغرب کے وقت میری سمجھ میں آ گیا میں نے اپنے دو رفیقوں سے کہا کہ یہ قوت خیالیہ ہے اب بعد مغرب ان سے پھر درخواست اس تصرف کی کرو اور ہم یہ خیال کریں کہ ان کا تصرف نہ چلے وہ کہنے لگا ہم میں اتنی قوت کہاں میں نے کہا عامل خواہ کچھ ہی ہوں مگر تم یہی سمجھو کہ یہ کچھ بھی نہیں ہے سب یہ خیال ہے اور ہمارا خیال ان سے قوی ہے تم یہی یقین کرنا چنانچہ اس کے بعد میں نے مغرب کے بعد ان عاملوں سے کہا کہ میں پھر دیکھنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ وہ متوجہ ہوئے اور ہم لوگوں نے اس کے خلاف خیال جما لیا تو ان سے کچھ بھی نہ ہوا غرض خیال ایسی چیز ہے اور اسی مصلحت سے اجازت کی ایجاد کی گئی ہے کہ خیال کی

طاقت سے عمل میں اثر پیدا ہو۔ ہاں میں یہ بیان کر رہا تھا کہ حمائل کے چھپے ہوئے عملیات کی اجازت لینے کے واسطے میرے پاس لوگوں کے خطوط آتے ہیں لوگوں نے قرآن سے آج کل یہ کام لیا ہے اس پر تعویذ گنڈوں کی بحث اس قدر طویل ہوگئی اب میں مقصود کی طرف پھر عود کرتا ہوں۔ بہرحال قرآن مبین کو قرآن کا لقب دے کر یہ بتلا دیا کہ یہ پڑھنے کے واسطے ہے اور کتاب کے لقب سے یہ معلوم ہوگیا کہ لکھ کر بھی رکھو مگر تعویذ گنڈوں کا کہیں ذکر نہیں۔

عطف تفسیری

یہ نکتہ ہے تِلْکَ آیَاتُ الْکِتٰبِ وَ قُرْآنٌ مُّبِیْنٌ (یہ آیتیں ہیں کامل کتاب اور قرآن واضح کی) میں کتاب وقرآن دو لفظ اختیار کرنے کا ورنہ مصداق دونوں کا ایک ہی ہے گو اصل عطف میں تغائر ہی ہے مگر وہ تغائر عام ہے خواہ ذات کا ذات سے تغائر ہو یا وصف کا وصف سے تغائر ہو۔ چنانچہ عطف تفسیری میں یہ اصل دوسرے تغائر کے ساتھ صادق آتی ہے کیونکہ جائز ہے کہ مفہوم معطوف علیہ کا اور ہو اور معطوف کا اور ہو مگر مصداق دونوں کا ایک ہی ہو۔ چنانچہ "وَاَنْزَلَ اللّٰہُ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَعَلَّمَکَ مَالَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ" (اور اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ باتیں سکھلائیں جس کا پہلے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم نہ تھا) بھی ایسا ہی عطف تفسیری ہے کہ معطوف علیہ ومعطوف کا مصداق ایک ہے۔

تنزیل اور تعلیم

اور عنوان دو ہیں اسی طرح انزل وعلم میں بھی باوجود معنوں کے اتحاد کے ایک خاص نکتہ کے لیے دو جداگانہ عنوان ہیں وہ نکتہ اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ ہم نے محض تنزیل ہی پر بس نہیں کی بلکہ تعلیم بھی فرمادی۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی کو خط بھیجے اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ خط بھیج دیا اور مخاطب کو سمجھایا نہیں جیسے میرے چھوٹے بھائی نے طالب علمی کے زمانہ میں مجھے میرٹھ سے انگریزی میں خط لکھا جس سے مجھ کو انگریزی خوان کی تلاش میں پریشانی ہوئی۔ میں نے جواب عربی میں لکھا اس وقت ابتدائی زمانہ تھا تو نوعمری کا جوانی کا جوش تھا تو میں نے اس میں تمام لغات مقامات حریری کے بھر دیئے۔ اب خط پہنچا تو انہیں ضرورت ہوئی کہ کوئی عربی خوان ملیں تو ان سے پڑھوائیں چنانچہ ایک تارک التدریس مولوی صاحب ملے مگر ان سے الفاظ بھی نہیں پڑھے گئے' بہت سوچتے رہے' بھائی نے ان سے کہیں یہ کہہ دیا کہ میں نے انگریزی میں ایک خط لکھا تھا یہ اس کا جواب ہے بس پھر کیا تھا اب تو مولوی صاحب کو بات بنانے کا بہانہ مل گیا' کہنے

لگے اچھا تو ضد اضدی میں لکھا ہے اس کے معنی کیا ہوتے حالانکہ وہ بامعنی تھا یہ نہیں کہ خط مہمل ہوتا مگر مولوی صاحب کو چونکہ معنی معلوم نہیں تھے تو انہیں یہ کہتے ہوئے عار آئی کہ مجھے معنی معلوم نہیں اور یہ کہنا سہل معلوم ہوا کہ ان الفاظ کے معنی ہی نہیں جیسے کسی مولوی صاحب سے پوچھا گیا تھا کہ عربی میں سرین کو کیا کہتے ہیں؟ مولوی صاحب بے چارے کو عربی معلوم نہ تھی' کہنے لگے کہ عرب میں سرین نہیں ہوتے پھر اس کی عربی کیسے ہوتی تو ایسے ہی ان مولوی صاحب نے بات بنادی کہ ضد اضدی کے معنی ہی کیا ہوتے۔ چنانچہ جب میں میرٹھ گیا تو پھر میں نے سمجھایا۔ غرض بعضے خطوط ایسے بھی لکھے جاتے ہیں کہ مخاطب بھی نہ سمجھے تو حق تعالیٰ نے جو کتاب نازل فرمائی اس سے مقصود محض تنزیل ہی نہ تھی بلکہ تنزیل سے مقصود تعلیم تھی' یہ نکتہ ہے عنوان کے جدا جدا ہونے میں۔ آگے فرماتے ہیں **الکتاب والحکمتہ** ایک عنوان یہ ہے اس کے بعد اسی کو **مالم تکن تعلم** سے تعبیر فرمایا' ایک عنوان یہ ہے اول عنوان میں ذات کا بیان ہے کہ وہ ایک کتاب حکمت کی اور دوسرے میں اس کے ایک وصف کا اول عنوان سے معطی کی وقعت وعظمت بتلانا ہے اس لیے اس کو کتاب وحکمت فرمایا اور دوسرے عنوان سے اس کے ایک خاص وصف یعنی **مالم تکن تعلم** سے ایک خاص امتنان پر دلالت کرنا ہے کہ ہم نے آپ کو ایسی چیز دی ہے کہ اس کے قبل آپ کو اس کی خبر بھی نہ تھی ہمارے خبر کرنے سے خبر ہوئی پھر ذات میں بھی دو عنوان ہیں۔

کتاب وحکمت

کتاب اور حکمت بعض نے اس کا فرق یہ بیان کیا ہے کہ کتاب سے مراد قرآن ہے اور حکمت سے مراد سنت (حدیث) پھر اس پر ایک سوال پیدا ہوا ہے کہ اس پر انزل کا حکم فرمایا گیا ہے اور حکمت کو اگر سنت کہا جاوے تو یہ نازل نہیں ہوئی پھر اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ تنزل عام ہے نزول ظاہری ونزول باطنی کو میں کہتا ہوں کہ ایک توجیہ یہ بھی لطیف ہے کہ خود کتاب ہی کو عام کہا جاوے قرآن وحدیث دونوں کے لیے چنانچہ حدیث میں ہے کہ **اقض بیننا بکتاب اللہ** یعنی ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک مقدمہ میں عرض کیا تھا کہ ہمارے درمیان کتاب اللہ کے موافق فیصلہ فرمادیجئے پھر آپ نے جو فیصلہ فرمایا قرآن میں اس کا کہیں ذکر نہیں مگر اس پر بھی آپ نے یہ کیوں نہیں فرمایا کہ بھائی یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر چیز قرآن میں ہو سو آپ نے یہ نہیں فرمایا بلکہ خود ہی فیصلہ فرمادیا اور پھر فیصلہ کرانے والے نے بھی کوئی شبہ نہیں کیا کہ یہ فیصلہ تو قرآن میں نہیں اس سے معلوم ہوا کہ کتاب اللہ دونوں کو عام ہے قرآن کو بھی حدیث کو بھی' اسی طرح

حکمت کو بھی، سنت کے ساتھ خاص کرنے کی ضرورت نہیں یہ بھی دونوں کو عام ہے اور یہ عطف تفسیری ہے کتاب کا کہ ایسے علوم دیئے جو کتاب و حکمت دونوں کے ساتھ متصف ہیں، رہا یہ کہ جب کتاب و حکمت دونوں کو عام ہے تو سنت پر انزلنا کیسے صادق آوے گا سو اس کا جواب یہ ہے کہ انزال کو بھی عام کہا جاوے گا کہ انزال دو قسم کا ہے حسی اور معنوی۔ چنانچہ اس بناء پر وحی کی بھی دو قسمیں ہیں ایک جلی جو بواسطہ جبرئیل کے آتی ہے اور ایک معنوی کہ براہ راست قلب پر القاء ہوتا تھا۔ بس اسی طرح تنزیل کی بھی دو قسمیں کہیں گے اور جس طرح قرآن و حدیث کو اس میں اشتراک ہے کہ دونوں پر تنزیل کا حکم صحیح ہے جیسا ابھی مذکور ہوا۔ اسی طرح ان دونوں کو ایک اور وصف میں بھی اشتراک ہے وہ یہ کہ حدیث کا محل ورود تو سب کے نزدیک قلب ہی ہے مگر ایک آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا محل ورود بھی قلب ہی ہے وہ آیت یہ ہے کہ "فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ" (اسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر نازل کیا گیا) پس حکم تنزیل اور محل تنزیل یعنی قلب قرآن و حدیث دونوں کو شامل ہو گیا اور "نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ" پر ایک شبہ کیا ہے ملحدین نے جو کہتے ہیں کہ الفاظ قرآن کی منزل نہیں کیونکہ الفاظ کا محل ورود تو مسامع ہیں نہ کہ قلب قلب پر صرف معنی کا ورود ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کے معانی تو منزل من اللہ ہیں الفاظ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں سو اس کا جواب یہ ہے کہ تنزیل علی القلب کے حکم سے نفی لازم نہیں آتی، تنزیل علی المسامع کی دونوں جمع ہو سکتے ہیں باقی تنزیل علی القلب کا عنوان کیوں اختیار کیا گیا۔

زبانوں کی دو قسمیں

سو اس میں نکتہ یہ ہے کہ زبانیں دو قسم کی ہوتی ہیں ایک مادری اور ایک مکتسب، ان دونوں کے احکام میں ایک فرق یہ بھی ہوتا ہے کہ جو زبان کہ مکتسب ہوتی ہے اس کی خاصیت تو یہ ہے کہ جب اس زبان میں آپ سے کوئی گفتگو کرتا ہے تو اول التفات اس میں الفاظ کی طرف ہوتا ہے جس کا مدرک سمع ہے اور اس کے بعد معانی کی طرف اور مادری زبان میں اس کے برعکس ہوتا ہے کہ اول ہی سے التفات معانی کی طرف ہوتا ہے۔ پھر بعض اوقات الفاظ کی طرف چنانچہ میں جو مضمون اس وقت آپ کے سامنے عرض کر رہا ہوں یہ آپ کی مادری زبان میں ہے اس لیے اول التفات آپ کو معانی کی طرف ہو رہا ہے اور پھر الفاظ کی طرف قصد کرنے سے ہوتا ہے تو نکتہ علی قلبک میں اس پر دلالت ہے کہ قرآن آپ کی مادری زبان یعنی عربی میں ہے تاکہ آپ کے فہم میں کوئی کمی نہ رہے اور گو عربیاً بھی اس معنی کو مفید ہو سکتا تھا مگر یہ خاص بات نہ پیدا ہوتی جو علی قلبک میں پیدا ہوئی کہ تصریح ہو گئی کہ اول

التفات آپ کے قلب کو ہوتا ہے اس لیے فہم میں کوئی کمی نہیں رہ سکتی۔ غرض کتاب وحکمت دونوں میں تعمیم ہوگئی قرآن وحدیث دونوں کے لیے چنانچہ قرآن کو ایک جگہ کتاب حکیم بھی فرمایا ہے اور یہاں زید عدل کے قاعدہ سے الحکمۃ کہہ دیا اب یہ بات رہ گئی ہے کہ حکمت کیا چیز ہے سو حکمت کا مفہوم تو وہی چیز ہے جو حکماء نے بیان کیا ہے یعنی **العلم بحقائق الاشياء على ماهي عليه بقدر الطاقة البشرية** البتہ اس حکمت اور اس حکمت کے مصداق میں ضرور فرق ہے وہ فرق یہ ہے کہ قرآن میں تو اصالتاً ان اشیاء کی حقیقت سے بحث کی گئی ہے جن کو نجات وقرب میں دخل ہے اور اس حکمت میں مطلق اعیان خارجیہ سے بدون قید مذکور بحث کی گئی ہے تو اب حکمتیں دو ہوگئیں ایک وہ جس میں امور تشریعیہ سے بحث کی جاوے گی اور ایک وہ جس میں امور تکوینیہ سے بحث کی جاوے۔ مثلاً فلسفہ ریاضی منطق اقلیدس وغیرہ کہ سب حکمت تکوینیہ ہیں اور گو فلاسفہ بھی اپنی حکمت میں الٰہیات سے بحث کرتے ہیں اور اس کو علم اعلیٰ کہتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ عقول وواجب کے ساتھ جس حکمت کا تعلق ہے وہ سب سے افضل ہے مگر ان کی بحث کی حیثیت وہ نہیں جو شریعت کی بحث کی ہے بلکہ دلائل صحیحہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ ان کے بعض مباحث خلاف حق بھی ہیں مثلاً عقول کا قابل ہونا گو بعض نادانوں نے ان کی حمایت کی ہے کہ عقول کی تفسیر ملائکہ سے کر کے ان مباحث کو شریعت پر منطبق کیا ہے مگر واقع میں عقول کا ترجمہ ملائکہ سے خود کرنا خود بھی صحیح نہیں کیونکہ شریعت کے نزدیک ملائکہ اجسام ہیں ان میں حرکت بھی ہے اور حکماء عقول کو مجرد اور منزہ عن الحرکۃ مانتے ہیں تو دونوں کی حقیقت متحد کیسے ہوتی البتہ عقول کی نفی سے مطلق مجردات کے استحالہ کا حکم صحیح نہیں جیسا بعض نے کہا ہے کیونکہ بکثرت صوفیاء نے بھی روح اور قلب اور لطائف کو مانا ہے اور ان کے نزدیک عالم امر عالم مجرد کو کہتے ہیں گو بعض متکلمین نے اس شخص کی تکفیر کی ہے جو ان کے تجرد کا قائل ہے کیونکہ ان کے نزدیک یہ مقدمہ مسلمہ ہے کہ تجرد اخص صفات باری تعالیٰ میں سے ہے اور ظاہر ہے کہ اخص صفات باری تعالیٰ میں کسی کو شریک ماننا محض کفر ہے مگر صوفیاء نے اس کے جواب میں کہا ہے کہ اس کی کوئی دلیل نہیں کہ تجرد اخص صفات باری تعالیٰ سے ہے بلکہ اخص صفات حکماء کے نزدیک تو صرف وجوب بالذات ہے اور اہل حق کے نزدیک وجوب بالذات کی طرف قدم بھی اخص صفات میں سے ہے بلکہ وجوب بالذات اور قدم دونوں متلازم ہیں اور یہ جو فلاسفہ کہتے ہیں کہ قدم کی دو قسمیں ہیں قدم بالذات اور قدم بالزمان اور قدم بالزمان کو واجب کے ساتھ خاص نہیں کہتے تو کہتا ہوں کہ دلائل سے ثابت ہو چکا ہے کہ قدم بالزمان ممکن کے لیے کوئی چیز نہیں اسی لیے تو کہتا ہوں ممکن چیز قدیم بالزمان بھی نہیں۔ بہر حال حکماء بھی اس کے قائل ہیں کہ جس حکمت کا تعلق واجب کی ذات وصفات واحکام سے ہے وہ سب سے افضل ہے مگر واقع میں وہ حقائق صحیحہ تک نہیں پہنچے اس لیے ان کی حکمت کو حکمت الٰہیہ کہنا

بھی صحیح نہیں اسی طرح گو انہوں نے اپنے یہاں اخلاق سے بھی بحث کی ہے مگر شریعت کے مقابلہ میں بالکل ہیچ ہے چنانچہ وہ خود کہتے ہیں کہ شریعت مصطفویہ نے علم اخلاق کی حاجت کو پورا کر دیا اور اس کی بحث سے ہم کو مستغنی کر دیا۔ بہر حال انہوں نے تکوین کے احکام و آثار بیان کیے ہیں اور ان میں بھی زیادہ تر مادیات کے متعلق اور اس میں بھی بہت غلطیاں کی ہیں اور تشریعیات میں تو حکماء بالکل چل ہی نہیں سکے کیونکہ اس کا تعلق وحی سے ہے اور وہ اس کے اتباع سے محروم ہیں۔ غرض یہ حاصل تھا حکمت کا جو بقدر ضرورت بیان کیا گیا۔

حاصل آیت

اب حاصل آیت کا یہی ہوا کہ ایسے علوم عطا فرمائے جنہیں نجات و قرب میں دخل ہے پھر اس کے بعد فرماتے ہیں "وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا" یعنی آپ پر خدا تعالیٰ کا بڑا فضل ہے یوں تمام نعماء فضل ہی ہیں۔ چنانچہ "وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ" (اور اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرو) میں رزق کو فضل فرمایا ہے کیونکہ اسی آیت میں فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ بھی ہے اور انتشار فی الارض پر جس فضل کی طلب مرتب ہوتی ہے ظاہر ہے کہ وہ طلب رزق ہی ہے لیکن سب افراد فضل کے برابر نہیں اسی لیے اس امر کو یعنی "وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ" کو مفسرین نے اباحت پر محمول کیا ہے کیونکہ اس کے اوپر ہے وَذَرُوا الْبَيْعَ اس سے یہ شبہ ہوتا تھا کہ شاید ترک بیع کا امر مستمر ہو۔ پس "فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ" (زمین پر پھیل جاؤ اور اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرو) سے بتلا دیا گیا کہ بعد فراغ صلوٰۃ کے وہ اب جائز ہو گیا ہے کیونکہ امر بعد الحظر اباحت کے لیے ہوتا ہے۔ غرض یہاں سب کے نزدیک تفسیر فضل کی رزق ہی ہے اسی لیے اس کے بعد یوں بھی فرما دیا کہ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ کہ خدا کی بھی یاد رکھو یہ نہ ہو کہ رزق کو فضل مقصود بالذات سمجھ کر اس کی تلاش میں خدا کو بھول جاؤ نہیں بلکہ دنیا غالب نہ ہو اور یہاں سے ایک مسئلہ تمدن کا بھی نکلتا ہے جس کو استطراداً ذکر کرتا ہوں۔

اجتماع صالحین کی دو صورتیں

وہ یہ کہ مجمع کی دو قسمیں ہیں ایک اجتماع مفسدین کا اور یہ اکثر تو بیشک موجب خطر ہے دوسرا اجتماع صالحین کا اس کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ کسی ضرورت سے ہو دوسرے یہ کہ کام کچھ نہیں ویسے ہی اجتماع ہو گیا تو اس صورت میں تجربہ ہے کہ نفس خود کوئی کام اپنے لیے تجویز کرلے گا اور ظاہر ہے کہ نفس کا میلان الی الشر زیادہ ہے اس لیے غالباً وہ شر ہی کو تجویز کرے گا اور جس شر کو مجمع

تجویز کرے گا اس کا اثر بھی بہت شدید ہوگا۔ اگرچہ تنہائی میں بھی نفس اپنے لیے شر تجویز کرے گا مگر وہ بہت کم متعدی ہوگا مثلاً تنہائی میں تو یہ سوچتا رہے گا کہ کسی کی ٹمٹم لے لو کسی کا لڑکا اچھا ہے اسے گھور لو کوئی عورت اچھی ہے اسے تاکو اور مجلس میں جو شر تجویز ہوگا وہ آج کل کی اصطلاح کے موافق تبادلہ خیالات سے تجویز ہوگا۔ خدا جانے یہ تبادلہ کون سا صیغہ ہے' خیر میں بھی انہیں کے الفاظ میں کہتا ہوں جس میں سمجھنے میں آسانی ہو تو تبادلہ خیالات سے ایک جوش اور ہیجان پیدا ہوگا کوئی کچھ کہے گا کوئی کچھ دوسرا سوچے گا کہ اس کی تجویز میں ہمارے خلاف جو اجزاء ہیں انہیں رد کرنا چاہیے ورنہ سکوت وخاموشی سے تسلیم ورضا لازم آئے گا۔ پس اول تو دونوں راد بنے کہ ایک نے دوسرے کے قول کو رد کیا پھر دونوں مردود ہوگئے کہ کچھ انہوں نے انکار کر دیا اور کچھ انہوں نے اور یہی فساد ہے اس لیے اس صورت میں عقل یہ حکم کرتی ہے کہ جب مجمع ناجائز ہو تو منتشر کردو۔ چنانچہ اسی حکم عقلی کے موافق تمام حکومتوں نے قانون بنایا ہے لیکن اس میں ایک کسر تھی کہ اسی حالت میں منتشر کرنے کا حکم دیا جب غرض ناجائز کے لیے اجتماع ہوا ہو اور شریعت نے اس کسر کو اپنے یہاں نہیں رکھا بلکہ مجمع ناجائز اسے بھی قرار دیا جو طاعت میں مشغول نہ ہو اگرچہ وہ ناجائز غرض سے جمع نہ ہوا ہو جب یہ مقدمہ سمجھ میں آ گیا تو اب جب نماز ختم ہوگئی تو مسجد میں خالی بیٹھ کر کیا ہوگا' ایک ایک کی غیبت ہوگی اور پھر رد وقدح ہوگا اور اس سے فساد برپا ہوگا اس لیے حکم ہوا کہ ذکر وطاعت میں مشغول ہو تو مسجد میں ٹھہرو ورنہ چلے جاؤ اور چونکہ وعظ بھی ذکر ہے اس لیے بعد نماز جمعہ اگر وعظ کے لیے اجتماع باقی رہے تو جائز ہے۔

اردو میں خطبہ پڑھنا جائز نہیں

اور اس مقام پر ایک مسئلہ "فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰهِ" (ذکر اللہ (یعنی نماز وخطبہ) کی طرف فوراً چل پڑا کرو) سے مستنبط ہوا اس کو بھی استطراداً ذکر کرتا ہوں وہ یہ کہ خطبہ اردو میں پڑھنا جائز ہے یا نہیں وہ استنباط یہ ہے کہ قرآن نے خطبہ کا نام ذکر اللہ رکھا ہے چنانچہ "فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰهِ" فرمایا ہے جب خطبہ ذکر ہے تذکیر نہیں تو خطبہ کو اردو میں نہ پڑھیں گے جیسے بعض لوگوں نے استدلال کیا ہے کہ خطبہ سے مقصود تذکیر ہے اور تذکیر موقوف ہے فہم پر اس لیے مادری زبان میں پڑھنا چاہیے تو اس سے اس کا جواب ہوگا کہ قرآن نے خطبہ کو ذکر فرمایا ہے جس کی غرض فہم پر موقوف نہیں تذکیر نہیں بلکہ قرآن مجید کو جابجا ذکری بمعنی تذکیر فرمایا گیا ہے مگر پھر بھی کسی کے نزدیک نماز میں وہ مادری زبان نہیں پڑھا جاتا تو خطبہ کے لیے تو بدرجہ اولیٰ یہ حکم ثابت ہوگا تو

"فَاسۡعَوۡا اِلٰی ذِکۡرِ اللّٰہِ" سے یہ مسئلہ مستنبط ہوا اور یہ تبرع ہے ورنہ اگر اس سے یہ نہ بھی مستنبط ہو تب بھی فتویٰ اس پر موقوف نہیں، فتویٰ تو فقہاء کے قول پر ہے کہ انہوں نے اس پر نہایت قوی استدلال کیا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کبھی غیر عربی زبان میں خطبہ نہیں پڑھا حالانکہ وہ فارس میں روم میں برابر رہے اور صحابہ وہاں کے فارسی اور ترکی زبان کے ماہر بھی تھے مگر خطبہ کبھی ترکی یا فارسی زبان میں نہیں پڑھا۔ بس ہمارے لیے فقہاء کا یہ کہہ دینا کافی ہے خیر میں نے نکتہ اور لطیفہ کے طور پر آیت سے بھی اس کو مستنبط کر دیا جیسے فَانۡتَشِرُوۡا سے وہ تمدن کا مسئلہ ذکر کر دیا تھا جس کا حاصل یہ ہے کہ نماز کے بعد اگر وعظ میں مشغول ہو گئے یا کسی اور طاعت میں لگ گئے تو اس کے لیے اجتماع جائز ہے کیونکہ اس کے لیے بھی تو جمع ہی کیے گئے ہیں لیکن اگر کوئی کام نہیں ہے تو اپنے اپنے کام کو جاؤ، خالی مت بیٹھو کہ فساد کا اندیشہ ہے۔ فَانۡتَشِرُوۡا کا بھی حاصل ہے اب اگر اس تقریر پر فانتشروا کو بجائے اباحت کے استحباب کے لیے کہہ دیا جاوے تو کوئی حرج نہیں ہے اگرچہ کوئی جزئی اس علت کے سبب امر کو وجوب کے لیے بھی کہہ سکتا ہے مگر یہ وجوب لغیرہ ہوگا بعینہ نہ ہوگا اس کے بعد ارشاد ہے: "وَابۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِ اللّٰہِ" یعنی منتشر ہونے کے بعد رزق تلاش کرو یہ نہیں کہ لہو ولعب میں مشغول ہو جاؤ۔ بعضے اہل ہوی صرف اسی آخر کے ٹکڑے کو لے لیتے ہیں کہ قرآن میں تلاش رزق کا حکم ہے۔ بس رات دن اسی میں مشغول رہنا چاہیے گویا تمام قرآن میں ان کو بھی حکم پسند آیا جیسا جیسے کوئی شخص روزہ تو رکھتا نہ تھا مگر افطاری و سحری میں شریک ہو جاتا تھا کسی نے کہا کہ روزہ تو رکھتا نہیں سحری و افطاری کیوں کھاتا ہے کہنے لگا کیا تمہارا یہ مطلب ہے کہ بالکل ہی کافر ہو جاؤں چونکہ روزہ میں مشقت تھی اس لیے اس نے روزہ چھوڑ دیا اور افطاری سحری میں چکوتھیاں ملتی تھیں کہ مسجد میں دس گھر کی افطاری جمع ہوتی ہے اسے پسند کر لیا ایسے ہی انہیں بھی اوپر کی آیات کے احکام "ذَرُوا الۡبَیۡعَ (خرید و فروخت چھوڑ دیا کرو) اور فَاسۡعَوۡا اِلٰی ذِکۡرِ اللّٰہِ" (نماز و خطبہ کی طرف فوراً چل پڑا کرو) تو پسند نہیں آئے صرف آخر میں وَابۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِ اللّٰہِ (اور اللہ کا فضل تلاش کرو) پسند آیا یہ نفس بڑا اپنے مطلب کا ہے انتخاب اعمال میں اس نفس کا یہی خاصہ ہے ایسے ہی لوگوں کی باب میں شیخ نے کہا ہے:

نہ سنت نہ بینی در ایشان اثر مگر خواب پیشین و نان سحر

(یعنی سوائے قیلولہ اور سحری کی روٹیوں کے ان میں سنت کا کوئی اثر نہ پائے)

یعنی ان کو سنتوں میں صرف دو سنتیں پسند آئیں ایک قیلولہ اور ایک سحر کی روٹیاں ایسے ہی ایک شخص کی حکایت ہے کہ اس سے پوچھا گیا تم کو احکام میں سے کیا پسند ہے کہنے لگا کلوا واشربوا

کھاؤ پیو۔ پھر پوچھا گیا دعاؤں میں کون سی دعا پسند ہے' کہنے لگا" رَبَّنَا اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِّنَ السَّمَاءِ" اے اللہ ہمارے لیے آسمان پر سے دسترخوان نازل فرما دیجئے' بہر حال حق تعالیٰ نے محض فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ پر تو اکتفا نہیں فرمایا کیونکہ محض مسجد سے نکل جانا ہی مقصود نہیں کیونکہ وہاں تو نمازی تھے اور یہاں بازار میں اہل بازی ہیں اور نہ محض ابتغاء رزق پر اکتفا فرمایا بلکہ اسی کے ساتھ واذکروا اللہ کثیرا بھی فرمایا' پھر اس وابتغوا میں بھی ایک قید لگائی یعنی رزق کو جو فضل سے تعبیر فرمایا تو اس کو اللہ کی طرف مضاف فرمایا یعنی اس طرح فرمایا:

عجیب بلاغت

"وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ" (اور اللہ کا فضل تلاش کرو) جس میں عجیب بلاغت ہے کہ خالی فضل نہیں فرمایا بلکہ فضل اللہ فرمایا یعنی رزق کو رزق سمجھ کر حاصل نہ کرو بلکہ خدا کا فضل سمجھ کر حاصل کرو کہ اس میں بھی خدا سے تعلق رکھو۔ سبحان اللہ کیا تعلیم ہے کہ دنیا طلبی میں بھی خدا سے تعلق رکھو۔ محض دنیا کا قصد نہ رکھو بلکہ اس کے ساتھ خدا کے تعلق کو بھی ملالو یہی عارفین کی تعلیم کا بھی خلاصہ ہے۔ وہ یہی چاہتے ہیں کہ ہر امر میں خدا سے تعلق صحیح باقی رہے اور اسی تعلق کے سبب عارف کو نعمت سے جتنی محبت ہوتی ہے اتنی غیر عارف کو نہیں ہوتی کہ عارف یہ سمجھتا ہے کہ اسے محبوب سے تعلق ہے اور اسی اصل پر طالب کو شیخ سے اتنی محبت ہوتی ہے کہ ماں باپ سے بھی نہیں ہوتی کیونکہ وہ موصل الی اللہ ہے اور اسی حیثیت سے عارف کو اپنے ہاتھ پاؤں سے بھی محبت ہوتی ہے اور وہ ان کی بہت حفاظت کرتا ہے کہ حلوے کھا رہا ہے گھی کھا رہا ہے کیونکہ یہ سب سرکاری چیزیں ہیں اس حیثیت سے ان کی حفاظت ضروری ہے جیسے سرکاری مشین کا نوکر مشین کو اس حیثیت سے تیل دیا کرتا ہے اس پر شاید کوئی نفس پرست کہے کہ اچھا اب سے ہم بھی یہی سمجھ کر خوب حلوے اور مٹھائیاں کھایا کریں گے۔ صاحب خوب سمجھ لو یہ بات کہیں محض سمجھنے سے تھوڑا ہی ہوتی ہے بلکہ وہ تو ایک حال ہے کہ یہ سرکاری چیزیں ہیں اور اس کا معیار یہ ہے کہ جوارح نافرمانی میں مشغول نہ ہوں کیونکہ سرکاری چیزیں خلاف قانون استعمال نہیں کی جاتیں تو جب یہ حال ہو جائے تو ایسا شخص جو کچھ کھائے گا وہ عبادت ہے' دودھ کھائے تو وہ بھی عبادت ہے حلوہ کھائے تو وہ بھی عبادت ہے اسی کو کہتے ہیں:

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است　　افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

(مجھ کو اپنی آنکھوں پر ناز ہے کہ انہوں نے تیرے جمال کو دیکھا اور اپنے پیروں پر رشک کرتا ہوں کہ وہ تیرے کوچہ میں پہنچتے ہیں)

ہردم ہزار بوسہ زنم دست خویش را   کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

(ہر گھڑی اپنے پیروں کو ہزار بوسہ دیتا ہوں کہ انہوں نے تیرا دامن پکڑ کر میری طرف کھینچا ہے)

غرض اس شخص کو اس حیثیت سے اپنی حالت پر بھی ناز ہے پاؤں ہاتھ پر بھی ناز ہے اور اپنی آنکھ پر بھی ناز ہے اس میں ایک دو دفعہ سرمہ بھی لگاتا ہے اور بعض اوقات ایک دوسری حالت بھی پیش آتی ہے کہ آنکھ پھوٹنے کی بھی پرواہ نہیں کرتا اس میں تفصیل یہ ہے کہ جس کی معرفت عشق پر غالب ہوتی ہے وہ تو سب چیزوں کی حفاظت کرتا ہے اور جس کا عشق معرفت پر غالب ہوتا ہے وہ کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتا۔ اسی حالت کو مولانا بیان فرماتے ہیں:

زاہدے راگفت یارے درعمل   کم گری تا چشم را نا ید خلل

(ایک زاہد سے اک دوست نے کہا کہ عمل میں اتنا نہ رویا کرو ورنہ آنکھیں جاتی رہیں گی، یعنی زیادہ مت رو کہ آنکھیں نہ جاتی رہیں)

گفت زاہد از دو بیروں نیست حال   چشم بیندیا نہ بیند آں جمال

(اس نے جواب دیا کہ دو حال سے خالی نہیں یا تو وہ آنکھ جمال دیکھے گی یا نہیں)

گر بہ بیند نور حق راچہ غم ست   درد صال حق دودیدہ کی کم ست

(اگر آنکھ وہ جمال دیکھے گی تو ہزاروں آنکھیں اس پر قربان ہوں)

ورنہ بیند نور حق راگو برو   ایں چنیں چشم شقی گو کور شو

(اور اگر نہ دیکھے گی تو ایسی منحوس آنکھ کا پھوٹ جانا ہی بہتر ہے)

یعنی اگر آنکھ وہ جمال نہ دیکھے گی تو ہزاروں آنکھیں اس پر قربان ہیں اور اگر نہ دیکھے گی تو ایسی منحوس آنکھ کا پھوٹ جانا ہی بہتر ہے اور جن کی معرفت غالب ہے ان کی حالت یہ حدیث ہے:

ان لنفسک علیک حقا و ان لعینک علیک حقا[1]

''بے شک تیری جان کا بھی تجھ پر حق ہے اور بلا شبہ تیری آنکھ کا بھی تجھ پر حق ہے۔''

حقوق نفس میں حکمت

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی سرمہ لگاتے تھے کیوں اس لیے کہ آنکھ سالم رہے تا کہ راستہ چل سکیں، مسجد میں جماعت کے لیے حاضر ہو سکیں، بیت اللہ کے حج کو جا سکیں، تو آنکھ کا بھی حق ہے اور اس مرتبہ والا یہ کہتا ہے:

---

[1] (مسند احمد ۲:۲۶۸، مستدرک حاکم ۴:۶۰)

نازم بچشم خود کہ جمال دیدہ است   افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

(مجھ کو اپنی آنکھ پر ناز ہے کہ انہوں نے تیرے جمال کو دیکھا ہے اور اپنے پیروں پر رشک کرتا ہوں کہ وہ تیرے کوچے میں پہنچے)

اس پر اگر کوئی شبہ کرے کہ جمال کہاں دیکھا ہے یہ حکم کیسے صحیح ہے اگر دیکھے گا بھی تو وہاں دیکھے گا کیونکہ یہاں تو دلائل شرعیہ سے ناممکن ہے اور جس جمال کو یہاں دیکھ سکتا ہے وہ آنکھ بند کر کے بھی جب چاہے دیکھ سکتا ہے وہ تو ایک قسم کا تصور ہے اس میں آنکھ کا کیا دخل جواب یہ ہے کہ مراد اس سے یہ ہے کہ مظاہر جمال دیکھے ہیں یعنی قرآن کو دیکھا ہے' بیت اللہ و بیت الرسول کو دیکھا ہے' آیات اور مناظر قدرت اسی نظر سے دیکھے ہیں کہ یہ سب ان کے بنائے ہوئے ہیں اس حیثیت سے مصنوعات کو دیکھنا ایک معنی کو مانع کو دیکھنا ہے اسی کو کسی نے کہا ہے:

ہرچہ بینم درجہاں غیر تو نیست   یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

(تمام عالم آپ کے صفات کا مظہر ہے ہر چیز کو آپ سے تعلق ہے غیر وجود ہی نہیں بلکہ ہر جگہ آپ کا ظہور ہے)

اور اسی بناء پر ایک بزرگ عارف نے اس شعر میں اصلاح دی ہے کسی شاعر کا قول تھا:

گلستان میں جاکر ہر اک گل کو دیکھا   نہ تیری ہی سی رنگت نہ تیری ہی سی بو ہے

ان عارف نے یہ اصلاح کی ہے۔

گلستان میں جاکر ہر ایک گل کو دیکھا   تیری ہی سی رنگت تیری ہی سی بو ہے

یہی مطلب اس شعر کا بھی ہے کہ

ہرچہ بینم درجہاں غیر تو نیست   یا توئی توخوئے یا بوئے تو

(تمام عالم آپ کے صفات کا مظہر ہے ہر چیز کو آپ سے تعلق ہے غیر وجود ہی نہیں بلکہ ہر جگہ آپ کا ظہور ہے)

تو اس معنی کو جمال تو دیدہ است کہہ دیا کہ واقع میں سب میں انہیں کا جلوہ نظر آیا جس کو جمال تو دیدہ است کہہ دیا

نازم بچشم خود کہ جمال دیدہ است   افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

(مجھ کو اپنی آنکھوں پر ناز ہے کہ انہوں نے تیرے جمال کو دیکھا ہے اور اپنے پیروں پر ناز کرتا ہوں کہ وہ تیرے کوچے میں پہنچے ہیں)

ہر دم ہزار بوسہ زنم دست خویش را   کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

(ہر گھڑی اپنے پیروں کو ہزار بوسہ دیتا ہوں کہ انہوں نے تیرا دامن پکڑا میری طرف کھینچا ہے)

تو ہر چیز سے ان کو اس حیثیت سے محبت ہو جاتی ہے کہ ان میں جلوہ ہے محبوب کا اور تعلق ہے محبوب سے چنانچہ رزق سے بھی اسی لئے محبت ہوتی ہے وہ فضل اللہ ہے۔

حکایت حضرت غوث اعظمؒ

حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ بڑے خوش وضع اور خوش خوراک مشہور ہیں، امام مستغفری نے آپ کی ایک حکایت لکھی ہے کہ حضرت غوث اعظم کے پاس ایک بڑھیا اپنے لڑکے کو سپرد کرنے لائی جیسا کہ آج کل بھی لوگ اپنے لڑکوں کو مدرسوں میں مدرسوں یا بزرگوں کے سپرد کر دیتے ہیں اور منشاء یہ ہوتا ہے کہ بلا سے پڑھے یا نہ پڑھے روٹی تو مفت کھانے کو ملے گی اور یہ حضرت ہیں کہ نور الانوار سے آگے بڑھتے ہی نہیں تاکہ روٹی ملتی رہے ایک طالب علم نے خود مجھ سے آگے نہ پڑھنے کی یہی مصلحت بیان کی تھی چنانچہ اس بڑھیا کا لڑکا ضعیف نحیف تھا اس نے بھی یہی خیال کیا کہ حضرت عمدہ عمدہ کھانے نوش فرمایا کرتے ہیں اگر بچا کچا بھی دے دیں گے تو میرے لڑکے کا کام بن جاوے گا۔ چنانچہ جب تھوڑے دنوں کے بعد وہ آئی تو اس نے لڑکے کو پہلے سے بھی زائد دبلا پایا اور حضرت کو دیکھا کہ مرغ نوش فرما رہے ہیں اور لڑکا الگ بیٹھا سوکھی روٹی کھا رہا ہے۔ بس یہ دیکھ کر جل ہی گئی، کہنے لگی کہ کیا یہی مروت ہے کہ آپ تو کھائیں مرغ اور میرے بیٹے کو کھلائیں سوکھی روٹیاں، آپ نے فرمایا کہ جب تمہارا لڑکا مرغ کھانے کے قابل ہوگا اسے بھی مرغ دیں گے، اس کے بعد آپ نے سب ہڈیاں جمع کر کے فرمایا قم باذن اللہ کہ اے مرغ اللہ کے حکم سے اٹھ کھڑا ہو۔ چنانچہ وہ مرغ زندہ ہو کر کھڑا ہو۔ آپ نے فرمایا کہ بی ہمیں تو ایک مرغ زندگی بھر کو کافی ہے تمہارے لڑکے کو تو ہزاروں مرغ ہوں جب وہ روز کھا سکے تو پھر کہاں سے لائیں یہ جواب احیاء مرغ سے تو اس کے مذاق کے موافق دیا ورنہ اصل تو قلب کا زندہ کرنا ہے اور احیاء قلب کے لیے مجاہدہ کرنا پڑتا ہے اس لیے اس لڑکے کو ہنوز مجاہدہ کی ضرورت تھی اور کرامت میں مجاہدہ نہیں اس لیے صاحب کرامت وہی ہوسکتا ہے جو مجاہدہ سے فارغ ہو چکا ہو۔ ایک اور حکایت ہے کہ ایک تاجر بغداد میں کپڑا اتنا قیمتی لایا کہ خلیفہ بھی نہیں خرید سکتا تھا وہاں کوئی بزرگ بھی تھے غالباً یہ بھی حضرت غوث اعظم ہی ہیں انہوں نے اس سے وہ کپڑا خرید لیا، بادشاہ کو خبر پہنچی تو نہایت ناگوار ہوا، وزیر کو حکم دیا کہ شاہ صاحب کو پکڑ لاؤ انہوں نے ہماری اہانت کی۔ جب وزیر شاہ

صاحب کے یہاں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس کپڑے کو عبا بیونتی جا رہی ہے اور اس میں ایک کلی کم ہے تو شاہ صاحب نے حکم دیا کہ اچھا ایک کلی ٹاٹ کی لگا دو' یہ حال دیکھ کر وزیر واپس گیا اور خلیفہ سے سب حال کہا اور کہا جس کی نظر میں ٹاٹ اور قیمتی کپڑا برابر ہو اس کو آپ نہیں پکڑ سکتے۔

نعمائے آخرت کی رغبت

ہمارے حضرت حاجی صاحب نے اس حقیقت کے متعلق ایک آسان سی بات فرمائی کہ عارف ان نعمتوں میں آخرت کی نعمتوں کا مشاہدہ کرتا ہے اس لیے ان کی طرف توجہ کرتا ہے۔ فقہاء نے بھی اسی کے قریب قریب اسے خوب سمجھا ہے۔ چنانچہ چار انگل حریر کے جواز کی دلیل ہدایہ یہی بیان فرماتی ہے "لیکون انموذ جالحریر الجنة" تاکہ حریر جنت کا نمونہ ہو جائے اور باری تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی اسی بناء پر ہے: "وَفِی ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ" کہ ان نعمتوں کے بارے میں رغبت کرنے والوں کو رغبت کرنا چاہیے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نعمائے آخرت کی رغبت واجب ہے تو جو معین ہوگا اس رغبت کا وہ بھی مرغوب ہوگا تو جسے جنت کے لباس کی رغبت ہو اس کے واسطے چار انگل حریر کا استعمال مستحسن ہوگا مگر اس کے لیے محض الفاظ کافی نہیں کہ ہمیں بھی لباس آخرت کی رغبت ہے اس سے کیا ہوتا ہے بلکہ حال ہو جانا چاہیے ورنہ زبان سے کہہ دینے سے کیا ہوتا ہے دل میں بھی تو اس کا اثر ہو۔ یہاں مجھے مدرسہ جامع العلوم کا ایک قصہ یاد آیا کہ ایک طالب علم نے مولوی اسحاق صاحب سے کچھ گستاخانہ سوال و جواب کئے تھے۔ جب مجھے معلوم ہوا میں نے ان سے کہا کہ مولوی صاحب سے معافی مانگو تو دل میں تو ان کے معافی کا خیال تھا نہیں محض میرے کہنے سے معافی مانگنے کو تیار ہوئے بس تن کر کھڑے ہوئے اور دونوں ہاتھ کر کے پیچھے باندھ لیے اور زبان سے اتنا کہہ دیا کہ میں معافی مانگتا ہوں' لہجہ میں ذرا بھی خضوع نہیں تھا جس سے اپنے کردار پر شرمندگی ظاہر ہوتی جیسے آج کل نو تعلیم یافتہ معافی مانگتے ہیں بلکہ آج کل تو یہ بھی لطف ہے کہ گستاخی سے پہلے معافی مانگ لیتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں گستاخی معاف ہو یہ بات یوں ہے ارے بھائی جب اسے گستاخی سمجھتے ہو تو پھر کہتے ہی کیوں ہو۔ اسی طرح زبان سے یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ ہمیں بھی لباس آخرت کی رغبت ہے بلکہ یہ حال ہو جانا چاہیے' غرض جس چیز کا خدا سے تعلق ہو اس کو خدا کا فضل سمجھ کر حاصل کرو' مقصود بالذات سمجھ کر حاصل مت کرو' آگے فرماتے ہیں:

وَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا خدا کا ذکر زیادہ کیا کرو اس میں یہ تعلیم ہے کہ اگرچہ تلاش رزق فضل اللہ سمجھ کر کرو مگر اس میں بھی غلو زیادہ نہ ہونا چاہیے بلکہ ذکر کی حیثیت غالب رہنی چاہیے۔ اسی لیے ابتغاء رزق میں انہماک نہ ہونا چاہیے۔ بہرحال رزق کو اس آیت میں بھی فضل کہا ہے اور دوسری جگہ بھی فضل کہا ہے مگر اسے ساتھ ہی ذکر اللہ سے غافل ہونے کو منع کیا ہے۔ اسی کو سعدی فرماتے ہیں:

خوردن برائے زیستن وذکر کردن ست　　تو معتقد کہ زیستن از بہر خوردن ست
(کھانا زندہ رہنے اور ذکر کرنے کے لیے ہے اور تو اس کا مقصد ہے کہ زندگی کھانے کے لیے ہے)
تو اس طرح ذکر اللہ کے ساتھ ابتغاء فضل میں کچھ مضائقہ نہیں۔

دوران حج تجارت کی نیت

چنانچہ حج میں اکثر لوگ عطر وغیرہ بھی لے جاتے ہیں تاکہ بکری ہو اور اس سے حج کے اخراجات میں آسانی ہو اور اس کو مقصود سمجھ کر نہیں لے جاتے کہ مال بیچیں گے اور نفع اٹھائیں گے اور مفت میں حج بھی کر لیں گے سو حج کی اعانت کے لیے ایسا کرنا مضائقہ نہیں اور اس صورت میں حج کا ثواب بھی پورا ملے گا ہاں اگر بکری ہی مقصود ہو جیسے بعض لوگ اس غرض سے جاتے ہیں اور وہ حج کو ایسا سمجھتے ہیں جیسے پیران کلیر اور اجمیر کا عرس جس کی شان ایک میلہ سے زیادہ نہیں تو اگر حج اس واسطے کیا بکری ہوگی تو حج خراب گیا اور اس کا سارا سفر بکری ہی بکری ہو گیا اور اگر نیت حج کی ہے ضمناً بکری بھی کر لی تو بھی حج میں داخل ہو گئی۔ اسی طرح رزق کا بھی یہی حکم ہے کہ اسے فضل اللہ سمجھ کر حاصل کرو اور ساتھ ہی ذکر اللہ بھی کرتے رہو تو ساری تجارت ذکر ہی میں شمار ہوں۔ اسی درجہ کے ظاہر کرنے کے لیے حق تعالیٰ نے رزق کو محض فضل اللہ فرمایا ہے فضل عظیم نہیں فرمایا جس طرح کتاب وحکمت کے متعلق ارشاد فرمایا: "وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا" (اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کا فضل عظیم ہے) اور نکتہ اس میں یہ ہے کہ رزق دین محض نہیں ہے بلکہ اس کا ذریعہ ہے اور جو علوم واعمال دین محض میں اس لیے وہ فضل عظیم ہیں۔ رزق اس کے مقابلہ میں زیادہ عظمت نہیں رکھتا یہاں سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہو گئی جو ترقی معاش کے ذرائع کو علوم دینیہ پر ترجیح دیتے ہیں اور اس ترجیح کے ثابت کرنے کے لیے ان کے فضائل قرآن وحدیث سے ثابت کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص تلاش رزق کے لیے کوئی زبان انگریزی وغیرہ حاصل کر لے تو فی نفسہ جائز ہے مگر خواہ مخواہ اس کے فضائل ایسے شد ومد سے قرآن سے ثابت کرنا یہ تو قرآن کی تحریف ہے جیسے بعض لوگوں نے انگریزی زبان کو خوبی قرآن سے ثابت کیا ہے۔

فی الدنیا حسنہ کا مفہوم

اس طرح کہ قرآن میں ہے: "رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ" "اے اللہ ہماری دنیا میں بھی حسنہ دیجئے اور آخرت میں بھی حسنہ دیجئے اور ہمیں عذاب دوزخ سے بچائیے۔" اب یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ حسنہ میں انگریزی زبان بھی داخل

ہے کیونکہ آدمی بدون اس کے دنیا میں اچھی طرح زندگی بسر نہیں کر سکتا اس دلیل کا مدار اس پر ہے کہ حسنہ سے مراد کثرت مال واسباب و وسعت عیش ہو تو اس کے مقدمہ کو بھی اس کے ساتھ ملحق کر سکتے ہیں سو خود یہ دعویٰ ہی قرآن کی محض تحریف ہے۔ دیکھئے میں قرآن کی تفسیر قرآن سے کرتا ہوں۔ میں دعویٰ کرتا ہوں کہ اس سے مراد کثرت مال نہیں بلکہ حسنہ سے مراد حالت حسنہ ہے جس کا اول مصداق تو حسنات و طاعات ہیں کہ اس میں ان کی توفیق کی دعا مانگی ہے اور اگر دنیا ہی کی حالت حسنہ مراد لے لی جاوے تب بھی مراد دنیوی راحت واطمینان ہے اور وہ کثرت مال سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اعمال صالحہ سے حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً

''یعنی جو شخص عمل نیک کرے اور وہ مومن بھی ہو ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اسے لذیذ اور پاکیز زندگی دیں گے۔''

اور ظاہر ہے کہ اعمال صالحہ سے کثرت مال کا وقوع ضروری نہیں پس حیات طیبہ سے کثرت مال ہرگز مراد نہیں ہو سکتی بلکہ وہی راحت واطمینان کی حالت مراد ہے اس کا حق تعالیٰ نے اعمال صالح پر وعدہ فرمایا ہے اور اسی کے لیے وہ دعا سکھلائی گئی ہے اب آیت کے معنی یہ ہوئے کہ اے اللہ ہمیں اعمال حسنہ کی توفیق دے دنیا میں اور اے اللہ ہمیں جزائے حسنہ دے آخرت میں اور جس کے اعمال حسنہ ہوں گے اس کے لیے اس آیت میں پاکیزہ زندگی عطا فرمانے کا وعدہ فرمایا گیا ہے اور میں دعویٰ کرتا ہوں کہ پاکیزہ زندگی یعنی اطمینان وراحت قلب کثرت مال سے نصیب نہیں ہوتی وہ صرف طاعت سے ہوتی ہے جس کا دل چاہے اندرونی حالت مالدار عاصی اور نادار مطیع کی مشاہدہ کر لے۔ مشاہدہ خود بتلا دے گا کہ انگریزی پڑھنے سے گو مال کی کثرت ہو جاوے اگرچہ آج کل اس میں بھی کلام ہے مگر اعمال صالحہ کی توفیق بہت کم ہوتی ہے معاصی پر دلیری زیادہ ہوتی ہے اور دعویٰ سے کہا جاتا ہے کہ خدا کے نافرمان کو راحت قلب حاصل نہیں ہو سکتی۔ بالخصوص اگر وہ مسلمان بھی ہے بلکہ یہ راحت قلب اور حیات طیبہ انہیں مطیع لوگوں کو حاصل ہے جن کو آپ مفلس قلاش اور مسجد کا مینڈھا سمجھتے ہیں مگر ان کی یہ حالت ہے:

مبیں حقیر گدایاں عشق راکیں قوم　　شہاں بے کمر و خسروان بے کلہ اند

(گدڑی پوش گدریان عشق کو حقیر نہ سمجھو یہ لوگ شاہان بے تاج وتخت ہیں)

ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ بدون تاج وغیرہ کے بادشاہ ہوتے ہیں بادشاہوں کو بھی وہ چین نصیب نہیں جو ان کو حاصل ہے انہیں فقیر مت سمجھو اسی کو عارف شیرازی کہتے ہیں

درسفالیں کاسۂ رنداں بخواری منگرید کین حریفاں خدمت جام جہاں میں کردہ اند

یعنی ان فقیروں کو ذلت کی نظر سے مت دیکھو ان کا قلب استاغنی ہوتا ہے کہ انہیں کسی کی پرواہ نہیں ہوتی۔ راز اس میں کیا ہے بات یہ ہے کہ یہ حضرات اپنی رائے کو رضائے حق میں فنا کردیتے ہیں اور یہ ایسی ترکیب ہے کہ اس سے جب چاہے فقیر بھی غنی ہوجائے۔ وہ یہ کہ تم خود اپنی رائے سے کوئی تجویز نہ کرو کہ نوکر وفادار ہونا چاہیے بیوی مطیع ہونی چاہیے ان مواقع میں کوشش تو اصلاح کی کرو مگر رائے اور تجویز مت کرو پھر جو کچھ پیش آوے گا ناگوار نہ ہوگا اور اس پر غم نہ ہوگا کیونکہ غم کی حقیقت ہے خلاف توقع جب توقع نہ رہی پھر غم کیسا پھر ایسے شخص پر ہر حالت میں فلنحیینہ حیاۃ طیبہ صادق رہے گا کہ پاکیزہ اور بے غم زندگی نصیب ہوگئی اور یہی حسنہ کا حاصل بھی ہے۔ تو اب آپ کی انگریزی سے پاکیزہ زندگی حاصل ہوتی ہے یا ہماری عربی سے ہماری عربی میں تو یہ ہے کہ اعمال صالحہ کرو بس پھر چین ہی چین ہے اور یہ جو لوگ حریت حریت پکارتے پھرتے ہیں وہ حریت بھی دراصل اسی میں ہے کہ ہم کامل طور پر خدا کی بندگی کریں۔

گر تو خواہی حری و دل زندگی بندگی کن بندگی کن بندگی

(اگر تم آزادی اور دل کی حیات چاہتے ہو تو بندگی کرو بندگی کرو بندگی کرو)

فضل عظیم صرف علوم دینیہ ہیں

صاحبو! واللہ اگر تم آزادی چاہتے ہو تو خدا کی غلامی کرو کہ اس غلامی میں تمہیں دوسرے ہم جنسوں کی غلامی سے آزادی ہوجائے گی اور فطری طور پر تم غلامی سے تو کسی حال میں بچ نہیں سکتے اور جب نہیں بچ سکتے تو انہیں کی غلامی کیوں نہ قبول کرو جن کی غلامی سے بادشاہوں کو بھی فخر ہے ان کی غلامی کے یہ معنی ہیں کہ شریعت سے آزاد نہ ہو۔ اب میں اس مضمون کی طرف عود کرتا ہوں کہ خداوند تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت خوش عیشی وغیرہ ہے تو سب فضل۔ مگر فضل عظیم نہیں ہے فضل عظیم صرف علوم دینیہ ہی ہیں۔ البتہ جب کمائی مطلق فضل ہے تو اس کے حاصل کرنے کے لیے اسی کے مناسب علوم کی بھی ضرورت ہوگی۔ بشرطیکہ وہ شریعت کے اندر ہوں تو ایسے علوم کا حاصل کرنا بھی جائز بلکہ لغیرہ مستحسن ہوگا مگر ان علوم شریعت سے اعظم واہم نہ سمجھو کیونکہ رزق کو مطلق فضل فرمانے اور علوم شرعیہ کو فضل عظیم فرمانے میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ علوم شریعت افضل ہیں ان علوم سے اور راز اس میں یہ ہے کہ وہاں بھی علوم سے خاص اعمال پیدا ہوتے ہیں اور یہاں بھی تو علوم و اعمال تو دونوں جگہ ایک دوسرے سے وابستہ ہیں مگر اب دیکھ لو کہ علوم شریعت سے کون سے اعمال

پیدا ہوتے ہیں اور علوم معاش سے کون سے اعمال ظاہر ہے کہ علوم شرعیہ سے اعمال آخرت پیدا ہوتے ہیں اور علوم معاش سے اعمال دنیا اور اعمال آخرت یقیناً مقدم ہیں اعمال دنیا سے کیونکہ مسلمان کے نزدیک دین یقیناً دنیا سے مقدم ہے نیز اعمال آخرت کا ثمرہ دائم اور عظیم ہے اور اعمال دنیا کا ثمرہ فانی اور حقیر ہے اور اسباب کی فضیلت مسببات کے اعتبار سے بھی ہوتی ہے جب علوم شرعیہ کا مسبب علوم دنیا کے مسبب سے افضل ہے تو یقیناً علوم شرعیہ علوم دنیا سے افضل ہیں۔ نیز دنیا واسطہ ہے آخرت کے لیے خود مقصود نہیں ہے اور مقصود واسطہ سے افضل ہوتا ہے تو مقصود کا علم بھی واسطہ کے علم سے افضل ہوگا اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دنیا کے علوم وہی جائز ہوں گے جو مقصود کے لیے مزاحم نہ ہوں اور اسی سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ جب یہ علوم افضل ہیں تو اس علم کے علماء بھی افضل ہوں گے اب جو لوگ علماء کو نظر حقارت سے دیکھتے ہیں وہ ذرا بتلائیں تو کیا ان بے چاروں نے ان کا کیا قصور کیا ہے کچھ نہیں بلکہ وہی بات ہے جس کو حق تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ شَهِيْدٌ.

''یعنی کافروں نے مسلمانوں میں کوئی عیب نہیں پایا' بجز اس کے کہ وہ خدا پر ایمان لے آئے تھے جو غالب اور سزاوار حمد ہے ایسا کہ اسی کی سلطنت ہے آسمانوں اور زمین کی اور اللہ ہر چیز سے خوب واقف ہے اور یہ کوئی عیب بات نہ تھی۔'' تو مطلب یہ ہوا کہ وہ بلاوجہ محض عناد کی بناء پر ان پر طعن کرتے ہیں اسی مضمون کو کسی شاعر نے خوب کہا ہے:

ولا عيب فيهم غيران سيوفهم   بهن فلول من قراع الكتائب

(ان میں سوائے اس کے کوئی عیب نہیں کہ ان کو تلواروں کی دھار شمشیر زنی سے گر گئی)

فضل العلوم اور اشرف العلوم

صاحبو! اسی طرح علماء کا بس یہی جرم ہے کہ انہوں نے علم دین حاصل کر لیا ہے اور آج کل لوگوں نے علم دین کو حقیر سمجھ رکھا ہے۔ افسوس اسی تحقیر کی وجہ سے لوگوں کی مشغولی علم دین سے چھوٹ گئی ہے اور جو بے چارے اللہ کے نیک بندے مشغول بھی ہوتے ہیں تو ان پر طرح طرح کے اعتراض کئے جاتے ہیں کہ مولوی تنگ خیال ہیں علماء کو وسیع الخیال ہونا چاہیے۔ میں ان معترضین سے کہتا ہوں کہ تم اپنی اولاد کو وسیع الخیال کیوں نہیں بناتے' یہ بے چارے اگر کچھ کر رہے ہیں تو کیا سب کام یہی کریں' صاحب جو شخص دو من اٹھا سکتا ہے وہ خواہ مخواہ چار من کیوں اٹھائے۔ اگر تم کو ان

پر اعتراض ہے تو براہ مہربانی چار من کا بوجھ آپ ہی اٹھائیں' جتنا ان غرباء سے ہوسکا انہوں نے کیا اور جو ان سے رہ گیا اسے چاہیے کہ امراء پورا کریں۔ آخر ان پر بھی تو دین کا کچھ حق ہے یا یہ محض اعتراض ہی کرنے کے لیے بنے ہیں۔ بہر حال جو لوگ علوم دینیہ اور اس کے حاملین یعنی علماء کو نظر حقیر سے دیکھتے ہیں وہ ذرا اس آیت کو تو دیکھیں جس کو میں نے تلاوت کیا ہے' دیکھو اس میں حق تعالیٰ نے علم کتاب وحکمت کو فضل عظیم فرمایا ہے جس سے مراد یقیناً علوم دینیہ ہیں جو تمام علوم دنیا سے افضل ہیں اور افضل العلوم اور اشرف العلوم ان ہی کو کہہ سکتے ہیں اور جس اتفاق سے اس مدرسہ کا نام بھی جہان میں بیان ہو رہا ہے اشرف العلوم ہے اور اس پر ظاہراً یہ اشکال ہوتا ہے کہ مدرسہ کیسے اشرف العلوم ہوسکتا ہے کیونکہ مفضل کو مفضل علیہ کی جنس سے ہونا چاہیے اور مدرسہ ظاہر ہے کہ علم نہیں ہے جو علم کا مفضل بن سکے سو اس میں ہم یہ تاویل کریں گے کہ یہاں ایک مضاف محذوف ہے اور پورا نام یوں ہے مدرستہ اشرف العلوم یعنی بزرگ ترین علوم کے درس کی جگہ یعنی علوم شرعیہ کی درسگاہ۔ گو اس صورت میں لفظی تطویل تو ہو مگر اس تاویل کو غنیمت سمجھو کہ میں نے بگڑی ہوئی ہانڈی کو بنا دیا' گو نام رکھنے والوں نے تو بے سوچے سمجھے ہی نام رکھ دیا تھا مگر خیر یہ تاویل اس کی صحت کے لیے کافی ہے گو بعض وجوہ سے یہ مولوی سالار بخش صاحب جیسی تاویل ہوگئی ہمارے اطراف میں ایک مولوی سالار بخش صاحب تھے وہ فن تاویل خوب جانتے تھے اپنی بات کو بہت جلدی بنا دیا کرتے تھے اور ان لوگوں کی ذرا ذرا سی بات پر اعتراض کر دیا کرتے تھے کہ یہ نام مت رکھو کفر ہے اور اس میں شرک ہے کسی نے ان پر بھی اعتراض کر دیا کہ مولوی صاحب آپ کے نام میں بھی تو شرک ہے پوچھا وہ کیسے؟ کہا سالار بخش کے معنی سید سالار کے دیئے ہوئے ایسے شرک کے ناموں سے تو آپ لوگوں کو منع کرتے ہیں اور آپ کا نام خود اسی قسم کا ہے۔ افسوس آج کل ایسے ناموں کا بے حد رواج ہوگیا ہے جیسے نبی بخش' علی بخش' رسول بخش وغیرہ ایسے ناموں کو علماء نے منع کیا ہے اور ایک شخص نے غضب ہی کیا کہ اس نے قرآن سے اس قسم کا نام نکالا یعنی اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام جبرئیل بخش مستنبط کیا۔ اس طرح سے کہ قرآن میں ہے: ''لِاَهَبَ لَکِ غُلٰمًا زَکِیًّا'' کیا یہ حضرت جبرئیل کا قول ہے حضرت مریم علیہا السلام سے کہ میں اس لیے آیا ہوں تاکہ آپ کو ایک پاکیزہ لڑکا دوں۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام جبرئیل علیہ السلام کے دیئے ہوئے تو جبرئیل علیہ السلام بخش ہوئے مگر یہ بھی خبر ہے کہ وہاں حضرت مریم علیہا السلام اور حضرت جبرئیل علیہ السلام دونوں کا کیا عقیدہ تھا آگے حضرت جبرئیل علیہ السلام خود فرماتے ہیں: ''قَالَ کَذٰلِکِ قَالَ

رَبُّکِ هُوَ عَلَیَّ هَیِّنٌ وَلِنَجْعَلَهٗ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا وَکَانَ اَمْرًا مَّقْضِیًّا'' ترجمہ: ''فرشتہ نے کہا کہ یوں ہی (اولاد ہو جائیگی) تمہارے رب نے ارشاد فرمایا ہے کہ یہ (بات) مجھ کو بالکل آسان ہے اور (اس طور پر) اس لیے پیدا کریں گے تا کہ ہم اس (فرزند) کو لوگوں کے لیے ایک نشانی (قدرت) کی بنادیں اور (باعث) رحمت بنادیں اور یہ ایک طے شدہ بات ہے جو (ضرور) ہوگی۔'' جس سے صاف معلوم ہوگیا کہ وہ دونوں اس ولادت کو تصرف الٰہی سمجھتے تھے۔ خیر اس سے بھی قطع نظر کی جاوے تب بھی ایسے ناموں کا جواز نہیں نکلتا کیونکہ وہاں جبرئیل علیہ السلام نے ایک فعل تو کیا تھا یعنی نفخ فی الجیب تو اسناد الی السبب ہوگئی اور یہاں سالار، نبی، رسول وغیرہ کون سا فعل کیا ہے جس کی وجہ سے وہ نام رکھا گیا ہے اور فعل جبرئیل علیہ السلام کا یعنی نفخ اس آیت میں مذکور ہے۔ ''فَنَفَخْنَا فِیْهَا مِنْ رُّوْحِنَا'' یہاں استطر اداً ایک کام کی بات بھی یاد آ گئی اس کو سمجھ لینا چاہیے وہ یہ کہ قرآن میں اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا سے سوءِ تہذیب کا اشکال پیدا ہوتا ہے کہ خاص موقع کا صریح نام لے دیا گیا مگر تفسیر میرے ذہن میں نہایت سہل آئی ہے وہ یہ کہ فرج کے معنی یہاں پر چاک گریبان کے ہیں جو قمیص میں عموماً ہوتا ہے جس کو عربی میں جیب بھی کہتے ہیں اور فارسی میں گریبان کہتے ہیں تو اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا کے یہ معنی ہیں کہ حضرت مریم علیہا السلام نے اپنے چاک یا گریبان کو پاک و صاف اور باعفت رکھا تھا کہ کسی غیر کا اس میں ہاتھ بھی نہیں لگا تھا اور یہ کنایہ ہے ان کی پاک دامنی سے اور اب نفخ کا محل ''نفخنا فیها بھی یہی فرج بالمعنی الذکور'' ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ہم نے ان کے گریبان میں پھونک ماردی اور عموماً عادت بھی یہی ہے کیا کرتے تھے تو اب وہ بناء ہی نہ رہی جس سے شبہ پیدا ہوا تھا بہر حال یہاں پیدا کرنے والے گو واقع میں حق تعالیٰ ہیں مگر جبرئیل علیہ السلام درمیان میں سبب تو ہیں کیونکہ نفخ ظاہری فعل جبرئیلی تھا۔ گو سبب اس نفخ کا حکم الٰہی تھا اس لیے سبب کی طرف اسناد مجازی کردی گئی ہے اور یہاں سالار بخش وغیرہ میں تو سالار نے کوئی فعل ہی نہیں کیا جس کی وجہ سے اسناد کی گئی ہے اور اگر کوئی کہے کہ سالار صاحب نے بھی ایک فعل کیا تھا یعنی دعا کی تھی تو میں کہتا ہوں کہ اس کی کیا دلیل کہ دعا کی تھی آج کل تو نام ایسے لوگوں کے ہوتے ہیں جنہوں نے کبھی انہیں دور سے بھی نہیں دیکھا تھا پھر دعا کرنا کیسے معلوم ہوگیا' پھر اس زمانہ میں نبی بخش بھی تو نام رکھا جاتا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صاحبزادہ کے واسطے کس دن دعا کی تھی ذرا کوئی صاحب ثابت تو کریں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ بعض کا نام محمد نبی ہوتا ہے یہ تو اور بھی برا ہے۔ چنانچہ ایک صاحب کا یہی نام تھا میں نے اسے بدل کر محمد نبیہ کردیا کہ نبیہ کے معنی رفیع کے ہیں۔

سالار بخش نام کی تاویل

غرض جب مولوی سالار بخش صاحب سے پوچھا گیا کہ آپ کا نام سالار بخش بھی تو شرکا نام ہے تو وہ بگڑ گئے اور کہنے لگے جاہل ہو کر عالم پر اعتراض کرتا ہے یہ ان کا تکیہ کلام تھا' پھر فرمایا اس سے سالار مسعود غازی مراد نہیں ہیں بلکہ یہ لفظ ہے سال اور سال آر کے معنی ہیں سال کالانے والا اب دیکھ لو سال کو کون لاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا لاتا ہے تو سالار خدا تعالیٰ کا وصف ہوا تو پھر شرک کہاں ہوا' مولوی صاحب کی عادت تھی کہ توجیہ بہت کرتے تھے اور خاص کر جس سے ناراض ہو جاتے تھے اس کی تو وعظ میں بھی اسی قسم کی توجیہوں سے خوب خبر لیتے تھے۔ چنانچہ ایک شخص تھے قمر الدین مولوی صاحب کہیں ان سے ناراض ہو گئے تو کہنے لگے کہ دیکھو اس کو اکثر لوگ کہتے ہیں کمرو یعنی بھونڈا منہ اس کے چہرے پر رونق بہت کم ہے اور کوئی لکھا پڑھا خمرو کہتا ہے یعنی ٹیڑھا منہ اور جو بہت ہی پڑھا ہوا ہے وہ کہتا قمرو جس کی اصل میں قم رد یعنی اٹھ اور علم کی مجلس سے چلا جا۔ غرض مولوی سالار بخش صاحب کے طریقہ پر توجیہ کا باب بہت وسیع ہے مگر یہ توجیہ پھر لطیف ہے کہ اشرف العلوم سے مضاف حذف کر دیا یعنی اس کا پورا نام ہے مدرسہ اشرف العلوم کبھی محاورات میں مضاف حذف کر دیا جاتا ہے جیسے تفسیر جلالین سے مضاف کو حذف کر کے صرف جلالین مشہور ہو گیا' بہر حال اس بیان کو مدرسہ کے نام سے بھی مناسبت ہو گئی کہ اشرف العلوم یعنی علوم دینیہ میں ہوا اور مقصود اس بیان سے اس کی تعین ہے کہ کون سے علوم افضل ہیں چنانچہ بحمد اللہ اس کی تعیین ہو چکی ہے کہ وہ علوم کتاب وسنت ہیں مگر تعیین ہو جانے کے بعد محض اعتقاد ہی تک نہ رکھئے کہ ان علوم کو افضل سمجھ لیا بلکہ عمل سے بھی کام لیجئے۔ یعنی ان علوم کو حاصل بھی کیجئے جس میں اصل تو عربی میں حاصل کرنا ہے لیکن جو لوگ ان علوم کو عربی میں نہ پڑھ سکیں وہ اردو ہی میں پڑھ لیں اور اگر اردو میں نہ پڑھ سکیں تو علماء کی صحبت میں ہی بیٹھ کر پوچھ پاچھ کر لیا کریں اور اگر اس کا بھی وقت نہ ہو تو علماء سے بذریعہ خط وکتاب کے مسئلہ مسائل پوچھ لیا کریں' غرض اس سے غیر علماء کو تو یہ سبق لینا چاہیے۔

علماء اور طلباء کو نصیحت

اور ایک سبق علماء کو لینا چاہیے کہ علم کو فضل عظیم سمجھ کر حاصل کریں اور اس سے کوئی غرض دنیوی نہ رکھیں اور بعد تحصیل کے اس فضل عظیم کی پوری قدر کریں اس کی حفاظت کریں اس کو ضائع نہ کریں آج کل طلبہ کی یہ حالت ہے کہ علم کے حاصل کرنے تک تو نہ کچھ نیت ہوتی ہے نہ توجہ نہ شغل اور جب فارغ ہوئے تو بعض تو اسے دنیا کمانے کا ذریعہ بنا لیتے ہیں اور بعض اس سے تعلق ہی نہیں رکھتے کہ کوئی طبیب بن جاتا ہے کوئی تاجر بن گیا کوئی صناع ہو گیا میں کچھ بننے کو منع نہیں کرتا بنو' مگر علوم سے تعلق تو رکھو تا کہ

اس کا نفع متعدی رہے اور اس تعدیہ کی ایک خاص صورت ہے کہ پڑھاتا رہے اور ایک عام صورت ہے کہ وعظ کہتا رہے جس کو آج کل علماء نے بالکل چھوڑ دیا اور اسی لیے اسے جہلاء نے لے لیا اور اگر ان دونوں میں سے کچھ نہ ہو سکے تو کم از کم مطالعہ ہی کرتا رہے تاکہ ذہول نہ ہو جائے اور اگر اتفاق سے کسی کے لیے کسب کا ذریعہ بھی یہی علم ہو تو وعظ کو ذریعہ معاش نہ بناؤ بلکہ کوئی کتاب تصنیف کرو تدریس میں مشغول ہو اور اس سے معاش حاصل کرو شاید یہاں کسی کو یہ شبہ ہو کہ تدریس کی اس صورت میں بھی دین فروشی ہوگی تو خوب سمجھ لو کہ علم کا ذریعہ کسب بنانے کا دین فروشی ہونا یا نہ ہونا اس کا ایک معیار ہے وہ یہ کہ ایک تو وہ شخص ہے جس کا مقصود اصلی درس وغیرہ سے علم کا افادہ ہے مگر رفع حاجت کے لیے اس نے کچھ اجرت ٹھہرالی ہے تو اس میں کچھ حرج نہیں ہے اور یہ حقیقت میں اجرت نہیں بلکہ نفقہ ہے اور فقہاء نے ایک کلیہ لکھا ہے نفقہ جزائے احتباس ہے جزائے عمل نہیں ہے جو اس کو اجرت کہا جاوے۔ چنانچہ شہود کا نفقہ قاضی کا نفقہ یہ سب اجرت نہیں بلکہ نفقہ ہے۔ ایسا ہی بیوی کا نفقہ اور ایسا ہی یہ تنخواہ تدریس و افتاء کی علماء و فقہاء کا نفقہ ہے جو جزائے احتباس ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہوا "اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ" اور یہ نفقہ سب مسلمانوں پر واجب ہے اور اگر مقصود اکتساب ہے تو اجرت ہے جس کو بعض اقوام پر دین فروشی کہا جاسکتا ہے اب آگے اس کا ایک امتحان ہے جس سے مقصود کا اندازہ ہو سکتا ہے وہ یہ کہ اگر کسی عالم کو ایک جگہ تنخواہ اتنی ملتی ہے کہ گزر ہو جائے اور اتفاق سے کہیں دوسری جگہ سے اس سے بڑی تنخواہ پر بلایا گیا اب دیکھئے کہ یہ پہلی جگہ کو چھوڑ کر چلا گیا یا نہیں' اگر چلا گیا تو اجیر ہے ورنہ خادم دین ہے۔ اس صورت میں یہ مسئلہ پیش کرنے کی بھی ضرورت نہیں کہ شافعی کے نزدیک اجرت تعلیم کا جائز ہے کیونکہ اس تقریر پر حنفیہ کے نزدیک بھی یہ اجرت نہیں بلکہ نفقہ ہے جو حنفی کے نزدیک صرف جائز ہی نہیں بلکہ قوم پر واجب ہے بہر حال عالم کو چاہیے کہ وہ معاش کے لیے ایسا کام کرے جو مباح ہو' باقی ان کی بری حالت ہے جو وعظ کو ذریعہ کسب بنا رہے ہیں کیونکہ اس میں انہیں مداہنت کرنا پڑے گی کہ وعظ کسی کی مرضی کے خلاف نہ ہو ورنہ نذرانہ کم ہو جائے گا اگر کسی نے ایسا کیا تو معلوم ہوا اس نے علوم دینیہ کو فضل عظیم ہی نہیں سمجھا جیسے بچہ کہ ہزار روپے کا موتی ایک بسکٹ کے بدلے میں دے دیتا ہے۔ کم از کم اہل علم کو اتنا تو چاہیے کہ وہ اپنے علم کی قدر کریں اور یہ شان رکھیں:

اے دل آں بہ کہ خراب از مے گلگوں باشی بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی

(اے دل محبوب حقیقی کی شراب محبت سے خراب رہ اور مال و دولت قاروں کی سینکڑوں دونوں عزت پر بھاری رہ)

در رہ منزل لیلیٰ کہ خطر ہاست بجاں　　شرط اول قدم آنست کہ مجنون باشی

(محبوب کی منزل میں جان کو سینکڑوں خطرے ہیں)

ایک بزرگ کی حکایت

ایک بزرگ کی حکایت ہے جو رسالہ القاسم میں چھپی تھی کہ وہ بڑے علامہ تھے ان کے گھر جب فاقہ ہوتا تو وہ نان بائی کی دکان پر جا کے لوگوں کے جھوٹے ٹوٹے پھوٹے سوکھے ٹکڑے کھالیا کرتے تھے ایک مرتبہ گئے اتفاق سے کچھ نہیں ملا تو "تِلْکَ اِذًا کَرَّۃٌ خَاسِرَۃٌ" پڑھتے ہوئے ہنستے ہوئے چلے آئے' واللہ یہ بڑے عیش میں ہیں تم کو ان کی راحت کی کیا خبر۔ غرض اہل علم کا خاص حق ہے کہ اگر ان کو سختی پیش آئے تو وہ اس میں مگن رہیں۔

اے دل آں بہ کہ خراب از مے گلگوں باشی　　بے زرو گنج بصد حشمت قاروں باشی

در رہ منزل لیلیٰ کہ خطر ہاست بجاں　　شرط اول قدم آنست کہ مجنون باشی

(اے دل یہی بہتر ہے کہ محبوب حقیقی کی محبت وعشق میں مشغول رہ کر بے زرو مال وحشمت و دبدبہ میں قارون یعنی دنیاداروں میں بصد درجہ بڑھے رہو' لیلیٰ یعنی محبوب کی منزل میں جان کو سینکڑوں خطرے ہیں' پہلی شرط اس راہ کے لیے مجنوں بن جانا ہے)

پہلا شعر مال کے متعلق ہے کہ اس کی پرواہ مت کرو اور دوسرا جاہ کے متعلق ہے کہ محبوب کے راستہ میں اس کی بھی پرواہ نہ کرو کہ لوگ کیا کہیں گے اگر یہ حالت ہوگی تو اسے اہل علم خدا تمہیں اکثر تو اتنا مال و جاہ دے گا کہ تمہاری گمان سے بھی زیادہ ہوگا اور یہاں نہ بھی ملا تو یہاں راحت و طمانیت تو یقینی ہے بس ایک مسجد میں خدا پر بھروسہ کرکے بیٹھ جاؤ اگر اتنی بڑی دولت علم کی لے کر بھی تم امراء کے دروازے پر گئے تو تم نے فضل عظیم برباد کردیا بلکہ اس کا شکر کرو کہ اس نے تمہیں یہ دولت عطا کی ہے اس سے بڑی دولت کسی امیر کے پاس بھی نہیں' علماء کے لیے علم کا شکر یہی ہے کہ وہ اسے ضائع نہ کریں اور عوام کے لیے یہ ہے کہ وہ اسے حاصل کریں۔ بس اب میں ختم کرتا ہوں حق تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ فہم اور عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

وصلی اللہ علی خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین. واخر دعوانا ان الحمدللّٰہ رب العالمین.

سلسلہ التبلیغ کا چھبیسواں وعظ مسمی بہ

شکر المثنوی

بمقام مدرسہ امداد العلوم تھانہ بھون بتاریخ ۴ شعبان المعظم ۱۳۳۶ھ کو یہ وعظ ارشاد فرمایا۔

تقریر حضرت مجدد الملۃ والدین مولانا محمد اشرف علی صاحب جو کہ آپ نے اس جلسہ میں فرمائی جو کہ بتقریب اختتام کتاب شرح مثنوی مدرسہ امداد العلوم میں بتاریخ ۴ شعبان المعظم ۱۳۳۶ھ منعقد ہوا تھا اور جس کو احقر العباد حبیب احمد کیرانوی نے ضبط کیا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ نَحۡمَدُهٗ وَنَسۡتَعِيۡنُهٗ وَنَسۡتَغۡفِرُهٗ وَنُؤۡمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيۡهِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَيِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ يَّهۡدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنۡ يُّضۡلِلۡهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ وَنَشۡهَدُ اَنۡ لَّآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحۡدَهٗ لَاشَرِيۡكَ لَهٗ وَنَشۡهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدًا عَبۡدُهٗ وَرَسُوۡلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيۡهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصۡحَابِهٖ وَبَارِكۡ وَسَلِّمۡ. اَمَّابَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيۡطٰنِ الرَّجِيۡمِ. بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ.

مَايَفۡتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنۡ رَّحۡمَةٍ فَلَا مُمۡسِكَ لَهَا وَمَا يُمۡسِكۡ فَلَا مُرۡسِلَ لَهٗ مِنۡ بَعۡدِهٖ وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ○ (سورہ فاطر آیت نمبر۲)

ترجمہ: اللہ جو رحمت (بارش وغیرہ) لوگوں کے لیے کھول دے سو اس کا کوئی بند کرنے والا نہیں اور جس کو بند کر دے سو اس کے بند کرنے کے بعد کوئی جاری کرنے والا نہیں اور وہی غالب حکمت والا ہے۔''

سبب وعظ

ایک عرصہ سے احباب کا تقاضا تھا کہ مثنوی کی شرح کی ضرورت ہے اس لیے اس کے تمام دفتروں کی شرح ہونی چاہیے اس لیے میں نے اس کا کام شروع کیا اور جس طرح ہوسکا دفتر اول اور دفتر ششم کی شرح کی باقی دفتروں کی شرح کا سرانجام چونکہ بعض عوائق کی وجہ سے مجھ سے بلا استعانت نہ ہوسکتا تھا اس لیے میں نے اس کی تکمیل میں اپنے بعض احباب سے مدد لی اور بحمد اللہ اب مکمل ہوگئی چونکہ یہ انعام تھا حق سبحانہ کی طرف سے اور ہر نعمت شکر کو مقتضی ہوتی ہے اس لیے ضرورت تھی کہ حق سبحانہ کے اس انعام کا شکر یہ ادا کیا جاوے پس یہ جلسہ اس کے شکر کے لیے منعقد کیا گیا ہے (جس میں تداعی واہتمام وغیرہ کو دخل نہیں) لیکن جو آیت اس وقت اختیار کی گئی ہے اس پر بادی النظر میں عدم مناسبت مقصود جلسہ کا شبہ ہوسکتا ہے کیونکہ اس میں بیان ہے حق سبحانہ کے ''تفرد بالغلبة والقدرة والحكمة'' کا جس کو شکر سے بظاہر کچھ مناسبت نہیں معلوم ہوتی اس لیے قبل اس کے کہ نفس آیت کے متعلق کچھ بیان کیا جاوے یہ بتلا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آیت متلوہ مقصود جلسہ سے بے تعلق نہیں ہے بلکہ اس کو اس سے ایک غامض اور باریک تعلق ہے۔

شکر کا مفہوم

تفصیل اس کی یہ ہے کہ شکر کے معنی ہیں منعم کے۔ انعام کے جواب میں منعم کا دل سے یا زبان سے یا ہاتھ پاؤں سے کوئی ایسا فعل کرنا جس سے منعم کی عظمت ظاہر ہوتی ہو پس اس وقت ہمارا حق سبحانہ کے انعام کے جواب میں اس آیت کا تلاوت کرنا جو کہ اس کی توحید صفاتی پر دلالت ہے اور اس کی "تفرد بالقھر و الغلبة و القدرة و الحکمة" کا دل اور زبان سے اقرار کرنا اس کلمے کا ایک فرد اس مقسم کی ایک قسم ہوگا اس سے یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ صرف اسی آیت کا نہیں بلکہ ہر ایسی آیت جس سے حق سبحانہ کی توحید اور عظمت و جلالت شان ظاہر ہو اس کا تعلق شکر سے ہے اس سے نہایت واضح طور پر آیت متلوہ کا تعلق مقصد جلسہ سے ظاہر ہوگیا۔ اب نفس آیت کے متعلق کچھ بیان کیا جاتا ہے۔ اس آیت کا تعلق توحید سے ہے اپنی ذات سے بھی کیونکہ اس میں بیان ہے "تفرد بالقدرة و الغلبة و الحکمة" جو کہ توحید صفاتی کا فرد اور اپنے سیاق و سباق کے لحاظ سے بھی۔

توحید ذاتی، صفاتی اور افعالی

کیونکہ اس سے قبل حق سبحانہ نے فرمایا:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰئِكَةِ رُسُلًا اُولِیْ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ.

ترجمہ: "تمام تر حمد اسی اللہ کو لائق ہے جو آسمان اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے جو فرشتوں کو پیغام رساں بنانے والا ہے جن کے دو دو اور تین تین اور چار چار پردار بازو ہیں وہ پیدائش میں جو چاہے زیادہ کر دیتا ہے، بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہیں۔"

اس میں انہوں نے اپنی ان صفات و افعال کا بیان کیا ہے جو ان کی ذات کے ساتھ مخصوص ہیں پس اس کا تعلق توحید صفاتی و توحید افعالی دونوں سے ہوگا۔ اس کے بعد فرمایا:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَیْرُ اللّٰهِ یَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰی تُؤْفَكُوْنَ.

"اے لوگو! تم پر اللہ کے جو احسانات ہیں ان کو یاد کرو (شکر کرو اور غور کرو) کیا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی خالق ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے رزق پہنچاتا ہو سو تم (شرک کر کے) کہاں الٹے جا رہے ہو۔"

اس میں توحید ذاتی وتوحید صفاتی وتوحید افعالی تینوں کا بیان ہے پس ان تینوں کا تعلق توحید سے ہے یہاں توحید کے بعد حق سبحانہ نے مسئلہ رسالت کو بیان فرمایا ہے۔اور ارشاد فرمایا ہے:

"اِنْ یُّکَذِّبُوْکَ فَقَدْ کُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِکَ وَاِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ"

ترجمہ: (اے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپ کو جھٹلایا گیا ہے تو آپ سے پہلے رسولوں کو بھی جھٹلایا گیا ہے اور سب کا فر اللہ ہی کی طرف لوٹتے ہیں۔یعنی سب امور اللہ کے روبرو پیش کیے جائیں گے)۔اس کے بعد معاد کا بیان فرمایا ہے۔

تین امہات مسائل

اور ارشاد فرمایا ہے:

"یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّکُمُ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا وَلَا یَغُرَّنَّکُمْ بِاللّٰہِ الْغَرُوْرُ"

ترجمہ:"اے لوگو! اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ضرور سچا ہے سوایسا نہ ہو کہ یہ دنیوی زندگی تم کو دھوکہ میں ڈالے رکھے اور ایسا نہ ہو کہ تم کو دھوکہ باز شیطان دھوکہ میں ڈال دے۔"

یہ تینوں مسئلے امہات مسائل میں سے ہیں یہی وجہ ہے کہ حق سبحانہ نے قرآن پاک میں ان تینوں کو نہایت شرح وبسط کے ساتھ بیان فرمایا ہے اور ان پر زبردست براہین قائم کی ہیں امام رازی رحمہ اللہ نے اس پر جابجا تنبیہ کی ہے اور انہوں نے ثابت کیا ہے کہ تینوں مسئلے اصل ہیں اور باقی مسائل ان کی فروع اور یہ مضمون بالکل ٹھیک ہے جو شخص بامعان نظر قرآن کریم کا مطالعہ کرے گا اس کو اس کی قدر ہوگی اور وہ اس کی تصدیق کرے گا ان تینوں میں سب سے اہم مسئلہ توحید ہے اس کے بعد مسئلہ رسالت اس کے بعد مسئلہ معاد اس لیے حق سبحانہ نے اس مقام پر اول مسئلہ توحید کو بیان فرمایا اس کے بعد مسئلہ رسالت کو اس کے بعد مسئلہ معاد کو۔اس گفتگو کا تعلق تو نوعیت مضمون آیت سے تھا اب اس کا مضمون شخصی بیان کیا جاتا ہے اس آیت میں جو حق تعالیٰ شانہ نے "مَایَفْتَحِ اللّٰہُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَۃٍ" (اللہ جو رحمت بارش وغیرہ لوگوں کے لیے کھول دے) فرمایا ہے جس میں انہوں نے کلمہ ما استعمال فرمایا ہے جس ابہام کے ساتھ عموم کا فائدہ دیتا ہے پھر اس ابہام کی توضیح میں من رحمۃ فرمائی ہے۔

پس حاصل اس جملہ کا یہ ہوگا کہ حق سبحانہ جس رحمت کو بھی کھولدیں اس کا کوئی روکنے والا نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا کمال غلبہ وقدرت

اس سے حق تعالیٰ سبحانہ کا کمال قدرت وغلبہ ظاہر ہوا اور معلوم ہو گیا کہ اس سے بڑھ کر کوئی قوت اور قدرت والا نہیں جو اس کا مزاحم ہو سکے اور گو واقعی طور پر اس پر کوئی شبہ نہیں ہو سکتا مگر سطح نظر میں اور محض احتمال عقلی کے طور پر شبہ ہو سکتا تھا اس سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ فتح حق سبحانہ کے بعد کوئی روکنے والا نہیں لیکن اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس کے روکنے کے بعد کوئی کھول بھی نہیں سکتا اس لیے حق سبحانہ نے اس احتمال کو ہی دفع کر دیا اور فرمایا: ''وَمَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهُ'' یعنی جس کو وہ روک لیں اس کو کوئی چھوڑنے والا بھی نہیں۔ اب یہی ایک احتمال عقلی باقی تھا وہ یہ کہ اس سے تو معلوم ہوا کہ اس کے فتح اور امساک کے بعد اس کی کوئی مزاحمت نہیں کر سکتا لیکن یہ نہیں معلوم ہوتا کہ خود فتح وامساک کی حالت میں بھی اس کا کوئی مزاحم ہو سکتا ہے یا نہیں اس احتمال کے اٹھانے کے لیے فرمایا وهو العزيز یعنی عزت وغلبہ عین منحصر ہیں اس کی ذات میں اور وہی ہر حیثیت سے سب پر غالب ہے اس پر کسی طرح بھی کوئی غالب نہیں۔ اب تمام احتمالوں کا خاتمہ ہو گیا اور اس کا تفرد بالغلبۃ باکمال وجہ ظاہر ہو گیا یہ تو ہو گیا مگر اس پر ایک شبہ اور ہو سکتا تھا وہ یہ کہ جب اس کو ایسی قدرت اور قوت حاصل ہے اور اس کی کوئی مزاحمت نہیں کر سکتا تو شاید اس کی بھی وہی حالت ہو جو باقتدار انسانوں کی ہوتی ہے کہ بلا لحاظ مصلحت و منفعت جو جی میں آیا کر بیٹھے اس کے دفع کے لیے الحکیم بڑھا دیا اور ظاہر کر دیا کہ ہمارے افعال لاابالی حکام وسلاطین کے سے نہیں بلکہ ہم جو کچھ کرتے ہیں اس میں ہم کو مصلحت وحکمت ملحوظ ہوتی ہے۔ ''سبحان الذی تکلم بهذا الكلام البليغ الدقيق الاسرار''

آیت مبارکہ کے دقیق نکات

اس بیان سے معلوم ہو گیا کہ جملہ ''مَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهُ'' (اور جس کو بند کر دے سو اس کے (بند کرنے کے بعد) اس کا کوئی جاری کرنے والا نہیں) اور وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ'' (اور وہی غالب حکمت والا ہے) یہ دونوں جملہ تاکید میں مضمون ''مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا'' (اللہ جو رحمت لوگوں کے لیے کھول دے) کی کہ جن سے مقصود تمام اوہام وشکوک کو زائل کر کے اپنی کمال قدرت وحکمت کا ظاہر کرنا ہے جو اصل مقصود ہے اس آیت کا تو یہ بیان تھا حق سبحانہ کے عموم وکمال قدرت کا جو کہ اب آیت سے مقصود ہے اس سنئے کہ رحمت کے لغوی معنے

رقت قلب اور نرم دلی ہیں حق سبحانہ چونکہ دل اور نرمی سے جو کہ ایک خاص قسم کا تاثر اور انفعال ہے پاک اور منزہ ہیں اس لیے یہ لفظ اس مقام پر یا جہاں کہیں وہ حق سبحانہ کے لیے استعمال کیا جاوے جیسے رحمٰن رحیم وغیرہ اپنے معنی لغوی ہیں مستعمل نہیں ہوسکتا بلکہ مجازاً بعلاقہ سببیت اثر رقت قلب یعنی فضل و انعام احسان مراد ہوگا اس مقام پر یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حق سبحانہ نے "مَایَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ" (اللہ جو رحمت لوگوں کے لئے کھول) فرمایا اور من خیر نہیں فرمایا حالانکہ مطلب من خیر کا بھی وہی ہے جو من رحمۃ کا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ رحمت میں اشارہ ہے اس طرف کہ حق سبحانہ کے تمام انعامات بلا استحقاق منعم علیھم ہیں اور یہ اشارہ لفظ خیر میں نہ تھا اس لیے اس کے بجائے اس کو اختیار کیا چونکہ اس مضمون کو سن کر کہ حق سبحانہ کے تمام احسانات بلا استحقاق منعم علیھم ہیں کسی کو خلجان ہوتا اس لیے میں اس کو بھی زائل کئے دیتا ہوں یہ شبہ اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ حق سبحانہ کے انعامات کو بندوں کے انعامات کے مماثل سمجھا گیا ہے اور اپنی طاعت کو طاعت عباد کی مانند خیال کیا گیا لیکن خود یہ قیاس ہی غلط ہے کیونکہ آدمی جب بندہ کی خدمت کرتا ہے تو وہ اپنے قوی اور اعضاء وغیرہ کو ایک ایسے شخص کے کام میں لگاتا ہے جو اس کے مملوک و مصنوع ہیں اور اس لیے اس کو ان سے انتفاع کا کوئی حق بھی نہیں ہے اس بناء پر خادم مخدوم سے معاوضہ کا مستحق ہوتا ہے بخلاف اس کے کہ جب وہ سبحانہ کی خدمت اور اطاعت کرتا ہے تو وہ خود حق سبحانہ کی مملوک چیزوں کو اس کے کام میں لگاتا ہے اور وہ خود بھی حق سبحانہ کا مملوک ہے ایسی صورت میں وہ اپنی خدمت کے کسی معاوضہ کا مستحق نہیں ہوسکتا کیونکہ مملوک من حیث ہو مملوک کا مالک پر کوئی حق نہیں یہ مضمون آپ کی سمجھ میں یوں آسانی سے آجائے گا کہ جب کوئی شخص کسی کی ملازمت کر لیتا ہے تو اب وہ من حیث الخدمت اس کا مملوک ہوجاتا ہے خواہ عارضی ہی طور پر سہی پس جب وہ کوئی اپنا فرض منصبی انجام دیتا ہے تو اس کے معاوضہ میں وہ کسی معاوضہ کا مستحق نہیں سمجھا جاتا' ایسی حالت میں اگر آقا اس کی خدمت کا کوئی صلہ دے تو وہ اس کا انعام اور احسان سمجھا جاتا ہے اور اپنی خدمت کو اپنا فرض منصبی خیال کیا جاتا ہے پس جب کہ اس کمزور اور برائے نام ملک کا یہ اثر ہے تو آپ خیال کر سکتے ہیں کہ ملک حقیقی پر اپنی خدمت کے کسی معاوضہ کا کیا حق رکھ سکتا ہے اب ہم کو یہ ثابت کرنا رہ گیا کہ بندہ حق سبحانہ کا مملوک محض ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ یہ تو ظاہر ہے کہ کسی شخص کی کوئی چیز کسی کی ذاتی نہیں بلکہ عطائی ہے کیونکہ وہ ابتداء میں معدوم محض اور اپنے تمام کمالات حتیٰ کہ اپنی ہستی سے بھی عاری تھا ایسی حالت میں اس کی کوئی چیز خود اس کی ذاتی کیسے ہوسکتی ہے پس لامحالہ اس کی تمام چیزیں کسی

دوسرے کی مملوک ہیں اور خدا کے سوا اگر کوئی اس کے مالک ہونے کا مستحق ہوسکتا ہے تو اس کے ماں باپ ہوسکتے ہیں کیونکہ ان سے زیادہ اس کی ہستی میں کسی کو دخل نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اسی دخل کی بناء پر بعض لوگوں کو شبہ ہوگیا اور وہ اپنا خالق اپنے ماں باپ کو سمجھ بیٹھے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی ہستی کی دلیل

چنانچہ جس زمانہ میں میرے ماموں منشی شوکت علی صاحب مدرسہ سرکاری میں مدرس تھے اس زمانے میں ایک انسپکٹر مدارس مدرسہ میں امتحان کے لیے آئے' اثنائے امتحان میں انہوں نے لڑکوں سے اپنے منصب کے خلاف سوال کیا کہ بتلاؤ خدا کی ہستی کی کیا دلیل ہے' لڑکے بیچارے کیا جواب دیتے وہ تو خاموش رہے' ماموں صاحب نے فرمایا کہ جناب مجھ سے پوچھئے میں جواب دوں گا' انسپکٹر صاحب اپنی افسری کے گھمنڈ میں تھے' انہوں نے ناخوشی کے لہجہ میں فرمایا کہ اچھا آپ ہی جواب دیجئے' ماموں صاحب نے فرمایا کہ خدا کی ہستی کی دلیل یہ ہے کہ پہلے تو معدوم تھے اور اب موجود ہو اور ہر حادث کے لیے کوئی علت ہونی چاہیے وہ علت خدا ہے اس نے جواب دیا کہ ہم کو تو ہمارے ماں باپ نے پیدا کیا ہے نہ کہ خدا نے' ماموں صاحب نے فرمایا کہ آپ کے ماں باپ کو کس نے پیدا کیا' اس نے کہا کہ ان کے ماں باپ نے' ماموں صاحب نے فرمایا کہ دو حال سے خالی نہیں یا تو الی غیر النہایہ یوں ہی سلسلہ چلا جاوے گا یا جا کر ختم ہوگا۔ پہلی صورت میں تسلسل لازم آتا ہے جو کہ محال ہے۔ دوسری صورت میں خدا کا وجود ماننا پڑے گا اس کا اس سے کچھ جواب نہ آیا اور اس نے کہا کہ آپ تو منطق کی باتیں کرتے ہیں لوگوں کا مذاق بگڑ گیا ہے کہ دقیق اور گہرے مضامین کو ناقابل التفات سمجھتے ہیں اور سطحی اور پیش پا افتادہ باتوں کو دلائل خیال کرتے ہیں غرض کہنے لگا کہ ہم ان منطقی باتوں کو نہیں جانتے وہ یہ کہ اچھا اگر خدا ہے تو آپ اپنے خدا سے کہئے کہ ہماری آنکھ درست کر دے' یہ انسپکٹر کانا تھا' ماموں صاحب نہایت ظریف تھے' انہوں نے کہا بہت بہتر ہے ابھی کہتا ہوں یہ کہہ کر انہوں نے آنکھیں بند کر کے آسمان کی طرف منہ کیا اور تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے انسپکٹر صاحب سے کہا کہ میں نے عرض کیا تھا مگر وہاں سے یہ جواب ملا ہے کہ ہم نے اس کو دو آنکھیں عطا کی تھیں' اس نے ہماری نعمت کی ناشکری کی اور کہا کہ ہمارے ماں باپ نے ہمیں پیدا کیا ہے' ہمیں اس پر غصہ آیا ہم نے اسکی ایک آنکھ پھوڑ دی' اب اس سے کہو کہ اس آنکھ کو اپنے انہیں ماں باپ سے بنوا جنہوں نے تجھے پیدا کیا ہے' اس جواب پر اس کو بہت غصہ آیا اس کا اور تو کچھ بس نہ چلا مگر معائنہ خراب لکھ گیا' اس گستاخی کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصہ کے اندر درد اٹھا اور ہلاک ہوگیا۔

قہر کی دو قسمیں

یاد رکھو کہ حق سبحانہ کا قہر دو طرح کا ہوتا ہے کبھی تو صورتاً بھی قہر ہوتا ہے اور کبھی قہر بصورت لطف ہوتا ہے یہ قہر قہر اول سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے (اعاذنا اللہ منہ) کیونکہ اس میں توبہ اور انابت الی الحق کی طرف توجہ بہت کم ہوتی ہے اس لیے کہ انابت الی الحق اور توبہ تو اسوقت ہو جبکہ آدمی اس کو قہر سمجھے اور جبکہ لطف سمجھتا ہے تو وہ توبہ کیسے کرے گا اور حق سبحانہ کی طرف کیسے رجوع ہوگا' بعض مرتبہ بعض سالکین کو یہ واقعہ پیش آتا ہے کہ وہ معاصی کا ارتکاب کرتے ہیں اور ان کے ذوق و شوق و احوال و مواجید میں کچھ فرق نہیں آتا وہ سمجھتے ہیں کہ ہماری نسبت مع اللہ بہت قوی ہے کہ معصیت سے اس کو صدمہ نہیں پہنچتا اس سے وہ معاصی پر اور دلیر ہو جاتے ہیں۔ واضح ہو کہ یہ قہر بصورت لطف ہے اور قہر بصورت قہر سے زیادہ خطرناک ہے سالکین کو اس سے نہایت ہوشیار رہنا چاہیے اور یاد رکھنا چاہیے کہ نسبت احوال مواجید کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک خاص تعلق ہے جو کہ عبد طائع کو حق سبحانہ سے اور حق سبحانہ کو اپنے مطیع بندہ سے ہوتا ہے۔ احوال مواجید سو یہ غالب احوال میں اس تعلق کی امارات ہوتی ہیں نہ وہ عین تعلق خاص ہیں اور نہ اس تعلق کو مستلزم ہیں اور اگر بالفرض احوال واذواق ہی کو تعلق مع اللہ یا اس کو مستلزم کہا جاوے تو اس سے صرف یہ لازم آئے گا کہ اس کو خدا کے ساتھ تعلق ہے اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ خدا کو بھی اس سے تعلق ہو پس ایسے سالک کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے طالب علم سے کسی نے پوچھا کہ تمہاری شادی ہوگئی یا نہیں اس نے جواب دیا آدھی ہوگئی اور آدھی نہیں ہوئی' اس نے کہا کہ اس کا کیا مطلب ہے اس نے جواب دیا کہ میں فلاں شہزادی سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور اس کے لیے تراضی طرفین کی ضرورت ہے سو میں تو رضامند ہوں مگر وہ رضامند نہیں' پس جس طرح اس طالب علم کی رضامندی بغیر شہزادی کی رضامندی کے بے سود اور کالعدم تھی یونہی اس سالک کا تعلق بغیر حق سبحانہ کے تعلق کے بیکار ہے۔

مستی روحانی اور مستی شہوانی میں فرق

پس خوب سمجھ لینا چاہیے کہ اصرار بر معصیت کے ساتھ نسب مع اللہ ہرگز باقی نہیں رہ سکتی ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ میں ایک مقام پر مہمان گیا' میرے ساتھ ایک اور صاحب بھی تھے ہم نے ایک مسجد میں سونے کا ارادہ کیا' اتفاق سے اس روز محلّہ میں گانا بجانا بھی ہو رہا تھا مجھ کو آواز پہنچی میں نے سونے کے لیے دوسری جگہ تجویز کی مگر میرے ساتھی مسجد ہی میں رہے' صبح کو ان صاحب نے مجھ سے کہا کہ رات جس قدر میرا نوافل میں جی لگا ہے اور جس قدر مجھے مزہ آیا ہے اتنا کبھی نہیں آیا' محلّہ

سے گانے بجانے کی آوازیں آرہی تھیں جس سے ذوق وشوق کو حرکت ہورہی تھی اور میں اسی ذوق و شوق میں نماز پڑھ رہا تھا اور مجھ پر ذوق وشوق کا ایسا غلبہ تھا کہ خطرات بالکل دفع ہو گئے تھے' میں نے کہا کہ جناب یہ تو صحیح ہے کہ خطرات بالکل دفع ہو گئے تھے مگر یہ بھی تو دیکھئے کہ وہ کس چیز سے دفع ہوئے تھے اور مستی ذوق وشوق کس چیز کا تھی' یہ مستی روحانی نہ تھی بلکہ شہوانی تھی جو راگ باجے سے منبعث ہوئی تھی پس دافع خطرات خود خطرات سے زیادہ خطرناک تھا۔ ایسی حالت میں یہ اندفاع خطرات کیا قابل قدر ہوسکتا ہے اس کی تو ایسی مثال ہے جیسے کسی کے بچھو کاٹ لے اور وہ رفع تکلیف کے لیے سانپ سے کٹوا لے ایسا کرنے سے وہ تکلیف تو ضرور جاتی رہے گی مگر جان کے لالے پڑ جائیں گے۔ پس یہ کہنا کہ گانے سے خطرات دفع ہو گئے تھے عذر گناہ بدتر از گناہ کا مصداق ہے۔

عذر گناہ بدتر از گناہ کا مفہوم

اسی مثل پر ایک حکایت یاد آئی وہ ہے تو غیر مہذب مگر موضوع خوب ہے وہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ ملا دو پیازہ سے بادشاہ نے پوچھا کہ ''عذر گناہ بدتر از گناہ'' (گناہ کا عذر گناہ سے زیادہ برا ہے) کے کیا معنی ہیں انہوں نے اس وقت اس کا جواب نہیں دیا اور موقع کے منتظر رہے ایک روز بادشاہ آگے آگے جارہے تھے' پیچھے سے ملا نے ان کی پشت میں انگلی سے اشارہ کر دیا اس نے منہ موڑ کر دیکھا اور تیز لہجہ میں کہا یہ کیا نالائق حرکت' ملا نے جواب دیا کہ قصور معاف ہو میں سمجھا کہ بیگم صاحبہ ہیں' اس پر وہ اور بھی برافروختہ ہوا' تب ملا نے کہا کہ یہ معنی ہیں عذر گناہ بدتر از گناہ کے۔ اس طرح ان صاحب کا یہ عذر کہ مجھ کو خطرات بند ہو گئے اسی مثل کا مصداق ہے۔

اصرار معصیت کے ساتھ نسبت مع اللہ باقی نہیں رہتی

خلاصہ یہ ہے کہ اصرار بر معصیت کے ساتھ نسبت مع اللہ باقی نہیں رہ سکتی اور ذوق وشوق کسی معصیت سے پیدا ہو یا معاصی کی حالت میں باقی رہے وہ قہر بصورت لطف ہوتا ہے جو قہر بصورت قہر سے زیادہ خطرناک ہے خوب سمجھ لینا چاہیے اور کبھی یہ قہر بصورت قہر ہوتا ہے۔

مؤثر حقیقی اللہ تعالیٰ ہیں

جیسے اس منکر توحید کو پیش آیا ہاں ہم نے یہ کہا تھا کہ اگر خدا کے سوا کسی پر مالک ہونے کا شبہ ہوتا ہے تو ماں باپ پر ہوسکتا ہے جیسے اس منکر نے اپنی بکواس میں کہا تھا لیکن ماں باپ بھی مالک نہیں ہو سکتے کیونکہ گوان کو ان کی ہستی میں گونہ دخل ضرور ہے مگر وہ اس کے خالق نہیں ہو سکتے اس

لیے کہ یہ امر مشاہد ہے کہ اسکے وجود میں ان کے اختیار کو کچھ دخل نہیں چنانچہ بہت لوگ عمر بھر اولاد کے متمنی رہتے ہیں اور اولاد نہیں ہوتی اور بہت سے لوگ چاہتے ہیں کہ ہمارے اولاد نہ ہو مگر ہوتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ ماں باپ کو بچے کی ہستی میں محض برائے نام دخل ہے اور مؤثر حقیقی اور مفیض وجود فقط سبحانہ ہیں پس وہ ہی اس کی تمام چیزوں کے مالک ہوں گے اور جب وہ مالک ہیں تو بندہ کو اپنی خدمت کے کسی معاوضہ کا کچھ استحقاق نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم پیشتر اس کی تفصیل کر چکے اور جب کہ اس کا کوئی استحقاق نہیں تو حق سبحانہ کے انعامات اس کا فضل محض ہوں گے اس لیے بجائے من خیر کے من رحمۃ فرمایا ہے۔ یہاں تک معلوم ہو گیا کہ رحمت سے مراد انعام خداوندی اور اس کا فضل واحسان ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ لفظ رحمت کو لفظ خیر پر کیوں ترجیح دی گئی۔

لفظ رحمت کا مفہوم

اب ہم رحمت و فضل واحسان وانعام وارد فی الآیہ کی شرح کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مفسرین نے بیان کیا ہے کہ یہاں رحمت عام ہے، صحت، امن، علم، عمل، غرض کہ ہم مفید چیز کو خواہ چھوٹی ہو یا بڑی حتیٰ کہ روح المعانی نے عروہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ شغدف بھی رحمت ہے کیونکہ اس سے سفر میں راحت پہنچتی ہے مگر لوگ معمولی چیزوں کو نعمت نہیں سمجھتے بلکہ صرف بڑی چیزوں کو نعمت سمجھتے ہیں جو کہ بڑی مشقتوں کے بعد ملتی ہیں۔ اسی لیے وہ چھوٹی نعمتوں پر شکر ہی نہیں کرتے، یہ ایک بہت بڑی غلطی ہے میں جس زمانہ میں تفسیر لکھ رہا تھا اسی زمانہ میں شاید سہارن پور ریلوے تیار ہو رہی تھی حسن اتفاق سے جس روز میں اس آیت کی تفسیر لکھ رہا تھا اسی روز ہماری عیدگاہ کے سامنے پڑی بچھائی جا رہی تھی اس وقت مجھے عروہ رضی اللہ عنہ کا قول دیکھ کر خیال ہوا کہ ریل بھی خدا کی نعمت اور وہ بھی رحمت میں داخل ہے۔

تھانہ بھون میں ریل جاری ہونے کی تاریخ

پس میں نے اس مقام پر اس واقعہ کا بھی تذکرہ حاشیہ میں کر دیا اور ریل کے تھانہ بھون پہنچنے کی تاریخ بھی لکھ دی تاکہ بیک کرشمہ دو کار ہو جاوے۔ آیت کی تفسیر بھی ہو جاوے اور تاریخ بھی منضبط ہو جاوے، اب اگر کوئی مجھ سے پوچھتا ہے کہ ریل تھانہ بھون میں کب جاری ہوئی ہے تو میں کہتا ہوں کہ میری تفسیر دیکھ لو وہ متحیر ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس واقعہ کو تفسیر سے کیا مناسبت ہے تو میں ان سے واقعہ بیان کر دیتا ہوں میں ریل کے نعمت ہونے کی ایک سند ایک بڑے شخص سے

بھی رکھتا ہوں جب میری عمر ۱۴ برس کی ہوگی اس زمانہ میں مولانا شیخ محمد صاحب کے وعظ میں حاضر ہوتا تھا۔ ایک وعظ میں آپ نے فرمایا کہ ریل بھی خدا کی نعمت ہے۔

بعض اوقات کفار کے ہاتھ سے نعمت پہنچنا

گو دوسروں کی بنائی ہوئی ہے کیونکہ نعمت بعض اوقات کفار کے ہاتھ سے پہنچتی ہے شاید کسی کو سن کر استعجاب ہو اس لیے میں کہتا ہوں کہ حدیث شریف میں آیا ہے: "ان اللّٰہ لیوید ھذا الدین بالرجل الفاجر"[1] (بلاشبہ اللہ تعالیٰ اس دین کی تائید ایک فاسق فاجر شخص کے ذریعہ کرے گا) پس جب کہ کافر کے ہاتھ سے دین کی تائید واقع ہے تو کفار کے ہاتھ سے دنیوی نعمت کا پہنچنا کیوں مستبعد ہے اس مقام پر ایک حکایت یاد آ گئی ایک شیعی نے ایک عالم سے کہا آپ لوگ حضرت عمرؓ کی اشاعت اسلام پر فخر کرتے ہیں اور اس کو ان کے کامل مسلمان ہونے کی دلیل بتاتے ہیں حالانکہ اس سے ان کا اسلام بھی ثابت نہیں ہوتا کیونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ان اللّٰہ لیوید ھذا الدین بالرجل الفاجر"[2] (بلاشبہ اللہ تعالیٰ اس دین کی تائید ایک فاسق فاجر شخص کے ذریعہ کرے گا) اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ اس سے اتنا تو ثابت ہوا کہ جس دین کی وہ مدد کرے گا وہ دین اسلام اور دین حق ہوگا اب اگر تم حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس کا مصداق بناتے ہو تو اس سے اتنا تو لازم آیا کہ انہوں نے دین الٰہی میں مدد کی ہے اب یہ دیکھو لو کہ جس دین کی انہوں نے مدد کی ہے وہ شیعوں کا دین ہے یا سنیوں کا تم ضرور یہی کہو گے کہ سنیوں کا۔ پس سنیوں کے مذہب کا حق ہونا ثابت ہو گیا اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دین بھی یہی تھا لہٰذا ان کا مسلمان اور کامل الایمان ہونا بھی ثابت ہو گیا یہ سن کر وہ شیعی صاحب مبہوت ہو گئے۔ خیر تو ہم نے کہا تھا کہ ریل بھی رحمت میں داخل ہے۔

اب ہم کہتے ہیں کہ اس بناء پر اگر یوں کہا جاوے کہ من جملہ اور نعمتوں کے ریل کا ذکر بھی قرآن میں ہے تو ایک حد تک صحیح ہے اور یہ امر کوئی قابل اعتراض نہیں ہے اجمالی ذکر کا انکار محض بلاوجہ ہے اس کا اجمالی ذکر صرف اسی آیت میں نہیں ہے بلکہ دوسرے علماء نے اور آیات میں بھی اس کو داخل کیا ہے۔ مثلاً حق سبحانہ مراکب کے ذکر کے بعد فرماتے ہیں: "وَيَخْلُقُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ" (اور وہ ایسی چیزیں بناتا ہے جس کی تم کو خبر بھی نہیں) اس آیت کے عموم میں ریل بھی داخل ہے کیونکہ اوپر سے سواری اور بار برداری کے جانوروں کا تذکرہ آ رہا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے:

---

[1] (الصحیح للبخاری ۴: ۸۸، الصحیح لمسلم کتاب الایمان: ۱۷۸)
[2] (الصحیح للبخاری ۴: ۸۸، الصحیح لمسلم کتاب الایمان: ۱۷۸)

وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ وَتَحْمِلُ أَثْقَالَكُمْ إِلٰى بَلَدٍلَّمْ تَكُوْنُوْا بَالِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَؤُفٌ الرَّحِيْمِ وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً وَيَخْلُقُ مَالَاتَعْلَمُوْنَ.

ترجمہ: ''اوران کی وجہ سے تمہاری رونق بھی ہے جبکہ شام کے وقت لاتے ہواور صبح کے وقت چھوڑتے ہواور وہ تمہارے بوجھ بھی ایسے شہر کو لے جاتے ہیں جہاں تم بدوں جان کو محنت میں ڈالے ہوئے نہیں پہنچ سکتے تھے، واقعی تمہارا رب بڑی شفقت اور رحمت والا ہے اور گھوڑے اور خچر اور گدھے بھی پیدا کئے تاکہ تم ان پر سوار ہواور نیز زینت کے لیے بھی وہ ایسی چیزیں بناتا ہے جن کی تم کو خبر بھی نہیں۔''

گویا حق سبحانہ تعالیٰ نے ایجاد ریل کی خوشخبری بھی سنادی اور حاصل یہ ہوا کہ مذکورہ بالا سواری اور بار برداری کے جانور تو ہم نے تمہارے لیے پیدا کئے ہی ہیں ان کے علاوہ ہم ایک اور بار برداری کی (ریل) پیدا کریں گے جس کا اب تمکو علم بھی نہیں ہے اس سے کسی قدر زیادہ واضح طور پر اس کو ایک مقام پر ذکر فرمایا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے:

''وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ وَخَلَقْنَالَهُمْ مِنْ مِّثْلِهٖ مَايَرْكَبُوْنَ''

ترجمہ: ''اور ایک نشانی ان کے لیے یہ ہے کہ ہم نے ان کی اولاد کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا اور ہم نے ان کے لیے کشتی ہی جیسی ایسی چیزیں پیدا کیں جن پر یہ لوگ سوار ہوتے ہیں۔''

خیر تو جبکہ ریل اور شغدف وغیرہ نعمائے دنیویہ بھی رحمت میں داخل ہیں تو نعمائے اخرویہ مثل علم وغیرہ بالائے اس رحمت میں داخل ہوں گے خصوص علم کا عموم رحمت میں داخل ہونا ایک دوسری آیت سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ حق سبحانہ تعالیٰ حضرت خضر علیہ السلام پر اپنے انعام واحسان کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''فَوَجَدَا عَبْدًا مِنْ عِبَادِنَا اٰتَيْنَاهُ رَحْمَةً مِنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا'' (سو وہاں پہنچ کر انہوں نے اپنے بندوں میں سے ایک بندے (حضرت خضر علیہ السلام) جن کو ہم نے اپنی خاص رحمت یعنی مقبولیت دی تھی اور ہم نے ان کو اپنے پاس سے خاص طور پر علم سکھایا تھا۔) اس سے علم کا ایک رحمت کبریٰ اور موہبت عظمیٰ ہونا ظاہر ہے۔

پس حاصل کلام یہ ہے کہ لفظ رحمت ہر مفید چیز کو شامل ہے، خواہ دنیوی ہو یا دینی اور چھوٹی ہو یا بڑی اسی بناء پر حق سبحانہ نے بعض جگہ اپنے کلام میں نبوت کو کہ اکمل فرد ہے علم کی رحمت سے تعبیر فرمایا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے:

رحمت کا اطلاق نبوت پر بھی ہے

"اَھُمۡ یَقۡسِمُوۡنَ رَحۡمَتَ رَبِّکَ نَحۡنُ قَسَمۡنَا بَیۡنَھُمۡ مَّعِیۡشَتَھُمۡ"

ترجمہ: "کیا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پروردگار کی رحمت کو تقسیم کرتے ہیں، ہم نے ان کے مابین ان کی معیشت تقسیم کی۔"

تفصیل اس مضمون کی یہ ہے کہ جب جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت کا اعلان فرمایا تو علاوہ اور اعتراضوں کے کفار نے کہا تھا کہ قرآن مکہ اور طائف کے کسی بڑے شخص پر کیوں نہ نازل کیا گیا اور اس کو کیوں نہ نبی بنایا گیا، حق سبحانہ ان کے اس قول کو نقل فرما کر اس کا جواب دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ خدا کی رحمت یعنی نبوت کو کیا یہ لوگ اپنی تجویز سے تقسیم کرتے ہیں حالانکہ ان کو یہ حق نہیں ہے کیونکہ سامان معیشت سی ادنیٰ چیز کو تو ہم تقسیم کرتے ہیں اور اس کے تقسیم کا ان کو اختیار نہیں دیا ہے۔ نبوت سی عظیم الشان شے کو یہ خود کیوں تقسیم کریں گے اور ان کو اس کے تقسیم کا کیا حق ہوگا۔ جب یہ معلوم ہوگیا کہ رحمت کا اطلاق نبوت پر بھی ہوا ہے تو اس سے ایک دوسری آیت کی تفسیر بھی ہوگئی اور ایک بڑا معرکۃ الآرا مقام حل ہوگیا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حق سبحانہ نے فرمایا ہے: "قُلۡ لَّوۡ اَنۡتُمۡ تَمۡلِکُوۡنَ خَزَآئِنَ رَحۡمَۃِ رَبِّیۡۤ اِذًا لَّاَمۡسَکۡتُمۡ خَشۡیَۃَ الۡاِنۡفَاقِ وَکَانَ الۡاِنۡسَانُ قَتُوۡرًا" ترجمہ: "آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمادیجئے کہ تم لوگ میرے رب کی رحمت (یعنی نبوت) کے خزانوں (یعنی کمالات) کے مختار ہوتے تو اس صورت میں تم (اس کے) خرچ کرنے کے اندیشہ سے ضرور ہاتھ روک لیتے اور آدمی ہے بڑا تنگ دل۔" اس پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ اس آیت سے پہلے بھی رسالت کا ذکر ہے اور بعد کو بھی یہ بیچ میں انسان کے بخل کا ذکر کیسے آ گیا۔ مفسرین نے اس کے متعلق کوئی تسکین بخش بات نہیں لکھی۔ امام رازی نے گو اس کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے مگر انہوں نے بھی کوئی شافی بات نہیں لکھی لیکن جب کہ رحمت سے نبوت مراد لی جاوے اس وقت آیت مذکورہ بے تکلف اپنے ماقبل و مابعد سے مرتبط ہو جاوے گی۔

حافظ قرآن ہونا علم تفسیر میں معین ہے

اس بیان سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ مفسر کے لیے علاوہ دیگر شرائط کے حافظ ہونا بھی بہت معین ہے کیونکہ "القرآن بعضہ یفسر بعضًا" (قرآن کا بعض حصہ بعض حصہ کی تفسیر بیان کرتا ہے) مسلم ہے پس حافظ کی نظر چونکہ پورے قرآن پر ہوتی ہے اس لیے جس قدر آسانی اور صحت کے ساتھ مقصود آیت کی توضیح وہ کرسکتا ہے اس قدر آسانی اور صحت کے ساتھ غیر حافظ نہیں کرسکتا

کیونکہ وہ تفسیر کے وقت ایک مضمون کی تمام آیتوں کو ذہن میں مستحضر کرے گا اس کے بعد تفسیر کرے گا برخلاف غیر حافظ کے اسکی نظر صرف ایک ہی آیت تک محدود ہوگی اور وہ جو کچھ سمجھے گا اسی ایک آیت سے سمجھے گا۔ البتہ غیر حافظ مولویوں کے لیے تفسیر ابن کثیر زیادہ مفید ہے کیونکہ وہ جس آیت کی تفسیر کرتے ہیں اس مضمون کی تمام آیتوں کو ایک جگہ جمع کرتے ہیں اس کے بعد تفسیر کرتے ہیں لیکن جس قدر تفسیر ابن کثیر سے غیر حافظ مولویوں کے لیے آسانی ہوتی ہے اسی قدر بخاری کی کتاب التفسیر سے ان کو پریشانی بھی ہوتی ہے کیونکہ انہوں نے اس کا اہتمام نہیں کیا ہے کہ جس صورت یا آیت کی تفسیر کے لیے انہوں نے باب منعقد کیا ہے بعنوان صریح اس کی تفسیر کریں بلکہ وہ ایسا بھی کرتے ہیں کہ ایک سورۃ کے ذیل میں بلا تصریح دوسری سورۃ کے کسی لفظ کی تفسیر کر جاتے ہیں طالب علم اس لفظ کو اس سورۃ میں تلاش کرتے ہیں جب وہ نہیں ملتا تو پریشان ہوتا ہے لیکن اگر وہ حافظ ہو تو اس کو یہ پریشانی نہیں ہوسکتی میں اس کو ایک مثال سے سمجھاتا ہوں۔ سنو امام بخاری نے باب منعقد کیا ہے باب ماجاء فی فاتحة الکتاب اور اس باب میں لکھا ہے:

"الذین الجزا فی الخیر والشر کما تدین تدان قال مجاهد بالدین بالحساب مدینین محاسبین پس جب طالب علم قال مجاهد بالدین بالحساب"

پر پہنچتا ہے تو وہ سوچتا ہے کہ بالدین سورۃ فاتحہ میں کہاں ہے لیکن اگر وہ حافظ ہو تو اس کا ذہن فوراً ارأیتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنَ "کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو نہیں دیکھا جو روز جزا کو جھٹلاتا ہے" کی طرف منتقل ہو جائے گا اور سمجھ لے گا یہ لفظ فلاں سورۃ میں واقع ہوا ہے اور وہاں اس کی تفسیر منقول ہے اس تفسیر سے مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنَ "مالک ہے روز جزا کا" کی تفسیر ہے علیٰ ہذا جب وہ مدینین محاسبین پر پہنچے گا اور مدینین کو سورۃ فاتحہ میں نہ پائے گا تو متحیر ہوگا لیکن حافظ کا ذہن فوراً "لَوْلَآ اِنْ کُنْتُمْ غَیْرَ مَدِیْنِیْنَ" (تو فی الواقع اگر تمہارا حساب کتاب ہونے والا نہیں) کی طرف جو کہ سورۃ واقعہ میں ہے منتقل ہوگا اور وہ سمجھ لے گا کہ یہ تفسیر دوسری سورۃ سے متعلق ہے اس سے آپ کی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ مولویوں اور طالب علموں کے لیے حفظ قرآن کی نہایت شدید ضرورت ہے اسی واسطے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے جب کوئی شخص عربی پڑھنے کا ارادہ ظاہر کرتا تو آپ فرماتے تھے کہ بتلاؤ تم حافظ بھی ہو یا نہیں اس کے جواب میں اگر وہ یہ کہتا کہ جی ہاں میں حافظ ہوں تو آپ فرماتے تھے کہ میں تمہارے مولوی ہونے

کا ذمہ کرتا ہوں اور کہتا کہ حافظ تو نہیں ہوں تو فرماتے تھے اچھا کوشش کرو میں بھی دعا کروں گا اور تم بھی دعا کرنا چونکہ اوپر رحمت کی تفسیر میں نبوت و مطلق علم کا فرد رحمت ہونا مذکور تھا جس سے علم کا نبوت کے ساتھ ملابس ہونا معلوم ہوتا ہے۔

نبوت نا قابل انقسام منصب ہے

اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے متعلق ایک کام کی بات بتلادی جاوے، نبوت ایک منصب خاص ہے جو حق سبحانہ کی طرف سے اس کے خاص بندوں کو بالتخصیص عطا ہوتا ہے بعض چیزیں اس کے لوازم یا مناسبات میں سے ہوتی ہیں جو حقیقتاً نہ عین نبوت ہوتی ہیں نہ جز و نبوت مثلاً علم یا رویائے حقہ وغیرہ بعض لوگوں کو دھوکہ ہو جاتا ہے اور وہ نبوت کو قابل انقسام سمجھ کر اور اس کے حصے اور اجزاء متعین کر کے اپنے کو جزوی نبی کہنے لگتا ہے۔ یہ ایک سخت مغالطہ ہے اس سے آگاہ رہنا چاہیے۔

رویائے صالحہ کے نبوت کے چالیسواں جز و ہونے کا مفہوم

اور حدیث میں جو آیا ہے کہ رویائے صالحہ نبوت کا چالیسواں جز و ہے وہ محمول بر حقیقت نہیں ہے بلکہ شدت ملابست کی وجہ سے اس کو جز و کہہ دیا گیا ہے اور اگر مان بھی لیا جاوے کہ نبوت قابل انقسام ہے تب بھی ایسے شخص کو دعوت نبوت کا حق نہیں ہے کیونکہ بعض چیزیں تو ایسی ہوتی ہیں جن کے اجزاء نام میں اپنے کل کے شریک ہوتے ہیں، ہوا پانی اور بعض ایسی ہوتی ہیں جن کے اجزاء نام میں اپنے کل کی شریک نہیں ہوتی مثلاً اینٹ اور گھر تو رویائے صالحہ وغیرہ کے اجزاء نبوت ہونے سے یہ کیسے ثابت ہوا کہ جس میں کوئی جز و نبوت پایا جاوے وہ نبی کہلا سکتا ہے۔ یہ تفصیل تھی اسی آیت کے متعلق جس کو شکر کے لیے اس جلسہ میں تلاوت کیا گیا تھا اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خود مثنوی کے متعلق بھی کہ علم نافع کا ایک مادہ تحقیق ہے اور اس کی شرح اور شارحین کے و شرکاء جلسہ کے متعلق بھی کچھ بیان کر دیا جاوے۔

مثنوی مولانا روم مضامین حقہ سے لبریز ہے

مثنوی ایک ایسی کتاب ہے جو مضامین حقہ سے لبریز، مولوی جامی رحمۃ اللہ نے اس کی نسبت فرمایا ہے:

ہست قرآن در زبان پہلوی ۔۔۔ مثنوی مولوی معنوی

(یہ مثنوی مولوی معنوی فارسی زبان میں الہامی کتاب ہے)

اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ اس میں اسرار و دقائق قرآنیہ کو بیان فرمایا ہے یہ معنی

ایسے ہیں جن سے عوام کو وحشت نہیں ہوسکتی اور دوسرے معنی وہ جن میں عوام کے توحش کا خطرہ ہے اور وہ وہ ہیں جو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے غلبہ حال میں بیان فرمائے ہیں یعنی مثنوی حق سبحانہ کا الہامی کلام ہے اور اس مقام پر قرآن سے کلام معروف حق سبحانہ مراد نہیں ہے بلکہ مطلق کلام حق مراد ہے گو بالوحی نہ ہو بالالہام ہو حق سبحانہ کا کلام فی نفسہ تو حرف وصوت سے پاک ہے مگر جس طرح وہ لباس عربیت میں جلوہ گر ہوا ہے یوں ہی لباس فارسی میں بھی جلوہ گر ہوسکتا ہے اس سے کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ جب یہ کلام حق ہے تو اس کے لیے بھی وہی احکام ثابت ہوں گے جو قرآن کے ہیں کیونکہ قرآن کا کلام الٰہی ہونا قطعی ہے اور مثنوی کا کلام الٰہی ہونا قطعی نہیں ہے اس لیے دونوں کا حکم ایک نہیں ہوسکتا' قرآن اپنے مرتبہ میں رہے اور مثنوی اپنے مرتبہ میں بلکہ دوسری کتب سماویہ خود کلام قطعی بھی ہیں ان کے لیے بھی کسی حکم کا ہونا محتاج دلیل مستقل ہوگا' خیر یہ وہ معنی ہیں جو حضرت حاجی صاحب نے غلبہ حال میں بیان فرمائے ہیں۔

اہل کمال اور غیر اہل کمال کے غلبہ حال میں فرق

اور یہاں کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ اہل کمال مغلوب الحال نہیں ہوتے پھر حاجی صاحب کیسے مغلوب ہوئے کیونکہ یہ خود قاعدہ ہی صحیح نہیں کہ اہل کمال مغلوب الحال نہیں ہوتے ضرور ہوتے ہیں مگر ان میں اور غیر اہل کمال میں فرق یہ ہوتا ہے کہ جن احوال سے غیر اہل کمال مغلوب ہوجاتے ہیں اہل کمال ان سے مغلوب نہیں ہوتے بلکہ ان کے مغلوب کرنے والے احوال دوسروں کے احوال سے اقوی ہوتے ہیں۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ اہل کمال کی مغلوبیت کم ہوتی ہے اور غیر اہل کمال کی زیادہ مگر ان کی نفس مغلوبیت کا انکار مشکل ہے' انبیاء سے زیادہ کون صاحب کمال ہوسکتا ہے لیکن جب ان کے حالات میں غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تاثر من الحال وہاں بھی ہے چنانچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر[1] میں ان الفاظ سے دعا فرمائی تھی: "**اللھم ان تھلک ھذا العصابۃ لم تعبد بعدالیوم**" (اے اللہ اگر یہ جماعت ہلاک ہوگئی تو آج کے بعد (کوئی) آپ کی عبادت نہیں کرے گا) اب آپ خیال کرلیجئے کہ اگر غلبہ حال نہ ہوتا تو کیا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس عنوان سے دعا فرماتے جس میں ابہام ہے حق سبحانہ کی احتیاج الی العبادات کا گو آپ کا مقصود یہ نہیں بلکہ آپ کا مقصود یہ ہے کہ اے اللہ آپ نے انسانوں کو اپنی عبادات کے لیے پیدا فرمایا ہے گو آپ کو ان کی احتیاج نہیں ہے اور نہ

---

[1] (الصحیح لمسلم: ۱۳۸۳' مسند احمد ۱: ۳۲)

آپ کا کچھ نفع ہے پس اگر تیرے بندوں کی یہ قلیل جماعت ہلاک ہوگئی تو میرے خیال میں پھر حق کی اشاعت نہ ہو سکے گی اور انسانوں کی پیدائش سے جو مقصود ہے وہ فوت ہو جاوے گا اس لیے آپ اس جماعت کو بچا لیجئے:

رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَاءُ مِنَّا اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ○

یہ اگر غلبہ حال نہ تھا تو کیا تھا یہ واقعات محض تائید کے درجے میں ہیں اگر ان کو کوئی نہ مانے تو اس کو خود غیر انبیاء اہل کمال کا اعتراف تو ماننا ہی پڑے گا۔

عارف رومی اور ان پر غلبہ حال

حضرت مولانا مثنوی معنوی میں جگہ جگہ اپنی مغلوبیت کا اظہار فرماتے ہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

چوں بگوشم تا سرش پنہاں کنم سر برآرد چوں علم کا نیک منم
غم انغم گیروم ناگہ دو گوش کاے مدمغ چوں ہمی پوشی بپوش

دوسری جگہ کہتے ہیں:

اے بروں از وہم و قال و قیل من خاک برفرق من تمثیل من
بندہ نشکیبد تصویر خوشت ہر زماں گوید کہ جانم مفرشت

(اے اللہ آپ میرے وہم وخیال اور قیل وقال سے پاک ہیں، میرے سر اور تمثیل پر خاک پڑے، عاشق کو بغیر کسی تصور کے چین نہیں آتا اس لیے وہ آپ کے واسطے اچھی سی اچھی تمثیل بیان کر کے خوش ہوتا ہے)

علی ہذا اور بہت سے مقامات پر مولانا نے خود اعتراف فرمایا ہے اس تقریر سے "من عرف کل لسانہ" کے معنی بھی ظاہر ہو گئے اور معلوم ہو گیا کہ اس کلل میں کلال سے کلال اضافی مراد ہے نہ کہ عدم افشاء مطلقاً۔ اس مقام پر یہ بھی جان لینا چاہیے کہ یہ مقولہ دو طرح سے منقول ہے اول یوں کہ من عرف کل لسانہ اور دوسرے یوں کہ من عرف طال لسانہ ان دونوں میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت میں تعارض نہیں کیونکہ من عرف طال لسانہ ابتدائی حالت پر محمول ہے اور من عرف کل لسانہ انتہائی حالت یعنی عارف ابتداء میں ضبط اسرار پر قادر نہیں ہوتا اس لیے اس وقت اس کی زبان کشادہ ہوتی ہے لیکن جب وہ پختہ ہو جاتا ہے اس وقت اس کی زبان گنگی ہو جاتی ہے مگر مطلقاً نہیں بلکہ غالب اوقات میں۔ ہاں تو مثنوی مضامین حقہ سے لبریز

ہے مگر وہ عوام کی کام کی نہیں ہے کیونکہ اس کے مضامین دقیق ہیں اور مولانا کا کلام ذو وجوہ ہے ہر خیال کا، آدمی اس کے مضامین کو اپنے خیالات پر منطبق کرسکتا ہے اس لیے اس میں "یُضِلُّ بِهٖ كَثِيْراً وَّيَهْدِیْ بِهٖ كَثِيْراً" (اس (قرآن حکیم) سے بہت سے لوگ گمراہ ہوتے ہیں اور بہت سے لوگ ہدایت پاتے ہیں) کی شان ہے اس لیے مولانا فرماتے ہیں:

نکتہا چوں تیغ پولا دست تیز   چوں نداری تو سپر واپس گریز
پیش ایں الماس بے اسپر میا   کز بریدن تیغ رانبود حیا

(تصوف کی باریکیاں فولادی تلوار سے بھی زیادہ تیز ہیں، جب تمہارے پاس ڈھال نہیں ہے واپس آ ؤ، اس تلوار کے سامنے بغیر ڈھال نہ آ ؤ اس لیے کہ تلوار کو کاٹنے سے حیا نہیں آتی)

مثنوی کا ایک خاص کمال

مثنوی میں ایک خاص بات یہ ہے کہ اس کے مضامین حافظہ میں ضبط نہیں ہوسکتے حالانکہ میں اس کی شرح بھی لکھ چکا ہوں اور متعدد بار پڑھنے پڑھانے کا بھی اتفاق ہوا ہے لیکن جب اٹھا کر دیکھتا ہوں تو ہر مرتبہ وہ مجھے نئی معلوم ہوتی ہے اور جن اشعار کے جو مضامین میں نے پہلے سمجھے تھے وہ یاد نہیں آتے بلکہ نئے مضامین یاد آتے ہیں کبھی کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا اور خود اپنی شرح کو دیکھنا پڑتا ہے۔ یہ ہی حالت قرآن شریف کی ہے کہ جب دیکھئے نیا معلوم ہوتا ہے اور اس کے مطالب سمجھنے کے لیے ہی مجھے اپنی تفسیر دیکھنی پڑجاتی ہے۔ مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ قرآن شریف مثنوی شریف بخاری شریف یہ تینوں کتابیں البیلی ہیں یعنی ان تینوں کتابوں کا کوئی ضابطہ نہیں ہے جس کا احاطہ ہوسکے۔ مثنوی اور قرآن کے اس تشابہ طرز بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ مثنوی الہامی کلام حق ہے۔ مثنوی میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وقت وعلوصولت وشوکت معانی کی طرح اس میں شوکت وصولت الفاظ بھی ہے جو اور کتابوں میں نہیں دیکھے جاتے اور اس کا فیصلہ ذوق صحیح کرسکتا ہے کیونکہ یہ ایک ذوقی بات ہے نہ کہ استدلالی، دیکھو ایک بلغاء عرب تھے جن پر قرآن کریم کی بلاغت نے وہ اثر کیا ہے کہ باوجود کمال مخالفت وعناد وحق پوشی کے ان کو جرأت نہ ہوسکی وہ جھوٹا بھی کوئی کلام بنا کر اس کے مقابلہ میں لے آئیں اور کہہ دیں کہ یہ اس کے ہم پلہ ہے اور ایک آج کل کے حمقاء ہیں جو مقامات حریری کو بلکہ خود اپنے کلام کو قرآن کے برابر بتاتے ہیں۔ یہ تفاوت کیوں ہے محض اس لیے کہ بلغاء عرب کا ذوق صحیح تھا اور ان کا ذوق فاسد ہے ان کا ذوق صحیح ان کو اعتراف اعجاز پر مجبور کرتا تھا اور ان کا فساد مذاق اس بیہودہ دعوے پر جرأت دلاتا ہے۔ دیکھو

بلغاء تصریح کرتے ہیں کہ قرآن میں ابلغ الآیات یہ آیت ہے:

قِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآئَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ الْمَآءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ.

ترجمہ: ''اور حکم ہو گیا کہ اے زمین اپنا پانی نگل جا اور اے آسمان تھم جا اور پانی گھٹ گیا اور قصہ ختم ہوا اور وہ (کشتی) جودی پر آ ٹھہری اور کہہ دیا گیا کہ کافر لوگ اللہ کی رحمت سے دور''

صحت وفساد مذاق

مولوی فیض الحسن صاحب سہارن پور کی نسبت سنایا گیا ہے کہ جب وہ اس آیت کو پڑھتے تھے تو ان پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی حالانکہ ہم لوگوں کو کچھ بھی لطف نہیں آتا۔ یہ فرق کیوں ہے صحت وفساد مذاق کے سبب مجھے جس قدر لطف ایک مرتبہ اس آیت میں آیا ہے:

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآئَهُمْ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتَابٍ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمُ اللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ اللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ.

ترجمہ: ''سو جس نے ان کو تردد میں ڈال رکھا ہے سو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرف (ان کو برابر) بلاتے رہئے اور جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا ہے اس پر مستقیم رہئے اور ان کی (فاسد) خواہشوں پر نہ چلئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیجئے کہ اللہ نے جتنی کتابیں نازل فرمائی ہیں ان سب پر ایمان لاتا ہوں اور مجھ کو یہ بھی حکم ہوا ہے کہ اپنے اور تمہارے درمیان عدل رکھوں' اللہ ہمارا بھی مالک ہے اور تمہارا بھی مالک ہے' ہمارے اعمال ہمارے لیے اور تمہارے عمل تمہارے لیے' ہماری تمہاری کچھ بحث نہیں' اللہ تعالیٰ ہم سب کو جمع کریں گے اور اس میں شک نہیں کہ اس کے پاس جانا ہے۔''

اتنا عمر بھر میں کسی آیت میں نہیں آیا لیکن اگر پوچھے کہ کیوں تو میں اس کی وجہ نہیں بیان کر سکتا کہ اس لیے کہ یہ ذوق امر ہے اور امر ذوقی بیان میں نہیں آ سکتا۔

حسن معنوی ایک ذوقی امر ہے

چنانچہ اگر کوئی کسی پر عاشق ہو اور اس سے پوچھا جاوے کہ تو اس پر کیوں عاشق ہے تو وہ اس کی پوری اور مفصل وجہ نہیں بیان کرتا وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ اس میں فلاں خوبی ہے مثلاً اس کی آنکھ اچھی ہے یا

بال اچھے ہیں وغیرہ مگر جب اس سے پوچھا جاوے کہ اس میں کیا اچھائی ہے اور وہ کیوں اچھی ہے تو وہ اس کی وجہ بیان کرنے سے عاجز ہے اس سے معلوم ہوا کہ حسن معنوی کی طرح حسن صوری بھی درحقیقت ذوقی ہے نہ کہ مدرک بالبصر ہاں حسن صوری کو معلوم کرنے کے لیے حسن ظاہر شرط ہے بے شک ہے مگر شرط ہونا اور چیز ہے اور مدرک ہونا اور شے۔ اس بیان سے معلوم ہوا کہ حسن دو قسم کا ہے حسن صوری اور حسن معنوی اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مدرک دونوں کے لیے ذوق ہے۔ فرق اتنا ہے کہ حسن معنوی کے ادراک کے لیے حسن ظاہر شرط نہیں ہے اور حسن ظاہر کے ادراک کے لیے شرط ہے۔

اور اسی سے اس کا راز بھی معلوم ہو گیا کہ اندھے کسی پر کیوں عاشق ہو جاتے ہیں اس لیے کہ اس سے معلوم ہوا ہے کہ ادراک حسن کا مدار آنکھ پر نہیں ہے بلکہ بعض خوبیاں بدوں آنکھ کے بھی معلوم ہو سکتی ہیں پس اندھے ان پر ان خوبیوں کی بناء پر عاشق ہوتے ہیں جو بلاتوسط آنکھ کے مدرک ہو سکتے ہیں جیسے آواز ہے یا کوئی عادت وخصلت ہے وغیرہ وغیرہ' اندھوں کے عاشق ہونے پر ایک اندھے کا قصہ یاد آ گیا' لڑکوں کو پڑھاتا تھا' ایک لڑکے کی ماں خوشامد میں اس اندھے معلم کے پاس اپنے بچہ کے ہاتھ کبھی کبھی کھانا وغیرہ بھیج دیا کرتی تھی کبھی سلام کہلا بھیجتی' اندھے نے سمجھا کہ عورت مجھ سے محبت کرتی ہے اس لیے اس کو بھی اس سے محبت ہو گئی۔

ایک روز اس نے اس لڑکے کے ہاتھ اس کی ماں کے پاس اظہار عشق کے ساتھ درخواست ملاقات کا پیام کہلا بھیجا' عورت پارسا تھی' اسے ناگوار ہوا اس نے اپنے خاوند سے تذکرہ کیا ان دونوں میں طے ہو گیا کہ اندھے کو اس کا مزہ چکھانا چاہیے اور اس کی صورت بھی تجویز کر لی گئی اس کے بعد اس عورت نے حافظ جی کو لڑکے کے ہاتھ بلوا بھیجا' حافظ جی وقت معہود پر پہنچ گئے۔

اتنے میں باہر سے آواز آئی کواڑ کھولو' حافظ جی سن کر گھبرائے' عورت نے کہا کہ گھبراؤ نہیں میں ابھی انتظام کیے دیتی ہوں' تم یہ دوپٹہ اوڑھ کر چکی پیسنے لگو' حافظ جی نے ایسا ہی کیا' اس نے جا کر کواڑ کھول دیئے' خاوند اندر آیا' ملی بھگت تو تھی ہی' پوچھا یہ کون عورت ہے کہا ہماری لونڈی ہے آٹے کی ضرورت تھی اس لیے بے وقت چکی پیس رہی ہے وہ خاموش ہو رہا' حافظ جی نے کیوں چکی پیسی تھی آخر تھک گئے اور ہاتھ سست چلنے لگا یہ دیکھ کر خاوند اٹھا اور کہا مردار سوتی ہے پیستی کیوں نہیں یہ کہہ کر چند جوتے رسید کیے اور آ کر اپنی جگہ لیٹ رہا' حافظ جی نے قہر درویش بر جان درویش پھر پیسنا شروع کیا' تھوڑی دیر پیسنے کے بعد پھر ہاتھ سست چلنے لگا' خاوند نے پھر وہی کیا جو پہلے کیا تھا' غرض صبح تک حافظ جی سے خوب چکی پسوائی اور خوب جوتہ کاری کی' جب یہ دیکھا کہ حافظ جی کو کافی سزا مل

چکی ہے تو حسب قرارداد خاوند وہاں سے ٹل گیا' عورت نے کہا حافظ جی اب موقعہ ہے آپ جلدی سے تشریف لے جائیں ایسا نہ ہو وہ ظالم پھر آ جاوے' حافظ جی وہاں سے بھاگ گئے اور مسجد میں آ کر دم لیا' یہ قصہ تو رفت گذشت ہوا۔ اس کے بعد عورت کو شرارت سوجھی اور اس نے لڑکے کے ہاتھ پھر سلام کہلا بھیجا' حافظ جی نے کہا ہاں میں سمجھ گیا آ ٹا نہیں رہا ہوگا۔ خیر یہ مضمون تو استطراداً تھا۔

مثنوی سمجھنے کے لیے ذوق سلیم کی ضرورت

کہنا ہمکو یہ ہے کہ مثنوی میں حسن صوری بھی ہے اور معنوی بھی مگر اس کے سمجھنے کے لیے ذوق سلیم کی ضرورت ہے یہ سب کچھ ہے مگر اس کے مضامین کی دقت اور اس کے دو وجوہ ہونے نے اس کو اس قابل نہیں رکھا کہ وہ عوام کے ہاتھوں میں رہے کیونکہ اس سے لوگوں کی گمراہی کا سخت اندیشہ ہے اس بنا پر جی یوں چاہتا ہے کہ اس کو یوں پردہ میں چھپایا جاوے کہ کسی کو اس کی ہوا بھی نہ لگے کیونکہ گو مثنوی اپنی ذات سے ایک کتاب ہدایت ہے اور اس سے جو گمراہی پھیلتی ہے اس کی ذمہ دار خود لوگوں کی نااہلیت ہے مگر جس وقت کہ اس کی اشاعت میں ایک مفسدہ ہے گو خارجی ہے اور شیوع اس کا ضروری نہیں تو اس وقت ضرورت اس کی ہے کہ اس کو شائع نہ کیا جاوے اس لیے کہ یہ شرعی قاعدہ ہے کہ جس بات سے کوئی خرابی پیدا ہوتی ہے اور وہ کوئی مفسدہ بھی ہو تو خود اس کو نہ روکا جاوے گا بلکہ اس وقت خود مفاسد کو روکا جاوے گا لیکن اس وقت اس کے اشاعت کا بند ہونا تو ناممکن ہے کیونکہ اس کے لیے ضرورت ہے حکومت کی اور حکومت ہے نہیں تو اشاعت کیونکہ رکے۔ پس دو صورتیں ہیں یا تو مثنوی سے بالکل تعرض نہ کیا جاوے اور اس پر جو مفاسد مرتب ہوں' ہونے دیا جاوے یا ان مفاسد کو دور کرنے کی کوشش کی جاوے' پہلی صورت کچھ اچھی نہ معلوم ہوتی تھی اس لیے جی چاہتا تھا کہ مثنوی کی کوئی ایسی شرح ہو جاوے جو اس کے مضامین کو شریعت پر منطبق کر دے مگر اس طرح کہ حق بھی نہ چھوٹنے پائے تا کہ ایک حد تک مفاسد کا انسداد ہو جاوے۔

اب تک جو لوگوں نے حواشی و شروح لکھے وہ فرداً فرداً کافی نہیں کیونکہ بعض نے تو فن کو چھوڑ دیا ہے جیسے محض اہل علم ظاہر اور بعض نے شریعت کو چھوڑ دیا جیسے ولی محمد اور بعض ایسے ہیں جن کو مذاق سخن حاصل نہیں ہے اور جب تک مذاق سخن نہ ہو اس وقت تک کسی کے کلام کی شرح ناممکن ہے غرض کہ جہاں تک ہم نے غور کیا ہم کو کوئی شرح یا حاشیہ ایسا نہ ملا جو ان تمام باتوں کا جامع ہو یہ ممکن ہے کہ ان سب کے مجموعہ سے مقصود حاصل ہو جاوے مگر اس میں اول تو یہ دقت ہے کہ ہر شخص کے پاس اتنا ذخیرہ جمع ہونا مشکل پھر اگر جمع بھی ہو جاوے تو ہر شخص میں تنقید کی قابلیت کب ہے۔

کلید مثنوی لکھنے کا سبب

اس بنا پر جی چاہتا تھا کہ کوئی ایسی شرح ہو جاوے جس میں ان تمام باتوں کا حتیٰ الامکان لحاظ رکھا گیا ہو لیکن احباب کے اصرار سے یہ بار خود مجھ ہی کو اٹھانا پڑا اور میں نے دفتر اول کی شرح پوری کر دی اس کے بعد کئی سال تک ہمت پست رہی پھر احباب کی طرف سے بھی اصرار ہوا کہ کچھ آمادگی ہوئی لیکن یہ امید نہ ہوئی کہ میں اس کو پورا کر سکوں گا اس لیے خیال ہوا کہ کچھ اور لکھ دیا جاوے اور میں نے حاجی صاحب سے سنا تھا کہ دفتر ششم میں اسرار بہت ہیں اس لیے خیال ہوا کہ دفتر ششم کی شرح بھی ہو جاوے تو اچھا ہے اس بناء پر میں نے دفتر ششم کی شرح شروع کی اور بدقت تمام اس کو ختم کیا۔ اب تو ہمت بالکل ہی پست ہوگئی لیکن احباب کا اصرار کسی طرح پھر ہوا تب خیال ہوا کہ اس کو پورا ہونا چاہیے اور ہمت تھی نہیں اس لیے اس کے لیے یہ تدبیر بتلائی کہ میں پڑھا دوں اور پڑھنے والے ضبط کر لیں۔ چنانچہ دفتر ثالث' نصف اول دفتر رابع اول دفتر خامس کی شرح اس طرح تحریر مولوی حبیب احمد و مولوی شبیر علی تمام ہوگئی۔

مولانا حبیب احمد صاحب کو مثنوی سے مناسبت

اس کے بعد بعض عوارض کی وجہ سے اس کے درس کا سلسلہ موقوف ہو گیا مگر اس کی تحریر موقوف نہیں ہوئی یعنی میں نے مولوی حبیب احمد کو بوجہ اس کے کہ میرے خیال میں ماشاء اللہ ان کو مثنوی سے پوری مناسبت تھی اجازت دیدی کہ تم خود لکھ لو اور جو مقام حل نہ ہو یا جہاں کہیں کوئی شبہ ہو مجھ سے پوچھ لو' نصف ثانی دفتر رابع ربع ثانی و ثالث و رابع دفتر خامس کی شرح اس طرح تمام ہوئی۔ غرض چار دفتر تو یوں تمام ہوئے اور دو دفتر میں خود لکھ چکا تھا اس لیے اب بفضلہ تعالیٰ پوری مثنوی کی شرح ہوگئی چونکہ حق سبحانہ کا یہ ایک بہت بڑا انعام اور احسان تھا اس لیے جی چاہا کہ اس کے ادائے شکر کے لیے بے تکلف و اہتمام خاص ایک جلسہ کیا جاوے جس میں حق سبحانہ کی اس نعمت کو ظاہر کیا جاوے کیونکہ اظہار نعمت بھی شکر ہے اگر بہ نیت تفاخر نہ ہو چونکہ بعض وہ احباب موجود نہ تھے جن کے شریک کرنے کو جی چاہتا تھا اس لیے اس میں ذرا تاخیر ہوگئی آج وہ بھی اتفاقاً آ گئے اور احباب غیر متوقع بھی آ گئے اس لیے خیال ہوا کہ یہ کام آج ہی ہو جاوے تو اچھا ہے اس لیے یہ مختصر اور بے تکلف جلسہ منعقد کیا گیا گو شرح مثنوی کا کام ہمارے کئی کے ہاتھوں انجام پایا ہے۔

چھوٹی اور بڑی ہر نعمت پر اظہار شکر کی ضرورت

مگر ہمیں اس پر ناز نہ ہونا چاہیے کیونکہ حق سبحانہ فرماتے ہیں:

مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلاَ مُمْسِكَ لَهَا وَمَا يُمْسِكْ فَلاَ مُرْسِلَ لَهٗ مِنْ بَعْدِهٖ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ○

یعنی حق سبحانہ جس چھوٹی یا بڑی نعمت کو کھول دیں اس کو کوئی روکنے والا نہیں اور جس کو وہ بند کر دیں اس کو کوئی چھوڑنے والا نہیں اور وہی غالب مطلق اور حکیم مطلق ہیں۔ نیز فرماتے ہیں: "مَآ اَصَابَكُمْ مِنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ" یعنی جو نعمت تم کو ملی وہ حق سبحانہ کی طرف سے ہے ان نصوص میں تصریح ہے کہ ہر نعمت خواہ علم ہو یا کچھ اور اسی کے اختیار میں ہے اور بدوں اس کے دیئے کسی کو نہیں مل سکتے۔ پس بجائے اس کے ناز کیا جاوے ہم کو حق سبحانہ کا شکر کرنا چاہیے کہ اس نے ہم پر انعام کیا اور ہم سے یہ خدمت لی ہم کو ناز کا کیا حق ہوسکتا ہے جب کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ارشاد ہوتا ہے: "لَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ"

"یعنی اے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اگر ہم چاہیں تو جو ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی بھیجی ہے اسے سلب کر لیں۔"

شارحین مثنوی کی شکر گزاری اور انہیں ہدیہ سے نوازنا

پس ہم کو خدائے تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ یہ مضمون تو حق سبحانہ کے شکر سے متعلق تھا اب میں کہتا ہوں کہ حدیث میں "من لم یشکر الناس لم یشکر اللّٰہ"[1] اس لیے مجھے شارحین کی شکر گزاری کی بھی ضرورت ہے کیونکہ ان سے مجھے اس مقصد میں مدد ملی ہے۔ سنو ایک تو ان کی شکر گزاری کی یہ ہی صورت ہے کہ ان کی شناسی کے ساتھ ذکر ہو رہا ہے اور دوسری صورت ان کی شکر گزاری کی یہ کہ میں ان کے لیے دعا کرتا ہوں کہ ان پر حق تعالیٰ اپنی رحمت فرماویں اور ان کو تقویٰ حقیقی نصیب فرمائیں اور تیسری صورت یہ ہے کہ میں ان کے لیے کوئی ہدیہ تجویز کرو۔ سو مولوی شبیر علی تو میری مثل جز کے ہیں ان کے لیے کوئی ہدیہ تجویز کرنا تو خود اپنے لیے تجویز کرنا ہے اور مولوی حبیب احمد میرے دوست ہیں گو وہ بھی میرے لیے من وجہ جز وہی کی مثل ہیں مگر پھر بھی دونوں میں بہت فرق ہے اس لیے میں ہدیہ رسم صالحہ کے طور پر صرف مولوی حبیب احمد کے لیے تجویز کرتا ہوں اس تفریق کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

[1] (سنن الترمذی: ۱۹۵۵، مشکوٰۃ: ۳۰۲۵)

ہے: "لو کان بعدی نبی لکان عمرا"[1] اور یہ نہیں فرمایا لکان ابوبکر اس کی وجہ استادی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بوجہ شدت تعلق برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ملحق برسول صلی اللہ علیہ وسلم اور حکماً بعد کے مضاف الیہ میں داخل ہیں گو حیثیات الحاق دونوں واقعوں میں جداگانہ ہیں مگر اس سے اصل مقصود پر اثر نہیں پڑتا۔ دوسری وجہ فرق یہ بھی ہے کہ یہ ہنس کر فرمایا کہ مولوی حبیب احمد نے شرح کو پورا کیا ہے اور مولوی شبیر علی نے پورا نہیں کیا اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی ہے کہ جو بات محبت سے ہو وہ خود بھی محبوب ہے خواہ فعل ہو خواہ ترک ہو کیونکہ کبھی فعل مودی ہوتا ہے معنی کی اور کبھی ترک۔

مولانا حبیب احمد صاحب کو مفتاح مثنوی کے لقب سے نوازنا

خیر جو تحفہ میں نے مولوی حبیب احمد کے لیے تجویز کیا ہے وہ اب میں پیش کرتا ہوں۔

برگ سبز ست تحفہ درویش اس تحفہ کو حقیر نہ سمجھئے یہ میری ٹوپی ہے جس میں یہ شعر لکھا ہوا ہے:

گشتہ مفتاح باب مثنوی اے حبیب مولوی معنوی

(اے حبیب مولوی معنوی تو مثنوی کے باب میں مفتاح المثنوی ہوا)

اس میں لفظ حبیب مضاف ہے مگر بشکل موصوف اس کو عربی میں یوں پڑھا جا سکتا ہے۔

صرت مفتاحا لباب المثنوی یا حبیب المولوی المعنوی

میں نے اس پر ۱۳۳۶ھ بھی یادداشت کے لیے لکھ دیا ہے اور میں حبیب احمد کو مفتاح المثنوی کا لقب دیتا ہوں اور سلاح اعمال کی دعا کرتا ہوں۔ (اس کے بعد اتمام ذرہ نوازی کے لیے اس نااہل کو اپنے دست مبارک سے ٹوپی اڑھا دی حبیب احمد) میں شارحین کو حق سبحانہ کا ارشاد: "مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلاَ مُمْسِكَ لَهَا وَمَا يُمْسِكْ فَلاَ مُرْسِلَ لَهُ" (اللہ جو رحمت لوگوں کے لیے کھول دے سو اس کا کوئی بند کرنے والا نہیں اور جس کو بند کردے سو اس کے بند کرنے کے بعد کوئی کھولنے والا نہیں) پھر یاد دلاتا ہوں اور کہتا ہوں کہ وہ اس پر ناز نہ کریں بلکہ خدا کا شکر ادا کریں کیونکہ یہ ان کا انعام ہے جو ان پر کھولا گیا ہے اگر وہ بند کر لیتے تو پھر اس کا کوئی کھولنے والا نہ تھا۔

وعظ کا نام شکر المثنوی تجویز فرمانا

اس لیے میں اس وعظ کا نام شکر المثنوی رکھتا ہوں اور حاجی صاحب نے فرمایا تھا کہ مثنوی کے سبق کے بعد یہ دعا کیا کرو کہ اے اللہ جو کچھ اس میں ہے ہمیں بھی نصیب ہو۔ سبحان اللہ کیسی

---

[1] (سنن الترمذی: ۳۶۸۶، مشکوٰۃ المصابیح: ۶۰۳۵)

مختصر اور جامع دعا ہے اور ایک دفعہ اس دعا کے بعد فرمایا تھا کہ جو لوگ اس وقت موجود ہیں انشاء اللہ تعالیٰ سب کو ایک ذرہ محبت عطا ہوگا' آپ نے تو یہ بشارت دی تھی کہ جتنے لوگ اس جلسہ میں شریک ہیں سب کو اس میں سے حصہ ملے گا ہم بشارت کے قابل نہیں ہاں ہم کو حق سبحانہ کے فضل سے امید ہے کہ جتنے اس جلسہ میں شریک ہیں ان کو بھی انشاء اللہ تعالیٰ اس سے حصہ ملے گا۔

کلید مثنوی کی تکمیل پر تقسیم مٹھائی

اس جلسہ میں تقسیم کے لیے مٹھائی بھی منگائی گئی ہے جو تقسیم ہونے والی ہے جو لوگ اس تقسیم میں ایسے ہیں جن کو مٹھائی دینے سے ثواب ملے اے اللہ اس کا ثواب حضرت مولانا رومی کو پہنچے۔ یہ فاتحہ مروجہ نہیں ہے کیونکہ اس میں اور فاتحہ مروجہ میں بہت فرق ہے۔ اہل بدعت کی شیرینی وغیرہ ان کے آگے ہوتی ہے ہماری مٹھائی بائیں طرف رکھی ہے وہ کسی شے پر فاتحہ دے کر خود ہی کھا لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس شے کا ثواب مردہ کو پہنچ جاوے گا' ہمارے یہاں ایسا نہیں ہے ایک عورت کا قصہ ہے کہ جب وہ کوئی چیز پکاتی تو اس کو چند پیالوں میں اتارتی اور کہتی کہ یہ فلانے کے نام کا ہے اور یہ فلانے کے نام کا' اس کا ثواب فلانے کو پہنچے اور اس کا فلانے کو' کہہ کر خود کھا جاتی۔ سو ہمارے فاتحہ تو ایسی نہیں اہل بدعت کے یہاں ثواب کی تین قسمیں ہیں ایک مستحقین کو دینے کا اور ایک غیر مستحقین کو دینے کا ایک خود کھانے کا اس لیے ان کے مردوں کو ثواب بھی کم پہنچتا ہے کیونکہ جو غیر مستحقین کو دیدیا گیا خود کھالیا گیا اس کا ثواب تو کیوں ہی پہنچے گا' رہا وہ جو مستحقین کو دیا گیا ہے اس میں اگر خلوص نہ تھا جو کہ اغلب ہے کیونکہ ان کے ایصال ثواب میں یا ریا و تفاخر ہوتا ہے یا محض پابندی رسم و تقلید آباء تو وہ یوں اکارت گیا اب بتلایئے مردوں کو کیا پہنچا' برخلاف اہل حق کے کہ جب وہ ایصال ثواب کریں گے تو اس میں اس کی شرائط کا لحاظ رکھیں گے اس لیے سارا ثواب مردوں کو پہنچے گا۔ ایک قصہ ہے کہ ایک شخص نے منت مانی تھی' منت کا کھانا جن لوگوں کو کھلایا گیا ان میں کوئی تحصیلدار تھا کوئی پیش کار' غرض کہ سب اغنیاء تھے' ایک شخص نے کہا بھائی جس نے مساکین نہ دیکھے ہوں اس جلسہ میں دیکھ لے اگر کسی کو ہمارے مولانا کو ثواب پہنچانے پر یہ شبہ ہو کہ وہ تو خود بزرگ ہیں ان کو ثواب پہنچانے سے کیا فائدہ اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں دو فائدے ہیں ایک فائدہ تو خود بزرگوں کا ہے وہ کہ مراتب بلند ہوں گے اور ان کے تقریب خداوندی میں اضافہ ہوگا جس کے وہ ہم سے زیادہ طالب ہیں۔ دوسرا فائدہ خود ہمارا ہے کہ ان کے تعلق سے حق سبحانہ کو ہم سے تعلق ہوگا کیونکہ وہ خدا کے دوست ہیں اور دوست کا دوست دوست ہوتا ہے۔

آیت متلوہ کی عجیب وغریب تفسیر

اب میں آیت متلوہ کے متعلق تھوڑا سا مضمون اور بیان کرتا ہوں اس کے بعد اس بیان کو ختم کردوں گا۔ وہ یہ ہے کہ حق سبحانہ نے جس طرح اس آیت میں اپنے عموم قدرت وقہر غلبہ کو صراحتاً بیان فرمایا ہے یوں ہی انہوں نے اس میں اپنے کمال جود وکرم کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ آیت میں جملہ اولیٰ میں فتح (کھولنا) کے مقابلہ میں امساک لائے ہیں اور امساک کے مقابلہ میں فتح اور جملہ ثانیہ میں امساک (روکنا) کے مقابلہ میں ارسال (بھیجنا) لائے ہیں اور ارسال کے مقابلہ میں امساک

پس اس میں دو امر خلاف ظاہر ہیں ایک تو جملہ اولیٰ میں فتح کے مقابلہ میں امساک اور امساک کے مقابلہ میں فتح لانا کیونکہ فتح کا مقابلہ غلق ہے نہ کہ امساک اور امساک کا مقابلہ ارسال ہے نہ کہ فتح اور دوسرا یہ کہ جملہ ثانیہ مقابل ہے جملہ اولیٰ کا اور یہ معلوم ہو چکا ہے کہ فتح کا مقابلہ غلق ہے نہ کہ امساک

پس جملہ اولیٰ میں **مایفتح اللہ** فرمایا اور اس کے مقابلہ میں جملہ ثانیہ میں **مایمسک** فرمانا خلاف مقتضائے تقابل ہے اس بنا پر آیت مذکورہ پر شبہ ہوتا ہے کہ اس میں رعایت نہیں رکھی گئی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ رعایت معنوی چونکہ رعایت لفظی پر مقدم ہے اور رعایت معنوی عدم لحاظ تقابل میں تھی اس لیے اس کا لحاظ نہیں کیا گیا۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ اس آیت سے جس طرح اظہار کمال قدرت مقصود ہے یوں ہی اس میں غایت کرم اور کمال جود کی طرف بھی اشارہ ہے پس جملہ اولیٰ میں بجائے لفظ ارسال کے فتح کا لفظ اس واسطے استعمال کیا گیا ہے کہ گویا یہ دونوں لفظ اطلاق پر دلالت کرتے ہیں مگر جو دلالت اطلاق پر لفظ فتح کرتا ہے وہ دلالت لفظ ارسال نہیں کرتا اس لیے ما یفتح اللہ میں اشارہ ہوگا اس طرف کہ جب حق سبحانہ کسی پر رحمت کرتے ہیں تو بہت اور بیدریغ کرتے ہیں اور یہ اشارہ ارسال میں نہ تھا اس لیے بجائے ارسال کے فتح لایا گیا اور بجائے غلق کے امساک کا لفظ استعمال کیا گیا ہے کہ جس قدر کمال قدرت نفی ممسک سے ظاہر ہوتا ہے اس قدر نفی غالق سے ظاہر نہیں ہوتا کیونکہ غلق خاص ہے اور امساک عام اور نفی عام تو نفی خاص کو مستلزم ہے مگر نفی خاص نفی عام کو مستلزم نہیں اور جملہ ثانیہ میں لفظ امساک بجائے غلق کے اس لیے لایا گیا ہے کہ وہ دلالت کرتا ہے کرم پر کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حق سبحانہ جب کسی پر انعام نہیں کرتے تو یہ اس کا بند کرنا نہیں ہوتا کہ نہر جاری نہ ہو بلکہ کسی وجہ سے عارضی طور پر روک لینا ہوتا ہے اور زوال عارض کے بعد پھر اس کا اجراء ہو جاتا ہے۔ **مایفتح اللّٰہ للنّاس من رحمۃ فلا غالق لھا** (اللہ جو رحمت لوگوں کے لیے

کھول دے اس کا کوئی بند کرنے والا نہیں) اس لیے نہیں کہا کہ اس میں گو کثرت جود کی طرف اشارہ ہے مگر اس سے کمال قدرت کا اظہار نہیں ہوتا کیونکہ نفی غالق کے لیے نفی ممسک لازم نہیں اور **مایرسل اللّٰہ للنّاس من رحمۃ فلاممسک لھا** (اللہ جو رحمت لوگوں کے لیے کھول دے اس کا کوئی روکنے والا نہیں) اس واسطے نہیں فرمایا گو اس میں کمال قدرت کا اظہار ہے مگر اس سے کہاں جود مفہوم نہیں ہوتا اور **مایرسل اللّٰہ للنّاس من رحمۃ فلا غالق** (اللہ جو رحمت لوگوں کے لیے کھول دے اس کا کوئی بند کرنے والا نہیں) اس واسطے نہیں فرمایا کہ نہ اس میں کمال قدرت کا اظہار ہے اور نہ کمال جود کی طرف اشارہ اور **مایغلق فلاح فاتح لہ** اس واسطے جو کہ ادنیٰ ہے غلق سے نیز اس میں کمال قدرت پر بھی دلالت نہیں ہے کیونکہ نفی فاتح مستلزم نفی مرسل نہیں ہے۔

مایغلق فلا مرسل لہ اس واسطے نہیں فرمایا گو اس میں کمال قدرت پر دلالت ہے مگر حق سبحانہ غلق رحمت نہیں فرماتے اور **مایمسک فلاح فاتح لہ** اس واسطے نہیں فرمایا کہ اس میں کمال قدرت پر دلالت نہیں ہے۔ اس تفصیل کے بعد آیت کا حاصل یہ نکلا کہ حق سبحانہ جب کسی پر کوئی عنایت کرتے ہیں تو بے دریغ کرتے ہیں اور خود ان کی طرف سے کوئی روک نہیں ہوتی اور جس کسی پر وہ عنایت کرتے ہیں اس کا کوئی بند کرنے والا تو درکنار روکنے والا بھی نہیں ہوتا اور جس پر وہ رحمت نہیں کرتے تو وہ اس کو بند نہیں کرتے بلکہ کسی عارض کی وجہ سے روک لیتے ہیں اور اگر وہ عارض زائل ہو جاوے تو پھر جاری فرما دیتے ہیں۔ اس سے اہل سلوک کو خاص طور پر سبق لینا چاہیے اور اگر کسی وقت احوال ومواجید اور ذوق شوق میں کمی آ جاوے یا وہ بند ہو جاویں تو مایوس نہ ہوں کیونکہ حق سبحانہ نہایت کریم ہیں اس لیے کسی نعمت کو خود نہیں روکتے بلکہ کسی عارض کی وجہ سے روکتے ہیں اور عارض کبھی معصیت ہوتا ہے اور کبھی غیر معصیت۔ پس اگر معصیت ہو تو اس کا توبہ و استغفار سے تدارک کرنا چاہیے۔ حق سبحانہ پھر اس کو جاری فرما دیں گے اور غیر معصیت ہو تو سمجھنا چاہیے کہ یہ روکنا کسی خاص مصلحت سے ہے اور مفید ہے نہ کہ مضر اس لیے اس کی کچھ پروا نہ کرنی چاہیے اور اپنا کام کرتے رہنا چاہیے اور پریشان نہ ہونا چاہیے کیونکہ حق تعالیٰ حکیم ہے یا نہیں۔

حق تعالیٰ شانہ کے ہر امر میں حکمت و مصلحت ہوتی ہے

چنانچہ اسی آیت میں "وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ" (اور وہ زبردست حکمت والا ہے) فرمایا ہے اسی لیے ان کی کسی نعمت کے روکنے میں کوئی مصلحت ہوتی ہے خود میرا واقعہ ہے کہ ابتداء میں جب کہ جوش زیادہ تھا ایک مرتبہ خیال ہوا کہ ہم کو طلب بھی ہے اور یہ بھی مسلم ہے کہ حق سبحانہ کو ہماری حالت کا علم ہے اور یہ بھی مسلم ہے کہ ان کو قدرت تامہ بھی حاصل ہے اور کریم بھی ہیں پھر ان باتوں کے ہوتے ہوئے

دیر کیوں ہے اس کا جواب میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ جب بہت پریشانی بڑھی تو خیال ہوا کہ مولانا رومی سے مشورہ لوں یہ خیال کر کے مثنوی کھولی تو پہلے ہی صفحہ پر اشعار نکلے جن میں چاروں مقدمے وہ تھے جو میں نے قائم کیے تھے اور پانچواں مقدمہ اور تھا جو کہ میرے ذہن میں نہ تھا جس کے نہ ہونے کے سبب میری سمجھ میں جواب نہ آتا تھا یعنی یہ کہ وہ حکیم بھی ہیں اور اس تاخیر میں حکمت ہے اشعار مذکورہ یہ ہیں:

چارہ میجوید پے من درد تو　　　　می شنو دم دوش آہ سرد تو

می توانم ہم کہ بے ایں انتظار　　　　رہ نمایم داد ہم راہ گذار

تا ازیں طوفاں دوراں وارہی　　　　برسر گنج و صالم پانہی

لیک شیرینی و لذات مقر　　　　ہست بر اندازہ رنج سفر

انگہ از فرزند و خویشاں برخوری　　　　کز غریبی رنج محنتہا بری

(تیرا درد میرے وصال کی چارہ جوئی کر رہا تھا اور کل گزشتہ رات میں تیری آہ سرد بھی سنتا تھا' اس میں اس کے درد ولطف کو بھی مان لیا اور علم ورحمت کو بھی مان لیا' مجھ کو قدرت ہے کہ بغیر انتظار کر کے راستہ دکھاؤں اور راہ گزر کو ظاہر کردوں تا کہ زمانہ کے رنج والم کے طوفان سے چھٹکارا پائے میرے وصل کے خزانہ کو حاصل کرنے کے لیے' لیکن وطن کی لذت اور لطف سفر کے رنج وتعب برداشت کرنے کی مقدار پر ہے' اس وقت خویش واقارب' اہل وعیال کی صحبت کا لطف حاصل ہوسکتا ہے کہ مسافرت میں بہت سی تکلیفیں اور محنتیں اٹھائی ہیں)۔

حاصل اشعار کا یہ ہے کہ "یہ مسلم ہے کہ تمہارے درد عشق میرے وصال کی تدبیر کا طالب ہے اس میں میرا مقدمہ اولیٰ تسلیم کیا ہے اور میں کل رات تمہاری آہ سرد کو سنتا بھی تھا اس میں میرے مقدمہ ثانیہ کو مانا گیا ہے اور میں یہ بھی کرسکتا ہوں کہ تم کو اپنے وصال کی طرف رہنمائی کروں اور تمہیں آنے کے لیے راستہ دے دوں تا کہ تم گردش کے طوفان سے نجات پا جاؤ اور میرے گنج وصال پر پہنچ جاؤ۔"

اس میں میرے مقدمہ ثالثہ کو تصریحاً اور رابعہ کو اشارۃً تسلیم کیا ہے لیکن کسی قدر تاخیر کے بعد کیونکہ قاعدہ ہے کہ گھر کا مزہ اور اس کی لذت اسی قدر حاصل ہوتی ہے جس قدر کہ سفر میں تکلیف اٹھائی ہو اور تم کو اپنے بال بچوں اور عزیز واقارب سے مل کر لطف تام اسی وقت حاصل ہوتا ہے جبکہ سفر میں بہت کچھ تکلیفیں اور زحمتیں اٹھانا پڑیں۔ اس مضمون میں ایک مقدمہ خامسہ بتلایا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ہم حکیم بھی ہیں اور ہمارے کام مصلحت سے ہوتے ہیں اس توقف میں یہ مصلحت ہے کہ جب تمہیں ہمارا وصال نصیب ہو تو تمہیں اس کی قدر ہو' واقعی بات یہ ہے کہ جو راحت بہت سی تکالیف کے بعد حاصل ہوتی ہے اس میں نہایت ہی لطف آتا ہے۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ مجھے مولوی ناظر حسن کی بارات میں شریک ہونے کا

اتفاق ہوا (پہلے تو میں بارات میں شریک ہو جاتا تھا اب شریک ہونا چھوڑ دیا ہے) بارات دیر میں رخصت ہوئی اور راستہ ہی میں رات ہو گئی' مینہ اور آندھی رعد و برق کے ساتھ جو آئی لوگ اپنی اپنی گاڑیاں اڑا لے گئے ہماری گاڑی بھی اکیلی رہ گئی' غرض بے حد تکلیف ہوئی' اللہ اللہ کر کے تھانہ بھون آیا۔ جب میں گھر پہنچا ہوں میں نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت مجھے کس قدر لطف آیا ہے اور کس قدر راحت حاصل ہوئی ہے اسی پر ان سالکین کی حالت کو قیاس کر لینا چاہیے جو بہت سی تکالیف برداشت کرنے کے بعد مقصود تک پہنچتے ہیں۔ اب ایک بات اور بیان کرتا ہوں اس کے بعد بیان کو ختم کرتا ہوں وہ یہ کہ حق سبحانہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "وَمَا يُمْسِكْ فَلاَ مُرْسِلَ لَهُ مِنْ بَعْدِهِ" (اور جس کو بند کر دے اس کے بند کرنے کے بعد اس کا کوئی جاری کرنے والا نہیں) من بعدہ میں مضاف محذوف ہے اے من بعد امسا کہ چونکہ مضاف بلا ذکر بھی سمجھا جاتا تھا اس لیے اس کو حذف کر دیا گیا غرضیکہ قرآن میں لفظی اور معنوی دقائق و محاسن بے انتہا ہیں مگر جس قدر ان کو اہل زبان سمجھ سکتے ہیں غیر اہل زبان نہیں سمجھ سکتے۔ ایک شاعر کا واقعہ ہے کہ اس نے بڑی محنت اور دماغ سوزی کے بعد ایک شعر کہا اور اس پر بہت خوش ہوا۔ شعر یہ تھا:

سیہ چوری بدست آں نگاری نازنین دیدم　　بشاخ صندلیں پیچیدہ مار آتشیں دیدم

(میں نے اس نازک اندام خوبصورت مہندی لگے ہوئے ہاتھ میں سیاہ رنگ کی چوڑیاں دیکھیں' گویا شاخ صندلی پر لپٹا ہوا سانپ دیکھا)

اور بہت فخر کے ساتھ ایک اہل زبان شاعر کو سنایا اس نے سنتے ہی ناک چڑھائی اور بجائے اس کے کہ تعریف کرتا یہ کہا کہ تم نے شعر کا ناس کر دیا' نازنین دیدم آتشیں دیدم کیا ہے کہو۔

سیہ چوری بدست آں نگارے　　بشاخ صندلیں پیچیدہ مارے

(اس نازنین کے ہاتھ میں سیاہ چوڑیاں گویا صندلی شاخ پر لپٹا ہوا سانپ)

اس اصلاح نے شعر کو کہیں پہنچا دیا۔ واقعی زبان کا لطف اہل زبان ہی کو حاصل ہوتا ہے۔ غیر اہل زبان کو وہ لطف نہیں آتا۔

خاتمہ بر دعائے خیر

اچھا اب دعا کرو مولانا رومی کے لیے اور وعظ لکھنے والوں کے لیے بھی اور تمام مسلمانوں کے لیے بھی اور شارحوں کے لیے بھی کہ خداوند تعالیٰ ہر غلطی سے بچائیں۔ آمین

واخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین. وصلی اللہ علی خیر خلقه سیدنا ومولانا محمد وآله واصحابه وبارک وسلم.

سلسلہ حسن الموعظت کا وعظ ہشتم

مظاہر الاحوال

وعظ ہذا حال حقیقت کی تبدیلی میں اکسیر ہے اور دوام ترک معاصی عادۃً حال کے پیدا کرنے پر موقوف ہے۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ نَحۡمَدُهٗ وَنَسۡتَعِيۡنُهٗ وَنَسۡتَغۡفِرُهٗ وَنُؤۡمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيۡهِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَيِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ يَّهۡدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنۡ يُّضۡلِلۡهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ وَنَشۡهَدُ اَنۡ لَّآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحۡدَهٗ لَاشَرِيۡكَ لَهٗ وَنَشۡهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدًا عَبۡدُهٗ وَرَسُوۡلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيۡهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصۡحَابِهٖ وَبَارِكۡ وَسَلِّمۡ. اَمَّابَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيۡطٰنِ الرَّجِيۡمِ. بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ.

اِنَّمَا التَّوۡبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ السُّوۡٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوۡبُوۡنَ مِنۡ قَرِيۡبٍ فَاُوۡلٰٓئِكَ يَتُوۡبُ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا.

(النساء آیت نمبر ۱۷)

ترجمہ: ’’توبہ جس کا قبول کرنا اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے وہ تو ان ہی کی ہے جو حماقت سے کوئی گناہ کر بیٹھتے ہیں، پھر قریب ہی وقت میں توبہ کر لیتے ہیں، سو ایسوں پر اللہ تعالیٰ توجہ فرماتے ہیں اور اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں حکمت والے ہیں۔‘‘

ہر چند کہ خصوصیت وقت کا مقتضی یہ تھا کہ اس جلسہ میں علوم دینیہ کے فضائل اور ترغیب اور اس کی ضرورت بیان کئے جاویں جیسا کہ بارہا اکثر جلسوں میں اس کے متعلق بیان ہوا ہے لیکن پارسال یہ بات ذہن میں آتی تھی۔

علم کا مقصود اصلی عمل ہے

کہ اس کو بیان کرنا چاہیے لیکن اس سال ایسا اتفاق ہوا کہ بوجہ اعذار عارضہ حاضری سے قاصر رہا لیکن دل میں یہ بات کھٹکتی رہی کہ کوئی موقع ہو تو اس مضمون کو بیان کروں جلسہ عامہ نہ ہو تو جلسہ خاصہ ہی میں یہ مضمون ہو جاوے اس کے ساتھ ہی ایک بار یہ ہوا کہ اس مدرسہ کے طلباء نے اپنی محبت سے مجھ کو بلایا اور وعظ سننے کا شوق ظاہر کیا۔ یہ ان کی سعادت مندی ہے کہ انہوں نے اپنے اوپر یہ بار اٹھایا جس کی مجھ کو بہت مسرت ہے۔ چنانچہ میں حاضر ہوا اور میں نے عمل کے متعلق مختصر سا بیان کیا اور اس جلسہ کا بیشتر حصہ طلباء ہی تھے۔ بیان بھی وہ ایسا تھا کہ اس کے لیے جلسہ عامہ کی ضرورت نہ تھی۔ اس لیے کہ ضرورت عمل کی ہر چند کہ سب حضرات کو ہے اور سب اس

کو ضروری جانتے ہیں مگر طلباء کے لیے جس درجہ کی ضرورت ہے حق یہ ہے کہ ان میں اکثر اس کو اس درجہ میں ضرورت نہیں سمجھتے اس درجہ سے بہت کمی ہے چونکہ روئے سخن جماعت خاصہ کی طرف تھا اس سے اس بیان کے لیے جلسہ خاصہ ہی کی ضرورت تھی۔ الحمد للہ وہ مضمون ادا ہوگیا اور میری خواہش پوری ہوگئی اور اس تقریر کا لقب مظاہر الاعمال رکھا گیا۔ پس اس وقت تک کے جلسوں میں دو چیزیں نہایت ضروری یعنی اول علم دوسرے عمل نہایت کافی طور سے بیان ہوچکیں۔

حالی پیدا کرنے کی ضرورت

اس کے بعد ایک تیسری چیز کی ضرورت خیال میں آئی جو ضرورت میں پہلی دو چیزوں سے کم نہیں اس لیے کہ ان دونوں کا نفع اس تیسری شے پر موقوف ہے اگرچہ حصول ان کا اس ثالث پر موقوف نہیں لیکن یہ تیسری شے ان دونوں سے انتفاع کی موقوف علیہ ضرور ہے۔ بحمد اللہ اس کے بیان کا موقع آج ملا ہے۔ پس آج میں علم و عمل کی ضرورت کو بیان نہ کروں گا' اس لیے کہ ان کا بیان ہوچکا۔ آج ایسی شے بیان کروں گا کہ اکثر لوگ اس کی حقیقت سے بے خبر ہیں اور اس کی جس درجہ ضرورت ہے اس سے عوام تو کیا بعض خواص بھی ناآشنا ہیں۔ الحمد للہ کہ جلسہ عامہ میں اللہ تعالیٰ نے اس کے بیان کا موقع میسر فرمایا۔ یہ آیت جو میں نے پڑھی ہے اس میں سے اس تیسری شے کا استنباط ہوسکتا ہے بلکہ اگر غور کیا جاوے تو اس آیت کو اس شے کی صریح دلالت ہے۔ چنانچہ مفصل تقریر استدلال کی آگے بیان کی جاوے گی' میری تقریر سن کر سامعین کو تعجب ہوا ہوگا کہ علم و عمل کے سوا تیسری شے کیا ہے اس لئے کہ تمام پند و نصیحت کا خلاصہ اور جان علم و عمل ہے اس کے سوا تیسری شے کیا ہوگی اور بعض کو سن کر فکر بھی ہوا ہوگا کہ علم و عمل ہی کا بار ہم سے نہ اٹھ سکتا تھا اب اس تیسری شے کی اور مصیبت آئی۔ یہ وہی مثل ہوئی بلائے تھے دو' آ بیٹھے تین۔

صاحبو! آپ اپنے اوپر گرانی نہ لیجئے۔ وہ تیسری شے ایسی ہے کہ دو پہلی چیزوں کی جو آپ کو گرانی ہے وہ اس کو بھی اٹھا دے گی ان دونوں مہمانوں کا بار جو آپ پر تھا کہ دیکھئے یہ کس قدر کھاتے ہیں۔ اس تیسرے مہمان کی خبر سن کر آپ زیادہ نہ گھبرائیے اس لیے وہ تیسرا آ کر ان دو کے بار کا متحمل ہوجائے گا اور آپ کو بالکل ہلکا کردے گا۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ آپ کے یہاں دس مہمان آجاویں اور آپ کو ان کا کھانا کھلانا بھاری ہورہا ہے' ایک گیارھواں مہمان آیا اور وہ اس قدر کھانا لایا کہ ان دس نے بھی کھالیا اور دس کا کھانا بچ بھی گیا تو ایسے مہمان کا آنا بہت مبارک ہے۔ پس آپ کو یہ تیسری شے سے گرانی نہ ہونی چاہیے اور نہ تعجب ہونا چاہیے۔ آپ کو یہ تعجب اس لیے ہے کہ مضامین

کے سمجھنے اور سننے اوراس تیسری شے سے انتفاع کی عادت نہیں رہی۔ یادرکھو وہ تیسری شے ایسی ہے وہ آپ کی تمام گرانیاں اور تمام مصیبتیں دفع کردے گی۔ یہ بدگمانی نہ کرو کہ وہ تیسرا مہمان بہت سا کھا جاوے گا۔ صاحبو! اس کو آپ اپنے یہاں جگہ دے دو وہ تم سے کھانا نہیں مانگتا صرف ٹھکانا مانگتا ہے ذرا جگہ دے دو پھر دیکھو وہ کیا کام کرتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ہماری تمام مشقتیں جاتی رہیں اب تو آپ سن کر اور بھی حیران ہوئے ہوں گے اور شوق کے ساتھ جستجو بھی ہوئی ہوگی کہ وہ کیا شے ہے میں اول اس کا پتہ بیان کردوں کہ وہ مہمان کہاں رہتا ہے اور اس کا کیا حلیہ ہے۔ وہ صدر نشین ہے یعنی آدمی کے دل میں رہتا ہے حاشیہ نشین نہیں ہے کہ ہاتھوں یا پاؤں میں رہتا ہو اس لیے کہ وہ شریف اور صدر ہے اس لیے صدر ہی پر رہنا چاہتا ہے اگر پچاس دفعہ تم کو غرض پڑے اس کو صدر میں بٹھلاؤ پھر دیکھو وہ کیا گل کھلاتا ہے۔ اگر اعتقاد سے اس کو نہیں بٹھلاتے امتحان ہی کے طور پر جگہ دیدو علی سبیل التزل کہا جاتا ہے کہ وہ اگر نافع نہیں ہے تو مضر تو کسی طرح نہیں جیسے بعض ہلکی دوائیں ہوتی ہیں اگر ان کو طبیب کی تقلید سے استعمال کیا جاوے تو وہ نفع کرتی ہیں اور نفع نہیں تو ضرر تو کسی صورت نہ کریں گی۔ سو صاحبو! آپ اس کو جگہ دے کر تو دیکھئے اگر نافع ثابت نہ ہوگا تو پھینک دیجئے' نکال دیجئے' میں آپ کو بدون امتحان کیسے یقین دلاؤں اور میں تو بلا تردید کہتا ہوں کہ نافع ہے بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ ہم لوگوں کے اندر جو خرابیاں ہیں یہ تمام تر اسی تیسری شے کے نہ ہونے سے ہیں عوام تو اس کے نہ ہونے کے سبب علم و عمل سے بے بہرہ ہیں اور علماء اس کے نہ ہونے سے اپنے علم سے منتفع نہیں ہیں اور خواص یعنی عاملین اس کے فقدان سے عمل کے کمال سے محروم ہیں ہم لوگ جو مولوی کہلاتے ہیں نیک صالح مشہور ہیں لیکن اپنے علم و عمل سے اس لیے کافی حصہ حاصل نہیں کر سکتے کہ اس تیسری شے کا اس میں میل نہیں ہے اور اس کا میل نہ ہونے سے ہمارے علم و عمل کی وہ حالت ہے جو حدیثوں میں آیا ہے: "یقرؤن القرآن لایجاوز حناجرھم" یعنی وہ لوگ قرآن پڑھیں گے لیکن وہ قرآن ان کے گلے ہی میں رہے گا یعنی اس کی حقیقت مجرد صورت ہوگی' گلے سے آگے نہ بڑھے گا یعنی اوپر نہ چڑھے گا کہ قابل قبول نہیں یا نیچے نہ اترے گا یعنی دل میں کچھ اثر نہ ہوگا پس بغیر اس تیسری شے کے کوئی عمل قابل اعتماد نہیں ہے اب تو آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ وہ تیسری شے کس درجہ ضروری ہے۔ اب میں اس کا نام بتائے دیتا ہوں وہ شے دل ہے مگر وہ عرسوں اور میلوں کا حال نہیں ہے کبھی آپ لوگ خوش ہوں کہ آج تو حال کی تعلیم ہوئی ہے پس حال کھیلنے کی اجازت ہوگی تو یادرکھو وہ کوئی کھیلنے کی چیز نہیں ہے اور نہ وہ ہال ہاہوز سے ہے یعنی ہلنا بھی نہیں ہے۔

حال کا مفہوم

وہ حال بحاظی ہے اور تحویل بمعنی تبدیل سے ہے یعنی وہ ایک حقیقت کو دوسری حقیقت سے بدل دیتا ہے وہ آپ کو تانبے سے سونا بلکہ اکسیر بنانے والا ہے یعنی کامل و مکمل بنانے والی بات یہ ہے کہ اگر صرف تانبے کو سونا بنادے جو کہ کیمیا کا خاصہ ہے تو وہ تانبا خود تو کامل بن گیا اور اس کی حقیقت بدل گئی لیکن وہ دوسرے تانبے کو تو سونا نہیں بنا سکتا۔ چنانچہ تانبے کو سونے سے مس کرنے سے وہ سونا نہیں بن سکتا۔ یہ خاصہ اکسیر ہی کا ہے کہ جس شے کے ساتھ اس کا تعلق ہوتا ہے اس کو سونا بنادیتا ہے تو حال وہ شے ہے کہ آپ کو اکسیر یعنی ایسا کامل کردے گا کہ آپ سے دوسروں کی تکمیل ہو سکے گی اور یہ مضمون کوئی رنگین نہیں ہے کہ کانوں کو خوش معلوم ہو بلکہ دل میں جگہ دینے کی چیز ہے۔ الحاصل تین چیزیں ضروری ہوئیں علم، عمل، حال اول دو کی ضرورت بارہا بیان ہو چکی۔ اس وقت حال کی حقیقت اور اس کی ضرورت کا بیان ہے جاننا چاہیے کہ میری مراد حال ہے۔

حال اور مقام کی تحقیق

یہاں وہ حال مصطلح صوفیاء کا نہیں ہے کہ جس کو وہ مقام کے مقابلہ میں اطلاق کرتے ہیں وہ تو کیفیت غیر راسخہ کو حال اور راسخہ کو مقام کہتے ہیں میری مراد حال سے متعلق وہ کیفیت ہے جو بالمعنی الاعم حال اور مقام دونوں کو شامل ہے۔ حقیقت اس کی صرف اس قدر ہے کہ قلب میں کوئی بات غلبہ کے ساتھ پیدا ہو جاوے اس تقریر سے آپ کو روشناسی کے مرتبہ میں اجمالاً اس تیسری شے کا علم ہو گیا ہو گا لیکن بصیرت کے ساتھ اس کا ادراک نہیں ہوا اور ضرورت اس کی ہے کہ کما حقہ اسکا علم آپ کو ہو اس لیے کہ جس مبحث کا موضوع متعین نہ ہو اور علی وجہ الکمال اس کا علم نہ ہو تو اس کے متعلق جس قدر محمولات اور احکام ہیں وہ سب بیکار ہوں گے اور اوپر اوپر اڑتے چلے جائیں گے اور اس کی تفصیل بالکل بیکار ہوگی اس لیے موضوع مطلوب کی حقیقت اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ حقیقت تو اس کی یہی ہے کہ کوئی بات غلبہ کے ساتھ دل میں پیدا ہو جاوے اگر وہ راسخ ہو جاوے تو حال راسخ ہے جس کو صوفیاء مقام سے تعبیر کرتے ہیں اور اگر غیر راسخ ہے تو حال غیر راسخ ہے جس کو وہ حال بالمعنی الاخص کہتے ہیں اب میں اس کو موٹی سی مثال سے واضح کرتا ہوں۔

دیکھئے آپ اولاد کی پرورش کرتے ہیں ان کے لیے کماتے ہیں مشقتیں اٹھاتے ہیں، اولاد اگر بیمار ہو تو پہلے آپ بیمار ہو جاتے ہیں، معالجہ کرتے ہیں ان کے آرام کو اپنے آرام پر ترجیح دیتے ہیں، کبھی آپ نے اس میں بھی غور کیا ہے کہ یہ سب بار آپ کیوں اٹھاتے ہیں اس کا منشا کیا ہے

آیا اس کا منشاف صرف اس قدر ہے کہ آپ نے علماء سے سنا ہے کہ ماں باپ کے ذمہ اولاد کا حق پرورش ہے۔ کیا ان مشاق ومتاعب کے برداشت کے لیے اتنا ہی علم کافی ہے کہ ان کے حقوق ہمارے ذمہ ہیں ہرگز نہیں اگر صرف اسی قدر ہوتا اور کوئی بات اس سے زائد تمہارے قلب میں نہ ہوتی تو تم سے یہ حقوق ہرگز ادا نہ ہوتے اور اگر ہوتے بھی تو قلب پر بے انتہا مشقت ہوتی۔ یقینی بات ہے کہ وہ چیز جو تم سے یہ بار اٹھوا رہی ہے وہ کوئی دوسری شے ہے وہ کیا چیز ہے محبت اور تعلق کہ اس نے یہ سب تلخیاں شیریں کر دی ہیں۔

ضابطہ کا تعلق حقوق کے ادا کرنے کے لیے کافی نہیں ہے

حضرت خوب سمجھ لیجئے کہ صرف ضابطہ کا تعلق حقوق پرورش کے ادا کرنے کے لیے کافی نہیں ہے دوسری مثال اور لیجئے دیکھئے اگر بیوی سے محبت نہ ہو صرف قانونی تعلق ہو تو یہ قسم قسم کے زیور اور نوع بنوع کے جوڑے آپ ہرگز نہ بناویں اور بیمار ہوتی ہے تو سینکڑوں روپیہ جو آپ خرچ کرتے ہیں ہرگز نہ کریں' اس لیے شرعاً زوج کے ذمہ زوجہ کا معالجہ نہیں اسی طرح زوجہ کو اگر زوج سے محبت نہ ہو تو خانہ داری کے متعلق وہ خدمات جو قانون شرع سے اسکے ذمہ نہیں ہرگز نہ کرے۔ ہمارے تھانہ بھون میں ایک مرتبہ ایک مولوی صاحب واعظ آئے تھے انہوں نے وعظ میں یہ کہہ دیا کہ کھانا پکانا عورتوں کے ذمہ نہیں ہے جن عورتوں پر قانونیت غالب تھی وہ بہت خوش ہوئیں اور انہوں نے اپنے خاوندوں کی مخالفت شروع کر دی۔ میں نے جب یہ رنگ دیکھا تو میں نے وعظ میں یہ کہنا شروع کیا کہ اگر کھانا پکانا عورتوں کے ذمہ نہیں ہے تو دوا دارو کرنا مردوں کے ذمہ نہیں لیکن یہ اثر ان ہی عورتوں پر ہوا تھا کہ جن پر ضابطہ اور قانون غالب تھا اور جن میں محبت تھی ان کو کچھ اثر نہیں ہوا۔

خلاصہ یہ ہے کہ قانون اور ضابطہ کا یہ اثر ہے کہ اس کو سن کر زائد کام سے ہمت قاصر ہو جاتی ہے اور جو اہل تعلق ہیں ان میں ضابطہ کے جاننے سے تفاوت نہیں ہوتا۔ میں خود اپنی ہی حالت کہتا ہوں کہ طالب علمی سے پہلے تو کچھ نفلیں پڑھنے کی توفیق ہوتی بھی تھی اور جب سے نفلوں کی تعریف پڑھی کہ نفل زائد کو کہتے ہیں اگر نہیں پڑھے گا تو گناہ نہ ہوگا اس دن سے چھوٹ گئیں اس لیے قانونی تعلق تھا محبت کا میل نہ تھا۔ پس اگر آپ کو محبت اور عشق ہے تو گو آپ سمجھتے ہیں کہ یہ خدمات ہم پر واجب نہیں ہیں۔ مثلاً بیوی کا معالجہ واجب نہیں ہے اور اگر آپ ان کو نہ کریں تو کوئی گناہ نہیں لیکن آپ وہ دل کہاں سے لاویں گے کہ آپ اولاد کو بیوی کو بیمار دیکھیں اور آپ چین سے بیٹھ رہیں۔ آپ سے یہ ہرگز نہ ہو سکے گا کہ آپ خود تو پانچ روپے گز کا کپڑا پہنیں اور بیوی کو دو آنہ گز کا پہناویں۔

پس یہ محبت ہی ہے جو آپ سے ان مشقتوں کو نہایت سہولت سے تحمل کرا رہی ہے اور یہ حق تعالیٰ کی بڑی عنایت ہے کہ حقوق کے واجب فرمانے کے ساتھ اہل حقوق کی ایسی محبت بھی لگا دی کہ اگر حقوق ادا نہیں کرتے تو قلب میں تکلیف ہوتی ہے۔ پھر کام ایسا بتایا کہ اگر فرض بھی نہ ہوتا تب بھی ہم اپنی رفع تکلیف اور تحصیل راحت کے لیے لامحالہ کرتے اور فرض کرنے کے بعد جو ادا کرتے ہیں تو ثواب بھی ہے اور لذت بھی اور زیادہ قلوب ایسے ہی ہیں اور بعضے ایسے بھی ہیں جن میں محبت نہیں بھی ہوتی۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسن رضی اللہ عنہ یا حسین راضی اللہ عنہ کو پیار کرر ہے تھے۔ اقرع بن جابس رضی اللہ عنہ رئیس نجد کے بیٹے تھے ان کو تعجب ہوا انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے تو دس بیٹے ہیں میں تو کبھی ایک کو بھی پیار نہیں کرتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا کروں اگر تمہارے قلب سے اللہ تعالیٰ نے رحمت نکال لی ہو۔

محبت اور تعلق ایک وجدانی شے ہے

الحاصل محبت اور تعلق ایک وجدانی شے ہے کہ جس کے اندر وہ موجود نہیں ہے ایسے شخص کو اس کے آثار دیکھ کر تعجب ہوتا ہے میرے ایک دوست ہیں ان کے سامنے کسی نے اشعار پڑھے اور لوگوں کو تو بہت لطف آیا وہ کہنے لگے کہ لوگ کہتے ہیں کہ اشعار میں مزہ ہے ہم کو تو کچھ بھی مزہ نہیں آتا' شعر بھی کوئی مزہ کی چیز ہے نہ میٹھے ہیں نہ نمکین' گویا ان کے نزدیک مزہ یہی تھا کہ کوئی شے میٹھی یا نمکین ہو اور جن کو لطف آتا ہے وہ کہتے ہیں لذات الافکار خیر من لذات الابکار دیکھئے عنین کو اگر کوئی سمجھائے کہ عورت میں کیا لطف ہے تو ہرگز نہیں سمجھا سکتا' اندھے مادرزاد کو اگر دیکھنے کی حقیقت سمجھاؤ تو ممکن نہیں ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ وجدانیات کو الفاظ سے نہیں سمجھا سکتے مگر جس کو وہ شے حاصل ہے اس کو آثار سے سمجھا سکتے ہیں۔ پس یہ کیفیت محبت کی جو آپ کو سہولت سے طرح طرح کے مصائب کا تحمل کرا دیتی ہے اور اس کے سبب سے اولاد و بیوی و ماں باپ کے حقوق آپ ادا کرتے ہیں ایسی ہی کیفیت کا نام حال ہے۔

جس طرح اولاد بیوی وغیرہ کے حقوق ہیں اسی طرح حق تعالیٰ کے بھی ہیں

اب آپ غور کیجئے کہ جس قدر حقوق آپ کے ذمہ اولاد بیوی ماں باپ کے ہیں خدائے تعالیٰ کا بھی کچھ حق ہے یا نہیں اور جو محبت آپ سے یہ حقوق ادا کرا رہی ہے حق تعالیٰ بھی ایسی محبت کے مستحق ہیں یا نہیں۔

محبت کا انحصار تین باتوں پر ہے

غور کر کے جو دیکھا جاتا ہے تو مدار اس محبت اور حقوق کا صرف تین چیزیں ہیں جمال' کمال' نوال یعنی عطاء وانعام تو کیا خدائے تعالیٰ کے اندر کوئی کمال نہیں یا اس کی طرف سے کوئی انعام نہیں یا اس کے اندر جمال نہیں ظاہر ہے کہ مرکز تمام کمالات کی وہ ہی ذات پاک ہے اور جو کمال اوروں کے اندر دیکھا جاتا ہے وہ اسی کے کمال کا پرتو ہے۔

حسن خویش از روئے خوباں آشکارا کردہ　　پس بچشم عاشقاں خودرا تماشا کردہ

(تو نے اپنی خوبی کو خوبصورتی کے چہروں سے ظاہر کر دیا ہے مگر عاشقوں کی نظروں میں نمایاں بن گیا ہے)

پرتو حسنت نگنجد درزمین و آسمان　　درحریم سینہ حیرانم کہ چوں جاں کردہ

(تیرے حسن کا پرتو نہ زمین میں سما سکتا ہے نہ آسمان میں' میں حیران ہوں کہ میرے سینہ کی چار دیواری میں کس طرح سمایا ہے)

بڑی حماقت ہے ان لوگوں کی جو ایسے جمیل حقیقی کو چھوڑ کر جمال مستعار کو اپنا قبلہ توجہ بناتے ہیں ان کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے کوئی دیوار پر آفتاب کا عکس دیکھ کر بالذات اس کو چمکیلا سمجھ کر اس پر عاشق ہو جاوے۔ جب آفتاب غروب ہو جاوے گا اور اپنی چمک ساتھ لے جاوے گا اس وقت معلوم ہوگا کہ یہ فیض آفتاب کا تھا۔ ایسے ہی یہ محبوبان مجازی جن پر ہم لوگ لٹو ہو رہے ہیں ان کا حسن و جمال محض عاریتی ہے۔ فی الحقیقت یہ مردہ ہیں۔

عشق با مردہ نباشد پائے دار　　عشق را باحی و قیوم دار

(مردہ کے ساتھ عشق کی پائیداری نہیں ہے اس لیے حی و قیوم کا عشق اختیار کرو)

عشقہائے کز پے رنگے بود　　عشق نبود عاقبت ننگے بود'

(جو عشق ہمیشہ باقی ہے جو عشق محض رنگ وروپ پر ہوتا ہے اس کا انجام حسرت وندامت ہے)

عاشقی با مردگاں پائندہ نیست　　زانکہ مردہ سوئے ما آئندہ نیست

(عشق حقیقی میں غرق ہو جاؤ اس میں غرق ہونا اولین و آخرت کا عشق ہے)

عاشق صورت پر حق تعالیٰ کی عقوبت ہے کہ ساری عمر گھلتا ہے اور جلتا ہے اور حاصل کچھ نہیں اس لیے کہ محبوبان مجازی کے اندر وفا نہیں ہے۔ عاشق اپنا جان و مال آبرو سب کچھ دے دیتا ہے اور وہ منہ بھی نہیں لگاتے اور اگر ملے بھی تب بھی عاشق صورت کو چین نہیں ہے اور انجام یہ ہوتا ہے کہ یا

تو محبوب اس کو چھوڑ کر چل دیتا ہے یا عاشق جدا ہو جاتا ہے بخلاف محبوب حقیقی کے کہ اس کی محبت میں حلاوت چین اطمینان اور محبت اتنی کہ اگر کوئی جھوٹ موٹ بھی اس کا نام لے تو وہ بھی خالی نہیں جاتا۔

ایک بت پرست کی حکایت ہے کہ وہ ہر وقت بت کے سامنے معتکف ہوا بیٹھا رہتا اور نرے اعتکاف ہی پر اکتفانہ کرتا تھا بلکہ اس کا نام بھی جپتا تھا یعنی صنم صنم کا وظیفہ پڑھا کرتا تھا اس کا وہ حال تھا۔ ابونواس کہتا ہے:

الا فاسقنی خمرا وقل لی ھی الخمر　　ولا تسقنی سراً متیٰ امکن الجھر

(مجھے شراب محبت پلا اور مجھ سے کہو کہ یہ شراب ہے اور مجھے پوشیدہ مت پلا جب تک ظاہر کرنا ممکن ہو)

یعنی خبردار مجھ کو شراب پلا اور کہہ کہ یہ خمر ہے اور خفیتاً مت پلا جبکہ علی الاعلان پلانا ممکن ہے۔

یہاں سے ایک راز معلوم ہوا وہ یہ ہے۔

محض دعویٰ محبت کافی نہیں

جو شخص محبت کا دعویٰ کرے اور کبھی اللہ کا ذکر نہ کرے وہ دعویٰ محبت میں جھوٹا ہے جس سے محبت ہوتی ہے جی یہ چاہا کرتا ہے کہ ہر وقت اسی کی باتیں کریں جیسے مجنوں کی حکایت ہے:

دید مجنوں را یکے صحرا نورد　　در بیابان غمش بنشستہ فرد

(مجنوں کو کسی نے جنگل بیابان میں دیکھا کہ اکیلا بیٹھا ہے)

ریگ کاغذ بود انگشتاں قلم　　می نمودے بہرکس نامہ رقم

(اور انگلیوں سے ریت پر کچھ لکھ رہا ہے)

گفت اے مجنوں شیداں چیست ایں　　می نویسی نامہ بہر کیست ایں

(اس نے کہا اے مجنوں یہ کیا کر رہے ہو اور یہ کس کو خط لکھ رہے ہو)

گفت مشق نام لیلیٰ میکنم　　خاطر خود را تسلی میدہم

(اس نے کہا لیلیٰ بیٹھے لکھ رہا ہوں اور دل کو ٹھنڈا کر رہا ہوں)

دیکھئے مجنوں کے اس لیلیٰ لیلیٰ لکھنے اور کہنے سے لیلیٰ اس کو مل نہیں گئی۔ لیکن محبت کا خاصہ ہے کہ اگر محبوب نہ ملے تو اس کو نام ہی سے تسلی کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ وہ کافر صنم صنم کر رہا تھا اشد درجہ کا کافر تھا چاہتا تھا کہ محبوب حقیقی کا تک بھی نہ آوے اگر بھولے سے تصور بھی مالک حقیقی کا آ جاتا تو اس پر اس نے ایک ڈانٹ لگا دی کہ صنم صنم پکارتا تھا۔ حسب عادت وہ اسی طرح ایک روز صنم صنم کہہ رہا تھا' زبان بہک کر اس کی زبان سے

ایک بار صمد نکل گیا معاً آواز آئی لبیک یا عبدی لبیک یعنی حاضر ہوں میں اے میرے بندے کہہ کیا کہتا ہے اس پر ایک حالت طاری ہوئی اور چیخ مار کر بیہوش ہوگیا۔ جب افاقہ ہوا بت کو خطاب کر کے کہا کہ کم بخت تجھ پر خدا کی مار اتنے دنوں سے میں تیرا نام لیتا تھا کبھی ایک دن بھی تیرے منہ سے جواب نہ نکلا' قربان ہوں میں اپنے مالک حقیقی کے کہ بھولے سے ایک مرتبہ اس کا نام میرے منہ سے نکلا فوراً جواب آیا کاش میں پہلے سے اسی کو پکارتا اگر کوئی کہے کہ ہم تو اتنے دنوں سے اللہ کا نام لے رہے ہیں ہم کو تو ایک مرتبہ بھی لبیک نہ کہا۔ حضرت آپ کو بھی لبیک کہا جا رہا ہے اور آپ کے لبیک کے سامنے اس بت پرست کے لبیک کی کچھ بھی حقیقت نہیں اس نے تو ظاہری کانوں ہی سے لبیک سنا اور ایک ہی مرتبہ سنا اور آپ کا قلب جو اشرف الاعضاء ہے ہر وقت لبیک سن رہا ہے۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے حکایت لکھی۔

عبادت کے مقبول ہونے کی علامت

ایک شخص عبادت کیا کرتا تھا کہ ایک روز اس کو شیطان نے بہکایا' اس کو یہ خیال آیا کہ میں ذکر اور عبادت کرتے کرتے تھک گیا اور ادھر سے نہ پیام ہے نہ جواب ہے۔ یہ خیال کر کے اس روز وہ تمام اپنے اوراد اور عبادت چھوڑ کر سو رہا۔ خواب میں حق تعالیٰ کا پیام آیا کہ تو نے آج ہمارا نام نہیں لیا' عرض کیا کہ نام کیا لوں نہ کچھ جواب ہے نہ پیام ہے' ارشاد ہوا کہ یہ جو تو ہمارا نام لیتا ہے اور تجھ کو توفیق نام لینے کی ہوتی ہے یہی ہماری طرف سے لبیک ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

گفت آں اللہ تو لبیک ماست　　　　دیں نیاز و سوز و دردت پیک ماست

(انہوں نے کہا کہ تمہارا اللہ کہنا ہماری لبیک ہے تمہارا سوز و درد ہماری پکار ہے)

ہمارے پیر و مرشد حضرت حاجی صاحب قبلہ قدس سرہ نے اس کی شرح فرمائی کہ دیکھو اگر کوئی تمہارے یہاں آوے اگر اس کا آنا تم کو اچھا معلوم ہوتا ہے تو اس کو آنے دیتے ہو اور اگر اس کا آنا مکروہ معلوم ہوتا ہے تو ایک مرتبہ طوعاً کرہاً آنے دیتے ہو پھر اس کو منع کر دیتے ہو تو اگر کوئی ایک مرتبہ اللہ کا نام لیتا ہے اور اس کو پھر توفیق دوسری مرتبہ نام لینے کی ہوئی تو سمجھ لو کہ وہ پہلا اس کا نام لینا مقبول ہوگیا۔ اگر مقبول نہ ہوتا تو دوسری مرتبہ اس کو توفیق نام لینے کی نہ ہوتی۔ اگر کسی نے صبح کی نماز پڑھی اور ظہر کے وقت کی پھر پڑھی تو یہ علامت ہے اس کی کہ اس کی صبح کی نماز مقبول ہوگئی۔ اگر مقبول نہ ہوتی تو ظہر کے وقت اس کو دربار میں گھسنے کی ہرگز اجازت نہ ہوتی اس پر ایک حکایت یاد آئی۔

غلام نمازی اور آقا بے نمازی کی حکایت

ایک آقا کا غلام نمازی تھا اور آقا بے نمازی تھا' دونوں بازار میں چلے جارہے تھے اتنے میں نماز کا وقت آ گیا اور ایک مسجد سامنے آ گئی۔ غلام نے کہا کہ حضور میں نماز پڑھ لوں' آقا نے اجازت دیدی کہ جلدی پڑھ آؤ' میں مسجد کے دروازے پر بیٹھا ہوں۔ غلام نے مسجد میں جا کر نہایت اطمینان اور خشوع وخضوع سے نماز شروع کی اور نماز سے فارغ ہو کر وظیفہ وغیرہ پڑھ رہا تھا کہ آقا نے آواز دی کہ آ جاؤ' غلام نے جواب دیا کہ آنے نہیں دیتا' آقا نے کہا کون نہیں آنے دیتا کہا کہ جو تم کو اندر نہیں آنے دیتا وہ مجھے باہر نہیں آنے دیتا۔

الحاصل یہ ان کی عنایت ہے اور علامت مقبولیت بھی ہے کہ آپ کو پھر توفیق اس کی یاد کی ہو گئی ورنہ آپ کیا کر سکتے ہیں۔ حضرت آپ اپنے اعمال پر کیا ناز کرتے ہیں وہ اگر ادھر سے توفیق نہ ہو تو ایک رکعت بھی نہیں پڑھ سکتے۔ یہ حق تعالیٰ کا احسان ہے کہ آپ سے کام لے رہے ہیں۔

منت منہ کہ خدمت سلطان ہمیکنی   منت شناسا زو کہ بخدمت بداشتت

(یہ احسان مت رکھ کہ تو بادشاہ کی خدمت کررہا ہے بلکہ اس کا احسان مان کہ اس نے مجھے اپنی خدمت کے لیے رکھ لیا ہے۔)

یہ پھر عنایت پر عنایت یہ کہ ہمارے ناقص عمل کو قبول کر رہے ہیں اور اگر اس قدر عنایت نہ ہو تو ان کی بارگاہ کے لائق تو کسی مخلوق کا بھی عمل نہیں ہے ہماری نماز جو قسم قسم وساوس اور خطرات و مکروہات کا مجموعہ ہے اس قابل کہاں ہے کہ قبول ہو بلکہ ہمارا عمل تو خواہ کتنا ہی کامل ہو پھر بھی ناقص ہے اس لیے کہ نقصان ہمارے لوازم ذات سے ہے کسی طرح قابل انفکاک نہیں' ہمارا وجود ہی سراپا نقصان ہے' وجودک ذنب لا یقاس بہ ذنب۔ ہماری حمد وثناء بھی دلیل نقصان کی ہے۔

خود ثناء گفتن زمن ترک ثناست   کیں دلیل ہستی و ہستی خطاست

خود ہمارے اندر امکان ہے ایسا دھبہ ہے جو مرکز بھی رفع نہ ہوگا وجوب تو ایسی شے ہے کہ بالفرض اگر اس کا موصوف نہ رہے تو وجوب بھی جاتا رہے گا گو اس کے موصوف کا ارتفاع محال ہے مگر وہ قضیہ شرطیہ تو صادق ہے لیکن امکان ایسی بلا کی شے ہے کہ ممکن پر عدم طاری ہونے کے بعد بھی وہ کہیں نہیں جاتا اس لیے کہ ممکن کی اصل ہی خود عدم ہے۔ پس یہ امکان کی علت ایسی ہمارے ساتھ لگی ہوئی ہے کہ کسی حالت میں ہمارا اس سے پیچھا نہیں چھوٹتا۔ پس ہم کو کیسے توقع ہو سکتی ہے کہ ہمارا کوئی عمل اس دربار کے لائق ہے وہاں تو جب کوئی عمل مقبول ہوگا ناقص ہی ہوگا۔ پس ہم کو تو قوی امید ہے

کہ ہماری یہ نماز جس کو ہم ناقص سمجھتے ہیں اور فی الواقع سراسر ناقص ہے انشاء اللہ مقبول ہی ہوگی۔

ایں قبول ذکر تواز رحمت ست   چوں نماز مستحاضہ رخصت ست

(آپ کا ہمارے ذکر کو قبول فرمالینا ہی رحمت ہے جیسے مستحاضہ کی نماز مجبوراً سے قبول فرمالیتے ہیں)

دیکھئے مستحاضہ کے خون ٹپکتا ہے اور اس پر بھی اس کو حکم ہے کہ نماز پڑھ حالانکہ نماز بدون طہارۃ کے نہیں ہوتی لیکن اس کو شارع کی طرف سے کہا جارہا ہے "انت طاهرة انت مصلية" ایسے ہی ہماری نماز ہے کہ باوجود خطرات اور وساوس کی نجاست کے انشاء اللہ مقبول ہے اور یہی حال تمام اعمال کا ہے اب آپ کو اپنے لبیک کی حقیقت معلوم ہوئی ہوگی آپ کو ہر وقت لبیک کہا جارہا ہے اور آپ سن رہے ہیں مگر آپ بہرے بنے ہوئے ہیں۔

یہ آپ کا مچلا پن ہے پس بت پرست کی لبیک پر مت رنجھو وہ چونکہ حق سے بہت دور پڑا تھا اور بیگانہ تھا اور نیز فہم سے بالکل کورا بلکہ بمراحل بعید تھا اور منظور تھا کہ اس کو ہدایت ہو اس لیے اس کو فوراً لبیک بالصوت المسموع کہا گیا اور اس کے کان کو سنایا گیا تا کہ اس کا بہرہ پن دور ہو اس لیے کہ لسان حقیقت کی لبیک سننے سے وہ قاصر تھا اور آپ ماشاء اللہ مسلم ہیں۔ آپ کا قلب حق پرست اور حق شنو ہے آپ کے اندر لبیک حقیقی کے سننے کی قابلیت ہے پس آپ کو اگر اس کے حاسہ سمع سے لبیک سننے پر رشک ہے تو یہ آپ کا رشک بالکل بے محل ہے اس لیے کہ اس نے اگر کان سے ایک مرتبہ سنا تو آپ قلب سے ہر وقت سنتے ہیں اور آپ ہی بتلایئے کہ کان اور قلب میں کون افضل ہے۔

حق تعالیٰ جھوٹ موٹ نام لینے سے بھی عنایت فرماتے ہیں

بہرحال حق تعالیٰ کی وہ عنایت ورحمت ہے کہ اگر کوئی جھوٹ موٹ بھی اس کا نام لیتا ہے تو وہ اس کے حال پر بھی عنایت فرماتے ہیں۔

محبوب حقیقی کو چھوڑ کر دوسروں کی طرف توجہ کرنے سے غیرت حق کو جوش ہوتا ہے

پھر کتنا ظلم ہے کہ ایسے محبوب حقیقی کو چھوڑ کر دوسری طرف توجہ کی جاوے، غیرت حق کو بہت جوش آتا ہے اور اسی لیے عاشق صورت اور متوجہ الی الغیر سخت تکلیف میں رہتا ہے کسی طرح اس کو چین نہیں آتا۔ اے صاحبو! اس محبوب کو تم کیوں نہیں اختیار کرتے جو خود آپ کا طالب ہے۔

غرق عشقے شوکہ غرق است اندریں   عشقہائے اولیں و آخریں

(عشق حقیقی میں غرق ہو جاوے، اس میں غرق ہونا اولین وآخرین کا عشق ہے)

تو مگو ما را بداں شہ بار نیست   با کریماں کارہا دشوار نیست

(یہ مت کہو کہ ہمارا تو اس درگاہ میں دخل نہیں رہا اس لیے ہم پر یہ کام آشکار نہیں)

بہر حال کوئی کمال ایسا نہیں ہے کہ جو حق تعالیٰ کے اندر نہ ہو پس حق بھی ان کا سب سے زیادہ ہوگا بلکہ اصل حق اسی کا ہے پھر انصاف سے فرمایئے کہ جو کیفیت محبت اور تعلق کی آپ سے اولاد کے حقوق نہایت بشاشت سے ادا کرا رہی ہے کیا حق تعالیٰ کے حقوق بھی آپ اسی بشاشت اور سہولت سے ادا کرتے ہیں اور کیا آپ کے اندر وہ تعلق ہے یہ تو میں نہیں کہتا ہوں کہ نہیں خدا وہ دن نہ کرے کہ یہ تعلق نہ ہو، ہے لیکن بہت مغلوب اگر غالب ہے تو کیا وجہ ہے کہ آپ صبح کو سوتے رہتے ہیں اور نماز قضا ہو جاتی ہے یا جماعت فوت ہو جاتی ہے اور کیا وجہ ہے کہ اولاد اگر بیمار ہو تو تمام رات بیداری میں ختم ہو جاتی ہے اور تہجد کے لیے آپ سے نہیں اٹھا جاتا ہے یا اٹھتے ہوئے بہت کاہلی ہوتی ہے اس کی کوئی وجہ بجز اس کے نہیں ہے کہ دل میں لو نہیں وہ محبت کی نار شعلہ زن اگر کوئی کہے کہ ہم کیا کریں مجبور ہیں اولاد کی تو ہم کو محبت لگا دی گئی ہے اس لیے ان کے لیے ہم تمام مشقتیں برداشت کرتے ہیں اور حق تعالیٰ کی محبت اس درجہ نہیں ہے ہم کہتے ہیں کہ بتلاؤ جن کے دل میں حق تعالیٰ کی محبت اس درجہ کی ہے کیا اول ہی سے ہے یا بعد میں پیدا ہوئی ہے اس میں شک نہیں کہ بعض اولیاء اللہ ایسے بھی ہوئے ہیں اور ہیں کہ بدوں فطرت سے وہ مادر زاد ولی ہیں لیکن بہت کم ہیں اکثر تو ایسے ہی ہیں کہ ابتداء میں نہیں تھے اور مجاہدہ ریاضت کر کے انہوں نے اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کی ہے بلکہ بہت سے ایسے بھی ہیں کہ ابتداء عمر میں وہ نہ نماز پڑھتے تھے نہ روزہ رکھتے تھے اور بہت سے معاصی صغائر و کبائر میں بھی مبتلا تھے پھر حق تعالیٰ نے توفیق دی آج ان کی یہ حالت ہے کہ ان کی حالت بہت سے شیوخ سے بھی بہتر ہے بعضے عوام ایسے اب موجود ہیں کہ پہلے ان کی یہ حالت بہت ابتر تھی اب ان کی تہجد تک کی قضا نہیں ہوتی حقوق العباد کا ان کو بڑا اہتمام ہو گیا' بتلایئے کیا وہ ہمیشہ سے ایسے ہی تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اپنے کرنے سے اب بھی نہیں ہوئے خدا ہی نے ان کو ایسا کر دیا ہے لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ ان کی طرف سے کچھ طلب تو ہوئی یاد رکھو طلب کے بغیر کچھ نہیں ملتا' حق تعالیٰ خود ارشاد فرماتے ہیں "اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ" یعنی کیا ہم اپنی رحمت تم کو چپکا دیں اور تمہاری حالت یہ ہو کہ تم اس سے کارہ ہو کام تو وہی بنانے والے ہیں لیکن یہ دیکھتے ہیں کہ تمہاری طرف سے کچھ تو حرکت ہو۔ چنانچہ ارشاد ہے: "وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا" یعنی جو لوگ ہماری راہ میں مشقت و مجاہدہ کرتے ہیں ہم بیشک ضرور ان کو اپنے راستے بتلا دیں گے۔

مجاہدہ ومشقت پر وعدہ ہدایت ہے

دیکھئے مجاہدہ ومشقت پر وعدہ ہدایت ہے یہ تو ابتدائی حالت ہے اور انتہا یہ ہے کہ "وَاِنَّ اللّٰہَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ" یعنی بیشک اللہ نیک کاروں کے ساتھ ہے۔ الحاصل آپ کی طرف سے کچھ طلب ہونا چاہیے۔

طلب صادق اور غیر صادق کی پہچان

آپ شاید کہیں گے کہ ہم تو بہت چاہتے ہیں کچھ بھی نہیں ہوتا' صاحبو! آپ کے اس چاہنے کی ایسی مثال ہے جیسے ایک بھوکے کے پاس کسی نے ستو اور شکر اور پانی لاکر رکھ دیا اور کہہ دیا کہ بنایئے اور کھایئے تھوڑی دیر میں وہ شخص آیا تو دیکھا ستو اور شکر وغیرہ اسی طرح رکھا ہے۔ پوچھا کہ میاں تم نے کھایا نہیں کہنے لگے کہ میں نے تو چاہا تھا کہ کھاؤں مگر کھایا نہیں گیا' اس شخص نے پوچھا کہ کیونکر چاہا تھا' کہا میں نے اس کی تسبیح پڑھی تھی کہ تجھے کھاؤں تجھے کھاؤں مگر خاک اثر نہیں ہوا۔ پس جیسے اس شخص نے کھانا چاہا ایسے ہی آپ کی خدا طلبی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس شخص کو ہر عاقل دیوانہ کہے گا اور اس کو کہا جاوے گا کہ میاں چاہنا اس کو نہیں کہتے اگر تم پیٹ بھرنا چاہتے ہو تو یہ کرو کہ ستو میں شکر اور پانی ملاؤ اور اس کو گھولو اور منہ کھولو اور اس کو منہ میں رکھو اور پھر منہ چلاؤ اور پھر نگلو اسی طرح سارا ستو کھاؤ اس کو چاہنا کہتے ہیں۔ اگر پھر بھی پیٹ نہ بھرے تو شکایت کرو۔

طلب نری تمنا کا نام نہیں

اور چاہنا نام نری تمنا کا نہیں ہے یہ تمہاری غلطی ہے کہ تمنا کا نام تم نے طلب رکھا ہے نری تمنا اور رونے پیٹنے سے کام نہیں چلتا جیسے عرفی کہتا ہے:

عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال　　　　صد سال میتواں بہ تمنا گریستن

(عرفی اگر رونے سے وصال حق میسر ہوسکتا تو سو سال میں اس کی تمنا میں روسکتا ہوں)

بعض لوگ وعظ سنتے ہیں اور اس کا صرف اس قدر اثر لیتے ہیں کہ دو چار آنسو بہادیئے اور دو چار مرتبہ سانس بھر لیے بس ساری ولایت ختم ہوگئی۔ اس میں شک نہیں کہ رونا مفید ہے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی قدر ہے۔ جیسے مولانا فرماتے ہیں:

کیں تضرع رابر حق قدر ہاست　　　　کایں بہا کانجاست زاری راکجاست

(حق تعالیٰ کے یہاں ایسے تضرع کی قدر ہے اس قدر میں قیمت کہاں اور زاری کہاں)

لیکن بغیر عمل اور مجاہدہ کے اس رونے کی ایسی مثال ہے جیسے وضو کرلیا اور نماز نہیں پڑھی تو جس طرح نری وضو بغیر نماز کے کافی نہیں اسی طرح صرف رونا بھی کافی نہیں ۔عرفی کا شعر یہاں بھی یاد کرلو اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

لو کان ھذا العلم یدرک بالمنی ماکان یبقی فی البریتہ جاھد

(یعنی علم اور معرفت صرف تمنا اور خیال سے حاصل ہوجایا کرتا تو دنیا میں کوئی بھی اس سے محروم نہ رہتا)

فاجھد ولا تکسل ولاتک غافلا فندامۃ العقبیٰ لمن یتکاسل

(کوشش کرو اور عمل کرو اور جو کوئی کوشش کرتا ہے اس کو انجام کار پچھتانا پڑتا ہے)

اگر کوئی کہے کہ تم نے اول تو یہ دعویٰ کیا تھا کہ اس تیسری شے سے تمام گرانیاں دفع ہو جائیں گی یہاں تو تم نے پھر وہی محنت اور مشقت کی علت لگائی ۔بات یہ ہے کہ میں نے یہ کہا تھا کہ وہ تیسری شے ان تمام گرانیوں کو سہل کردے گی جو تم کو تکلیفات شرعیہ کے ادا کرنے میں پیش آتی ہیں اور خود اس شے کی تحصیل کے اندر جو مشقت پیش آوے گی اس کی میں نے نفی نہیں کی۔

حال کی تحصیل میں مشقت چند روزہ ہے بعد کو راحت ہے

اور یاد رکھو کہ حال کے تحصیل میں جو مشقت ہے وہ چند روزہ ہے اس کے بعد راحت ہی راحت ہے۔

چند روزے جہد کن باقی بخند

(چند روز کوشش کرو، باقی ہنسو)

اور اس چند روز کی کوئی میعاد نہیں ہے بعضوں کا چالیس ہی روز میں کام بن جاتا ہے' بعضوں کا اس سے بھی کم میں' بعضوں کو کچھ زائد مدت کی ضرورت ہوتی ہے اس کے لیے کوئی خاص قاعدہ نہیں ہے تو اتنی تھوڑی مدت کی مشقت ایسے گرانمایہ نفع کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں ہے' ہمارے حضرت حاجی صاحب قدس سرہ تو فرماتے ہیں:

متاع جان جاناں جان دینے پر بھی سستی ہے

جان دے کر بھی اگر یہ دولت ملے تو ارزاں ہے اس لیے کہ یہ جان کہاں سے آئی ہے یہ بھی تو ان کی ہی دی ہوئی ہے ایسی مثال ہے کہ ایک شخص کسی بڑے تاجر کی دکان پر گیا اور وہاں دیکھا کہ بڑی عجیب عجیب چیزیں فروخت ہورہی ہیں' اس کو ایک شے دیکھ کر لالچ آیا اس کی قیمت

دریافت کی تو معلوم ہوا کہ وہ شے ہزار روپے کی ہے۔ اب ہزار روپیہ کہاں ہے کہ خریدے اس تاجر نے اس کا افلاس دیکھ کر اپنے نوکر کو حکم دیا کہ اس شخص کو ایک ہزار روپیہ دے دو چنانچہ غلام نے ایک ہزار روپیہ اس کو دیدیئے اس نے اس روپے کی وہ شے خرید لی اب اس کو خریدنا اور مبادلہ نہ کہا جاوے گا وہ کریم تاجر اپنے کرم سے چاہے اس کو بیع وشرا کہے لیکن فی الواقع یہ عطا اور صلہ اور کرم ہے۔ پس یہ جان اور مال جو ہم اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں یہ سب ان کی ہی عطا ہے مگر وہ اپنے کرم سے اس کو اشترا فرماتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے: ''اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ'' اللہ تعالیٰ نے مومنین سے ان کی جانوں اور مالوں کو اس کے عوض میں خرید لیا ہے کہ ان کے لیے جنت ہے قیمت بھی ان ہی کی ہے اور متاع بھی ان کی۔

نیاوردم ازخانہ چیزے نخست — تو دادی ہمہ چیز من چیز تست

(میں گھر سے کوئی چیز نہیں لایا اے اللہ سب چیزیں تو نے مجھے دی ہیں سب چیزوں کا تو ہی مالک ہے۔)

پس مومنین کو انہوں نے جان اور مال اس لیے عطا فرمائے ہیں کہ اس کے عوض میں جنت خریدیں لیکن ہم ایسے بے عقل ہیں کہ ہم کو جو قیمت دی گئی تھی اس کو دیتے ہوئے ہم بخل کرتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ وہ دولت جو یہ جان و مال دے کر آوے گی وہ اس سے کروڑ ہا درجہ بہتر ہے جیسے اس تاجر نے اس مفلس کو ہزار روپے اس لیے دیئے تھے کہ ان سے وہ شے خریدے جو قیمت میں ایک لاکھ روپیہ کی ہے لیکن اس احمق نے وہ ہزار روپیہ بھی لے کر رکھ لئے اور یہ نہ سمجھا کہ ان کو خرچ کردوں گا تو ایک لاکھ روپے کی شے آوے گی۔ پس اے حضرات اگر جان دینے سے بھی یہ دولت ہاتھ آجاوے تو بہت سستی ہے اور میں تو آپ کو بہت تھوڑے دنوں کی محنت بتلاتا ہوں کہ جس کی کچھ میعاد بھی معین نہیں بعضوں پر منٹوں میں فضل ہوجاتا ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ ہماری محنت کا تو نام ہی نام ہے اصل تو عنایت ہے اسی لیے بزرگان دین فرماتے ہیں کار بعنایت ست باقی بہانہ جس وقت عنایت ہوتی ہے ایک منٹ بھی نہیں گزرتا۔ پس میں کوئی میعاد بھی مقرر نہیں کرتا اور نہ محنت ومشقت کے لیے کہتا ہوں۔

طلب حق میں لگ جانے اور رہبر کامل کے دامن پکڑنے سے دولت ملتی ہے

بس اتنا کرو کہ طلب میں لگ جاؤ اور کسی رہبر کامل کا دامن پکڑلو پس انشاء اللہ دولت ملی ہوئی ہے کچھ دیر نہیں دیکھو جن کو دولتیں ملی ہیں وہ کیا کہتے ہیں ان کے اقوال دیکھئے۔ اقوال عارف شیرازی فرماتے ہیں:

دوش وقت سحراز غصہ نجاتم دادند　　　واندراں ظلمت شب آب حیاتم دادند

(صبح کے وقت غصہ سے مجھے نجات عطا ہوئی رات کی تاریکی میں مجھے آب حیات عطا کی گئی)

آ گے اس دولت کے ملنے کا ظاہری سبب ارشاد فرماتے ہیں:

کیمیایست عجب بندگی پیر مغاں　　　خاک او گشتم وچند درجاتم دادن

(مرشد کی تابعداری عجیب کیمیا ہے کہ مجھ کو اس کے پاؤں کی خاک بننے سے بڑے درجے ملے)

یعنی رہبر و مرشد موصل کی غلامی عجیب چیز ہے کہ جن کی وجہ سے مجھ کو یہ درجات ملے ہیں۔ پس موصل کی ضرورت ہے موسلوں کی ضرورت نہیں اتنی سہولتوں پر بھی اگر کوئی محروم رہے تو واجد علی شاہ کے یہاں کے احدیوں سے کم نہیں ہے۔

کہ اس کے یہاں احدی تھے ایک دن ان میں سے ایک روز بیٹھا رہتا تھا اور دوسرا لیٹا رہتا تھا اور دوسرے دن دوسرا بیٹھتا تھا اور ایک لیٹتا تھا۔ ایک روز ایک سوار جا رہا تھا جو احدی لیٹا تھا اس نے کہا میاں سوار یہ بیر جو میری چھاتی پر رکھا ہے ذرا میرے منہ میں ڈالتے جاؤ' اس نے کہا بھائی تم خود ڈال لو یہ تو کوئی مشکل کام نہیں' کہنے لگا کہ واہ یہ مشکل نہیں ہاتھ اٹھانا پھر اس کو موڑ کر چھاتی پر لانا' پھر بیر جیسی بھاری چیز اٹھانا' پھر منہ میں رکھنا یہ کتنا بڑا کام ہے' اس سوار نے کہا کہ یہ جو تیرے پاس بیٹھا ہے یہ ڈال دے گا۔ یہ سن کر وہ بیٹھا ہوا احدی کہنے لگا کہ نہ صاحب میں ہرگز نہ ڈالوں گا' کل کی بات ہے میں لیٹا تھا یہ بیٹھا تھا ایک کتا میرے منہ میں موت گیا اس سے اتنا تو ہوا ہی نہیں کہ کتے کو ہٹا دے' میں اس کے منہ میں بیر کیوں ڈالوں' بیر تو خود پہلے اسی نے باندھا ہے (اس حکایت پر تمام مجمع کو بے اختیار ہنسی آ گئی ۱۲ جامع) تو صاحبو! ہم ان احدیوں کی حکایت پر تو ہنستے ہیں مگر فی الحقیقت ہم میں بھی ہر شخص۔

خدائے تعالیٰ کی راہ میں اکثر احدی ہو رہے ہیں

خدائے تعالیٰ کی راہ میں ایسا ہی احدی ہے کہ پکی پکائی رکھی ہے اور ہم سے اتنا نہیں ہو سکتا کہ ہاتھ بڑھا کر منہ میں رکھ کر چبا کر نگل جاویں اور پکی پکائی کیا چیز ہے پکایا کس نے ان کو بھی بیان کر دوں' پکانے والے وہ ہیں کہ جن حضرات نے دین کو جمع کیا اور اس کے واسطے طرح طرح کی مشقتیں اٹھائیں' انہوں نے اس کو پیسا چھانا گوندھا پکایا اب وہ بالکل ہر طرح سے تیار ہے کوئی حالت منتظرہ اس میں نہیں ہے آپ کے سامنے دستر خوان بچھا ہوا تیار رکھا ہے اب کھانا آپ کا کام ہے اور اگر کسی نے لقمہ اٹھا کر آپ کے منہ میں بھی رکھ دیا تو چبانا اور نگلنا تو بہر حال آپ کو ہی پڑے گا یہ تو ممکن نہیں کہ کوئی اور کھا لے اور پیٹ میں تمہارے چلا جاوے۔ ہاں اگر ایسا ہوتا کہ کوئی پیٹ

بھرا انگڑائی لے لے اور ہمارے پیٹ میں چلا جاوے تو ممکن تھا لیکن اس صورت میں ہم کون بنتے کتے بن جاتے یا ایسی مثال ہے کہ کوئی میاں جی لڑکوں سے کہے کہ سبق یاد کرو تو وہ لڑکے کہیں کہ میاں جی تم ہی یاد کرلو۔ تعجب ہے کہ سوائے دین کے جس قدر مقاصد ہیں سب میں یہ سمجھتے ہیں کہ بغیر کئے کچھ نہیں ہوتا مگر دین کو یہ سمجھتے ہیں کہ بغیر کئے بھی حاصل ہو جاتا ہے۔

دینی مقاصد کے مجاہدے کبھی بے ثمرہ نہیں ہوتے

اے صاحبو بغیر کئے کچھ نہیں ہوتا' کرنا پڑتا ہے مگر بہت نہیں جس درجہ کا مطلوب ہے اس درجہ کی محنت نہیں کرنا پڑتی اس سے بہت کم کرنا پڑتی ہے۔ تھوڑی سی توجہ اور طلب سے اللہ کا فضل ہو جاتا ہے۔ دیکھو کھیتی جو مقاصد دنیوی سے ہے اور مقاصد اخروی کے ساتھ اس کو وہی نسبت ہے جو ایک ادنیٰ غلام کو اپنے آقا سے ہوتی ہے اس کے لیے بھی بڑے سامان کی ضرورت ہے کہ اول ہل بنواؤ' بیل لاؤ' زمین کو کریدو' بیج ڈالو' پھر جب کھیتی نکل آئے اس کو سینچو' پانی دو' نولاؤ' حفاظت کرو اس کے بعد امید رکھنا برمحل ہوتا ہے اور اگر کوئی کچھ نہ کرے اور امید باندھ لے تو ہر شخص اس کو احمق بنائے گا' نرے چاہنے سے کھیتی نہ نکلے گی کرنے پر بھی اگر پیدا ہو جاوے تو حق تعالیٰ کا فضل ہے۔ اسی طرح مقاصد آخرۃ ہیں کہ نرے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا کچھ کرنا ضروری گو تھوڑا ہی سہی اور جب حق تعالیٰ کا فضل ہو جاوے تو اس پر یہ نہ سمجھو کہ ہمارے عمل کا ثمرہ ہے اور دینی و دنیوی مقاصد میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ دنیوی مقاصد کے لیے جو مشقت کی جاتی ہے اس پر کبھی ثمرہ مرتب ہوتا ہے کبھی نہیں ہوتا بخلاف دینی مطالب کے کہ ان کے لیے تھوڑا سا عمل بھی اگر کیا جاتا تو کبھی بے ثمرہ نہیں رہتا لیکن بجز رضائے حق کے دوسرے ثمرہ کی طلب نہ ہونا چاہیے' طلب سے محض رضائے مولیٰ مقصود ہونا چاہیے۔ پس آپ کا کام محض طلب ہے اور ایصال ان کا کام ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

آب کم جو تشنگی آور بدست تا بجوشد آبت از بالا و پست

(پانی کی جستجو کرو پیاس پیدا کرو تا کہ پانی تمہارے لیے بالا و پست سے جوش مارے)

تشنگاں گر آب جویند از جہاں آب ہم جوید بعالم تشنگاں

(اگرچہ عام طور پر دنیا میں چاہے ہی پانی کی تلاش کرتے ہیں مگر ابھی پانی میں اس دنیا میں پیاسوں کو تلاش کرنا ہے)

لیکن ان اشعار سے یہ نہ سمجھو کہ نری طلب کافی ہے کرنا کچھ نہ پڑے گا اس لیے کہ جب پانی چاروں طرف سے جوش مارے گا تو اس کو پینا تو تمہارا ہی کام' پانی کو لانا تو تمہارا کام نہیں ہے

باقی پینا تو تم کو ہی پڑے گا اور پانی اس وقت بھی تمہاری چاروں طرف سے ابل ابل کر آ رہا ہے۔ دیکھو اس وقت جو تمہارے کانوں میں دین کی باتیں پڑ رہی ہیں بتلاؤ تم نے کون سے اس کے لیے پھاوڑے اور گدال چلائے تھے بلا تمہاری محنت کے تم کو مل رہا ہے اب پینا تمہارا کام ہے۔ اگر یہ بھی تم سے نہ ہو سکے تو بہت افسوس ہے۔ طبیب اگر تمہارے گھر آ کر نبض دیکھے اور نسخہ لکھے اور دوا بھی اپنے نوکر سے بنوا دے پھر بھی اگر مریض اس کو نہ کھاوے اور یہ کہے کہ حکیم جی بس آپ ہی پی لیں تو اس مریض کو اپنی شفا ہی مطلوب نہیں، حکیم جی کی دوا پینے سے اگر مریض کو صحت ہو جاتی ہے تو اس کو اس سے بھی انکار نہیں تھا لیکن کیا کیا جاوے کام تو اپنے ہی کئے ہوتا ہے، جاہل پیروں نے اپنی آمدنی کے واسطے لوگوں کے دل میں یہ بٹھلا دیا کہ پیر تمہارے سب بوجھ اٹھالیں گے تم کو کچھ کرنا نہ پڑے گا۔

ایک موروثی پیر کی حکایت

جیسے ایک موروثی پیر کسی گاؤں میں پہنچے ایک مرید نے کہا کہ پیر توں (تو) دبلا بہت ہو رہا ہے۔ پیر صاحب فرماتے ہیں کہ دبلا کیسے نہ ہوں ظالمو نماز تم نہیں پڑھتے، مجھ کو تمہاری طرف سے نماز پڑھنا پڑتی ہے، روزہ نہیں رکھتے روزہ میں رکھتا ہوں، پل صراط پر تمہاری طرف سے مجھ کو چلنا پڑتا ہے جو تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے، کہنے لگا کہ پیر تو ہماری وجہ سے بڑی مصیبت میں ہے جا فلانا کھیت مونجی کا تجھ کو دے دیا۔ پیر نے کہا کہ بھائی مجھ کو چل کر قبضہ کرا دے وہ اس کے ساتھ کھیت دکھلانے چلا ایک پتلی سے ڈول آئی، پیر پھسل کر گر گئے، گاؤں والے نے ایک لات پیچھے سے رسید کی اور کہا کہ پل صراط پر تو کیا چلتا ہوگا ڈول پر تو تجھ سے چلا ہی نہ گیا، ایسے پیروں نے لوگوں کے دماغ خراب کر دیئے ہیں، ساری دنیا کے قصوں کے بھی پیر ہی ذمہ دار ہیں۔ گناہوں کا بوجھ بھی پیر ہی اٹھانے والے ہیں، پیر کیا ہوئے خاصے پلہ دار ہیں بلکہ بھنگی ہیں۔ اس لیے کہ گناہ نجاست سے بھی زیادہ ہے اور بعضے گاؤں میں تو ایسوں کو واقعی بھنگی کے برابر سمجھتے ہیں ایک گاؤں میں کمینوں کے حقوق نکال رہے تھے کہ یہ حصہ دھوبی کا ہے یہ بڑھئی کا ہے یہ لوہار کا ہے یہ سقہ کا ہے ایک بڈھا سا بیٹھا تھا، کہنے لگا کہ ارے اس سہرے پیر کا تو نکال لو قیامت کے روز ایسے پیروں کی گردن ناپی جائے گی۔ یاد رکھو کہ جب کام چلے گا اپنے ہی کرنے سے چلے گا۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: "**لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰى**"، یعنی انسان کو وہ ہی ملنا ہے جو اس نے سعی کی ہے۔ یہاں پر ایک بات طلبہ کے کام کی یاد آئی وہ یہ ہے کہ معتزلہ نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے

کہ ایک کے عمل کا ثواب دوسرے کو پہنچانے سے بھی نہیں پہنچ سکتا اور ایصال ثواب کا انکار کرتے ہیں۔ جواب اس کا یہ ہے کہ للانسان میں لام نفع کا ہے اور نفع دو قسم کا ہے ایک ثواب دوسرا وہ خاصیت جو عامل کے اندر اس سے پیدا ہوتی ہے۔ پس یہاں دوسری قسم کا نفع مراد ہے نہ کہ اول قسم کا بوجہ دوسری نصوص کے۔ چنانچہ ایک دوسری آیت سے بھی یہ مضمون معلوم ہوتا ہے۔

عمل کے بعض ثمرات خاص عامل ہی کو ملتے ہیں

کہ عمل کی بعض خاصیتیں وہ ہیں کہ ان کا ثمرہ خاص عامل ہی کو حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: "مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ وَتَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ" یعنی مثل ان لوگوں کی جو اپنے مالوں کو اللہ کی رضا مندی کی طلب کرنے اور اپنے نفسوں کو نیک کاموں پر جمانے کے لیے خرچ کرتے ہیں۔ دیکھئے اس آیت میں مال کے خرچ کرنے کی خاصیتیں ارشاد فرمائی ہیں۔ اول تو اللہ تعالیٰ کی رضا مندی طلب کرنا یعنی ثواب دوسرے اپنے نفس کو جمانا یعنی اس میں سخاوت کا ملکہ پیدا کرنا جس کا حاصل اخلاق کی درستی ہے۔

چنانچہ واوٗ عاطفہ ان دونوں کے تغائر پر دال ہے۔ پس ثواب تو وہ شے ہے کہ دوسرے کے کرنے سے بھی مل جاتا ہے اور نفس عمل کو جو خاصیت ہے یعنی نفس میں ملکہ اور قوت پیدا ہونا یہ بغیر اپنے کئے نہیں ہوسکتا۔ دیکھو پہلوان درست دشمن سے بچاوے گا لیکن تمہارے اندر وہ قوت پیدا کرسکتا قوت جب ہی ہوگی جبکہ تم خود ورزش کرو گے۔ خلاصہ یہ ہے کہ بدون اپنے کئے نفس کے اندر قوت نیک اعمال کی پیدا ہوسکتی اور اس قوت ہی کا نام حال ہے سو لوگوں کو بالعموم اس کی فکر ہی نہیں ہے۔ نماز پڑھتے ہیں لیکن اس کا فکر نہیں کہ اسکی دھن لگ جائے' روزہ رکھتے ہیں' حج کرتے ہیں' زکوٰۃ دیتے ہیں مگر اترے دل سے اس کا شوق نہیں کہ بعض فرائض وواجبات سے ترقی کرکے ذکر بھی کرتے ہیں لیکن ان کا ذکر صرف زبان پر ہے قلب میں کچھ اثر نہیں اور اس اثر نہ ہونے کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ان کی ان عبادات کو دوام نہیں ہوتا ہے اس لیے کہ ان کی جڑ قلب میں پیدا نہیں ہوئی اگر نماز قضا ہوجائے تو ہوجائے کچھ غم نہیں وہ نماز روزہ بزبان حال یہ کہتا ہے:

قلق از سوزش پروانہ داری　　　دلے از سوز ما پروانہ داری

(پروانے کے جلنے کا تمہیں افسوس ہے لیکن ہمارے جلنے کی تمہیں کوئی پرواہ نہیں)

ایک پیسہ کا نقصان ہوجاتا ہے تو اس کا غم ہے اور نمازیں چٹ کرتے ہیں لیکن ذرا دل نہیں دکھتا' بعضے نمازی مہینوں نماز پڑھتے ہیں اور پھر مہینوں چھوڑ دیتے ہیں۔ ذرا جی برا نہیں ہوتا تو یہ بات کیا ہے۔

بات یہی ہے کہ قلب میں کوئی بات پیدا نہیں ہوئی، عوام تو عوام اہل علم اور طلبہ کی ان سے زیادہ شکایت ہے کہ پڑھ لکھ کر ان میں یہ بات نہیں پیدا ہوئی ان کا بڑا مقصد جاوے اور اگر چار آدمیوں میں شہرت بھی ہو جاوے تو یہ انتہا معراج ہے اندرونی حالت خواہ کیسی ہی ہو کچھ پرواہ نہیں، ہماری وہ حالت ہے:

از بروں چوں گور کافر پر حلل　　　　واندروں قہر خدائے عزوجل

(ظاہری حالت تو تمہاری گور کافر کی طرح آراستہ و پیراستہ ہے اور اسکے اندر خدائے عزوجل کا قہر وغضب نازل ہے)

از بروں طعنہ زنی بر با یزید　　　　وزدرو نت ننگ مے دارد یزید

(ظاہر سے تو بایزید بسطامی بزرگ پر طعنہ زنی کرتے ہو اور تمہاری اندرونی حالت جس سے سلطان بھی شرماتا ہے)

ہم یزید کو ملامت کرتے ہیں لیکن ہمارا قلب یزید سے بھی بدتر ہو رہا ہے ان ہی افعال میں ہم بھی مبتلا ہیں جن میں وہ تھا گویا خود اپنے کو ملامت کر رہے ہیں جیسے شیطان کی نسبت لوح محفوظ میں لکھا تھا کہ ایک ان میں سے ملعون ہوگا، شیطان نے اس کو دیکھ کر کہا کہ اے اللہ اس پر لعنت کر جو تیری نافرمانی کرے حالانکہ ملعون خود ہی تھا۔

در لوح بنوشتہ کہ ملعوں شود یکے　　　　بردم گماں بہر کس و برخود گماں نبود

(لوح محفوظ میں لکھا تھا کہ ان میں سے ایک ملعون ہوگا اس نے دوسرے ہر ایک پر گمان کیا لیکن اپنے بارے میں گمان نہ کیا)

حملہ برخود میکنی اے سادہ مرد　　　　ہمچواں شیرے کہ برخود حملہ کرد

(اے بھولے انسان تو اپنے اوپر حملہ کرتا ہے اس شیر کی طرح جو اپنے اوپر حملہ کرتا ہے)

ہم لوگوں کی بھی یہی حالت ہے کہ ہم دوسروں کی عیب جوئی اور برا کہنے میں مشغول ہیں حالانکہ وہ جملہ خود اپنے اوپر ہے اس لیے کہ وہ ہی صفات خود ہمارے اندر موجود ہیں۔

ایک حبشی کے آئینہ پانے پر حکایت

ایک حبشی کی حکایت لکھی ہے کہ اس کو کہیں سے ایک آئینہ پڑا ہوا مل گیا اس کو اٹھا کر دیکھا تو اس میں اپنی کالی کالی صورت شریف نظر پڑی، کہنے لگا کہ کمبخت جب تو ایسا بدصورت تھا تب ہی تو کوئی تجھ کو یہاں پھینک گیا ہے۔ ایک اور احمق کی حکایت ہے کہ اس کا بچہ کھانا کھا رہا تھا، روٹی کا ٹکڑا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پانی کے لوٹے میں گر گیا اس بچہ نے اس میں دیکھا تو اپنی صورت

اس میں نظر پڑی' کہنے لگا کہ ابا اس نے میری روٹی چھین لی۔ ابا جان نے جھک کر دیکھا تو اس میں اپنی صورت مبارک نظر آئی کہتے ہیں تف ہے تیری اوقات پر اور لعنت ہے تجھ پر یہ ڈاڑھی سفید لگا کر بچہ کی روٹی چھین لی۔ پس اے حضرات ہم یزید کو یا کسی کو جو لعنت کرتے ہیں وہ لعنت درحقیقت ہم اپنے اوپر کر رہے ہیں۔

حکایت جوحی

ایک اور شخص کی حکایت مثنوی شریف میں لکھی ہے اس کا نام جوحی تھا وہ اپنے باپ کے ساتھ رہا تھا ایک شخص کا جنازہ لیے جا رہا تھا اور اس کا بیٹا کہتا تھا اے ابا تجھ کو یہ کہاں لئے جا رہے ہیں وہ ایسا مکان ہے کہ نہ اس میں دیواریں ہیں نہ فرش ہے نہ کیواڑ ہیں نہ کھانے کی کوئی چیز ہے نہ کوئی انیس ہے نہ مددگار ہے تو جوحی یہ سن کر اپنے باپ سے کہتا ہے کہ ابا کیا اس کو ہمارے گھر لیے جا رہے ہیں اس لیے یہ صفات تو ہمارے مکان کے ہیں۔ مولانا اس کے بعد کہتے ہیں کہ اے شخص جن چیزوں پر تو لعنت کرتا ہے جب وہ تمام تیرے اندر موجود ہیں اور سب کے پتے تیرے اندر ملتے ہیں تو یہ لعنت تو ان پر نہیں ہے یہ تو خود تجھ پر ہوئی' ہماری حالت یہ ہے کہ مولوی ہو گئے ہیں پیر بن گئے ہیں اور دوسروں کو وعظ نصیحت کرتے ہیں لیکن باطن ہمارا ظاہر کے مطابق نہیں ہے جیسے حافظ شیرازی فرماتے ہیں:

واعظاں کیں جلوہ برمحراب و منبر میکنند　　　چوں بخلوت مے روند ایں کار دیگر میکنند

(یہ واعظین جو محراب و منبر پر جلوہ افروز ہوتے ہیں جب خلوت میں پہنچتے ہیں تو دوسرا کام کرتے ہیں)

مشکلے دارم ردانشمند مجلس باز پرس　　　توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر میکنند

(مجھ کو ایک اشکال ہے کسی دانشمند مجلس سے پوچھ کر توبہ کی نصیحت کرنے والے خود کیوں توبہ نہیں کرتے)

معتقدین نے ہمارا دماغ خراب کر دیا ہے یہ عوام کا اعتقاد ہمارے کیا کام آ سکتا ہے جبکہ ہمارا قلب درست نہ ہو' ہماری وہ مثال ہے کہ

ایک گھوڑے کے مالک کی حکایت

کسی شخص کے پاس ایک گھوڑا بہت سرکش اور شریر تھا اس نے ایک اپنے دوست سے کہا کہ میاں اس گھوڑے نے مجھ کو بہت دق کیا ہے اس کو بکوا دو اس نے بازار میں کھڑے ہو کر اس گھوڑے کی تعریف شروع کی کہ یہ گھوڑا ایسا رہوار ہے اور ایسا ایسا ہے' مالک بھی وہاں موجود تھا' اس کے چکنے چپڑے الفاظ سن کر کہنے لگا کہ اس کو میں ہی خرید لوں' اس نے کہا کہ کمبخت تیرے پاس یہ گھوڑا اتنی

مدت سے ہے اور تجھ کو اس کے عیوب معلوم ہیں' تیرا اتنی مدت کا علم میرے چند الفاظ سے جاتا رہا ایسے ہی ہماری حالت ہے کہ کوئی ہم سے پچاس برس کا ہے کوئی چالیس برس کا اور اتنے دنوں سے ہم اس نفس سرکش کی سرکشی دیکھ رہے ہیں کہ ہم کو اس نے دق کر رکھا ہے لیکن عوام کی جھوٹی مدح وثناء سے ہم دھوکہ میں پڑے ہوئے ہیں اور مدتوں کا تجربہ ہمارا جاتا رہتا ہے۔ایک اور حکایت یاد آئی۔

اشعب طماع کی حکایت

اشعب ایک شخص عرب میں بہت طماع تھے' ان کو لڑکے بہت چھیڑتے تھے۔ایک روز حسب عادت لڑکے دق کر رہے تھے انہوں نے لڑکوں کے منتشر کرنے کے واسطے یہ کہہ دیا کہ دیکھو فلاں مقام پر کھانا تقسیم ہو رہا ہے' لڑکے اس طرف دوڑے' لڑکوں کے دوڑنے سے ان کو بھی وہم ہو گیا کہ یہ جو جا رہے ہیں تو ضرور کھانا تقسیم ہو رہا ہوگا' خود بھی اس طرف چل دیئے۔

اسی طرح ہم لوگوں کی حالت ہے کہ خود ہی تو لوگوں کو ہم نے دھوکہ دیا پھر وہی لوگ جو ہمارے ہاتھ چومتے ہیں تو اس سے ہم دھوکہ میں پڑ جاتے ہیں کہ ہمارے اندر کچھ تو ہے جو لوگ ہماری اس قدر تعظیم کرتے ہیں اور اپنی شرارتوں کو اور دھوکہ بازی کو بھول جاتے ہیں۔

اہل علم میں اخلاق حسنہ کی کمی پر اظہار افسوس

اے صاحبو! اہل علم میں جو فضائل ہونا چاہیے وہ ہمارے اندر کہاں ہیں' صبر کہاں ہے شکر کہاں ہے' تواضع کہاں' حب جاہ سے نفرت اور خموں کی رغبت جو مسلمان ہم سے ملتے ہیں ہم خود ان سے تعظیم کے طالب ہوتے ہیں اگر کوئی ایک مرتبہ ہم کو بلاوے اور نذر دے دوسری دفعہ اگر بلائے گا تو خیال ہوتا ہے کہ اب کی مرتبہ بھی نذر ملے گی اور اگر نہیں دیتا تو قلب میں شکایت ہوتی ہے اور بعضے زبان سے بھی ظاہر کر دیتے ہیں اور یہ حالت میں عام واعظوں کی بیان نہیں کرتا ان کے حالات تو اس سے بھی زیادہ ناگفتہ بہ ہیں۔یہ تو ان علماء کی حالت ہے جو علم کے ساتھ مشیخت کی مسند پر بھی بیٹھے ہیں اور لوگوں کے مقتدا بنے ہیں تو آخر یہ کیا بات ہے یہ کیا آفت ہے۔بس بات یہ ہے کہ علم ہمارے صرف زبان پر ہے ہمارے اندر نہیں پہنچا۔اگر قلب میں اس کا اثر ہوتا اور قلب اس سے رنگین ہوتا تو ہماری یہ حالت نہ ہوتی۔

علم چوں بردل زنی یارے بود   علم چوں برتن زنی مارے بود

(علم کو اگر دل پر مارو تو دوست بن جاتا ہے اور علم کو اگر بدن پر مارو تو سانپ بن جاتا ہے)

علم چہ بود آنکہ رہ بنمایدت رنگ گمراہی زدل بزدایدت
(علم وہ ہے جو تجھے راستہ دکھادے اور تیرے دل سے گمراہی کا رنگ دور کرے)

ایں ہوسہا از سرت بیروں کند خوف و خشیت دردلت افزوں کند
(یہ علم تمام خواہشات نفسانی کو باہر نکال دیتا ہے اور خوف دعاجزی کو تیرے دل کے اندر زیادہ کرتا ہے)

تو ندانی جز یجوز ولا یجوز خود ندانی کہ تو حوری یا عجوز
(تو سوائے جائز اور ناجائز کے کچھ نہیں جانتا اور تو نہیں جانتا کہ تو دوشیزہ ہے یا تو بوڑھی عورت)

ہمارے اندر کبر اس درجہ ہے کہ اگر راہ میں کوئی مسلمان مل جاوے تو خود سلام نہ کریں گے منتظر رہیں گے کہ یہ خود ہم کو سلام کرے اگر کسی مسئلہ میں ہم سے غلطی ہو جاتی ہے تو ہرگز نہ مانیں گے۔ اگر تدریس کے وقت کوئی طالب علم حق بات کہے اور وہ ہمارے خلاف ہو تو اپنی بات کی پچ کریں گے ہرگز اس کی بات کو تسلیم نہ کریں گے تو آفت کس شے کی ہے اور یہ حالت ہماری کیوں ہے۔ بس قلب میں کوئی چیز نہیں ہے اس لیے میں اہل علم کو بالخصوص خطاب کرتا ہوں کہ علم تو آپ لوگوں نے حاصل کرلیا اور عمل بھی کم وبیش بفضلہٖ تعالیٰ کرتے ہو اب اس کی کوشش کرو کہ تمہارے اندر ایسا ملکہ راسخہ پیدا ہو جاوے کہ

اعمال شرعیہ کے طبیعت ثانیہ کے حصول کا طریق

جس سے اعمال شرعیہ تمہاری طبیعت ثانیہ بن جاویں اور دنیا کے واسطے آپ دین کو ذلیل نہ کریں آپ اس دنیا سے اس قدر مستغنی ہوں کہ اگر ہفت اقلیم کی سلطنت بھی آپ کو ملے اور دین کا استخفاف ہو تو آپ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھیں' آپ کی وہ حالت ہو:

اے دل آں بہ کہ خراب از مئے گلگوں باشی بے زرو گنج بصد حشمت قاروں باشی
(اے دل محبوب حقیقی شراب محنت سے سرشار رہ اور بغیر زر و مال کے حشمت نہیں دنیا داروں سے بڑھ کر دی)

در رہ منزل لیلیٰ کہ خطر ہاست بجاں شرط اول قدم آن ست کہ مجنوں باشی
(محبوب کی منزل میں جان کو سینکڑوں خطرے ہیں پہلی شرط تو اس راہ کے لیے مجنوں بن جانا ہے)

اور آپ کی یہ حالت ہو کہ نہ آپ کو مال کی طلب ہو نہ جاہ کی نہ اچھے لباس کی اور نہ اچھے مکان کی نہ لوگوں کی تعظیم وتکریم سے آپ از جارفتہ ہوں اور نہ کسی کی تحقیر وتوہین سے آپ دل شکستہ ہوں

اور نہ دنیا کے واسطے امراء کے دروازوں پر جا کر آپ ذلیل ہوں اور نہ غرباء کے یہاں جانے سے آپ کو عار ہو اگر ہزار روپیہ آپ کو ملتے ہوں لیکن دین کچھ بھی جاتا ہو تو آپ ان ہزاروں روپیہ پر پیشاب کر دیں میں آج صاف کہتا ہوں گو میری اس رائے کو لوگ پسند نہیں کرتے اور گو بعض احباب کو ناگوار ہو کہ جیسے دنیا کے واسطے امراء کے دروازوں پر جانے سے میں روکتا ہوں۔

دین کے واسطے امراء کی طرف مائل نہ ہونا چاہیے

اسی طرح دینی کاموں کے واسطے چندہ لینے کے لیے بھی امراء کی طرف مت مائل ہو۔ حضرات آپ کو معلوم نہیں ہے آج کل مانگنے والوں کی وہ کثرت ہوئی ہے کہ لوگ گھبرانے لگے ہیں۔ مولویوں کی صورت دیکھتے ہی گھبرا جاتے ہیں کہ اب چندہ دینا پڑے گا، بہت کم ہیں وہ نفوس جو محض اخلاص سے دین کی خدمت کے لیے آپ کو دیتے ہیں اس لیے خدا کے لیے اس کو بالکل چھوڑ دو، بس جو آپ کا کام ہے وہ آپ کریں آپ کا کام دین کی خدمت ہے آپ گوشوں میں رہیے اور اپنے کام میں لگے رہیے اگر آپ ایسا طرز اختیار کر لیں گے تو میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ امراء خود آپ کے دروازوں پر آ دیں گے خدا کے واسطے اس عادت کو چھوڑ دو، خدا جانے آپ کے اس طریق نے تباہ کر دیا ہے دین کو خدا کے لئے ہاتھ کھینچو اور دیکھو حق تعالیٰ اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا ارشاد فرماتے ہیں: "لَاتَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَامَتَّعْنَابِهٖ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا" یہ آپ کا کام نہیں کہ امراء اور روسا کے دروازہ پر جا کر بھیک مانگو گو دین ہی کے لیے ہو یہ کام امراء کے ذمہ ہے کہ وہ آپ کی خدمت کریں خواہ اپنے پاس سے یا چندہ جمع کر کے آپ تو حق تعالیٰ پر توکل کر کے اپنے کام میں لگے رہیے جو دوسروں کا کام ہے وہ آپ اپنے ذمہ نہ رکھئے۔

کار خود کن کار بیگانہ مکن

(اپنا کام کر دوسروں کا کام نہ کر)

دین کی محبت عنقا ہے

اگر آپ کہیں کہ ہم اپنے نفس کے لیے نہیں مانگتے ہم تو خدا کے واسطے مانگتے ہیں۔ صاحبو! آپ نے غور نہیں فرمایا اپنے لیے مانگنا اس زمانہ میں اتنا برا نہیں جس قدر کہ دینی کاموں کے لیے سوال کرنا ہے اس لیے کہ یہ وہ وقت ہے کہ اخلاص مقصود ہے دین کی محبت عنقا ہے دنیا کی محبت قلوب میں جگہ پکڑے ہوئے ہے یہ سمجھنے والے بہت کم ہیں کہ یہ دین کی خدمت کے لیے سوال کرتے ہیں اور ان کی خطا بھی نہیں اس لیے کہ بہت سے مکار مولوی دین کے پردہ میں دنیا کمانے

لگے اس لیے اس وقت مانگنے سے سخت ذلت ہوتی ہے اور بجائے اس کے کہ علم دین کی عظمت اور وقعت ہو اس کی ذلت ہوتی ہے پس اپنے نفس کے لیے مانگنے سے تو اپنی ہی ذلت ہوتی ہے اور خدا کے واسطے مانگنے سے دین کی۔ سب کی اس وقت قریب قریب لازم سی ہوگئی۔ اس لیے آپ ہرگز کسی کے دروازہ پر نہ جاویں، امراء خود آپ کے پاس آویں گے اس لیے کہ وہ آپ کے محتاج ہیں، آپ ان کے محتاج نہیں ہیں، اس لیے کہ آپ کے پاس دین ہے جو امراء کے پاس بقدر ضرورت بھی نہیں اور اس کو اس کی حاجت ہے اور گو ان کے پاس دنیا ہے مگر وہ آپ کے محتاج ہیں آپ اپنی حاجت غنی مطلق سے رکھئے "وَاللّٰهُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ" اگر آپ گوشوں میں بیٹھ جاویں گے تو امراء خود آپ کو دنیا پیش کریں گے اور اصرار کریں گے اور آپ انکار کریں گے، آپ اس کو سن کر متعجب نہ ہوں اس کے نمونے بہت اب بھی موجود ہیں۔ اگرچہ مجھے اپنی زبان سے تو کہنا زیبا تو نہیں مگر کیا کروں نمونہ کے طور پر عرض کرتا ہوں۔ ایک شخص نے ہمارے مدرسہ میں ابھی پانچ روپیہ منی آرڈر بھیجے اور ساتھ میں یہ بھی لکھ دیا کہ طلباء سے میرے واسطے دعا کرادو، میں نے منی آرڈر واپس کر دیا اور یہ لکھ دیا کہ ہمارے یہاں دعاؤں کی دکان نہیں کہ دعائیں بکتی ہوں اور واقعی ہے بھی یہی بات اگر طلباء کی خدمت کرنا ہے تو خلوص کے ساتھ کرنا چاہیے، روپیہ بھیج کر دعا کی درخواست چہ معنی دیکھئے اللہ تعالیٰ صحابہ رضی اللہ عنہم کی مدح فرماتے ہیں: "اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَانُرِیْدُمِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا" یعنی وہ لوگ ایسے مخلص ہیں کہ مساکین کو کھانا کھلا کر یہ کہتے ہیں کہ ہم تو تم کو بس اللہ کی رضامندی کے لیے کھلاتے ہیں، ہم تم سے نہ کسی قسم کی جزاء کے طالب ہیں اور نہ شکریہ کے اور دعا کرانا بھی جزاء میں داخل ہے اس کی طلب بھی نہ ہونا چاہیے اور اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو آجکل دستور ہے کہ کوئی کسی دینی کام میں کچھ پیش کرتا ہے اور اس دینی کام کا رکن اس کا شکریہ تقریراً یا تحریراً ادا کرتے ہیں یہ بھی نہ ہونا چاہیے مجھ کو تو اس شکریہ سے بہت غیرت آتی ہے اس دینے والے کو ہمارا شکریہ ادا کرنا چاہیے اس لیے کہ ہم نے اس پر احسان کیا کہ اپنا کام چھوڑ کر اس کے کام میں وقت خرچ کیا کہ اس کی رقم کو نیک کام میں صرف کر دیا نہ کہ اس کا شکریہ ہم ادا کریں ہم پر اس نے کیا احسان کیا ہے۔ اگر کوئی سو روپیہ دے کر شکریہ کا طالب ہو تو پھینک دو اس کے سو روپیہ اور کہہ دو کہ رکھو اپنے گھر میں اسی طرح کسی کی خدمت کر کے اس سے دعا کی بھی درخواست نہ کرو۔ باقی یہ دوسری بات ہے کہ ہم لوگ سب مسلمانوں کے دعا گو ہیں وہ مستقل ہمارا کام ہے ہمارے ذمہ ہے کسی کے دینے لینے پر موقوف نہیں ہے۔

ایک شخص نے حضرت حافظ ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ حضرت میرا ارادہ پٹوارگری کا امتحان دینے کا ہے اس کے لیے جارہا ہوں آپ دعا فرما دیجئے' اگر آپ دعا کریں تو میں جاؤں ورنہ نہیں۔ فرمایا کہ میاں ہم تو دعا ہی کے واسطے ہیں اگر دعا بھی نہ کریں گے تو پھر ہم کس مصرف کے ہیں لیکن دوسروں کو یہ نہ چاہیے کہ وہ اس لیے خدمت کریں کہ دعا کریں گے غرض میں نے وہ منی آرڈر واپس کردیا۔ یہ خیال نہ کیجئے مدرسہ کا پانچ روپیہ نقصان کیا بات یہ ہے۔

زر و نقرہ چیست تا مجنوں شوی   چیست صورت تا چنیں مفتوں شوی

(یہ سونا چاندی کیا ہے جس پر تو عاشق ہوا جاتا ہے اور یہ رنگ وخون کی صورتیں کیا حقیقت رکھتی ہیں جن پر تو پاگل ہوا جاتا ہے)

اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ منی آرڈر پھر آیا اور اس شخص نے لکھا کہ میں غلطی کا اقرار کرتا ہوں بیشک مجھ سے غلطی اور بے تہذیبی ہوئی کہ منی آرڈر بھیجنے کے ساتھ دعا کی درخواست کی خدا کے واسطے آپ منی آرڈر وصول کر لیجئے میں دعا وغیرہ کچھ نہیں چاہتا' میں نے وہ وصول کر لیا اور لکھ دیا کہ آپ کے روپے مدرسہ میں صرف کیے جائیں گے اور آپ کے لیے دعا بھی کرادی گئی۔ شاید کوئی اس حکایت کو سن کر کہے کہ پانچ روپے ایک قلیل مقدار ہے اس لیے واپس کردیئے اگر رقم کثیر ہوتی تو واپس نہ کرتے اس انتباہ کے دفع کرنے کے واسطے دوسرا واقعہ عرض کرتا ہوں کہ ابھی ایک صاحب نے دوسو روپیہ مدرسہ میں بھیجے اور لکھا کہ میرا جی تمہارے لانے کو چاہتا ہے میں خود آکر تمہارے آنے کی تحریک کروں گا میں نے ان کو لکھ دیا کہ اگر میرے بلانے کے متعلق آپ مضمون نہ لکھتے تو میں یہ روپیہ وصول کر لیتا اور اب اس مضمون کے ہونے سے مجھ کو آپ کے خلوص میں شبہ پڑ گیا کہ روپیہ بھیجنے سے شاید آپ کا مقصود یہ ہے کہ میں آنے کے متعلق آزادانہ جواب نہ دے سکوں' روپیہ آنے سے اثر ہو اس لیے یہ روپیہ ڈاک خانہ میں امانت رکھا ہے وصول نہیں کیا اور میں واپس ہی کردیتا لیکن آپ کی دل آزاری کے لیے خیال سے واپس نہیں کیا اگر اس کا جواب میرے مذاق کے موافق آیا تو رکھوں گا ورنہ واپس کردوں گا۔ حضرت ہم لوگوں کے تساہل سے یا طمع سے یا ہماری خوش اخلاقی سے ان بڑے لوگوں کے دماغ بگڑ گئے ہیں واللہ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ سو دوسو روپیہ دکھا کر ہم نے ان ملانوں کو خرید لیا ہے اس کا جواب یہ آیا کہ بلانے کی تحریک سے دست بردار ہوتا ہوں میں آپ کو نہیں بلاتا آپ یہ روپیہ قبول کر لیجئے' میں نے ان کو لکھ دیا کہ مجھے آپ کی اس تہذیب کے برتاؤ سے بہت مسرت ہوئی اور آپ سے اس قدر محبت ہوگئی کہ اب مجھے

خود آپ سے ملنے کا اشتیاق ہوگیا ہے، میں آؤں گا لیکن یہ عہد کر لیجئے کہ وہاں بلا کر مجھ کو کچھ دیا نہ جاوے۔ چنانچہ وہاں جانا ہوا اور انہوں نے کچھ پیش کرنا چاہا میں نے کہا کہ میں آپ کا جی برا نہیں کرنا چاہتا لیکن میرے معمول کے خلاف ہے کہ کہیں جا کر کچھ لوں اگر تم کو دینا ہے تو وہاں آ کر دو یا بھیج دو۔ چنانچہ ایک عرصہ کے بعد وہ آئے اور ہدیۃً کچھ دیا ان کے واقعہ سے ان کے خلوص کا امتحان ہوگیا، بعضے ایسے بھی ہیں کہ بعد ایک بار کے عذر کے پھر وہ کروٹ بھی نہیں لیتے جس سے ان کے خلوص کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ محض رسم کے طور پر دیتے تھے تو مجھ کو تو تجربہ نے یہ دکھلا دیا ہے کہ اکثر لوگوں کے اندر اس زمانہ میں خلوص بہت کم ہے کوئی دباؤ سے کچھ دیتا ہے کوئی اپنی جاہ کی حفاظت کے لیے کوئی رسم ورواج کی پابندی سے اس لیے میں اس باب خاص میں ذرا زیادہ احتیاط رکھتا ہوں اور سب اہل علم کو یہی مشورہ دیتا ہوں کہ اس مادہ خاص میں ذرا کشیدگی اختیار کریں اور وہ بات دل میں پیدا کریں کہ اگر ہفت اقلیم کی سلطنت بھی ہو تمہارے سامنے گرد ہو اس لیے کہ

آں را کہ ترا شناخت جاں راچہ کند   فرزند و عزیز و خان و مال راچہ کند

(جس کو حق سبحانہ وتعالیٰ کی معرفت حاصل ہوگئی وہ جان کو کیا کرے، بیٹے، رشتہ دار اور منصب و مال کو کیا کرے گا)

واللہ اگر حق تعالیٰ کی معرفت اور نسبت ہم کو نصیب ہو جاوے تو کیا چیز ہے روپیہ اور کیا چیز ہے جان مگر افسوس کہ ہمارا قلب اس دولت سے خالی ہے اس لیے بھٹکتا پھرتا ہے اور اگر یہ دولت ہوتی تو ہمارے سامنے کسی شے کی کوئی وقعت نہ ہوتی۔

چو سلطان عزت علم برکشد   جہاں سر بجیب عدم درکشد

(جب بادشاہ اپنی عزت کا جھنڈا بلند کرتا ہے تو ساری دنیا عدم کے گریبان میں منہ چھپا لیتی ہے)

اگر آفتاب ست یک ذرہ نیست   وگر ہفت دریاست یک قطرہ نیست

(اگر وہ آفتاب ہے تو اس کے مقابل میں ذرہ کے جیسا ہے اگر وہ سات دریا ہے تو ایک قطرہ کے برابر ہے)

اگر ہمارے اندر یہ دولت ہوتی تو ہم کو نہ کسی کی تعظیم اور مدح ثناء سے کوئی مسرت ہوتی اور نہ کسی سے خوف اور امید ہوتا اور یہ حالت ہوتی ہے:

موحد چہ برپائے ریزی زرش   چہ فولاد ہندی نہی برسرش

(موحد اور عارف کے قدموں کے نیچے خواہ سونا بکھیر دیں یا اس کے سر پر تلوار رکھ دیں)

امیدو هراسش نباشدزکس همیں ست بنیاد توحید وبس

(امید وخوف اس کو بجز خدا کے کسی سے نہیں ہوتا توحید کی بنیادیں اسی پر ہے)

اور نہ ہم کو مصائب سے پریشانی ہوتی اور نہ ہم کو دنیوی راحتوں سے فرح اور بطر ہوتا' اللہ کے بندوں کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ ان پر بلائیں آتی ہیں قسم قسم کی' تکلیفیں ان کو پیش آتی ہیں لیکن ان کے قلب میں ذرا پریشانی نہیں ہوتی اس لیے کہ ان کے قلب میں ایسا نور پیدا ہوجاتا ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے کسی شے کی گنجائش نہیں ہوتی' اسی کی نسبت ارشاد ہے:"وَاَیَّدَھُمْ بِرُوْحٍ مِّنْہُ" یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی تائید فرمائی ہے اپنے پاس سے ایک روح کے ساتھ وہ روح ہے کہ جو ان کو ہمیشہ ہمیشہ کو زندہ رکھتی ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت ست بر جریدہ عالم دوام ما

(وہ شخص ہرگز نہیں مرتا جس کا دل عشق سے زندہ ہوگا' دنیا کے تمام اخبارات پر ہمارا دوام ثابت ہوگا)

اور یہ حیات ہے کہ جس کی نسبت ارشاد ہے:"مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَکَرٍ اَوْاُنْثٰی وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْیِیَنَّہٗ حَیٰوۃً طَیِّبَۃً" الآیہ یہ وہ عیش ہے جو سلاطین کو نصیب نہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ان کو معیت نصیب ہوجاتی ہے حیّ قیوم کے ساتھ پھر ان کو کیوں ۔ کیوں نہ حیات میسر ہو ان کو تعلق ہوتا ہے محبوب ومطلوب حقیقی سے پھر ان کو کیوں پریشانی ہو دیکھو اگر کسی کا محبوب مدتوں سے نہ ملا ہو اور تڑپتے تڑپتے وہ مدتوں کے بعد ایک روز محبّ کے پاس آ بیٹھے اور وہاں اتفاق سے بہت تیز دھوپ بھی ہو تو عاشق ناتواں کو دھوپ سے الم تو ہوگا لیکن وہ اگر عاشق ہے تو وہاں سے اٹھنا ہرگز گوارا نہ کرے گا اور یہ چاہے گا کہ خواہ مجھ کو کتنی ہی تکلیف ہو لیکن خدا کرے اس سے جدائی نہ ہو اور یہ کہے گا۔

ہر کجا یوسف رخے باشد چوماہ جنت ست آں گرچہ باشد قعر چاہ

(میرا محبوب جو حضرت یوسف علیہ السلام کے جیسے چہرہ والا چاند کی طرح ہے جس جگہ موجود ہو پھر خواہ وہ جگہ اندھا کنواں ہو مگر میرے لیے تو وہی جنت ہے)

اور اس کا یہ حال ہوگا:

گفت معشوقے بعاشق اے فتی تو بغربت دیدہ بس شہرہا

(ایک معشوق نے اپنے عاشق سے کہا کہ تو نے سفر میں بہت سے شہر دیکھے)

پس کدامی شہر آزاں ہا خوشترست گفت آں شہرے کہ دروے دلبرست

(عاشق نے جواب دیا وہی شہر سب سے بہتر ہے جس میں معشوق موجود ہے)

اور یہ کہے گا:

باتوں دوزخ جنت جنت ست اے جانفزا　　بے تو جنت دوزخ ست اے دلربا

(اے محبوب تو میرے ساتھ جنت بھی ہے دوزخ بھی ہے اگر تو میرے پاس نہ ہو تو میرے لیے جنت بھی دوزخ کے برابر ہے)

محبت کا اثر

یہ اثر ہے محبت کا کسی چیز کا اثر اس کے قلب پر نہیں ہوتا اس کے ہاتھ پاؤں اور تمام بدن پر واقعات کا اثر ہوتا ہے مگر قلب اس کا محفوظ ہے اس لیے کہ وہ عرش اللعن گیا ہے اس پر کسی شے کا اثر کیسے ہوسکتا ہے غبار اور دھوئیں اور گرد کا اثر عرش تک کس طرح جا سکتا ہے ان کا قلب حصن حصین ہے نہ وہاں گولہ کا اثر ہے نہ توپ کا اس میں سوائے اللہ کے کوئی شے نہیں۔ پس یہ آثار ہیں اس تیسری شے کے جو علم وعمل کے علاوہ ہے (اس کو اپنے اندر پیدا کرو اور یہ کوئی اختراعی شے نہیں کہ کتاب وسنت سے ثابت نہ ہو میں نے اسی کے اثبات کے لیے یہ آیت کریمہ تلاوت کی ہے۔

اب میں اس آیت سے اس کو ثابت کرتا ہوں۔ ارشاد ہے: ''اِنَّمَا التَّوْبَۃُ عَلَی اللّٰہِ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ'' الخ'' ترجمہ آیت کا فی یہ ہے کہ توبہ کا قبول کرنا اللہ کے ذمہ ان لوگوں کے لیے ہے جو جہالت سے بڑے کام کرتے ہیں پھر جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ پس یہ لوگ ہیں کہ جن پر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے توجہ فرماتے ہیں اور اللہ تعالیٰ جاننے والے اور حکمت والے ہیں۔''

یہ ترجمہ ہے اس آیت کا اہل علم کو معلوم ہے کہ نص کا مدلول چار طرح سے ثابت ہوتا ہے اول عبارت النص دوم اشارۃ النص سوم اقتضاء النص چہارم دلالۃ النص اس آیت میں مدلول بعبارۃ النص تو اور مضمون ہے اور اس سے میرا مدعا ثابت نہیں' میرا مدعا مدلول باشارۃ النص ہے عبارۃ النص کو اور اشارۃ النص کو اصطلاحاً تو اہل علم جانتے ہی ہیں لیکن عوام کے فہم کے لیے یہاں صرف ان دونوں کی حقیقت مختصراً بیان کرتا ہوں جس مضمون کے لیے متکلم نے کلام کو وارد کیا ہے وہ تو مدلول بعبارۃ النص ہے اور مدلول باشارۃ النص یہ ہے کہ اس کے کلام کا شوق تو نہیں ہوا لیکن وہ مضمون نص کے الفاظ ہی سے نکلتا ہے۔ اب سمجھئے کہ عبارۃ النص کا مدلول تو یہاں صرف یہ ہے کہ قبول توبہ کی شرط بیان کرنا منظور ہے کہ قبول توبہ جب ہوگا کہ گناہ جہالت سے ہو جاوے اور فوراً توبہ کر لے اور اس سے دوسرا مضمون اشارۃ ایک اور معلوم ہو گیا گو اس کے لیے کلام وارد نہیں کیا گیا وہ یہ کہ صدور معصیت ہمیشہ جہالت سے ہوگا اور اسی سے میرا مدعا ثابت ہوگا اور یہ مضمون بھی

صریح لفظوں سے مدلول آیت کا ہے مگر عبارۃ النص سے نہیں اس لیے کلام صوق نہیں ہے بلکہ اشارۃ النص سے ثابت ہے جو قطعیت میں عبارۃ کے برابر ہے باقی خود یہ مضمون کہ صدور معصیت کا ہمیشہ جہالت سے ہوتا ہے اس کا سمجھنا ایک مقدمہ پر موقوف ہے وہ یہ ہے کہ نص کے اندر جو یہ بجہالۃ کی قید ہے یہ قید واقعی ہے احترازی نہیں ہے دلیل اس کی یہ ہے کہ اگر قید احترازی لی جاوے گی تو اس کا قائل ہونا پڑے گا کہ اگر کوئی جان کر گناہ کرے تو اس کی توبہ قبول نہ ہو حالانکہ اس پر اجماع ہے کہ گناہ خواہ جان کر ہو یا انجان پن سے ہو توبہ کرنے سے معاف ہو جاتا ہے حتیٰ کہ کفر اور شرک جو جان کر ہی کئے جاتے ہیں ان سے بھی توبہ ہو جاتی ہے۔ پس یہ قید واقعی ہے احترازی نہیں پس معنی یہ ہیں کہ گناہ ہمیشہ جہالت سے ہوتا ہے اب اگر کوئی کہے کہ جب گناہ ہمیشہ جہالت ہی سے ہوتا ہے تو اس کے بتلانے سے کیا فائدہ۔

فائدہ اس کے بتلانے میں یہ ہے کہ بغیر اس قید کے بتلائے علاج کی طرف تنبہ نہ ہوتا یہ قید گویا مادہ مرض ہے مرض کا اگر مادہ نہ بتلایا جاوے تو معالجہ کے اندر اشکال ہوتا ہے مثلاً سوداویت کی وجہ سے مرض ہوا اور اطلاع نہ کی جاوے تو ممکن ہے کہ بلغم کا مسہل پی لے اور بجائے نفع کے ضرر ہو اور اگر بتلا دیا جاوے گا تو مریض سودا ہی کی دوا پی دے گا۔ پس بجہالت کی قید سے یہ بتلا دیا کہ گناہ ہمیشہ جہالت سے ناشی ہوتا ہے تاکہ معلوم ہو جاوے کہ جہل کا ازالہ گناہوں کا علاج ہے اب غور کرنا چاہیے کہ جہالت کے یہاں کیا معنے ہیں جو گناہ کے لیے لازم ہے سو قرآن مجید میں جہل کا لفظ بہت جگہ آیا ہے اور ہر جگہ ایک معنی نہیں اسی طرح علم کا لفظ بہت متعدد معانی میں آیا ہے اور علم و جہل میں تقابل ہے جس قدر علم کی اقسام نکلیں گی اسی قدر جہل کی بھی اور علم کی تعیین سے جہل کی بھی تعیین ہو جاوے گی اس لیے میں علم کے اقسام بیان کیے دیتا ہوں۔

علم و جہل کے معنے

علم کے ایک معنی تو دانستن ہیں جس کو سب جانتے ہیں اس کے مقابلہ میں جہل کے معنے نادانستن ہیں۔ دوسرے معنی علم کے عمل ہیں قرآن شریف میں اسی معنی میں بھی علم کا استعمال آیا ہے۔ چنانچہ علماء یہود کے بارے میں ارشاد ہے: "وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرٰهُ مَالَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ" یعنی یہود جانتے ہیں کہ جو شخص سحر اختیار کرتا ہے اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ان کے لیے ایک علم ثابت کیا ہے کہ آگے ارشاد ہے: "وَلَبِئْسَ مَاشَرَوْابِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ" یعنی جس شے کے بدلہ انہوں نے اپنی جانوں کو بیچا ہے وہ بری

شے ہے کاش وہ جانتے یہاں علم کی ان سے نفی فرمائی ہے۔ معلوم ہوا کہ اس علم سے مراد دوسری قسم ہے علم کی ورنہ اجتماع نقیضین لازم آوے گا اور وہ قسم ترک عمل ہے پس معلوم ہوا کہ علم کے دو معنی ہیں۔ علم بمعنی دانستن اور عمل بالعلم پس جہل کے بھی دو معنی ہوئے اول نہ دانستن، دوسرے عدم العمل اور معنی ثانی جہل کے دوسرے مقام پر بھی آئے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے: "قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْنِیْ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجَاهِلُوْنَ" (اے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرمادیں کہ اے جاہلوں کیا تم مجھے اللہ کے سوا دوسروں کی عبادت کرنے کو کہتے ہو) یہاں کفار کو جاہل فرمایا ہے یہاں جہل کے معنی نادانستن نہیں ہیں اس لیے کہ دوسرے مقام پر ارشاد ہے:
"وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا" (اور (غضب تو یہ تھا کہ) ظلم اور تکبر کی راہ سے ان (معجزات) کے بالکل منکر ہوگئے حالانکہ ان کے دلوں نے ان کا یقین کرلیا تھا) اس سے معلوم ہوا کہ وہ خوب جانتے تھے پس معلوم ہوا کہ "اَيُّهَا الْجَاهِلُوْنَ" میں جہل سے مراد نادانستن نہیں بلکہ ترک عمل بالعلم ہے اور دیکھئے معجزات کی فرمائش کے بارے میں ارشاد ہے:
"وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ" یہاں بھی جہل کے مشہور معنی نہیں اس لیے کہ جہل بمعنی نادانستن تو مرتفع ہو چکا تھا اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم تھا "بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ" معلوم ہوا کہ **یجهلون** سے مراد **لایعلمون** (نہیں کرتے) نہیں بلکہ **لایعملون** (عمل نہیں کرتے) ہے۔
پس دو معنی تو علم اور جہل کے یہ تھے اب تیسرے معنی اور ہیں جس جگہ یہ دونوں معنی نہیں بن سکتے وہاں یہ تیسرے معنی مراد ہوتے ہیں۔ اب میں کہتا ہوں کہ اس آیت میں دونوں معنی نہیں بن سکتے، اول معنی تو اس لیے نہیں ہو سکتے کہ اس سے لازم آوے گا کہ گناہ ہمیشہ نادانستگی سے ہوتا ہے حالانکہ یہ مشاہدہ کے خلاف ہے اس لیے کہ گناہ بسا اوقات جان کر بھی ہوتا ہے اور دوسرے معنی یعنی عدم العمل اس لیے نہیں ہو سکتے کہ "**بجهالة قید یعملون السوء**" کی ہے پس اگر بجہالۃ کے معنی علم پر عمل کرنے کے ہوں گے تو مقید اور قید کا حاصل ایک ہی ہو جاوے گا اور یہ کلام قوت میں اس کے ہوگا "**یعملون السوء عاملین السوء**" (برے عمل کرتے اور برائی پر عمل کرنے والے) اور قرآن پاک ہے اس سے کہ اس میں ایسا بے معنی کلام ہو۔ پس جب جہل کے دونوں معنی نہیں بن سکتے فتعین الثالث متعین ہوگئے۔ اب کوئی صاحب مہربانی فرما کر بتلائیں کہ وہ تیسرے معنی جہالت کے کیا ہیں جو اس آیت میں مراد ہیں ورنہ میں عرض کرتا ہوں کہ وہ معنی ثالث بجز غلبۃ الحال کے اور کچھ نہیں یعنی احکام شرعیہ کی محبت اور منہیات شرعیہ سے نفرت قلب

میں رچ جائے اسی کا نام حال ہے اور اسی کو صوفیاء یقین بھی کہتے ہیں جس جگہ کتاب وسنت میں یقین کی تحصیل کا امر ہے اس سے یہی کیفیت مراد ہے پس جب گناہ صادر ہوگا اسی حال کے نہ ہونے سے ہوگا اور حال کے ہوتے ہوئے گناہ کا صدور نہیں ہو سکتا اور یہی میرا مدعا تھا کہ ہماری ساری خرابیاں حال کے نہ ہونے سے ہیں یہ تو مجملاً اس کا اثبات آیات سے ہوا باقی تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ مومن کے اندر دو قوتیں رکھی ہوئی ہیں ایک قوت تو اس کو خیر پر حامل ہوتی ہے اور دوسری شر سے روکتی ہے اگر یہ دونوں قوتیں مغلوب ہیں اور کالعدم ہیں تو گناہ کا ہمیشہ صدور ہوگا اور اگر کسی وقت غالب ہیں اور کسی وقت مغلوب تو مغلوبیت کے وقت اس کیفیت مانعہ کا مشاہدہ نہیں ہوتا اس لیے اس وقت بھی گناہ اس سے صادر ہوگا اور غالبیت کے وقت صادر نہ ہوگا اور اگر قریب قریب ہر وقت ان کا غلبہ ہے کسی وقت مغلوبیت نہیں ہوتی الا نادراً اسی کا نام حال ہے ایسے شخص سے گناہ کا ارتکاب نہ ہوگا۔ دیکھئے ہر مسلمان جانتا ہے کہ زنا حرام ہے شراب پینا حرام ہے ترک صلوۃ حرام ہے مگر یہ علم بہت سے مسلمانوں کو گناہ سے نہیں روکتا تو اس کی کیا وجہ ہے وجہ یہی ہے کہ حال نہیں ہے اور جو مغلوب الحال ہے وہ خدا کی نافرمانی نہ کرے گا۔

دوام ترک معاصی عادۃ حال کے پیدا کرنے پر موقوف ہے

پس معلوم ہوگیا کہ دوام ترک معاصی عادۃ حال کے پیدا کرنے پر موقوف ہے اور ترک معاصی علی الدوام واجب ہے اور مقدمۃ الواجب واجب تو حال کی تحصیل ہر مسلمان پر ضروری ہے۔ دیکھو حدیث شریف سے اس مضمون کی صاف تائید ہوتی ہے۔ ارشاد ہے:

"لایزنی الزانی حین یزنی وھو مومن ولا یسرق السارق حین یسرق وھو مومن"[۱]

"زانی جب زنا کرتا ہے اس وقت وہ مؤمن نہیں ہوتا اور چور جب چوری کرتا ہے اس وقت وہ مؤمن نہیں ہوتا۔"

معتزلہ کو اس مقام پر لغزش ہوئی وہ حدیث سے کہتے ہیں کہ زنا اور دیگر کبائر سے ایمان نہیں رہتا حالانکہ نصوص قطعیہ شاہد ہیں کہ عصاۃ مومنین بھی مومن ہیں چنانچہ بہت سی آیتوں میں ان کو "یایھا الذین امنوا" سے خطاب ہے اس لیے اہل سنت کا عقیدہ ہے اور حق یہی ہے کہ مرتکب کبیرہ ایمان سے خارج نہیں ہوتا اور یہ حدیث اپنے ظاہر پر نہیں ہے اس کے معنی اور کچھ ہی۔ محققین

---

۱ (الصحیح للبخاری ۳: ۱۷۸، سنن ابن ماجۃ: ۳۹۳۶)

علمائے ظاہر نے ان معنی کو سمجھا اور صحیح سمجھا لیکن اس کی پوری شرح نہ کر سکے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ مومن سے مراد اس حدیث میں مومن کامل ہے اور اس میں نفی ایمان کامل کی ہے مطلق ایمان کی نہیں ہے۔ یہ معنی نہایت لطیف اور بالکل صحیح ہیں لیکن ان حضرات نے یہ نہ بتلایا کہ وہ شے کونسی ہے کہ جس کے نہ ہونے سے اس کا ایمان ناقص ہوا اور اس کے ہونے سے کامل ہو جاتا ہے کہ جو اس کو گناہ نہ کرنے دیتی۔ صوفیاء کرام نے اس راز سربستہ کو کھولا اور انہوں نے فرمایا کہ ہم بتلاتے ہیں ہم سے سنو وہ شے حال ہے اس کے نہ ہونے سے ایمان میں نقصان رہتا ہے اور اسی کے نہ ہونے سے آدمی گناہ سے نہیں رکتا اور سوائے حال کے کوئی اور شے نہیں ہے جو گناہ سے روک سکے اور بدون اس کے اعمال اور عبادات کرنا ایسا ہے جیسے بے انجن کی گاڑی ہوتی ہے کہ اس کو مزدور ٹھیلتے ہیں جب تک وہ ٹھیلتے رہیں چلتی رہتی ہے اور جب ٹھیلنا موقوف کر دیں تو رک جاتی ہے اسی طرح ہمارے روزہ نماز کی گاڑی ہے کہ ہم اپنی طبیعت پر جبر کر کے اس کو چلاتے ہیں اور بعض مرتبہ جب عاجز ہو جاتے ہیں تو رک جاتی ہے اور اگر انجن کے اندر چنگاری ڈال کر اس کو گاڑیوں سے متصل کر دیں پھر دیکھئے وہ روکنے سے نہ رکیں گی وہ چنگاری کیا ہے۔ حال بس وہ چنگاری ہمارے اندر نہیں ہے اگر وہ ہوتی تو اعمال شرعیہ ہم سے بے تکلف صادر ہوتے بلکہ بغیر عبادات کے ہم کو چین نہ آتا اس لیے کہ وہ آگ ہر وقت ہم کو حرکت دیتی اسی کی نسبت تو کہتے ہیں:

صنمارہ قلندر سزوار بمن نمائی کہ دراز و دور دیدم رہ درہم پارسائی

(طریق زہد خشک بہت دور دراز کا راستہ ہے مجھے تو آپ طریق عشق میں چلائیے)

خالی بلا انجن کے گاڑی ٹھیلنا رہ رسم و پارسائی ہے کہ بہت دور دراز ہے مدتوں میں نہایت مشقت کے بعد گاڑی اس راستہ سے منزل مقصود پر پہنچتی ہے اور رہ قلندر سے مراد راہ محبت و عشق ہے کہ جو انجن کے مشابہ ہے کہ منٹوں میں گاڑیوں کو سینکڑوں میل پہنچا دیتا ہے اور بغیر اس کے تو ٹھیلنا ہے اور سینکڑوں عوائق و موانع کا مقابلہ کرنا ہے جیسے کہا گیا ہے:

بزمیں چو سجدہ کردم ززمیں ندا برآمد کہ مرا خراب کردی تو زسجدہ ریائی

(جب زمین پر میں نے سجدہ کیا تو زمین سے یہ ندا آئی کہ تو نے ریا کا سجدہ کر کے مجھے خراب کیا)

بطواف کعبہ رفتم بحرم رہم ندادند تو بروں درچہ کردی کہ درون خانہ آئی

(جب میں خانہ کعبہ کے طواف کو گیا تو حرم نے مجھ کو راستہ نہ دیا اور کہا کہ تو نے حرم کے باہر کیا کیا ہے جو خانہ کعبہ کے اندر داخل ہوتا ہے)

اعمال شرعیہ کے طبعی نہیں بنتے

یہی حال ہمارے روزہ نماز کا ہے جب تک کہ اعمال شرعیہ طبعی نہیں بنتے پورا خلوص ان میں نہیں آتا۔ پس معنی حدیث کے یہ ہوئے کہ زانی زنا نہیں کرتا جس حالت میں کہ اس کے اندر حال ہو یعنی مومن کامل ہو اور ایمان سے اس کو اس لیے تعبیر فرمایا کہ ایمان کہتے ہیں تصدیق کو اور تصدیق قسم ہے علم کی۔ پس وھو مومن کے معنی یہ ہوئے وھو عالم اور علم کے وہی معنے ثالث مراد ہیں یعنی غلبہ حال اس لیے کہ دو معنی اول کے یہاں بھی نہیں ہو سکتے کما ھو ظاہر یہ تو قرآن مجید اور حدیث سے حال کی ضرورت کا اثبات تھا اور لیجئے حال وہ چیز ہے کہ جس کی شہادت دوسرے مذہب کے لوگوں نے بھی دی ہے اور کیوں نہ دیں اس لیے کہ۔ **الحق ما طقت به الاعداء**

ہرقل کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں سوال و جواب

ہرقل کا مکالمہ اہل مکہ مکرمہ سے جو صحیح بخاری میں آیا ہے اس میں اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت بہت سی باتوں کا سوال کیا ہے من جملہ ان کے ایک سوال یہ بھی کیا تھا "**هل يرتد احدمنهم سخطة لدينه**"، یعنی کیا کوئی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین میں سے ان کے دین سے ناراض ہو کر پھر جاتا ہے اس کا جواب کہا گیا کہ نہیں ایسا نہیں ہوتا تو ہرقل جواب میں کہتا ہے "**كذلك الايمان اذا خالطت بشاشة القلوب**"، یعنی ایمان کی یہی حالت ہوتی ہے جب اس کی بشاشت دلوں میں رچ جاتی ہے پھر ہرقل کے اس قول کو صحابہ رضی اللہ عنہم نے اور علماء نے رد نہیں کیا۔ یہ دلیل ہے اس کی کہ یہ قول بالکل مسلم ہے اور بشاشت ایمان سے مراد یہی حال ہے دیکھئے ہرقل نصرانی ہے وہ کہتا ہے کہ جب ایمان کی حلاوت قلب میں آ جاتی ہے وہ جاتی نہیں لیکن یہ مرتبہ ہر حال کا نہیں ہے بلکہ حال کامل کا ہے جیسے تپ دق جب تیسرے درجہ میں پہنچ جاتی ہے پھر وہ ہرگز نہیں نکلتی۔ اسی طرح حال راسخ زائل نہیں ہوتا' شیطان اسی سے تو محروم تھا' اس لیے مرتد و ملعون ہو گیا' غرض حال کی ضرورت قرآن سے ثابت حدیث سے ثابت اور غیر قوم یعنی ہرقل کی شہادت سے ثابت ہوئی اب اس کے ساتھ ایک اور کمال اس دولت کے ساتھ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر چند کہ تحقیق کے مرتبہ میں حال راسخ کا اثر یہ ہوتا ہے کہ صاحب حال کبھی اس سے راجع نہیں لیکن اس کے ساتھ ہی اس شخص کو عبدیت اور تفویض اور تسلیم کی دولت بھی منجانب اللہ تعالیٰ اس کو عطاء فرمائی جاتی ہے کہ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ یہ دولت اب مجھ کو مل گئی ہے جا نہیں سکتی بلکہ ہر وقت خائف اور ترساں و لرزاں رہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ مالک کی عطاء ہے جب چاہیں گے مجھ سے لے لیں۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ سے مشکل سوال کا جواب

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا ایزنی العارف یعنی کیا عارف زنا کرتا ہے۔ یہ سوال نہایت ٹیڑھا تھا اور مزال الاقدام ہے اگر ہم سے پوچھا جاتا تو ہم تو اس کے جواب سے عاجز ہو جاتے۔ اس لیے کہ اگر اس کے جواب میں نعم کہا جاوے تو یہ اشکال ہوتا ہے کہ عارف عارف نہ رہے گا اور اگر لا کہا جاوے تو تسلیم وعبدیت کے خلاف اور قدرحت کا مقابلہ ہے اگر کسی اہل ظاہر سے ایسا سوال کیا جاتا تو وہ تنگ ہو کر یہ کہہ دیتا۔

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ   بازمیگوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

(دریا کی گہرائی میں تختہ سے باندھ دیا اور پھر کہہ دیا کہ دامن تر نہ ہو ہوشیار رہنا)

اور صاف کہہ دیتا کہ جواب نہیں ہو سکتا لیکن جنید رحمۃ اللہ علیہ سیدالطائفہ کیوں ہوتے اگر ایسے اشکالات کو نہ سلجھاتے پھر بھی یہ اشکال اس درجہ کا تھا حضرت جنید رضی اللہ عنہ کو بھی اس کے جواب میں تامل کرنا پڑا۔ چنانچہ آیا ہے **"فاطرق ملیاثم رفع راسه وقال وكان امر الله قدرا مقدورا"** یعنی جنید رحمۃ اللہ علیہ نے بہت دیر تک سر جھکایا پھر سر اٹھا کر فرمایا **"وكان امر اللّٰه قدرا مقدورا"** یعنی خدائے تعالیٰ جو تجویز کر چکتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے خدائے تعالیٰ کے سامنے کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ فلاں گناہ نہیں کر سکتا' سوائے تسلیم ورضا کے اس کے سامنے کوئی چارہ نہیں' یہ ایسا عجیب جواب ہے کہ اس میں ہر پہلو کی رعایت ہے اور کچھ تعارض وتناقض بھی لازم آتا ہے اس تحقیق کی بھی رعایت ہے کہ عارف سے زنا نہیں ہو سکتا' اس لیے کہ خدائے تعالیٰ ایسے لوگوں کے واسطے گناہ کو مقدر ہی نہیں فرماتا اور تسلیم ورضا وعبدیت کا پہلو بھی نہیں چھوڑا' کما ہو ظاہر۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کا اس جواب سے کمال علم اور معرفت ظاہر ہوتی ہے اور یہی تو وہ شے ہے کہ جس سے وہ شیخ الطائفہ ہوئے۔

عارف سے نہ گناہ ہوتا ہے نہ بعد ہوتا ہے

پس حقیقت یہی ہے کہ عارف سے نہ گناہ ہوتا ہے اور نہ اس کو بعد ہوتا ہے۔ مولانا رومی رحمہ اللہ نے اس کی عجیب مثال لکھی ہے وہ لکھتے ہیں کہ جیسے کوئی بالغ بعد بلوغ کے نابالغ نہیں ہوتا اسی طرح عارف بعد معرفت کے راجع نہیں ہوتا اور یہ مثال نہایت چسپاں اور مطابق ہے اس لیے کہ حقیقی بالغ عارف ہی ہے۔ عارف کے سوا سب نابالغ ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں:

خلق اطفالند جز مست خدا   نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا

(سوائے مست خدا کے ساری مخلوق بچوں کی طرح ہے جس نے خواہشات نفسانی کو ترک نہیں کیا وہ بالغ ہے نہیں ہے)

خوب کہا ہے صوفیاء نے کہ اہل لغت کے نزدیک تو بالغ وہ ہے جو منی والا ہو جاوے اور ہمارے نزدیک بالغ وہ جو منی سے نکل گیا ہے' اول منی بمعنی ماء ہے اور دوسری منی بمعنی من شدن یعنی خودی ہے۔ پس جیسے بالغ نابالغ نہیں ہوتا اسی طرح کامل دراصل راجع نہیں ہوتا اور مقبول ہو کر مردود نہیں ہوتا اور جیسے پھل جب پک جاتا ہے تو پھر وہ کچا نہیں ہوتا اور اس اخیر مثال میں اس طرف اشارہ ہے کہ جس طرح پکا پھل گو خام نہیں ہوتا مگر متغیر تو ہو سکتا ہے۔ اسی طرح عارف سے بھی کبھی کبھی لغزشیں ہوتی ہیں کبھی اجتہادی اور کبھی بمقتضائے بشریت مگر ان کی وہ غلطی کیسی ہے وہ غلطی ایسی ہے۔

ایں خطا ازصد صواب اولیٰ ترست　　خوں شہیداں راز آب اولیٰ ترست

(شہیدوں کا خون آب حیات سے افضل ہے یہ غلطی سینکڑوں درستیوں سے بہتر ہے)

اور ان غلطیوں پر انکی گوشمالی بھی ہوتی ہے اور یہ گوشمالی سالکین ہی کو ہوتی ہے' مجاذیب کو نہیں ہوتی لیکن ان غلطیوں کو ہم اپنی غلطیوں پر قیاس نہ کریں اس لیے کہ

کارپا کاں راقیاس از خود مگیر　　گرچہ ماند درنویشتن شیر و شیر

(نیک لوگوں کے کام کو اپنی طرح جو ہماری عبادت ہے وہ ان کے لیے لغزش ہے اور جو ہماری لغزش ہے وہ ان کے لیے کفر کا حکم رکھتی ہے)

ایک بزرگ ایک جنگل میں رہا کرتے تھے ایک روز بارش ہوئی ان کے منہ سے بے اختیار نکل گیا کہ سبحان اللہ کیسے اچھے موقع پر بارش ہوئی ہے۔ معاً ندا آئی کہ او بے ادب بتا بے موقع کس روز ہوئی تھی۔ بادشاہوں کے سامنے بولنا سیکھ' سن کر رنگ ہوا ہو گیا' بدن پر لرزہ پڑ گیا۔ صاحبو مدح کے لیے بھی سلیقہ چاہیے' مدح بھی ہر ایک نہیں کر سکتا۔

ایک اور بزرگ تھے وہ پاؤں پھیلا کر بیٹھے تھے' ندا آئی او بے ادب بادشاہ کے سامنے پاؤں پھیلایا کرتے ہیں' حضرت تمام عمر گزر گئی کبھی پاؤں نہیں پھیلائے۔ آپ سن کر سمجھتے ہوں گے کہ بیچارے بڑی تکلیف میں تھے صاحبو یہ شبہ اس لیے واقع ہوا کہ ہم نے ان بزرگ کو اپنے اوپر قیاس کیا' وہ تکلیف میں نہیں تھے ان کو اس خطاب کی لذت نے ایسا بے خود بنا دیا کہ ان کو اس حالت میں صدہا آرام سے بڑھ کر ذوق تھا۔ "من لم یذق لم یدر" ایک چسکہ اس خطاب کے لذت کا ہم کو بھی لگ چکا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ.

یعنی ہم نے امانت کو پیش کیا آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پس سب نے اس کو اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھالیا۔ امانت سے مراد احکام شرعیہ ہیں کہ اگر امتثال ان کا کیا جاوے تو مرحوم اور مغفور ہو اور اگر نافرمانی کی جاوے تو مغضوب اور مقہور ہو۔ سب مخلوق اس سے ڈر گئی اس لیے کہ حق تعالیٰ کے غضب اور قہر کا کون متحمل ہوسکتا ہے۔ حضرت انسان آگے بڑھ کر بولے کہ لایئے ہم اٹھالیں گے تو آپ نے غور بھی کیا کہ انسان نے اس امانت کو کیوں اٹھایا اس کی وجہ اہل مشاہدہ سے پوچھو۔ حافظ شیرازی فرماتے ہیں:

آسماں بار امانت نتوان ست کشید قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

(آسماں خلافت کے بار کو نہ اٹھاسکا اس کا قرعہ مجھ دیوانہ کے نام نکلا)

لفظ دیوانہ سے اشارہ فرمادیا کہ وجہ اس بار امانت کے اٹھانے کی مادہ عشق ہے جو انسان کی فطرت میں رکھا ہوا ہے جس وقت خطاب عرض امانت کا پہنچا تو سکر عشق سے ایسا بے خود ہوا کہ آپے سے گزر گیا، قوت فکر یہ گئی گزری ہوئی یہ نہ سوجھی کہ یہ بوجھ جو میں اٹھا رہا ہوں اس کا انجام کیا ہوگا۔ اگر احکام کا امتثال نہ ہوا تو عقاب و مواخذات بھی ہوں گے اور گویا لسان حقیقت سے یہ کہا کہ ارے میاں جوتیاں لگیں گی تو لگنے دو اس بہانہ سے ان سے بات چیت کا تو موقعہ ملے گا۔ پس آج یہ جو احکام شرعیہ کا بار اٹھا رہے ہیں یہ اسی عشق کا نتیجہ ہے پس اگر وہ عشق سابق جو اس جسد عنصری کے آثار سے کمزور ہو رہا ہے ظاہر کرادے تو آپ پر یہ بار بار نہ رہے پس اسی واسطے اس خطاب کی لذت نے ان بزرگ کو ساری عمر پاؤں سکوڑ لینا آسان کردیا۔ الحاصل ان حضرات کو ان گوشمالیوں میں لذت آتی ہے۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں:

بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ نکو گفتی جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

(تو نے مجھے برا کہا اور میں خوش ہوں اللہ مجھ کو معاف کرے تو نے ٹھیک کہا میٹھے سرخ ہونٹوں سے کڑوا جواب بھی اچھا پہلو معلوم ہوتا ہے)

بدگفتن تو درکنار دہ کردن پر بھی راضی ہیں۔

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(اب دشمن کا نصیب نہ ہو کہ آپ کی تلوار سے ہلاک ہو دوستوں کا سر تیری خنجر آزمائی کے لیے سلامت رہے)

اور کہتے ہیں:

ناخوش تو خوش بود بر جان من　　　دل فدائے یار دل رنجان من

(محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے اس کی وہ طبیعت کے لیے ناخوش ہی کیوں نہ ہو)

اب بتلایئے کہ زندگی یہ ہے یا وہ زندگی ہے جو ہم جی رہے ہیں اگر وہ زندگی چاہیے تو اس زندگی کو خیر باد کہے۔

بمیرا ے دوست پیش از مرگ اگرے زندگی خواہی

کہ ایں از جنیں مردن بہشتی گشت پیش ازما

(وہ میری جان کے لیے پسندیدہ ہے میں اپنے یار پر جو میری جان کو رنج دینے والا ہے، دل قربان کرتا ہوں)

یہ ہے حیات اصلی اگر ایسی زندگی کی رغبت نہ ہو تو نہایت افسوس ہے یہی ہے وہ زندگی جو حال کی بدولت نصیب ہوتی ہے یہ تو اس حیات کے دلائل تھے اگر دیکھنے کو جی چاہے تو آپ دیکھ سکتے ہیں، آپ کے اندر موجود ہے۔

ستم ست اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو سمن درآ　　　تو زغنچہ کم نہ دمیدہ دردل کشا بچمن درآ

(تمہارے اندر خود چمن ہے اس کا پھاٹک تمہارے ہاتھ میں ہے جب جی چاہے سیر کرلو)

اور جو آپ کو اس کی ہمت نہیں ہے کہ اپنے باغ کی سیر کرو تو کسی اور ہی کے باغ کو دیکھو، ایسی مثالیں اب موجود ہیں ان کا نماز روزہ دیکھو اور اپنا دیکھو، ان کی خوشی اور غمی دیکھو اور اپنا دیکھو۔ ان کا چلنا پھرنا، ہنسنا بولنا دیکھو اور اپنا دیکھو اگر غور کر کے دیکھو گے تو انسان اور حیوان کا سا فرق نظر آوے گا اور بے اختیار صاف تم خود اس کی شہادت دو گے کہ بات تو یہ ہے کہ دنیا کا راحت اور آرام بھی ان ہی حضرات کا حصہ ہے اور زندگی اگر ہے تو یہ ہے واقعی ایسا عیش بادشاہوں کو بھی میسر نہیں اور اس عیش کے ہوتے ہوئے ان کو بادشاہت کی بھی پرواہ نہیں۔

شاہ سنجر کی حکایت

چنانچہ حضرت غوث اعظم قدس سرہ کی خدمت میں ملک سنجر نے لکھا کہ میں ملک نیم روز کا کچھ حصہ حضور کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت نے جواب میں لکھا:

زانگہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب　　　من ملک نیم روز بیک جو نمے خورم

(کیونکہ مجھے دولت نیم شبی کی حقیقت معلوم ہو چکی ہے اس لیے میں ملک سنجر کو ایک جو کے بدلے میں بھی نہیں لوں گا)

کوئی یہ نہ کہے کہ اب ایسے بزرگ کہاں ہیں۔ صاحبو! ان حضرات کی جوتیاں اٹھانے والے اب بھی موجود ہیں ابھی گم نہیں ہوئے لیکن بات یہ ہے کہ لوگوں کو اپنے معاصرین کی قدر نہیں ہوتی، پہلے بزرگوں کے معاصرین بھی یہی کہا کرتے تھے آج ہم ان کو ہی بزرگ سمجھتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ وہ مر کر بزرگ ہوئے یا زندگی ہی میں تھے۔ ظاہر ہے کہ مر کر کوئی بزرگ نہیں ہوا جو کچھ کسی کو ملتا ہے زندگی ہی میں ملتا ہے، یہ انکار آپ لوگوں کا حسد کی وجہ سے ہے خدا کے لیے حسد چھوڑ و اور بزرگوں کی برکات سے محروم نہ رہو اور میں سچے بزرگوں کی بہت آسان پہچان بتلاتا ہوں وہ یہ ہے کہ ان کی صحبت میں یہ اثر ہوتا ہے کہ تمہاری حالت بدلنا شروع ہو جاوے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ معتقد ہو کر ہی ان کے پاس رہو ہاں یہ ضرور ہے کہ اعتقاد نہ ہو تو بداعتقادی بھی نہ ہو، خالی الذہن ہو کر رہنے سے بھی حالت بدلے گی۔ اس وقت آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ اسی معادن سے نکلے ہوئے ہیں اور یہ بھی اسی باغ کے پھول ہیں جب تم خود اپنے اندر اثر دیکھ لو گے تو خود ایمان لے آؤ گے اور بغیر پاس رہے دور دور سے کیا ہو سکتا ہے۔ دیکھو بیر کے درخت میں جب قلم لگا دیتے ہیں تو پیوندی بیر آنے لگتے ہیں تم بھی پیوند لگاؤ یعنی تعلق پیدا کرو دیکھو پھر کیسے پھل لگتے ہیں۔ وہ حالت ہوگی جیسے شیخ شیرازی فرماتے ہیں:

گلے خوشبوئے درحمام روزے رسید ازدست محبوبے بدستم

(خوشبودار مٹی ایک روز حمام میں محبوب کے ہاتھوں میں پہنچی)

بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری کہ ازبوئے دلاویز تو مستم

(میں نے اس سے کہا کہ تو مشک ہے یا عبیر کہ تیری مرغوب خوشبو نے مجھے مست کر دیا)

بگفتا من گلے ناچیز بودم ولیکن مدتے باگل نشستم

(اس نے مجھ سے کہا کہ میں تو ناچیز مٹی ہوں لیکن عرصہ تک پھولوں کی صحبت میں بیٹھی ہوں)

جمال ہم نشیں درمن اثر کرد دگرنہ من ہما خاکم کہ ہستم

(میرے ہم نشین گل کے جمال نے مجھ پر اثر کیا ورنہ میں تو وہی مٹی ہوں جو تھی)

اور اگر پاس رہنے کی ہمت نہ ہو تو ان کے پاس رہنے والوں کی حالت سے ان کا اندازہ کرو، دیکھو کہ ان کے پاس رہنے والوں کی پہلے کیا حالت تھی اور اب کیا حالت ہے۔ اب اس سے زیادہ آسان بات کیا بتلاؤں۔ پس جب تم کو ان علامات سے ایسے حضرات کا پتہ لگ جاوے تو اب سستی نہ کرو اپنے کو ان کے سپرد کر دو اور طریقہ کے موافق کام کرو۔

وصول الی اللہ حاصل کرنے کا طریقہ

طریقہ یہ ہے کہ جو اس راہ کے مواقع ہیں ان کو رفع کرو اور جو شرائط ہیں ان کو جمع کرو اس سے علت تامہ وصول الی اللہ اور مقبولیت کی متحقق ہو جاوے گی۔ یہی حاصل ہے کہ علت تامہ کا بعضے لوگ کچھ دنوں کام کرتے ہیں اور جب ثمرہ ظاہری ان کو نظر نہیں آتا تو چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ ان کی وہی مثل ہے۔ ”**الحائک اذا صلی یومین انتظر الوحی**“ (جولاہا جب دو دن نماز پڑھ لے تو وحی کا انتظار کرتا ہے) دو چار مہینے ذکر شغل کر کے شکایت کیا کرتے ہیں کہ اجی ہم کو تو کچھ اثر نہیں ہوا۔ صاحبو! جن کو کچھ ہوا ہے کہتے ہیں:

صوفی نشود صافی تا درنکشد جامے　　بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

(صوفی جب تک بہت سے مجاہدے نہ کرے خام ہی رہتا ہے، پختگی مجاہدات کے بعد حاصل ہوتی ہے)

ان کو بھی مدتوں میں دولت ملی ہے لیکن یہ مدت کام کی جس میں کچھ اثر نہیں ہوا ہے اس کو بیکار نہ سمجھنا چاہیے اس لیے کہ جو کچھ اثر ہوتا ہے وہ اسی مدت کے کام کی بدولت ہے۔

مدت پس جن لوگوں پر جس منٹ میں فضل حق تعالیٰ کا متوجہ ہوا ہے اور ان کے قلب میں کچھ دولت آ گئی ہے وہ پہلے برسوں کو کہ جن میں کچھ اثر نہیں ہوا بیکار نہ جانیں وہ سب مدت حصول مطلوب کے لیے معد ہے اور شرط ہے رفتہ رفتہ جب علت تامہ بجمیع اجزاء مجتمع ہو جاتی ہے اور علت تامہ کا جزو اخیر کا تحقق ہو جاتا ہے تو مطلوب حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ سمجھتا ہے کہ اسی منٹ میں حاصل ہوا ہے حالانکہ وہ تمام مدت اسی کے ممد و معاون ہے ایسی مثال ہے جیسے کوئی معجون کھانا شروع کرے تو اول اول کچھ نفع محسوس نہیں ہوتا اور رفتہ رفتہ جب وہ اپنا اثر پورا کرتا ہے تو اس وقت صحت اس پر مرتب ہوتی ہے۔

حصول حال کا طریق

اب میں مختصراً حال کی تحصیل کا طریقہ عرض کرتا ہوں وہ طریقہ چند اجزاء سے مرکب ہے اور اس کی چند شرائط ہیں اور چند موانع ہیں۔ شرائط تو یہ ہیں کہ اول تو علم دین حاصل کرو خواہ مولوی بن کر یا علماء کی صحبت میں رہ کر اور مشغولین کے لیے تحصیل علم کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ جو لوگ اردو پڑھے ہوئے ہیں علماء محققین سے اردو کے رسائل سبقاً سبقاً پڑھ لیں اور جو ان پڑھ ہیں ان کو ایک وقت مقرر کر کے سنایا کریں۔

دوسرے یہ ہے کہ جو علم حاصل جاوے اس پر عمل کرنا شروع کر دو اور نماز روزہ اور تمام احکام شرعیہ کی پابندی نہایت اہتمام سے کرو جہلائے صوفیاء کہتے ہیں کہ جب مقصود ہم کو حاصل

ہو گیا تو ظاہری نماز روزہ کی ہم کو ضرورت نہیں اس لیے کہ یہ تو نماز روزہ کی صورت ہے اور جب ہم کو معنے حاصل ہو گئے تو صورت کی حاجت نہیں ۔ یہ ان لوگوں کی سخت غلطی ہے کتاب وسنت سے اس کا بطلان واضح ہے یاد رکھو کہ جو نماز ہم پڑھتے ہیں گو صورت نماز ہے لیکن کوئی صورت اللہ تعالیٰ نے بے معنی نہیں پیدا کی کوئی بادام کی نوع بے مغز نہیں اور کہیں مغز بغیر پوست کے نہیں ہے اور کوئی رس بغیر چھلکے کے نہیں پس نماز روزہ کی صورت بیکار نہیں ہے صورت کو بیکار کر دینا اصل مقصود یعنی جان کو ضائع کرنا ہے اس لیے جان کا بغیر صورت کے قیام نہیں ہے اور اگر جان ہی مقصود ہے جاڑے گرمی میں کپڑا کیوں پہنتے ہو اس لیے کہ اصل مقصود تو جان ہے اور اس کو سردی گرمی نہیں ستاتی ۔ افسوس ہے کہ تمام صورتیں ان کے نزدیک باقدر ہیں اور دین کی صورتیں بے قدر ۔ تیسری بات یہ ہے کہ اہل اللہ کی صحبت اختیار کرو اس واسطے کہ بدون اس کے ہزار عالم ہو جاؤ اور لاکھ مجاہدہ وریاضت کرو۔

عادۃ اللہ یہی جاری ہے کہ بدون شیخ کے کچھ کام نہیں چلتا ۔ دیکھو اگر صرف کتابوں کا مطالعہ کافی ہوتا تو طب کی کتب دیکھ کر جس کا جی چاہتا علاج کر لیتا اور خوان نعمت میں سے گلگلوں کے پکانے کی ترکیب دیکھ کر جس کا جی چاہتا پکا لیتا حالانکہ اگر کوئی کتاب دیکھ کر علاج کرے یا ترکیب دیکھ کر گلگلے پکائے تو وہ ضرور غلطی کرے گا اس لیے کہ وہ آنچ کا اندازہ اور پانی کی مقدار اور علاج میں دقائق طب کی رعایت کہاں سے لاوے گا وہ تو بغیر کسی کے پاس رہے حاصل نہیں ہوتے اور ہر فن کے اندر بعض خصوصیات اور دقائق وجدانی ایسے ہوتے ہیں کہ وہ تحریر میں آ ہی نہیں سکتے اور بغیر ان کے کمال اور وہ فن حاصل نہیں ہوتا اور ایسی چیزیں بدون پاس رہے حاصل نہیں ہوتیں جیسے کسی کا شعر ہے:

گر مصور صورت آں دلستاں خواہد کشید ۔۔۔۔ لیک حیرانم کہ نازش را چساں خواہد کشید

(اگر مصور اس محبوب کی تصویر بنائے لیکن میں حیران ہوں اس کے ناز وادا کو کیسے چسپاں کرے گا)

پس کتابوں سے گو تم تصوف کے مسائل یاد کر لو لیکن جو بات شیخ کے پاس رہنے سے حاصل ہوتی ہے وہ کہاں سے لاؤ گے ایسے وقت تو کتابوں کو اٹھا کر رکھ دینا چاہیے ۔ کوئی بزرگ فرماتے ہیں:

جملہ اوراق و کتب درنار کن ۔۔۔۔ سینہ را از نور حق گلزار کن

(تمام کتابوں اور اوراق کو آگ میں جھونکو اور سینہ کو حق تعالیٰ کے نور سے گلزار کرو)

پھر اگر ایسے شیخ کی صحبت ہو تو ادب کے ساتھ ہونا چاہیے اس لیے کہ اس صحبت سے مراد وہ بیوی کی صحبت نہیں یہ صحبت اور ہے اور آداب مشائخ کا خلاصہ اس مثال سے سمجھو کہ اگر کوئی مریض کسی طبیب کے پاس جاوے تو اس کو چاہیے کہ وہاں جا کر اپنے امراض اس سے بیان کرے وہ مریض بڑا احمق ہے کہ طبیب کے پاس جا کر دوسرے مریضوں کے امراض بیان کرے ۔

شیوخ کی خدمت میں رہنے کے آداب

آج کل یہ بڑی آفت ہے کہ بزرگوں اور مشائخ کے یہاں جا کر لوگ اپنے امراض کا علاج تو پوچھتے نہیں ہاں دوسروں کی غیبت اور عیب جوئی کرتے ہیں اور بعضے فضول قصے اور کہانیاں اور اخبار کی خبریں بیان کیا کرتے۔ بزرگوں نے یہاں تک لکھا ہے کہ مشائخ کے یہاں جاؤ تو کسی کا سلام بھی نہ لے جاؤ اہل ظاہر کو یہ سن کر وحشت ہوگی لیکن وحشت کی کوئی بات نہیں، شریعت کا قاعدہ الاہم فالاہم اس کے لیے مہتم بالشان اپنے امراض کا معالجہ ہے اور یہ سلام پہنچانا اس میں مخل ہے اور راز اس میں یہ ہے کہ شیخ محبوب کا وسیلہ اور ذریعہ ہونے کی وجہ سے محبوب ہے اور سلام پہنچانا اپنے محبوب کو غیر کی طرف متوجہ کرنا ہے، کیا کوئی محبّ گوارا کرسکتا ہے کہ اس کا محبوب اس کو چھوڑ کر غیر کی طرف مائل ہو، ہرگز نہیں اور اگر اس کو یہ گوارا ہو تو وہ عاشق و مرید نہیں ان کی تو یہ شان ہوتی ہے:

باسایہ ترانمے پسندم عشق است و ہزار بدگمانی

(میں محبوب کے سایہ کے ساتھ بھی کسی کو پسند نہیں کرتا کیونکہ عشق میں ہزاروں بدگمانیاں ہیں)

اور سایہ تو درکنار جب عشق کمال کو پہنچتا ہے ان کو خود اپنے سے غیرت آنے لگتی ہے۔ چنانچہ ایک عارف کہتے ہیں:

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم

(مجھ کو آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ ان کو محبوب کے رخ انور کو دیکھنے نہ دوں اور کانوں کو ان کی باتیں سننے نہ دوں)

عارف شیرازی فرماتے ہیں:

بخدا کہ رشکم آیدز دو چشم روشن خود کہ نظر دریغ باشد بچنیں لطیف روئے

(خدا کی قسم مجھے اپنی دونوں آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ ایسے حسین سے میری نظر دور رہتی ہے)

کسی کو شاید خیال ہو کہ یہ تو نری شاعری ہے کسی کو اپنی آنکھ سے بھی غیرت ہوئی ہے۔ صاحبو! من لم یذق لم یدر ہوتی ہے اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے تو کر کے دکھلا دیا۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے پوچھا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ شریف کیسا تھا وہ فرماتے ہیں کہ دیکھا کس نے ہے۔ خدا کی قسم ہے کہ دیکھنے کی ہمت اور جرأت نہیں ہوئی۔ باوجودت زمن آواز نیامد کہ کنم۔

الحاصل صحبت میں شیخ کی رہے تو آداب کے ساتھ رہے اور اس کی اطاعت کرے اسکے قلب پر گرانی نہ ہونے دے حتیٰ کہ اگر اس کو خدمت کرنا مثلاً پاؤں دبانا، جوتیاں سیدھی کرنا ناگوار

ہوتو نہ کرے، بزرگوں کا یکساں حال نہیں ہوتا کبھی ان کو خدمت کرنا پسند ہوتا ہے کبھی ناپسند ہوتا ہے۔ حقیقت میں یہ لوگ شاہ ہیں۔ گاہے بسلامے برنجند وگاہے بدشنامے خلعت دہند اللہ کا نام لینے سے ان حضرات میں وہ لطافت آ جاتی ہے کہ امراء کے اندر بھی نہیں ہوتی، کبھی ان کو سلام کا جواب دینا بھی بار ہوتا ہے اور کبھی تواضع میں ہوتے ہیں، خدمت کرنے سے اس میں فرق آتا ہے اور وہ اس میں بال برابر کمی نہیں چاہتے۔ ان کی وہ کیفیت ہوتی ہے:

بردل سالک ہزاراں غم بود　　　گر زباغ دل خلالے کم بود

(سالک کے دل پر ہزاروں غم وارد ہوتے ہیں اگر ذرا بھی اس کی باطنی حالت میں کمی ہوتی ہے)

پس اگر وہ پاؤں دبانے سے روکیں تو فوراً رک جانا چاہیے۔ بعضے وجہ پوچھنا شروع کردیتے ہیں کہ حضرت اس میں حرج کیا ہے اس جھک جھک سے ان کو اور زیادہ غصہ آتا ہے اور اس کو خبر نہیں ہے کہ اصلی وجہ کیا ہے اس لیے ان کو تیز مزاج بتاتا ہے۔ یاد رکھو اگر تمہاری خدمت سے ان کو راحت پہنچے تو خدمت کرو ورنہ نہ کرو اور اگر کہو کہ ہم کس طرح سمجھیں گے کہ ان کو اس وقت راحت ملے گی اور اس وقت ناگواری ہوگی۔ صاحبو! یہ امور ایسے ہیں کہ پاس رہنے سے ذرا فہم ہو اور غور کرنے کی عادت ہو خود بخود سمجھ میں آ جاتے ہیں۔ غرض تم ان کے تابع ہو جاؤ اس کی کوشش نہ کرو کہ وہ تمہارے تابع ہو جائیں۔ وہ لوگ مثل کعبہ کے ہیں تم کو چاہیے کہ تم کعبہ کی طرف رخ کرو یہ نہ چاہو کہ تم جس طرف ہو کعبہ غلام کی طرح اسی طرف ہو جائے وہ لوگ کعبہ حاجات ہیں وہ جس طرف ہوں تم کو بھی ادھر ہی گھومنا چاہیے۔ بعضے لوگ ایسی خدمت کرتے ہیں کہ

نادان کی خدمت سے بجائے راحت کے کلفت ہوتی ہے

ان کو بجائے راحت کے اذیت ہوتی ہے ہمارے استاد حضرت مولانا فتح محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ جامع مسجد سے باہر کو جارہے تھے ہاتھ میں جوتے تھے ایک شخص نے جوتہ لینا چاہا، مولوی صاحب کو ایسے امور سے بالطبع نفرت تھی نہ دیا، اس بھلے مانس نے ایک ہاتھ سے مولوی صاحب کی کلائی پکڑی دوسرے ہاتھ سے جھٹکا مار کر جوتہ ہاتھ سے چھین لیا۔

یہ خدمت ایسی ہی ہے جیسے کسی نے ریچھ پالا تھا جب وہ سوتا تھا تو وہ ریچھ حفاظت کیا کرتا تھا اور مکھیاں اڑایا کرتا تھا، ایک مرتبہ ایک مکھی اس کے اوپر بیٹھی اس نے اڑایا وہ اڑی نہیں جا کر ایک پتھر لایا اور اس زور سے کھینچ مارا کہ اس کا کام تمام ہوگیا، ایسے ہی بے عقل کی خدمت بجائے راحت کے تکلیف دہ ہو جاتی ہے یہ آداب ہیں شیوخ کے۔ یہ تو شرائط کا بیان تھا۔

موانع کا طریق اوران کے ترک کی تدابیر

اور موانع کا حاصل یہ ہے کہ دو کام کرو ایک تو معاصی خواہ صغائر ہوں یا کبائر سب کو چھوڑ دو اور اگر حقوق کچھ ذمہ پر ہوں تو ان کو ادا کر دو اور دوسرے یہ کہ بلاضرورت مخلوق سے نہ ملو ضرورت ہو تو ملو اور جب ضرورت ختم ہو جائے تو فوراً الگ ہو جاؤ اور فضول کام چھوڑ دو اور تیسرا کام جو بہت ضروری ہے یہ کرو کہ شب و روز میں کم از کم ایک گھنٹہ الگ خلوت میں بیٹھ جایا کرو اس کے لیے عشاء کے بعد کا وقت بہتر ہے۔ اس وقت اپنے نفس سے اپنے شب و روز کے کام کا محاسبہ کیا کرو اگر کوئی گناہ ہو تو اس سے توبہ کیا کرو اور آئندہ سے عزم رکھو کہ پھر نہ کریں گے۔ یہ طریقہ ہے حال کی تحصیل کا۔ خلاصہ طریقہ کا یہ ہوا کہ علم دین بقدر ضرورت خواہ مولوی بن کر خواہ اردو کے رسائل سے خواہ صحبت علماء سے حاصل کرو۔ دوسرا اس علم پر عمل شروع کر دو۔ تیسرے اہل اللہ کی صحبت اختیار کرو۔ چوتھے یہ کہ معاصی چھوڑ دو۔ پانچویں قلت اختلاط اور قلت کلام۔ چھٹے تھوڑی دیر خلوت اگر اس طریقہ پر آپ عمل شروع کر دیں تو آپ رجسٹری شدہ واصل الی اللہ ہو جاویں اور یہ نہ کہو کہ ولی ہونا بہت مشکل ہے ہم کیسے ہو جائیں گے۔ صاحبو نبوت ختم ہوئی ہے، ولایت ختم نہیں ہوئی۔ اس کے بعد آپ کو انشاء اللہ حیات طیبہ نصیب ہوگی اور تمام صعوبتیں دینی و دنیوی آسان ہو جائیں گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ حال کی تحصیل بہت ضروری ہے خصوصاً اہل علم کو بہت ہی ضروری ہے اب مجھ کو جو کچھ بیان کرنا تھا میں ختم کر چکا ہوں۔

مظاہر الاحوال نام رکھنے کا سبب

اس مدرسہ کا نام مظاہر العلوم ہے اس لیے میں نے اس سے پہلے وعظ کا جس میں عمل کی ضرورت بیان کی تھی مظاہر الاعمال نام رکھا تھا اور اس بیان کو مظاہر الاحوال سے موسوم کرتا ہوں۔

دعا کی ضرورت

ایک بات ضروری باقی ہے وہ یہ ہے کہ تحصیل حال کی نسبت جو میں نے کوشش اور سعی کی ترغیب دی ہے چونکہ اس کوشش اور سعی کی توفیق بدون حق تعالیٰ کی مدد کے میسر نہیں ہوتی اور بدون توفیق حق کے سب سعی بیکار ہے اس لیے اس کے لیے دل سے دعا اور تضرع اور زاری جناب باری میں کرتے رہیں اور اس کو طریقہ مذکورہ کا جزو اعظم سمجھیں اس لیے کہ

بے عنایات حق و خاصان حق   گر ملک باشد سیہ ہستی ورق

(خدا تعالیٰ اور خاصان حق کی بغیر عنایت کے اگر فرشتہ بھی ہوگا تو اس کا ورق (نامہ اعمال) سیاہ ہوگا)

اب میں اسی دعا پر ختم کرتا ہوں اللہ تعالیٰ سے توفیق کی دعا کریں۔ فقط

واخردعوانا ان الحمدللّٰہ رب العالمین.وصلی اللّٰہ تعالیٰ علی خیر خلقه سیدنا ومولانا محمد وآله واصحابه وبارک وسلم.

وعظ ملقب بہ

مفتاح الخیر

بمقام قصبہ جلال آباد ضلع مظفر نگر میں ۳ محرم الحرام ۱۳۳۶ھ بروز پیر ایک گھنٹہ ۱۵ منٹ کھڑے ہو کر یہ وعظ ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد ۵۰ تھی۔ احمد حسن صاحب نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلاَھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّاۤاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَاشَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارِکۡ وَسَلَّمۡ. اَمَّابَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ. بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ.

وَمَنۡ یُّؤۡتَ الۡحِکۡمَۃَ فَقَدۡ اُوۡتِیَ خَیۡرًا کَثِیۡرًا ○ (البقرہ آیت نمبر ۲۶۹)

’’اور جس کو دین کا فہم مل جائے اس کو بڑی خیر کی چیز مل گئی۔‘‘

حکمت کی فضیلت

یہ جملہ ایک آیت کا ٹکڑا ہے اس میں حق تعالیٰ نے حکمت کی فضیلت بیان فرمائی ہے اور اس بیان کا موقع ظاہر ہے کہ تقریب افتتاح مدرسہ اسلامیہ کی ہے اور میرا مقصود اس بیان سے استمداد مالی نہیں ہے کہ آپ لوگ مدرسہ کی مدد کریں بلکہ مقصود یہ ہے کہ اس فعل کی حقیقت معلوم ہو کہ آپ کو مسرت ہو کہ الحمدللہ ہم کو ایسے بڑے کار خیر میں شرکت کی توفیق ہوئی باقی اس کام کی حق تعالیٰ کے اختیار میں ہے خواہ وہ آپ حضرات کے ذریعے سے تکمیل فرماویں یا دوسرے لوگوں کے ہاتھ سے میری غرض تقریر سے صرف اسی قدر ہے کہ اس فعل کی حقیقت سے آپ حضرات آگاہ ہو جاویں اور مسرور ہو کر شکر خداوندی بجالاویں کہ ایسے عظیم الشان دین کے کام کی توفیق ہوئی۔

حکمت سے مراد حقیقت شناسی

حق تعالیٰ نے ان مختصر الفاظ میں علم دین کی فضیلت عنوان حکمت سے جس کے معنی حقیقت شناسی کے ہیں بیان فرمائی ہے اور اس پر اجماع ہے علماء حکماء عقلاء کا کہ مراد حکمت سے حقیقت شناسی ہے یہ دوسری بات ہے کہ حقیقت کی تعیین (مقرر کرنا) میں اختلاف واقع ہو جاوے۔ چنانچہ فلاسفہ یونانیین نے جن امور کو حقائق سمجھا ہے وہ اور ہیں اور حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے

جو حقائق ارشاد فرمائے ہیں وہ اور ہیں اور اس کا فیصلہ کہ کون سے حقائق صحیح اور حق ہیں آسانی سے اس طرح ہوسکتا ہے کہ جانبین کے دلائل میں غور کیا جاوے۔ اس سے معلوم ہو جاوے گا کہ کون سے دلائل صحیح ہیں اور کون سے فاسد ہیں اس سے صاف معلوم ہو جاوے گا کہ کس کا دعویٰ صحیح اور کس کا غلط ہے کیونکہ صحت وفساد دعویٰ کا دلیل ہی کے صحت فساد سے معلوم ہوتا ہے سو دلائل میں غور کرنے سے کالشمس فی نصف النہار صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حکماء کے دلائل ومقدمات نہایت ضعیف اور لچر ہیں اور اس بات کو جو پابند مذہب نہیں وہ بھی جانتے ہیں بلکہ خود مستدلین (استدلال کرنے والے ہیں) بھی اپنے دل میں سمجھتے ہیں کہ ہم کیسی پوچ باتیں کہہ رہے ہیں اور حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے دلائل ومقدمات نہایت قوی ہیں اور یقینی ہیں اور صرف نقلی ہی نہیں ہیں بلکہ عقلی بھی ہیں کیونکہ نقلیات کا مرجع عقلیات ہوا کرتے ہیں مثال اس کی یہ ہے کہ مثلاً قیامت کا وقوع دلیل سے ثابت ہے اور صرف عقل سے اس کا ادراک نہیں ہوسکتا لہٰذا یہ مسئلہ نقلیہ ہے مگر اس طرح یہ مسئلہ عقلیہ ہے کہ اس کی دلیل مرکب ہے اور مقدموں سے پہلا مقدمہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے وقوع کی قرآن مجید میں خبر دی ہے اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ جو کلام اللہ میں بتلایا جاوے وہ صحیح ہے اور اس سے پہلے مقدمے کو اس حیثیت سے بیان نہیں کیا گیا کہ یہ کلام اللہ ہے اور اس کا صحیح ہونا لازم ہے بلکہ یہ ایک دوسرا مستقل مقدمہ ہے جس کی دلیل عقلی خود قرآن مجید میں یہ موجود ہے: "وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ" (اور اگر تم کچھ خلجان میں ہو اس کتاب کی نسبت جو ہم نے نازل فرمائی ہے اپنے بندہ خاص پر تو اچھا پھر تم بنالاؤ ایک محدود ٹکڑا جو اس کا ہم پلہ ہو) جس کا ماحصل یہ ہے کہ اگر تم کو اس قرآن کے کلام الٰہی ہونے میں شبہ ہے اور کلام بشر ہونے کا احتمال ہے تو اس کی مثل ایک ہی سورۃ تصنیف کر لاؤ اور آخر تم فصحاء بلغاء واہل زبان ہو سو تم کو تو اس میں کچھ بھی تامل نہ ہونا چاہیے (قالہ الجامع عفی عنہ) اور چونکہ وہ لوگ باوجود مخالفت (سخت مخالفت اور پوری کوشش کے باوجود) شدیدہ وسعی بلیغ کے قرآن کے مقابل ایک سورۃ تو کیا ایک آیت بھی نہ لاسکے تو ثابت ہو گیا کہ یہ کلام بشر نہیں ہے اور کلام عزوجل ہے۔

مسئلہ وقوع قیامت عقلی ہے

بس معلوم ہو گیا کہ مسئلہ وقوع قیامت کا تقریر مذکور کے اعتبار سے عقلی ہے اور تمام دعاوی نقلیہ مقدمات عقلیہ سے ثابت ہونے کی وجہ سے عقلیہ ہوتے ہیں لہٰذا عقلی ہونے کی وجہ سے حکماء پر بھی حجت ہیں اور حکماء میں خود باہم جوتی پیزار ہونا اور ایک دوسرے کی دلیلوں کا توڑنا یہ بھی ان

کے مقاصد و مقدمات کے ضعف کی دلیل ہے بخلاف ان مقاصد و مقدمات کے جن کو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام لائے ہیں کہ ان سب کا مقصود واحد اور اصول متفق ہیں گو بعض فروع ہیں با ختلاف ازمنہ اختلاف واقع ہوا ہے لیکن اس اختلاف میں اور حکماء کے اختلاف میں زمین و آسمان کا فرق ہے اس اختلاف میں تناقص نہیں اور اگر مجتہدین کے اختلاف میں کہاں تناقص بھی ہے۔ تب بھی ایک کو دوسرے کے رد کا خیال بھی نہیں ہوتا اور حکماء کے اختلاف میں علاوہ تناقص کے ان کو بجز رد قدح کے اور مقصود ہی نہیں ہوتا اور اگر بعض مدعیان عقل نے انبیاء علیہم السلام کے دعوؤں کو بھی رد کرنا چاہا مگر مبطل کو ہمیشہ محرومی ہی ہوئی ہے اور کبھی کامیابی نہیں ہوئی غرض دلائل سے معلوم ہو رہا ہے کہ حقائق کو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہی نے سمجھا ہے پس اس آیت میں حکمت سے مراد یہی حقائق ہیں جو انبیاء علیہم السلام کے بتلائے ہوئے ہیں جن کا حاصل دین ہے اور بجائے لفظ علم کے حکمت کا لفظ اس لیے اختیار کیا گیا کہ حکمت کی خیریت متفق علیہ ہے گو اس کی حقیقت کی تعیین مختلف فیہ ہو تو اس صورت میں صرف تعیین حقیقت ہی میں کلام رہے گا باقی حکمت کا خیر کثیر ہونا مسلم رہے گا بخلاف عنوان دین کے کہ اس میں خود اس حکم ہی میں اختلاف ہو جاتا غرض حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو شخص حکمت یعنی علم دین عطا کیا جاوے تو اس کو بیشک خیر کثیر مل گئی۔

تفسیر آیت متلوہ

اب یہ سمجھئے کہ آیت میں **یوت الحکمتہ** فرمایا یہ نہیں ارشاد فرمایا "**من تعلم الحکمة یامن حصل الحکمة**" یعنی حق تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ جو شخص حکمت دیا جاوے اس کو خیر کثیر مل گئی یہ نہیں فرمایا جو حکمت سیکھے یا جو حکمت حاصل کرے اس کو خیر کثیر مل گئی اس میں یہ رمز ہے کہ کہیں طالب علم و محصل کو زعم اور عجب اور ناز نہ پیدا ہو جاوے کہ میں نے اپنی فطانت و ذہانت و محنت سے علم حاصل کیا ہے پس **من یوت** میں یہ بتلا دیا کہ یہ محض موہبت خداوندی ہے جس کو چاہیں عطا فرماویں۔ گو اس کے اسباب مکتسبہ ضرور ہیں اور اسی بناء پر انسان اس کی تحصیل کا مکلف قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے:

> "**طلب العلم فریضة علی کل مسلم** (علم (دین) کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد عورت پر فرض ہے) **و قال الجامع رواہ ابن عبداللّٰہ باسناد صحیح کما فی الجامع الصغیر (والمتن) قال ابن القطان صاحب ابن ماجه فی کتاب العلل عقب ایرادله من جهته سلام الطویل عن انس و مرفوعا انه غریب حسن الاسناد وقال العراقی قد صحح**

بعض الائمة بعض طرقه و قال المزی ان طرقه تبلغ به رتبته الحسن رده بناه فی ثانی السمعونیات من حدیث موسیٰ بن داؤد ثناء حماد بن سلمة عن قتادة عن انس به ورجاله ثقات هذا کله فی المقاصد الحسنة قال الجامع و بسط فیه الکلام لان المشهور انه لیس له اسناد ثابت"[1]

مگر سچ یہ ہے کہ بعد سعی کے علم دین کا حاصل ہو جانا یہ محض موہوب من اللہ ہے مکسوب نہیں ہے جیسے نکاح فعل اختیاری ہے اور اسی طرح مجامعت بھی فعل اختیاری ہے۔ مگر اولاد کا ہونا بالکل غیر اختیاری ہے اگر حق تعالیٰ چاہیں عطا فرمادیں اور چاہیں محروم فرمائیں۔ سو اسی طرح کتاب پڑھنا محنت کرنا سامان تحصیل مہیا کرنا افعال اختیاریہ ہیں لیکن حصول علم دین غیر اختیاری ہے کیونکہ درحقیقت علم دین حقائق دینیہ کا قلب پر وارد ہونا ہے اور وہ محض موہوب ہے اور میں اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر دعویٰ سے کہتا ہوں کہ آپ دو طالب علم لیجئے جو ہر طرح ظاہری اسباب تحصیل میں مساوی درجہ کے ہوں یعنی استاد دونوں کا ایک ہو توجہ بھی استاد کی دونوں پر مساوات کے ساتھ ہو تدریس و تحشیہ وتصنیف وغیرہ کا کام بھی دونوں سے برابر درجہ میں لیا گیا ہو مدت تکمیل بھی دونوں کی ایک ہو عمر بھی ایک ہو فطانت و ذہانت میں بھی برابر ہوں مگر ایک میں تقویٰ زیادہ ہو تو ضرور ہے کہ متقی کا علم لطیف اور بڑھا ہوا ہوگا اور یہ امر مشاہدہ ہے۔ لاریب فیہ (اگر شبہ ہو) کہ تقویٰ بھی تحصیل علم کا سبب ہے اور وہ ایک شخص میں کم ہے اسی لیے اس کے علم میں بھی کمی ہے پھر موہوب علم کہاں رہا اور مساوات کہاں مستحق ہوئی تو جواب یہ ہے کہ اول تو ہم کو تو یہی مسلم نہیں کہ تقویٰ بھی تحصیل علم کا ایک سبب ہے چنانچہ کوئی شخص خاص اس نیت سے تقویٰ کر کے دیکھے کہ ہمارے علم میں ترقی ہوگی سو دیکھ لے گا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ اس کے علم میں خاک بھی ترقی نہ ہوگی ترقی تو عادۃ ہو جاتی ہے جبکہ مقصود تقویٰ سے خالص رضائے الٰہی ہو اور برتقدیر تسلیم یہ اسباب ظاہریہ میں سے نہیں ہے اور یہاں ذکر اسباب ظاہری کا ہے اور جو اسباب کو عام لیا جاوے تو اسباب غیر ظاہری تو رحمت خداوندی بھی ہے جو سبب ہے موہبت کا تو پھر یہ بھی کہا جاوے گا کہ ایک کے شامل رحمت الٰہیہ ہے اور وہ سبب ہے زیادت کا اور دوسرے کو یہ میسر نہیں خلا مساوات حالانکہ یہ اعتراض کوئی فہیم نہیں کرسکتا ۱۲ جامع عفی عنہ) بلکہ بعض اوقات متقی اس درجہ کا ذہین نہیں ہوتا جس درجہ کا وہ دوسرا شخص ذہین ہوتا ہے جو اس سے تقویٰ میں کم درجہ کا ہے مگر باوجود اس کے متقی کا علم زیادہ اور لطیف ہوتا ہے پھر اسباب ظاہریہ کی مساوات

---

[1] (المعجم الکبیر للطبرانی ۱۰: ۲۴۰)

کے ہوتے ہوئے تقویٰ سے علم کا زیادہ لطیف ہو جانا یہ موہوب ہونے کے سبب سے نہیں تو اور کیا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ حصول علم دین محض وہبی ہے وللہ در العارف الرومی حیث یقول:

بینی اندر خود علوم انبیاء بے کتاب و بے معید و اوستا

(اپنے اندر علوم انبیاء مشاہدہ کرو گے بدون کتاب اور تکرار کرانے والے کے اور استاد کے)

حجۃ الاسلام حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے علوم کی شان

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب علیہ الرضوان کے دیکھنے والے اس جماعت میں موجود ہیں۔ مولانا کی تقریر آپ حضرات نے سنی ہوگی کہ کس درجہ کی ہوتی تھی اور مولانا کا کیسا علم تھا اور مولانا کی طالب علمی کی شان دیکھنے والوں سے سننے والے بھی موجود ہیں کہ کس بے پروائی سے مولانا نے پڑھا تھا۔ ابتداء ہی سے ویرانوں' جنگلوں سے الفت اور تجرد پسند تھے' کہیں جمنا میں تیر رہے ہیں کہیں سیر و سیاحت کر رہے ہیں' ایک آزاد طبیعت تھی بخلاف ان کے اقران و ہم عصر حضرات کے کہ انہوں نے توجہ سے پڑھا' محنت کی' اساتذہ کاملین سے تحصیل کی مگر مولانا کے علوم کی شان ان میں نہ پیدا ہوئی۔ یہ صرف تقویٰ کی برکت تھی۔ حدیث میں ہے: "**من عمل بما علم ورثه الله علم مالم يعلم او كما قال (اخرجه فى حلية اولياء كماورده فى بهشتى جوهر حصه اول قال الجامع)**"[1] یعنی جو عالم اپنے علم پر عمل کرے وارث کرے گا اس کو اللہ تعالیٰ ایسے علم کا جس کو وہ نہیں جانتا ہے حضرت استاذی و مولائی مولوی شاہ محمد یعقوب صاحب قدس سرہ سے میرے سامنے پوچھا گیا کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ کو اس درجہ کا علم کس طرح حاصل ہو گیا۔ آپ نے چند اسباب ذکر فرمائے کہ اساتذہ کامل تھے' پیر کامل تھے' تقویٰ تھا' اساتذہ کا ادب زیادہ فرماتے تھے اور یہ امور آپ کے قرآن میں بھی تھے مگر باطنی تقویٰ کی ایک خاص شان آپ کے اندر تھی جو آپ کے معاصرین کو کم میسر تھی سب سے بڑی وجہ علم کی ترقی کی یہی ہوئی غرض اس لیے حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ **من یوت الحکمتہ** الخ یعنی جس کو حکمت عنایت فرمائی گئی اس کو خیر کثیر مل گئی اشارہ اس طرف ہے کہ اگر تم حکمت کا لینا چاہتے ہو تو براہ راست اس کا حاصل ہو جانا تمہارے اختیار میں نہیں ہے اس کے حاصل ہونے کی صرف یہی صورت ہے کہ اپنے اندر قابلیت ایسی پیدا کر لو کہ جس سے ہمارا عطیہ اور موہوبہ لینے کے قابل ہو جاؤ اور وہ قابلیت تقویٰ کا اختیار کرنا ہے مگر یاد رہے کہ اس قصد سے تقویٰ اختیار کرنا کہ علوم القاء

---

[1] (اتحاف السادة المتقين ۱: ۴۰۳' المغنى عن حمل الاسفار ۱: ۷۱)

ہوں ہرگز زیبا نہیں اور نہ اس طریق سے کامیابی کی امید بلکہ تقویٰ محض مخلصاً اللہ تعالیٰ اور رضائے الٰہی کے لیے ہو عادت خداوندی کے موافق اس کی قابلیت کے اندازہ سے جو علوم حق تعالیٰ کو عطا فرمانے ہوں گے وہ عطا فرمادیں گے اور جس کو سچا تعلق خداوند تعالیٰ سے ہوگا وہ تو عبادت لغیر اللہ تعالیٰ کیوں کرنے لگا اور ایسا ہی شخص محل نزول برکات بھی ہے اور حکمت کا لفظ بجائے علم کے ارشاد فرمانے کی اس کی وجہ جو میں پیشتر بیان کر چکا ہوں اس کے نظائر قرآن مجید میں اور بھی ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں: "تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ" یعنی اے اہل کتاب تم ایسی بات کی طرف چلے آؤ اور وہ امر قبول کرلو جو ہمارے اور تمہارے درمیان میں اتفاقی ہے اور وہ توحید ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: "اَنْ لَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِکَ بِهٖ شَیْئًا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" یعنی وہ کلمہ یہ ہے جس کی طرف ہم داعی ہیں کہ ہم (اور تم خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں) اور کسی شئی کو اس کا شریک نہ ٹھہراویں اور بعض ہم میں سے بعض کو اپنا رب نہ بنائیں خدا کو چھوڑ کر جیسا وہ لوگ علماء کے ساتھ برتاؤ کیا کرتے تھے۔ اب اس عنوان سے ایک درجہ میں ان سے موافقت کرلی کہ تم بھی توحید کو مانتے ہو اور ہم بھی پھر موافقت کے بعد ان سے یہ کہنا کہ تمہاری توحید واقع میں توحید نہیں ہے کہ ممزوج بشرک ہے اور ہماری توحید خالص اور واقعی توحید ہے اتفاق کے بعد اختلاف ہے جو ان پر زیادہ گراں نہ ہوگا اور اگر پہلے ہی سے ان کو مشرک کہا جاتا تو وہ اول ہی سے سخت برانگیختہ ہوجاتے اور توحید کے مضمون کو سننا بھی گوارا نہ کرتے۔

علم دین کو خیر کثیر کہنے کا سبب

اور ایک یہ بات سمجھنے کی ہے کہ آیت میں حکمت یعنی علم دین کو خیر کثیر کہا گیا حالانکہ صرف خیر کا لفظ بھی کافی تھا کیونکہ یہ لفظ ہم تفصیل ہے جس کے معنی ہیں بہت اچھا اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ جیسی عظیم الشان ذات جس چیز کو بہت اچھا فرمائے اس کی خوبی کس درجہ کی ہوگی مگر صرف اسی لفظ پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ مزید مبالغہ کے لیے کثیر کا لفظ بھی اضافہ فرمایا یعنی علم دین بہت ہی بڑی نعمت ہے اور بہت اچھا ہونے کے دو درجے ہیں ایک تو یہ کہ کوئی چیز بہت سی چیزوں سے یا کسی خاص چیز سے بہت اچھی ہو اور دوسرے یہ کہ تمام چیزوں سے زیادہ عمدہ ہو اور یہاں ظاہراً دوسری صورت مراد ہے کیونکہ یہاں مفضل علیہ مذکور نہیں ہے پس مراد یہ ہے کہ علم دین تمام اچھی چیزوں سے زیادہ بڑھ کر ہے۔ واضح ہو کہ اس خیر کے مفضل علیہ میں تمام واقعی عمدہ چیزیں داخل ہیں اور مال و دولت تو واقع میں کمال ہی نہیں اور نہ وہ کچھ زیادہ اچھا ہے بلکہ بقدر حاجت روائی محمود ہے اور وسیلہ ہے مقصود کا خود بذات کچھ محمود مقصود

نہیں اس لیے اس خیر کے مفصل علیہ میں اس کے داخل ماننے کی ضرورت ہی نہیں اب رہا ایمان سووہ خود ایمان اس علم ہی میں داخل ہے کیونکہ ایمان تصدیق بالقلب کا نام ہے اور ظاہر ہے کہ یہ علم ہے۔

اب رہی جنت سووہ اس خیر کے مفضل علیہ میں داخل ہے کیونکہ ایمان کہ علم دین کی ایک فرد ہے جنت سے افضل ہے گو بعض لوگوں نے جنت کو ایمان سے افضل کہا ہے اور یہ دلیل بیان کی ہے کہ "مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا" یعنی جو شخص نیکی کرے تو اس کو اس نیکی سے بڑھ کر جزا دی جاوے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ علم سے جزاء افضل ہے اور اعمال میں ایمان بھی ہے۔ لہٰذا ایمان کی جزاء یعنی جنت ایمان سے افضل ہوئی لیکن یہ استدلال صحیح نہیں ہے کیونکہ یہاں خیر سے مراد جنت نہیں بلکہ نفس حسنہ ہے تو مطلب یہ ہوا کہ آدمی جو نیکی کرتا ہے خواہ وہ ایمان ہو یا دیگر اعمال اللہ تعالیٰ اس عمل کو بڑھا دیتے ہیں۔ مثلاً ایک نیکی کو بڑھا کر دس نیکی کر دیں پھر ان دس نیکی پر جزاء مرتب ہوتی ہے اور دوسری آیت میں تصریح ہے کہ وہ بڑھائی ہوئی چیز حسنہ ہی ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے: "مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا" (جو شخص نیک کام کرے گا تو اس کو اس کے دس حصے ملیں گے) اور ظاہر ہے کہ امثالہا میں ضمیر مضاف الیہ کا مرجع حسنہ ہے تو حسنہ کے امثال حسنات ہی ہیں مثلاً کسی نے دو رکعت نماز پڑھی تو اس کو اول بیس رکعت یعنی دس گنا فرمایا' پھر اس بیس رکعت کا ثواب مرحمت فرمایا' کام کمزور تھا لکھا گیا قوی تھوڑا کیا تھا' تحریر میں لایا گیا زیادہ پس حسنات مضاعفہ کا حسنہ معمول بہا ہے افضل ہونا لازم آیا نہ کہ جزاء کا عمل سے اور اسی کی تائید کے درجہ میں نہ کہ احتجاج کے مرتبے میں عرض کرتا ہوں کہ

تبدیل سیئات بہ حسنات کا مفہوم

بعض حضرات نے "اُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ". (اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے (گزشتہ) گناہوں کی جگہ نیکیاں عطا فرمائے گا) کی تفسیر یہ کی ہے کہ سیئات سے مراد وہ طاعات ہیں جو موافق امر کے بجا نہیں لائی گئیں پس اللہ تعالیٰ بجائے ان کے خالص طاعات مرحمت فرمادیں گے مثلاً نماز پڑھی اس میں مکروہات (محرمات کا ارتکاب ہو گیا تو وہ نماز تھی سیئہ مگر عطا ہوئی نماز خالص یہ تفسیر کچھ بعید نہیں کیونکہ بعض احادیث میں وارد ہوا ہے کہ گناہ گن گن کر بعضے لوگوں کو حق تعالیٰ ان گناہوں کے عوض نیکیاں مرحمت:

(وهو ظاهر الآية وتقييه المعاصي بالمكروهات التنزيهته بعيد في المجمه وتحول عن الظاهر نعم لک ان تقول ان التبديل نعيم سائر المعاصي سواء كانت محرمة او مكروهة و تحمل الحديث والآية عليه فافهم ۱۲ جامع)

فرما دیں گے۔ سو جب مستقل معاصی کے عوض حسنات دی جاوے گی تو عارضی معاصی کے عوض حسنات عطا فرمایا جانا کیا بعید ہے سو یہاں پر ان اعمال ناقصہ کے عوض اعمال کاملہ عطا ہونا مذکور ہے اسی طرح **فله خیر منها** میں بھی حسنہ ناقصہ قلیلہ کے عوض میں ایسے اعمال جو اس سے خیر ہوں عطاء ہونا مراد ہوسکتا ہے پس اس سے بھی تائید دعویٰ مذکورہ کی ہوگئی۔ پس اجزاء کا عمل سے اعلیٰ و افضل ہونا ثابت نہیں ہوتا اور حق تعالیٰ نے حکمت کو جو خیر کثیر ارشاد فرمایا ہے اور کثیر کی کوئی حد نہیں فرمائی سو اول تو حق تعالیٰ جس چیز کو کثیر فرما دیں اس کی کثرت ظاہر ہے کہ کس درجہ کی ہوگی پھر اس کثیر کو بھی جب کسی حد سے مقید و محدود نہیں فرمایا بلکہ مطلق رکھا پس یہ کثرت نہایت ہی عظیم الشان کثرت ہوگی۔ حاصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس آیت میں حکمت یعنی علم دین کو ان مبالغات کے ساتھ خیر کثیر کے لقب سے ملقب فرمایا ہے یہ مضمون ایک مقدمہ ہے جو قرآن مجید سے ماخوذ ہے اور دوسرا مقدمہ حدیث شریف سے اخذ کر کے بیان کرتا ہوں اور چونکہ قرآن مجید سے ماخوذ ہے اور چونکہ قرآن مجید و حدیث شریف دونوں ادلہ شرعیہ میں سے ہیں۔ اس لیے ہم کو اختیار ہے کہ خواہ دونوں مقدموں کی حدیث وقرآن پر توزیع کر دیں یا دونوں کو صرف قرآن مجید یا فقط حدیث شریف سے اخذ کر لیں وہ حدیث یہ ہے:

فطوبی لعبد جعله الله مفتاحا للخیر مغلاقا للشروویل لعبد جعله الله مفتا حاللشر مغلاقا للخیر (اخرج ابن ماجه فی سنده عبدالرحمن بن زید هو ضعیف ولیحقق بقیته سنده قاله الجامع)[1]

یعنی خوش حالی اور خوبی ہے اس شخص کے لیے اللہ نے بھلائی اور نیکی کی کنجی بنایا اور برائی اور شر کا قفل بنایا اور خرابی ہے اس کے لیے جس کو حق تعالیٰ نے شر کی کنجی اور خیر کا قفل بنایا۔

کنجی کی خاصیت

کنجی کی خاصیت ہے کھولنا اور تالے کی خاصیت بند کرنا اب یہ شبہ رہا کہ کنجی تو تالا کھولتے اور بند کرتے وقت دونوں جگہ استعمال کی جاتی ہے کیونکہ اصل حاجت کنجی کی ہے اور خاصیت اس کی یہی ہے کہ تالا کھولتے وقت استعمال کی جاوے گو بند کرتے وقت عارضی طور پر کبھی اس کی حاجت ہوجاتی ہے جبکہ وہ تالا ایسا ہو جو بغیر کنجی کے بند نہ ہوسکے۔ بعض قفل بغیر کنجی کے بند ہوجاتے ہیں لیکن بغیر کنجی کے کھلتا کوئی نہیں حاصل یہ ہے کہ جس شخص سے امر خیر کا افتتاح ہو اور شر

[1] (سنن ابن ماجة:۲۳۷)

کا انسداد ہو اس کے لیے خوش حالی ہے (کہ دارین میں رحمت خداوندی سے مشرف رہے گا قالہ الجامع) اور جس کے ذریعے سے خیر کا انسداد اور شر کا افتتاح ہو اس کے لیے بدحالی ہے کہ دونوں کا بھی وجود مصلحت ہے کہ عمارت عالم بغیر اس کے درست نہیں ہوتی **فان الاشیاء تعرف باضداد**ھا جیسے کہ باغ انبہ وغیرہ طرح طرح کے عمدہ درخت ہوتے ہیں مگر باڑھ کیکر کے درختوں کی لگائی جاتی ہے۔ **ولقد اجاز العارف الشیرازی فیما قال**

در کارخانہ عشق از کفرنا گریز ست آتش کرابسوز دگر بولہب نباشد

(کارخانہ عشق میں کفر کا وجود بھی ضروری تھا ورنہ آگ کس کو جلاتی اگر بولہب نہ ہوتا یعنی کفر کی نسبت حق تعالیٰ کی ایجاد کے ساتھ حکمت پر مبنی ہے حق تعالیٰ کا شکر ہے کہ جس نے اپنی رحمت سے ہم سب کو ایمان کی دولت سے نوازا۔ دیکھو مکان تیار کیا جاتا ہے اس میں شہ نشین بھی ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ وہ کس قدر نفیس اور باوقعت شے ہے اور پاخانہ بھی ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ نفرت کی چیز ہے مگر چونکہ ایک درجہ میں اس کی بھی ضرورت ہے اس لیے بغیر اس نفرت کی چیز کے مکان کی عمارت کامل نہیں ہوتی اور ناقص رہتا ہے اسی طرح تعمیر عالم اور اس کی تکمیل کے لیے بری چیزوں کا وجوہ بھی ضرور ہے لیکن یہ خیال رہے کہ یہ حکمت برائی کے ارتکاب کے لیے عذر نہیں ہوسکتی کیونکہ برائی کرنے والے اپنے اختیار سے عصیاں خداوندی کا مرتکب ہوتا ہے اور وہ اس کارخانہ کا داروغہ نہیں ہے جو وہ اپنے کو اس کام کے لیے منتخب کرے لہٰذا وہ معذور نہیں ہے یہ حکمت تو خلق خداوندی کے اعتبار سے ہے نہ کہ کسب عباد کے اعتبار سے اب یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ حدیث میں لوگوں کی دو قسمیں ذکر کی گئی ہیں اور ظاہر عنوان سے ان میں انحصار معلوم ہوتا ہے کہ کوئی تیسری قسم نہیں ہے لیکن بظاہر ہر شبہ ہوتا ہے کہ اور قسمیں بھی نکلتی ہیں اور استیعاب اقسام کا یہ ہے۔ اول خیر کا مفتاح ہونا' شر کا مغلاق ہونا' ثانی خیر کا مغلاق ہونا' شر کا مفتاح ہونا اور یہ دو قسمیں تو حدیث میں مذکور ہیں۔ ثالث خیر کا مفتاح ہونا شر کا مغلاق ہونا رابع شر کا مفتاح ہونا خیر کا مغلاق نہ ہونا۔ خامس خیر کا مفتاح نہ ہونا شر کا مغلاق ہونا' سادس شر کا مفتاح نہ ہونا خیر کا مغلاق ہونا' سابع خیر وشر دونوں کا مفتاح ہونا' خیر وشر دونوں کا مغلاق ہونا' ثامن دونوں کا مفتاح ومغلاق نہ ہونا پس یہ اقسام ہیں لیکن یہ تمام اقسام جو حدیث میں ظاہراً مذکور نہیں ہے حقیقتاً حدیث ہی کے تحت میں داخل ہیں اس لیے انحصار منقوص نہیں ہوتا اور دخول کی یہ صورت ہے کہ خیر وشر باہم ایسے تقابل ہیں کہ ایک کا فتح دوسرے کے غلق کو اور ہر ایک کا غلق دوسرے کے فتح کو مستلزم ہے جب یہ سمجھ میں آ گیا تو حدیث میں غور فرمائیے جب کوئی شخص مفتاح خیر ہوگا تو

اس کے لیے مغلاق شر ہونا لازم ہے کیونکہ اس خیر کی فتح نہ ہوتی تو ایک شر جو اس کا مقابل ہے باقی رہنا اب فتح خیر سے اس شر کا انسداد ہو گیا پس قسم ثالث مستحق نہیں اسی طرح جو شر کا مفتاح ہوگا اس کے لیے اس کا مغلاق ہونا جو اس شر کے مقابل ہے لازم ہے پس قسم رابع کوئی قسم نہ ہوئی۔ اسی طرح جو مغلاق شر ہوگا اس کے لیے مفتاح خیر ہونا لازم ہے کیونکہ شر کا بند کرنا یہ بھی ایک خیر ہے پس قسم خامس مقدم ہو گئی۔ اسی طرح جو خیر کا مغلاق ہوگا وہ مفتاح شر ضرور ہوگا۔

مفتاح خیر ہونا ضروری ہے

پس قسم سادس نہ رہی اور جو دونوں کا مغلاق ہے وہ مختلف خیر و شر کے اعتبار سے مفتاح خیر بھی ہے اور مغلاق شر بھی ہے اسی طرح وہ مغلاق خیر بھی ہے اور مفتاح شر بھی۔ پس قسم سابع بھی ان ہی دو قسموں میں داخل ہے اور خیر و شر دونوں کا مفتاح و مغلاق نہ ہونا اس کے لیے بھی فتح خیر اور سد شر اور فتح شر اور سد خیر لازم ہے۔ پس قسم ثامن بھی ان ہی دو قسموں میں داخل ہوتی غرض حدیث میں انحصار ہے اب ہر شخص دیکھ لیوے کہ میں مفتاح خیر اور مغلاق شر ہوں یا اس کا عکس اور بعضے لوگ صرف اسباب پر خوش نہ ہوں کہ اگر ہم مفتاح خیر نہیں ہیں تو مفتاح شر بھی نہیں ہیں نہ اچھے کی مدد کرتے ہیں نہ برے کی مدد کرتے ہیں کیونکہ اوپر معلوم ہو چکا ہے مفتاح خیر نہ ہونے کے لیے مفتاح شر ہونا لازم ہے اس لیے کہ جب تم خیر کو نہ کھولو گے تو ظاہر ہے کہ خیر بند نہ ہوگا اور خیر کا بند رکھنا شر کا کھونا ہے خیر کا نہ کھولنے والا اضطراراً شر کا کھولنے والا ہو جاتا ہے لہٰذا ذیل کی وعید میں ایسا شخص بھی داخل ہوگا سو ہر شخص کو مفتاح خیر ہونے کی سعی کرنا چاہیے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ حدیث میں حکم مذکور ہر خیر شیر کے لیے عام ہے اور پہلی تقریر سے معلوم ہو چکا ہے کہ علم دین بہت بڑی خیر ہے تو خواہ اس خیر کو عموم حدیث میں داخل ہونے کے بعد حدیث کا احق مصداق کہا جاوے یا خیر سے خیر کامل مراد لے کر حدیث کو علم دین ہی پر محمول کیا جاوے۔ غرض دونوں صورتوں میں علم دین کی خدمت کرنے والے کے لیے حدیث میں خوش حالی کی بشارت ہے اور اس میں حصہ نہ لینے والے کے لیے وعید ہے اور حدیث شریف گو بظاہر کلام ہے جناب سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا لیکن حقیقت میں وہ کلام ہے حق تعالیٰ کا کیونکہ آپ اپنی طرف سے تھوڑا ہی احکام بیان فرماتے تھے جو کچھ فرماتے تھے سب حق تعالیٰ کا ارشاد ہوتا تھا: ''قال تعالیٰ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى و صدق من قال''

گفتہ او گفتہ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

(آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان گویا اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے، اگرچہ ایک اللہ کے بندہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے ادا ہوا ہے)

ان کا کہا ہوا ارشادات حق ہوتے ہیں اگرچہ وحی الٰہی زبان رسالت ہی سے ادا ہوئی ہے۔ دونوں مقدموں کا نتیجہ یہ ہے کہ فاتح علم خیر کے لیے خوش حالی کی بشارت ہے اور اس کی فتح میں سعی نہ کرنے والے کے لیے وعید ہے اور اسی نتیجہ کے لیے میں نے تقریر کی تھی۔ گو درمیان میں مضامین علیہ بھی آ گئے کیونکہ جو مضمون جس نوع کا ہوتا ہے وہ تو اسی شرح سے ادا ہو سکتا ہے مگر مضائقہ نہیں اس لیے کہ اصل مضمون جتنا ہے اس کو سب ہی سمجھ گئے ہیں اب آپ خدا تعالیٰ کا شکر کیجئے کہ الحمدللہ حق تعالیٰ نے آپ کو یہ موقع عطا فرمایا کہ ایسے کار خیر میں شرکت اور اس کا افتتاح آپ کے ہاتھ سے ہوا اور آپ اس کام کو چھوٹا سا کام سمجھ کر اس کو بے وقعتی کی نظر سے نہ دیکھیں کیونکہ خلوص کے ساتھ چھوٹا سا کام بھی بہت بڑا ہو جاتا ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: اے عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کسی نیکی کو حقیر نہ سمجھو' وجہ یہ ہے کہ کیا خبر ہے اللہ تعالیٰ کے یہاں معمولی نیکی کا وہ درجہ خاص کے سبب عطا ہو جاوے جو بڑی نیکی سے بھی بوجہ کسی عارض عدم خلوص وغیرہ کے نہ عطا ہوتا اور سمجھ لیجئے کہ دینی کاموں میں خلوص کی حاجت تو خلوص سے بہت زیادہ ہے اکثر لوگوں کو مدارس کے مقاصد میں فلوس کی طرف زیادہ نظر ہو جاتی ہے اور خلوص کا اس قدر اہتمام نہیں ہوتا حالانکہ فلوس تو خود آ جاتے ہیں کیونکہ اس کام کا رحمت اور خیر ہونا تو معلوم ہو چکا اور جو خیر منجانب اللہ مفتوح ہوتی ہے جس میں بڑا دخل خلوص کو ہے اس کا کوئی روکنے والا نہیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: "مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وَمَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْ بَعْدِهٖ" یعنی جو رحمت اللہ تعالیٰ عطا فرماویں اس کا کوئی بند کرنے والا نہیں اور جس رحمت کو وہ روک لیں اس کو کوئی دینے والا نہیں۔ لہٰذا بھروسہ حق تعالیٰ کی ذات پر ہونا چاہیے جتنے کارخانے خلوص پر مبنی ہوئے ہیں ان سب میں ترقی ہوئی ہے خود اصل دین کی حالت کو ملاحظہ فرمائیے کہ ابتداء اس کی کیا تھی تمام عالم مخالف تھا اور بات بھی جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی ہی ارشاد فرمائی تھی جو سارے جہان کے خلاف تھی اور یہی وجہ مخالفت کی تھی ورنہ قبل دعویٰ نبوت تو لوگ آپ کو بہت چاہتے تھے مگر باوجود اس مخالفت کے دیکھئے اسلام کہاں سے کہاں پہنچا۔ پس یہ برکت محض اخلاص کی تھی۔

ورنہ ظاہر ہے کہ اسلام کے پاس اس وقت کہاں کا لشکر تھا اس وقت یہ چند حضرات مسلمان تھے' عورتوں میں حضرت سیدنا خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سب سے پہلے ایمان لائیں' لڑکوں میں سب سے پہلے حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ غلاموں میں حضرت سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ'

بوڑھوں میں حضرت امام الامۃ مقدام الملۃ افضل اولیاء الامم اعظم الاتقیاء الملل سیدنا و مولانا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ ایمان لائے۔ یہ اسلامی کمیٹی تھی اور ایمانی لشکر تھا جس نے ساری دنیا کو زیر وزبر کردیا' سلطنت کا انتظام بہت بڑی قوت پر مبنی ہوتا ہے یہاں کون سی قوت تھی صرف اخلاص کی برکت تھی کون خیال کرسکتا تھا کہ یہ سلطنت عالمگیر ہوجاوے گی اور بعضے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے چلا ہے سواول تو یہ مسلم نہیں ہے اور علی تقدیر التسلیم صرف تلوار سے تو کام بھی نہیں چلتا تلوار کے لیے کوئی اس کا چلانے والا بھی تو ہونا ضروری ہے۔

خلوص کی برکت

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب یہی فرمایا کرتے تھے کہ میاں تلوار کے لیے کوئی تلوار چلانے والا بھی تو ہونا ضرور ہے اور وہ چلانے والے کہاں سے آئے وہ مجمع کس نے پیدا کردیا' یہ سب خلوص کی برکت سے حق تعالیٰ نے پیدا فرمادیا اور یہ بات کہ تلوار سے اسلام کی اشاعت ہوئی ہے۔ وہ شخص کہہ سکتا ہے جو تاریخ سے بالکل ناواقف ہو دیکھو ابتداء کبھی تلوار نہیں چلائی گئی بلکہ پہلے یہ کہا گیا کہ اسلام لاؤ یا اہل اسلام کی اطاعت قبول کرو اور جو دونوں امر منظور نہ ہوں تو پھر تلوار ہے پھر قبول اطاعت کا قانون ایسا وسیع ہے کہ ظاہراً اسلام کے لیے نہایت خطرناک تھا کیونکہ کبھی اطاعت تلبیس سے بھی ہوتی ہے۔ ظاہر میں اقرار کرلیا کہ ہم اطاعت قبول کرتے ہیں پھر دھوکہ دیدیا جب موقع پایا لیکن اس خطرہ کی پرواہ نہیں کی گئی کیونکہ کام کرنے والا حقیقت میں خدائے تعالیٰ ہے کہ

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ

''وہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ (اسلام) کو پھونکوں سے بجھادیں اور اللہ تعالیٰ اس سے انکار کرتا ہے کہ اپنے نور کو کامل کرے خواہ کافروں کو ناگوار ہی گزرے۔''

چراغے را کہ ایزد بر فروزد ہر آنکس تف زند ریشش بسوزد

(جس چراغ کو حق تعالیٰ روشن کرنا چاہتے ہیں اس کو جو بھی بجھانا چاہتا ہے اس کی ہی داڑھی کو جلادیتے ہیں)

حالت اضطرار میں تلوار اٹھانے کی اجازت دی گئی

اور ایسے خطرات پیش بھی آئے مگر پھر بھی جو قانون مقرر کردیا گیا وہ برابر جاری رہا قیامت تک وہی رہے گا اہل سلطنت کے قوانین میں تھوڑی تھوڑی مصلحت کے لیے تغیر کیا جاتا ہے اور یہاں

ایسے ایسے خطرناک قوانین کو بھی استقامت دی گئی **سبحان ما اعظم شانه وله الکبریا فی السموات ولارض**۔ صاحبو! تلوار خیر درجہ میں اٹھائی گئی ہے جب دونوں شقیں منظور نہ کیں نہ اسلام لائے نہ اطاعت قبول کی اور یہ تلوار اٹھانا بھی اس اضطرار کی وجہ سے تھا کہ بغیر اس کے مخالفین کے شر سے محفوظ رہنا ممکن نہ تھا اور بدون اطاعت کے محض صلح کی حالت کا اقرار امن وامان کا کہ وہ اہل اسلام کو ضرر نہ پہنچادیں گے موجب اطمینان نہ تھا لہٰذا ضرور تھا کہ انسداد شر باضابطہ ہو تاکہ اس سے محفوظ رہ کر حق تعالیٰ کی اطاعت اطمینان کے ساتھ ہو سکے اور اس ضابطہ کی صرف یہی صورتیں ہیں کہ یا تو مخالفین اسلام لاویں یا ضابطہ اطاعت اسلام قبول کریں اور جو یہ دونوں صورتیں نہ ہوں تو مجبوری کو مقاتلہ سے کام لیا جاوے۔ خود قرآن مجید بتلا رہا کہ صرف فتنہ فرو کرنے کے لیے تلوار کی اجازت دی گئی ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ''**حَتّٰى لَاتَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ**'' اور پھر عین اس مقاتلہ میں بھی ایسا قانون مقرر کیا جس میں مخالفین کو خدا کا بہت بڑا موقع تھا مگر مسلمانوں کو اس شبہ کی گنجائش نہیں دی گئی کہ شاید مخالفین نے دھوکہ دیا ہو اگر کسی اور ملت ودین میں یہ قانون ہوتا تو وہ ملت ہرگز ترقی نہ کر سکتی اور جس کا جی چاہے اب بھی کوئی ملت یا قانون مقرر کر کے دیکھ لے ہرگز ہرگز ترقی نہ کر سکے گی۔ یہ صدق اسلامی ہی کی برکت ہے کہ باوجود ایسے وسیع قانون کے پھر بھی اسلام نے ترقی کی وہ قانون یہ ہے کہ اگر کسی کافر پر تلوار اٹھائی ہو اور کافر بھی وہ جس کے ہاتھ سے اس تلوار اٹھانے والے کے تمام خاندان والے مسلمان قتل ہو چکے تھے اور اس نے عین اس حالت میں کلمہ پڑھ لیا تو حکم ہے کہ فوراً ہاتھ روک لو اور اگر اس نے اس طور پر اپنی جان کی حفاظت کر لی اور اگلے دن اس نے دھوکہ دیا اور پھر ایسا ہی کیا پھر بھی اسلامی قانون یہی رہا کہ جب کوئی کلمہ پڑھ لے اس سے درگزر کرو اور مسلمانوں جیسا برتاؤ اس کے ساتھ کرو گو وہ پھر دھوکہ ہی کیوں نہ دیدے' تم کو شبہ کرنے کا حق نہیں ہے کہ خلوص سے ایمان لایا عدم خلوص سے یہ تو ایسی وسعت ہے کہ لوگ جب چاہیں سلمانوں کا قلع قمع کر دیں لیکن اسلام کے صدق کی قوت ہے کہ باوجود ایسا موقع ملنے کے بھی مخالف لوگ اسلام کی قوت کو نہ توڑ سکے اور صحابہ رضی اللہ عنہم میں یہی خلوص تھا اور صدق تھا جس کی وجہ سے اسلام کو ترقی ہوئی۔ غرض یہ ہے کہ خلوص سے کام کرنا چاہیے فلوس کی زیادہ فکر نہ کرو مشہور مثل ہے سر سلامت چاہیے ٹوپیاں بہت خلوص وفلوس کی ایک لطیف مثال ذہن میں آئی جو حضرت حاجی صاحب قدس سرہ نے ارشاد فرمائی تھی کہ ایک جانور اڑا جا رہا ہے اور اس کے سایہ کا شکاری شکار کرنا چاہتا ہے تو خود سایہ کو کوئی پکڑنا

چاہے ہاتھ نہ آوے گا اس کے شکار کرنے کی صرف یہی تدبیر ہے کہ خود اس جانور کے تیر لگاؤ اور سایہ اس کے ہمراہ خود آ جاوے گا اور اس طرح آوے گا کہ تم علیحدہ کرنا چاہو گے اور وہ جدا نہ ہوگا۔

دنیا کے تارک حقیقی کو بشارت

حدیث میں ہے "اتته الدنيا وهي راغمة" یعنی ایسے لوگوں کے پاس دنیا ذلیل ہو کر آتی ہے اور اس کی مثال ایسی سمجھو کہ جیسے فواحش عورتیں مستغنی کے پیچھے پڑتی ہیں اور چاہنے والے سے ناز و نخرہ کرتی ہیں۔ حضرت حاجی صاحب یہ بھی فرماتے تھے کہ جو طالب دنیا ہونا چاہے وہ تارک دنیا ہو جاوے مگر یہ یاد رہے کہ جو اخلاق سے حق تعالیٰ کی رضا کے لیے ترک دنیا کرتا ہے اس کے پیچھے دنیا پڑتی ہے اور جو محض نقل ہی کرے اور تحصیل دنیا کی ایک تدبیر ترک دنیا کو سمجھے اور اس کو عمل میں لاوے تو چونکہ وہ سچا تارک نہیں اس لیے ثمرہ بھی اس کی اس تدبیر پر مترتب نہ ہوگا اور اگر تارک حقیقی ہے تو اس کے لیے حق تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ اتقیاء کو راحت وچین مرحمت فرماتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے:

"مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ"

"اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے مضرتوں سے نجات کی شکل نکال دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے رزق بہم پہنچاتا ہے جہاں اسے کبھی گمان بھی نہیں ہوتا۔"

مشاہدہ کر لیجئے ہر زمانہ میں ایسے لوگ رہتے ہیں کاندھلے میں جب میں نے اسی تقریب سے جو یہاں ہے بیان کیا تھا تو اس میں یہ بھی کہا تھا کہ صاحبو کام شروع کرو' روپیہ خود آ رہے گا' کام کے اندر مقناطیس جیسی خاصیت ہے جیسے وہ لوہے کو کھینچتا ہے اسی طرح کار خیر زر کو کھینچتا ہے۔ ہاں اخلاص اور استعانت من اللہ کی حاجت ہے مقناطیس کامل ہوا اور اس کے پاس لوہا خود آ جاوے گا اس کو لوہے کے پاس جانے کی کیا حاجت ہے۔ اہل اللہ سلطنت پر لات مار دیتے ہیں مگر پھر بھی دنیا ان کی گرتی ہے اور استغناء حقیقی تو بڑی چیز ہے اس کی نقل میں بھی کشش ہوتی ہے۔

کار خیر میں ایک خاص کشش ہے

ایک شخص میری یہ تقریر سن کر میرے ایک عزیز سے میرے متعلق بطور اعتراض کہنے لگے کہ ان کا یہ استغناء بھی ایک تدبیر ہے تحصیل دنیا کی اور یہ ان کی واقع میں غلطی تھی جو مجھے مستغنی سمجھتے تھے میں تو دنیا داروں سے بھی بدتر ہوں' خیر میں نے جب یہ حکایت سنی تو ضابطہ کا جواب دیدیا کہ بھائی میں نے کب دعویٰ کیا تھا کہ میں مستغنی ہوں اور میرے اندر جو یہ عیب ہے تو دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس سے مجھے پاک فرما دیں میں نے تو صرف یہی ضابطہ کا جواب دیا لیکن ان عزیز نے یہ

جواب دیا کہ صاحبو! اگر یہ طرز بطور تدبیر کے ہوتا تو ظاہر ہے ایسی تدبیر کو تو لوگ چھپایا کرتے ہیں تا کہ دوسرے اس سے مال نہ حاصل کرلیں اور یہ شخص تو برسر منبر اس کو بیان کرتا ہے کہ اہل علم کو استغناء اختیار کرنا چاہیے دنیا خود ان کے پیچھے دوڑے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ بہ نیت تدبیر یہ طرز اختیار نہیں کیا مگر سچا جواب تو وہی ہے جو میں نے دیا' غرض کار خیر کے اندر خاص کشش ہے گو کار خیر کی نقل ہی ہو پھر اگر اصل ہو جاوے تو کیا ٹھیک ہے قال العارف الرومی:

جرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند صاف گر باشد ندانم چوں کند

(جرعہ خاک آمیز جب مجنوں کرتا ہے تو اگر صاف ہو تو نہ جانے کیا اثر دکھائے گا)

یعنی ایسی شراب جس میں مٹی ملی ہو اس درجہ کا نشہ لاتی ہے کہ آدمی مجنوں ہو جاتا ہے اگر وہ صاف ہو تو خدا جانے کیا غضب برپا کرے۔ غرض خلوص کو اختیار کرنا چاہیے عمل بڑھے گا جیسے کہ رائی کا ایک دانہ بویا جاتا ہے پھر اس سے کس قدر ترقی ہوئی ہے مثل ضرب حسابی کے بڑھتا چلا جاتا ہے جیسے اگر برگد کے درخت کو اپنی حالت پر چھوڑ دیا جاوے اور اس کی داڑھی نہ کاٹی جاوے تو اس قدر پھیلے کہ ساری کمشنری میں بھی نہ سماوے۔ دیکھو اس ننھے سے رائی کے دانہ کی بدولت کس قدر ترقی ہوئی اسی طرح اگر لوگ خلوص سے جو نیک کام بھی شروع کریں وہ ترقی پذیر ہوگا اور برابر ترقی جاری رہے گی۔ ہاں اگر درمیان میں خلوص کا سلسلہ ٹوٹ جاوے اور اس کی وجہ سے سلسلہ ترقی کا مسدود ہو جاوے یہ دوسری بات ہے اور اپنی کوتاہی ہے آج حق تعالیٰ نے بناء مدرسہ کی آپ کو توفیق عطا فرمائی خلوص کے ساتھ شکر یہ کیجئے' قولاً بھی اور عملاً بھی کہ اس کی خدمت میں سعی کیجئے اس شکر سے نعمت بڑھے گی۔

دل کی حیات علم دین سے ہے

حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ''لَئِنۡ شَكَرۡتُمۡ لَاَزِيۡدَنَّكُمۡ'' یعنی اگر تم شکر کرو گے تو ہم زیادہ عطا فرماویں گے۔ اس قصبے میں مدرسہ کی ضرورت بھی تھی گو آس پاس مدارس دینیہ موجود ہیں لیکن علم دین کے انتظام کی تو ہر جگہ ہی حاجت ہے اور اگر قرب و جوار کے مدارس اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کافی ہیں تو جلال آباد میں کنوؤں کی بھی حاجت نہ ہونا چاہیے قرب و جوار میں کنویں بہت ہیں۔ تھانہ بھون کے کنوؤں سے پانی منگا لیا کرو۔ مگر یہ کسی کو گوارا نہیں اور نہ اس طرح کام چل سکتا ہے بلکہ لوگ تو کنوؤں کو اس کثرت سے بنانا چاہتے ہیں کہ ہر ہر گھر میں کنواں ہو جاوے تو اچھا ہے صاحبو! جیسے جسم کی زندگی پانی سے ہے اسی طرح دل کی حیات

علم دین سے ہے اگر تنافس نہ ہوتا تو میں تو یہ رائے دیتا کہ ہر ہر محلّہ میں مدرسہ ہونا چاہیے مگر آج کل تعداد مدارس کا نتیجہ تجربہ سے یہ معلوم ہوا ہے کہ باہم منافست اور مخالفت پیدا ہو جاتی ہے مدرسہ کے نام میں ہی آج کل یہ اثر ہو گیا ہے کہ متعدد مدارس ہوئے مخالفت رونما ہوئی ہاں جو مکتب یہاں پہلے سے ہیں ان میں یہ احتمال نہیں اور وجہ اس مخالفت کی صرف چندہ ہے مکاتیب میں چونکہ چندہ نہیں ہے اس لیے مخالفت بھی نہیں ہوتی اور مدارس میں چونکہ ہر مدرسہ کے مہتممین اور کارپرداز یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے مدرسہ کی طرف لوگوں کا زیادہ رجحان ہو اور اسی مدرسہ میں چندہ زیادہ آوے یہ تو خیال ہوتا نہیں کہ ہر مدرسہ خدائے تعالیٰ کا ہے جہاں جس کا جی چاہے دیوے ہم کو تزاحم کیا حق ہے سو اس وجہ سے مخالفت ہوتی ہے۔

چندہ پر زور دینے کا نتائج

میں جب تھانہ بھون آ کر بطریق استقلال رہا تو میری فرمائش تو تھی نہیں میرا تو صرف یہ قصد تھا کہ مجھ سے خود جس قدر علم دین کی خدمت ہو سکے گی کروں گا مگر لوگوں نے چندہ سے مدرسہ کی شکل بنائی، چندہ ہوتے ہی تزاحم اور حکومت شروع ہوئی، کوئی مدرس پر اعتراض کرتا ہے کوئی طلبہ پر حکومت کرتا ہے میں نے جو اس کے اسباب پر غور کیا تو ان تمام امور کی جڑ چندہ سمجھ میں آئی، میں نے چندہ حذف کر دیا جیسے کہ ایک مجذوب برہنہ پھرتے تھے مریدوں نے کپڑے بنا دیئے، کپڑوں کو چوہوں نے کتر لیا، اس کلفت کے ازالہ کے لیے بلی پالی، بلی کھانے خراب کرنے لگی تو کتا پالا وہ کھانوں کو ناپاک کرنے لگا تو آدمی مقرر کیا وہ آدمی مرغن کھانے کھا کر مستانے لگا، ادھر پھرنے لگا اس لیے اس کی شادی کر دی، بیوی آئی بال بچے ہوئے، شاہ صاحب آزاد منش تھے ان سب جھگڑوں کو دیکھ کر گھبرائے اور فرمانے لگے کہ ان سب کی جڑ لنگوٹا ہے اس کو اتار کر پھینک دیا غرض میں نے چندہ موقوف کرا دیا لیکن یہ نہیں کیا کہ کوئی مدرسہ کی اعانت خلوص سے کرے اس کو بھی اعانت کی اجازت نہ ہو بلکہ یہ اطلاع کرا دی کہ اب یہ توکل کا مدرسہ ہے نہ روئداد ہوگی نہ حساب کتاب ہوگا نہ رسید ہوگی نہ باضابطہ قواعد مقرر ہوں گے جس کا جی چاہے اس میں اعانت کرے اور جس کا جی چاہے نہ کرے اور جو کرے وہ اس شرط سے کہ اس کو اس قدر تحمل ہو کہ اگر میں ساری رقم اس کی خود بھی کھا جاؤں تو گوارا کر لے۔ سو الحمدللہ کہ پہلے سے زیادہ آمدنی اور اطمینان ہے، بعضے لوگوں نے کہا کہ اس طرح تم نے تو چلا لیا مگر اور کسی سے نہ چل سکے گا میں کہتا ہوں کہ ہر وہ شخص چلا لے گا جو خلوص سے اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر کام کرے گا اور اگر نہ بھی چلے تو چھوڑ دے میں نے بھی یہی قصد کر لیا تھا کہ جتنا کام اپنی ذات سے

ہو سکے گا وہ کرلوں گا اور اس سے زیادہ اگر حق تعالیٰ چاہیں گے کسی ذریعہ سے کرادیں گے ورنہ اس کے عدم ہی میں مصلحت سمجھوں گا۔ حدیث قدسی میں ہے: ’’انا عندظن عبدی بی (اخرجہ الشیخان والحاکم بسند صحیح)[1] یعنی حق تعالیٰ فرماتے ہیں میں بندہ کے گمان کے پاس ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر مجھ سے اچھا گمان رکھے گا تو میں بھی اچھا برتاؤ کروں گا اور جو بدگمانی کرے گا تو اس کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کیا جاوے گا۔ سو جن لوگوں کا گمان یہ ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کام چلائیں گے ان کے ساتھ ان کے گمان کے موافق برتاؤ کیا جاتا ہے اور جن کا یہ گمان ہوتا ہے کہ بغیر ظاہری سبب کے کام نہیں چل سکتا تو حق تعالیٰ ان کو اس گمان کا ثمرہ مرحمت فرماتے ہیں یعنی وہ کام بغیر ظاہری سبب کے نہیں چل سکتا چور کا گمان ہے کہ بغیر چوری کے رزق نہیں ملتا تو اس کو بغیر اس فعل شنیع کے روزی نہیں ملتی اس کی پھٹی ہوئی جھولی ہے اس میں برکت نہیں ہوتی آتا تو ہے مگر نکل جاتا ہے۔ دیکھئے اسٹیشن کی مسجد کی تعمیر میں کون سی لوٹ کھسوٹ ہوئی تھی کام دیکھ کر خود لوگوں کو رغبت ہوئی۔ بھوپال معمولی طور پر ایک غریب آدمی کی طرف سے اطلاع دی گئی کہ نہ خط کی رجسٹری کرائی نہ کوئی خاص اہتمام سفارش کا ہوا خصوصاً ایسے وقت میں کہ ولی عہد بیمار تھے اور اس وجہ سے بیگم صاحبہ کا کاروبار کی طرف پورے طور پر متوجہ بھی نہ ہوتی تھیں مگر پھر خدا تعالیٰ نے ان کو متوجہ کر دیا اور خط کے جواب میں انہوں نے تخمینہ دریافت کیا۔ تخمینہ بھی پورا پورا لکھ دیا گیا' بڑھا کر نہیں لکھا' اسی وجہ سے اخیر میں کمی پڑی' لوگوں نے کہا کہ تعمیر کے کام میں اندازہ سے زیادہ صرف ہوتا ہے اس لیے تخمینہ زیادہ لکھنا چاہیے' میں نے کہا کہ کیا واہیات بات ہے ہرگز ایسا نہ کرنا چاہیے غرض وہاں سے اعانت ہوئی پھر کمی پڑی پھر اطلاع دی گئی اس طریق۔ سے کہ آپ سے یہ درخواست نہیں ہے کہ آپ اس کام کی تکمیل کرائیں بلکہ اس غرض سے اطلاع دی جاتی ہے کہ کام ناتمام ہے شاید آپ مطلع ہو کر شکایت فرماویں کہ ہم کو کیوں نہیں خبر دی ہم اس کو پورا کرادیتے۔ انہوں نے اس درخواست پر بھی بقدر تکمیل مدد فرمائی اور کچھ متفرق لوگوں نے اعانت کی۔ غرض سب کام اسی طرح ہو گیا۔ غرض چندہ پر زور دینا سبب ہوتا ہے تحاسد و تنافس مدارس کا اور مدارس میں اکثر ایسا ہوتا ہے اس لیے میں ایک بستی میں تعدد کی رائے نہیں دیتا۔

تعدد مدارس کہاں مضر نہیں

ہاں تعدد مدارس وہاں مضر نہیں ہوتا جہاں حکومت کا اثر ہوتا ہے کیونکہ وہاں داعی ہی نہیں یعنی چندہ اور مانع موجود ہے یعنی حکومت۔ ایک طالب علم بخاری کہتے تھے کہ بخارا میں ۳۶ مدرسے

---

[1] (مسند احمد ۲: ۳۱۵' الترغیب والترهیب ۲: ۳۹۳)

ہیں ہر مدرسے میں پائیں باغ اور بڑے بڑے مکانات اور طلباء کو باغوں کے میوے وغیرہ تصرف میں لانے کی بے تکلف اجازت اور ان کا جیب خرچ مقرر ہے تو چونکہ وہاں حکومت اسلامیہ کے ماتحت مدارس ہیں اس لیے تنافس اور تخالف کا اثر نہیں اور میں نے چندہ پر زور ڈالنے سے منع کیا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اس مدرسہ کی اعانت کو منع کرتا ہوں میں مانع للخیر نہیں ہوں لیکن متعارف درخواست نہیں کرتا ہوں ہاں عام ترغیب دلاتا ہوں "لَایَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا" کے موافق درخواست ہے خوش قسمتی ہے آپ حضرات کو کہ ایسا موقع میسر ہو گیا ہے اگر اور بھی کچھ نہ ہو سکے تو دعا ہی کر دیا کرو۔

لاخیل عندک تھدیھا ولا مال　　　فلیسعد النطق ان لم یعد الحال

(نہیں ہے گھوڑا تمہارے پاس کہ تم ہدیہ کرو اور نہ مال ہے کہ اسے دو تو صرف زبان ہی سے موافقت کرو اگر تمہارا حال موافقت نہیں کرتا)

دعا بہت بڑی چیز ہے گو لوگ اس کو معمولی اور حقیر سمجھتے ہیں لیکن صرف اسی پر قناعت بھی نہ کیجئے بلکہ ہر طرف سے جو کچھ مدد ہو سکے فرمائیے اور اس مثل کے مصداق نہ ہو جئے (محبت رکھو پاک لینے دینے کے منہ میں خاک) گو بخیل کی (تبسم کے لہجہ میں ۱۲ جامع) دعائیں اس حیثیت سے زیادہ اثر کی امید ہے کہ وہاں خلوص زیادہ ہوتا ہے کیونکہ وہاں تو صرف دعا ہی دعا ہے اور کچھ ہے ہی نہیں مگر ایک دوسری حیثیت سے اور وہ حیثیت نحوست بخل ہے قبولیت دعا میں کمی ہو جاوے مگر خلوص تو بہت ہی ہوتا ہے اور عجب نہیں کہ خلوص برکت بخل کی نحوست پر غالب آ جائے اور ضرورت اس کام کی آپ کو معلوم ہی ہو چکی جب تک حضرت قاری محمد علی خان صاحب قدس سرہ یہاں تشریف فرما تھے تو اس قدر یہاں مدرسہ کی حاجت نہ تھی گو کسی درجہ میں جب بھی تھی اب کون ہے جس سے ضرورت کے وقت مسئلہ دریافت کیا جاوے۔ صرف کتابوں سے کام نہیں چل سکتا کیونکہ کتابوں کا پورے طور پر سمجھنا عالم کے سوا دوسرے کا کام نہیں ہے کبھی کسی کی ہمت پڑی ہے کہ کتابوں سے مسہل دیکھ کر استعمال کیا ہو ہمیشہ طبیب ہی کی حاجت ہوتی ہے۔ پھر جب طب جسمانی کے لیے صرف کتابیں کافی نہیں سمجھی جاتیں تو تعجب ہے کہ طب روحانی کے لیے کیونکر کتابوں پر قناعت ہو جاتی ہے حالانکہ قلب کی اصلاح جسم کی اصلاح سے اہم اور اس سے زیادہ نازک ہے لہٰذا یہاں مدرسہ میں ایک عالم کی حاجت ہے اور وہ عالم ایسے ہوں جن کی درسیات پوری ہو چکی ہوں اور ان کے متعلق تین کام ہونے چاہئیں ایک تو بچوں کا گھیرنا اور محبوس رکھنا تاکہ وہ آوارگی سے بچیں اور گو گھیر گھار سرکاری

مدارس میں بھی ہو جاتی ہے لیکن وہاں صرف علم معاش کی تعلیم ہوتی ہے علم معاد سے کوئی تعلق نہیں اس سے نفس کی اصلاح نہیں ہوتی اور میں علم معاش کا مخالف نہیں ہوں مگر مسلمان اس کو کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ علم معاش کے اہتمام میں اپنی عمر تمام کر دے اور معاد سے بے بہرہ رہے کم سے کم علم معاد میں قرآن مجید اور اردو کے رسائل جن سے ضروری مسائل پر عبور ہو جاوے اتنا ہی پڑھو اور دوسرا کام ان عالم کا یہ ہو کہ بوقت ضرورت مسائل بتلادیں اور اس عالم کا متدین ہونا بھی ضرور ہے تا کہ جن مسائل کو کتاب کی مدد سے بھی نہ بتلا سکے ان کے پوچھنے کے لیے اپنے سے بڑے عالم کا پتہ بتلا دے اور نیم ٹر عالم اگر متدین ہوگا تب تو کام نہ کر سکے گا اور جو متدین نہ ہوگا تو جو چاہے گا بتلائے گا صحیح و غلط کی پرواہ نہ کرے گا۔ تیسرا کام گاہے گاہے وعظ کہنا ہے کیونکہ تدریس سے تعلیم خاص حاصل ہوتی ہے اور وعظ تعلیم عام ہے اگر اسی طرح تھوڑے عرصہ تک کام چلتا رہا تو بہت سے فاسق متقی ہو جاویں گے بہت سے جاہل عالم ہو جاویں گے۔

مدرسہ مفتاح العلوم کا افتتاح

اور تجربہ سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جب تک مدرسہ کا مکان خاص نہ ہو اس وقت تک اطمینان سے تعلیم نہیں ہو سکتی۔ مسجد میں اول تو تنخواہ دار کا پڑھانا فقہاء نے مکروہ لکھا ہے دوسرے مسجد کا ادب ملحوظ رکھنا تدریس کی صورت میں دشوار ہے اور اگر مدرسہ کسی کی بیٹھک میں قائم کیا جاوے تو اس کا استقرار دشوار ہے ممکن ہے کسی وقت میں صاحب بیٹھک اہل مدرسہ کو وہاں سے اٹھا دے۔ نیز مسجد کی آبادی نمازیوں سے کافی ہو جاتی ہے طلباء پر موقوف نہیں اس لیے مسجد میں مدرسہ ہونے سے لوگوں کا خاص طور پر مدرسہ کی آبادی کا اہتمام نہیں ہو سکتا اور جب مدرسہ مستقل ہوگا تو اس وقت اس کی آبادی کا خیال ہوگا۔ درجہ اس مدرسہ کا یہ ہوگا کہ عربی کی ابتدائی کتابوں تک تعلیم رہے گی جب طلبہ یہاں کی تعلیم سے فارغ ہو چکیں کسی بڑے مدرسہ میں داخل ہو جاویں یہاں تو مختصر ہی مدرسہ مناسب ہے خصوصاً ابتدائی حالت میں۔ ایک اللہ کے بندے نے کچھ چندہ بھی جمع کر لیا ہے اور ایک عالم بھی ذہن میں قرار دے لئے ہیں ایک عالم کا بستی میں رہنا ضرور ہے اب وقت اس کا ہے کہ آپ لوگ عمارت کی بنیاد رکھیں اور یہ دعا کریں: "رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ" (اے ہمارے پروردگار ہم سے قبول فرما' بیشک آپ سننے والے اور جاننے والے ہیں) یہ دعا ہے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جو بوقت بناء کعبہ کے آپ نے جناب باری تعالیٰ میں عرض کی تھی اور واقع میں حق تعالیٰ کی اعانت کی نہایت ضرورت ہے کیونکہ

خلوص بھی جب ہی مؤثر ہے جبکہ حق تعالیٰ قبول فرمالیں۔اس لیے کہ سوائے اللہ جل جلالہ کے تمام اشیاء حادث ہیں اور خلوص بھی انہی میں سے ہے اور کوئی حادث فاعل بالذات نہیں ہوتا پس خلوص بغیر اعانت خداوندی مؤثر نہیں ہوسکتی جہاں تک ہوسکے جلد سے جلد اس کام کو شروع کردیجئے اور چونکہ یہ افتتاح عمارت مدرسہ کا وقت ہے اور مجھے معلوم نہیں کہ کبھی یہاں مدرسہ اس سے پہلے ہوا ہو۔اس مناسبت سے بھی اور نیز اس مناسبت سے افتتاحی کتابیں یہاں پڑھائی جاویں گی اور نیز اس مناسبت سے بھی فتح باب خیر ہے اور اس مناسبت سے بھی کہ حدیث میں جو یہاں بیان کی گئی ہے لفظ مفتاح واقع ہوا ہے اس مدرسہ کا نام مفتاح العلوم رکھتا ہوں۔

وعظ کا نام

اور اس وعظ کا نام مفتاح الخیر چونکہ یہ اسماء مشتقین من الحدیث ہیں اس لیے مدرسہ میں نیز اس وعظ میں برکت کی زیادہ امید ہے۔اب دعا فرمائیے (دعا پر جلسہ ختم ہوا اور سنگ بنیاد مدرسہ کا رکھا گیا)۔

سلسلہ التبلیغ کا وعظ مسمی بہ

تقلیل الکلام

بمقام مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون ۲۱ رمضان المبارک ۱۳۴۰ھ بعد نماز جمعہ ساڑھے تین گھنٹے کھڑے ہوکر یہ وعظ ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد ۱۰۰ تھی۔ مولانا ظفر احمد تھانوی صاحب نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَاشَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارِکۡ وَسَلِّمۡ. اَمَّابَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ. بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ.

وَالَّذِیۡنَ جَاھَدُوۡا فِیۡنَا لَنَھۡدِیَنَّھُمۡ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰہَ لَمَعَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ

(العنکبوت آیت نمبر ٦٩)

ترجمہ: ’’اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے قرب وثواب (یعنی جنت کے) راستے ضرور دکھائیں گے بے شک اللہ تعالیٰ کی (رضا ورحمت) ایسے خلوص والوں کے ساتھ ہے۔‘‘

یہ وہی آیت ہے جس کی اس کے قبل دو دفعہ تلاوت کی گئی ہے اور آج پھر تلاوت کی گئی ہے کیونکہ اس کے ذیل میں جو مضمون بیان ہو رہا ہے وہ ابھی تمام نہیں ہوا اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے۔

مجاہدات حکمیہ کی چار قسمیں

مجاہدات حکمیہ کی چار قسمیں ہیں۔ تقلیل طعام، تقلیل منام، تقلیل کلام، تقلیل اختلاط مع الانام۔ ان میں سے دو کا بیان ہو چکا ہے اور دو باقی ہیں اور جن دو کا بیان ہوا ہے وہ مستقلاً نہیں ہوا بلکہ اس حیثیت سے بیان ہوا کہ رمضان کی عبادت میں ان مجاہدات کی رعایت کی گئی ہے۔ اب دو جو باقی ہیں ان کی بھی اسی حیثیت سے تقریر ہوگی جن میں سے آج تقلیل کلام کے متعلق بیان کا ارادہ ہے اگرچہ بعض مقتضیات کی وجہ سے اس وقت تقلیل اختلاط مع الانام کا بیان ہونا چاہیے تھا کیونکہ یہ زمانہ اعتکاف کا ہے لیکن میں نے چند وجوہ سے تقلیل کلام کا بیان مقدم کیا۔

اعتکاف سنت علی الکفایہ کا سبب

ایک یہ کہ اعتکاف ایک خاص وقتی عبادت ہے جس میں اتنا عموم نہیں اور تقلیل کلام میں عموم ضرورت ہے۔ اعتکاف سب لوگ نہیں کر سکتے بلکہ اگر سب کریں تو

جائے گا کیونکہ اس سے حوائج وضروریات معطل ہو جائیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ اعتکاف سنت علی الکفایہ ہے۔ بستی بھر میں ایک آدمی اعتکاف کرلے تو کافی ہے اور تقلیل کلام کے مخاطب تمام افراد ہیں۔ فرداً فرداً اور اس پر سب کے سب عمل کر سکتے ہیں کیونکہ تقلیل کلام کی جو حقیقت آگے بیان کی جائے گی اس سے معلوم ہو جائے گا کہ اس پر سب کے عمل کرنے کی کسی ضرورت کا تعطل نہیں ہوسکتا۔ دوسرے تقلیل کلام کی رعایت جس عمل کے ضمن میں کی گئی ہے وہ عمل بھی بہ نسبت اعتکاف کے زیادہ عام ہے۔ چنانچہ آگے بیان کیا جائے گا کہ رمضان میں تلاوت قرآن کے ضمن میں تقلیل الکلام کی رعایت کی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ عمل عام ہے تلاوت قرآن کرنے والوں کا عدد سے بہت زیادہ ہے پھر یہ عمل ہر شخص کو اور ہر وقت سہل ہے اور اعتکاف ہر اک کو آسان نہیں نہ ہر وقت ہوسکتا ہے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول بھی کثرت تلاوت کا تھا اور اعتکاف اس کثرت سے نہ کیا جاتا تھا۔ تیسرے خود قلب اختلاط اور قلت کلام میں فی نفسہ قلت کلام زیادہ ضروری ہے کیونکہ قلت اختلاط اگر نہ بھی ہو مگر تقلیل کلام کی عادت ہو تو غوائل سے بچ سکتا ہے اور اگر تقلیل کلام نہ ہو تو محض قلت اختلاط سے غوائل سے نہیں بچ سکتا جو شخص زیادہ بک بک کرنے کا عادی ہوتا ہے وہ ایک ہی مجلس میں بہت باتیں گناہ کی کہہ ڈالتا ہے۔ الغرض جن اعمال کے ضمن میں تقلیل کلام و تقلیل اختلاط کی رعایت کی گئی ہے خود ان اعمال میں بھی تفاوت ہے۔

مجاہدات تسہیل اعمال کا ذریعہ ہیں

اور خود ان دونوں مجاہدوں میں بھی تفاوت ہے ان وجوہ سے میں نے تقلیل کلام کے بیان کو مقدم کیا لیکن مثل جمعہ گزشتہ کے اس وقت بھی مضمون سابق کا کچھ تتمہ ذہن میں آگیا ہے اور وہ دو تتمے ہیں جن کو پہلے بیان کر دینا مناسب ہے میں نے پہلے بیان کیا تھا کہ شریعت نے محض ان مجاہدات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کے ساتھ ساتھ اعمال بھی منضم کر دیئے گئے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ اصل مقصود اعمال ہیں اور مجاہدات تسہیل اعمال کا ذریعہ ہیں۔ پس اگر مجاہدہ کا ثمرہ حاصل نہ ہو یعنی کیفیات نہ ہوں اور اعمال موجود ہوں تو کافی ہے اور اگر اعمال نہ ہوں تو کیفیات کافی نہیں مثلاً ایک شخص نماز پڑھتا ہے روزہ رکھتا ہے زکوٰۃ دیتا ہے' بیوی بچوں کے حقوق ادا کرتا ہے' حرام آمدنی سے بچتا ہے کسی کا قرض لے کر نہیں مارتا' جھوٹ اور غیبت وغیرہ سے اجتناب کرتا ہے مگر اس کو وہ ثمرات حاصل نہیں جو مجاہدہ پر مرتب ہوا کرتے ہیں۔ مثلاً غلبہ ذوق وشوق ویکسوئی وغیرہ نہیں تو یہ شخص بے فکر رہے اس کو مقصود حاصل ہے اور جو مفقود ہے وہ مقصود نہیں اس کا غم نہ کرے اس پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب اعمال کافی ہیں اور غلبہ ذوق وشوق ویکسوئی وغیرہ کی

ضرورت نہیں تو طریق باطن کی کیا ضرورت ہے۔ اعمال تو ہم ویسے بھی کر سکتے ہیں اتنی بات کے لیے مشائخ کی خدمت اور مجاہدات وریاضات واذکار واشغال کی کیا ضرورت رہی یہ تو بدون اس کے بھی ہوسکتا ہے اس شبہ والے نے مقصود طریق ہی کو نہیں سمجھا' یہ شخص محض کیفیات ہی کو مقصود طریق سمجھتا ہے اسی لیے میرے اس کہنے پر کہ یہ کیفیات نہ ہوں تو بے فکر رہو اس کو طریق کے بیکار ہونے کا شبہ ہوا ''سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجاست''

کیفیات مقصود طریق نہیں

میں پھر کہتا ہوں کہ کیفیات مقصود طریق نہیں بلکہ مقصود طریق اعمال ہی نہیں اور یہ کیفیات خود ان اعمال کے تابع ہیں اگر عمل نہ ہو تو یہ کیفیات کبھی باقی نہیں رہ سکتیں' تجربہ کر کے دیکھ لیا جائے مگر جو اعمال مقصود طریق ہیں ان میں یہ شرط ہے کہ ان میں خلوص ہو رہا یہ کہ پھر مقصود طریق کیا ہے تو سنئے کہ مقصود طریق اور خلوص فی الاعمال یہی باطن عمل ہے جس کے متعلق ارشاد ہے: "وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ" (حالانکہ ان لوگوں کو حکم ہوا تھا کہ اللہ کی اس طرح عبادت کریں کہ عبادت اسی کے لیے خاص رکھیں) اور حدیث میں ارشاد ہے: "ان تعبداللہ کانک تراہ" (تو اللہ کی عبادت اس طرح کر گویا تو خدا کو دیکھ رہا ہے) تو آپ نے میرے اس قول سے کہ اعمال کافی ہیں یہ مطلب سمجھا کہ محض ظاہری اعمال کافی ہیں اسی لیے طریق باطن کے بیکار ہونے کا شبہ ہوا حالانکہ میرا مطلب یہ تھا کہ اعمال مع اپنی صورت ظاہرہ اور مع اپنی روح کے موجود ہوں تو کافی ہیں اور روح اعمال خلوص ہے اور تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ اس خلوص کے حصول میں طرق صوفیاء سے سہولت ہو جاتی ہے علم باطن میں ان ہی طرق کا بیان ہوتا ہے اور اسی کے لیے مشائخ کی صحبت اختیار کی جاتی ہے اور اسی کے لیے اذکار واشغال بتلائے جاتے ہیں۔ اسی خلوص میں کیفیات ذوق وشوق ویکسوئی سے بھی سہولت ہو جاتی ہے لیکن خلوص ان پر موقوف نہیں خلوص اس کے بغیر بھی حاصل ہوسکتا ہے گو دقت اور مشقت سے ہی ہو مگر ہوسکتا ہے اور طریق باطن سے یہ بسہولت ہو جاتا ہے اور حقیقت اس خلوص کی یہ ہے کہ مثلاً نماز پڑھے تو اس میں ریاء نہ ہو' عجب نہ ہو' قصداً حضار وساوس نہ ہو' تو اب اگر کوئی شخص نماز پڑھنے کھڑا ہوا اور سوائے رضائے حق کے اس کی کوئی غرض نہیں اور جو غرض بھی آتی ہے اس کو دفع کرتا ہے اور وساوس بھی دل میں خود نہیں لاتا تو یہ نماز خلوص کے ساتھ تمام ہوئی ہاں اگر یہ شخص کیفیات سے خالی ہے تو اس کے اہتمام اس کو مشقت بہت ہوگی لیکن اگر وہ اس مشقت کو برداشت کرتا رہے اور ہمت کر کے از خود نماز میں کوئی وسوسہ نہ لاوے نہ ریاء وعجب کو پاس آنے دے تو مقصود میں یہ شخص کامیاب ہے اور اس کو مشقت کی وجہ سے اجر بھی زیادہ ہوگا۔

خلوص روح اعمال ہے

جس کی دلیل وہ حدیث ہے "الذی یقرء القرآن وھو بہ ماھر فھو مع السفرۃ الکرام البررۃ والذی یتعتع فیہ وھو علیہ شاق لہ اجر ان"[1] (او کمال قال) لیکن اس مشقت کا روزانہ برداشت کرنا آسان نہیں۔ بعض دفعہ آدمی گھبرا جاتا ہے اور نفس کو ڈھیل دے دیتا ہے تو نماز میں اول سے آخر تک وساوس ہی وساوس ہوتے ہیں کبھی عجب بھی پیدا ہو جاتا ہے' ریاء میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے۔ سو طریق باطن کی تحصیل سے یہ مشقت باقی نہیں رہتی پھر حضور سہل ہو جاتا اور خلوص آسانی کے ساتھ حاصل ہو جاتا ہے تو طریق باطن بیکار نہ ہوا کیونکہ خلوص جو روح اعمال ہے وہ اس طریق سے بسہولت حاصل ہو جاتا ہے تو اب میرا یہ دعویٰ ثابت ہو گیا کہ اعمال کافی ہیں اور مقصود ہیں اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ طریق بیکار نہیں مقصود میں معین ہے اور برخلاف اس کے جب آدمی یہ عقیدہ کر لیتا ہے کہ کیفیات مقصود ہیں اور اعمال مقصود نہیں تو اس پر دو مفسدے مرتب ہوتے ہیں ایسا تو کون ہو گا جو نماز کو مقصود نہ سمجھے مگر مقصود بالذات و بالعرض میں کلام ہے بعض لوگ اعمال کو ان کیفیات کا وسیلہ سمجھتے ہیں اور مقصود بالذات کیفیات کو سمجھتے ہیں۔ اب ان کی حالت یہ ہے کہ نماز میں کیفیات حاصل ہوئی اور جی لگا تو سمجھتے ہیں کہ آج نماز پڑھی اور اگر جی نہ لگا تو سمجھے ہیں کہ نماز نہیں پڑھی مگر فرض کو تو ترک نہیں کرتے' فرائض کو تو گناہ کے خوف سے ادا کر لیتے ہیں لیکن جو اعمال مندوب ہیں جیسے تلاوت و ذکر اور نوافل وغیرہ ان کو تو چھوڑ ہی بیٹھتے ہیں۔ چنانچہ تجربہ ہے کہ اکثر ذاکرین کی یہی حالت ہے کہ جب ذکر میں ان کا دل نہیں لگتا تو اس دن ذکر کا ناغہ کر دیتے ہیں' نوافل میں جی گھبرایا تو ان کو بھی چھوڑ دیتے ہیں یاد رکھو یہ حالت سخت خطرناک ہے اگر تم جی لگنے کے ایسے ہی تابع رہو گے تو شیطان تم کو ہمیشہ عبادات و ذکر سے روکتا رہے گا' جب وہ دیکھے گا یہ شخص کثرت وساوس سے پریشان ہو کر کام ہی چھوڑ دیتا ہے تو وہ تمہارا پیچھا کبھی نہ چھوڑے گا اور تم کو اعمال سے معطل کر دے گا ایسے وقت میں وہی شخص کام کر سکتا ہے جو کیفیات کو مقصود نہ سمجھے عمل کو مقصود سمجھے وہ ہر حالت میں کام کرے گا خواہ دل لگے یا نہ لگے ان لوگوں نے ایک شعر یاد کر رکھا ہے جس کو اکثر واعظین وعظ میں پڑھا کرتے ہیں اور اس کو مولانا رومی کی طرف منسوب کرتے ہیں؟

بر زباں تسبیح دردل گا وخر   ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

(زبان پر تسبیح ہے اور دل میں گائے اور گدھے کا دھیان ہے' اس طرح کی تسبیح کب اثر رکھتی ہے)

---

[1] (سنن ابی داؤد: ۱۴۵۴' کنز العمال: ۲۲۶۷)

مگر میرے علم میں یہ مولانا کا شعر نہیں ہے مثنوی میں اس کا پتہ نہیں' غالباً بہاؤالدین عاملی کا شعر ہے اور وہ کوئی محقق نہیں' میرے نزدیک اس شعر کا مضمون بھی صحیح نہیں بلکہ تجربہ سے یہ ثابت ہوا ہے کہ ''ایں چنیں تسبیح ہم دارد اثر''

وسوسہ کے ساتھ بھی ذکر نافع ہے

رات دن کا تجربہ ہے کہ ابتداء میں وساوس کی کثرت ہوتی ہی ہے بہت کم ذاکر ایسے ہوں گے جن کی ابتداء میں وسوسے نہ آتے ہوں مگر میں ذاکرین سے کہہ دیتا ہوں کہ اس طرف التفات نہ کرو' وساوس کے ساتھ ہی ذکر کرتے رہو رفتہ رفتہ حضور حاصل ہو جائے گا۔

چنانچہ وہ ذکر مع الوساوس ہی ایک نہ ایک دن اپنا اثر دکھاتا ہے اور زبانی تسبیح اپنا رنگ لاتی ہے اور حضور میسر ہو جاتا ہے۔ پس میں کیسے مان لوں کہ 'وسوسہ کے ساتھ ذکر نافع نہیں ہوتا' ہاں اگر اس شعر میں یہ تاویل کی جائے کہ جو شخص ذکر کے وقت خود وساوس کو جمع کر کے لاتا ہے تو ایسا ذکر مؤثر نہیں تو وہ شعر صحیح ہو سکتا ہے گو ذکر بیکار اب بھی نہیں ثواب تو ملے ہی گا کیونکہ زبان تو ذکر میں مشغول ہے مگر اس صورت میں قلب پر اس کا اثر نہ ہوگا۔ یہ قلب کو از خود دوسری طرف متوجہ کر رہا ہے تو ذکر کی طرف خاک توجہ ہوگی اور جب ذکر کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتا تو قلب پر اثر کیسے ہوگا لیکن اگر از خود وساوس نہیں لاتا بلکہ وساوس بلا قصد آتے ہیں اور یہ ان پر التفات نہیں کرتا تو یہ ذکر نافع بھی ہے اور مؤثر بھی اور اس صورت میں وہ قول صحیح نہیں بلکہ اس کا نقیض صحیح ہے کہ ایں چنیں تسبیح ہم دارد اثر اور اگر وساوس مطلقاً مضر ہوتے اور اثر سے مانع ہوتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جب صحابہ رضی اللہ عنہم نے وساوس کی شکایت کی تھی آپ ان سے یہ کیوں فرماتے ہیں: ''**اوجد تموہ قالو انعم قال ذاک صریح الایمان**''[1] آپ فرماتے ہیں کہ کیا تم کو وسوسے آنے لگے اور تم نے ان کو اپنے اندر پالیا' صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے فرمایا کہ یہ تو خالص ایمان ہے مطمئن رہو جو لوگ ذکر میں جی نہ لگنے سے ذکر چھوڑ بیٹھتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کو خدا سے تعلق ہی نہیں اور اس کی طلب ہی نہیں ورنہ صاحب بھوکا آدمی کھانا سامنے آنے کے بعد یہ نہیں دیکھا کرتا کہ اس میں نمک ہے یا نہیں بھوکے کو مزے سے کیا بحث اسے تو کھانے سے کام ہاں جس کا پیٹ بھرا ہوا ہو اس کو یہ نخرے سوجھتے ہیں' اگر مزہ آیا کھالیا مزہ نہ آیا چھوڑ کر الگ ہو گیا' پس تم کو بھی اگر طلب اور بھوک ہوتی تو تم مزہ کو ہرگز نہ دیکھتے بلکہ تمہارا یہ مذاق ہوتا۔

---

[1] (الصحیح لمسلم ب: ۶۰' رقم: ۲۰۹' مجمع الزوائد ۱: ۳۴)

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب　　　　که حیف باشد از وغیرہ او تمنائے

(فراق اور وصل کوئی چیز نہیں، رضائے دوست طلب کرو محبوب حقیقی کی رضا کے علاوہ کسی چیز کی طلب قابل افسوس ہے)

صاحب یہ تو خدا تعالیٰ کی طرف سے تمہارا امتحان ہے کہ ذکر میں لذت کے طالب ہو یا ہمارے طالب ہو اگر تم کو خدا سے تعلق اور عشق ہوتا اور اسی کی طلب ہوتی تو یہ حال ہوتا۔

''گر مرادت راندات شکر است'' (اگر تمہارے مراد کی لذت سکر کی طرح ہے)

یعنی یہ مسلم لیکن ''بیمرادی ہم مراد دلبر است'' (لیکن نامرادی محبوب کی مراد ہے جو اس سے زیادہ لذیذ ہونی چاہیے) افسوس تم محبوب کی مراد پر اپنی مراد کو مقدم کرتے ہو ارے جب وہی چاہتے ہیں کہ وساوس کے ساتھ ہی ہمارا ذکر کرو تو تم وساوس سے خالی ہونا کیوں چاہتے ہو اور ذکر کے لیے اس انتظار میں کیوں ہو کہ جی لگے تو کروں۔

بس زبون وسوسہ باشی دلا　　　　گر طرب را با زدانی از بلا

(یعنی اپنے دل میں برا وسوسہ ہے کہ تو عاشق ہو کر طرب اور تعب میں فرق کرتا ہے یعنی عاشق کو محبت کے راستے میں مشقت کو بھی لذیذ سمجھنا چاہیے)

جو شخص طرب اور تعب میں فرق سمجھے وہ ابھی تک وسوسہ نفسانی کا شکار ہے ذاکر کو ہر حال میں اپنا کام کرنا چاہیے، خواہ طرب ہو یا تعب ہو۔

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب　　　　که حیف باشد از وغیرہ او تمنائے

(فراق اور وصل کوئی چیز نہیں، رضائے دوست طلب کرو محبوب حقیقی کی رضا کے علاوہ کسی چیز کی طلب قابل افسوس ہے)

طلب خدا کی تفسیر

یہ شخص اس کو فراق سمجھتا ہے کہ لذت میں کمی ہوگی، سمجھتا ہے کہ بس میں مردود ہو گیا، ارے کیا کیفیت خدا ہے جس کے زوال سے یہ سمجھتا ہے کہ میں خدا سے دور ہو گیا جب یہ خدا نہیں تو پھر اس کے طالب کیوں ہوتے ہو طالب خدا ہو کر غیر پر نظر افسوس کی بات ہے شاید یہاں کوئی ذہین یہ شبہ کرے کہ رضائے خدا کیا ہے، ظاہر ہے کہ خدا نہیں تو پھر تم رضا کے طالب کیوں ہو تم بھی طالب غیر خدا ہوئے۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ رضا گو عین خدا نہیں مگر غیر بھی نہیں کیونکہ رضا صفات الٰہیہ میں سے ہے اور صفات لا عین لا غیر ہیں یہ تو اجمالی جواب ہے جو اہل علم کے مناسب ہے اور تفصیلی

جواب یہ ہے کہ طلب خدا کی تفسیر یہی ہے کہ رضاء خدا کو طلب کرے۔ "اِبْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ" کے معنی یہی ہیں کہ "ابتغاء مرضاة اللّٰه" ہو چنانچہ حق تعالیٰ نے ایک مقام پر تو "يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ" فرمایا ہے اور دوسرے مقام پر ارشاد ہے: "مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاةِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ" (اوران لوگوں کے خرچ کیے ہوئے مال کی حالت جو اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی غرض سے کہ اپنے نفسوں کو اس عمل شاق کا خوگر بنا کر ان میں پختگی پیدا کریں، مثل حالت ایک باغ کے ہے جو کسی ٹیلہ پر ہو) یہاں طلب رضاء کا حکم ہے معلوم ہوا کہ ابتغاء وجہ اللہ یہی ہے کہ رضاء الٰہی کا طالب ہو اور راز اس میں یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی طلب بدون واسطہ صفات کے دشوار ہے کیونکہ ذات کا نہ تصور ہوسکتا ہے نہ اس کا حصول ہوسکتا ہے ذات کا تصور جب ہوگا صفات کے ہی واسطے سے ہوگا اور بلا واسطہ یعنی تصور بالکنہ اس کی ذات کا محال ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

در تصور ذات اورا گنج کو   نادر آید در تصور مثل او

(ہمارے تصور میں اللہ تعالیٰ کی ذات غیر محدود کیسے آسکتی ہے تصور میں جو کچھ آتا ہے وہ مثل ہے)

عارف شیرازی اسی کی نسبت کہتے ہیں:

عنقا شکار کس نہ شود دام باز چیں   کیں جا ہمیشہ باد بدست است دام را

(عنقا کا شکار کوئی شخص نہیں کرسکتا جال یہاں سے ہٹالے کہ عنقا کے شکار کی ہوس جس نے کی اس کے جال میں سوا ہوا کے کچھ حاصل نہ ہوا)

کسی شاعر نے اس مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے:

برو ایں دام بر مرغ دگر نہ   کہ عنقارا بلندست آشیانہ

(اے مخاطب جا اور جال کسی دوسری چڑیا کے لیے لگا کہ عنقا کا آشیانہ تیرے جال سے بہت بلند ہے)

رضا کی طلب ہی طلب الٰہی ہے

اسی واسطے عراقی اور غزالی نے ایک روایت نقل کی ہے جس کی تخریج عراقی نے ابونعیم واصبہانی سے کی ہے۔ "لاتفکروا فی اللّٰه فانکم لن تقدر واقدره"[1] یعنی خدا کی ذات میں تفکر نہ کرو تم اس کا احاطہ نہیں کرسکو گے تو جس ذات میں تصور بالکنہ محال ہے اس کی طلب بلا واسطہ کیونکر ہوسکتی ہے پس رضا کی طلب یہی طلب خدا ہے اور اسی کی طلب کا امر بھی ہے اگر یہ کہو کہ جنت کی طلب کا

---

[1] (حلیة الاولیاء ٦:٦٧)

بھی تو امر ہے اور وہ یقیناً غیر خدا ہے تو طلب غیر خدا جائز ہوئی تو پھر کیفیات کی طلب میں کیا حرج ہے اگر وہ طلب رضا کے برابر نہیں تو طلب جنت ہی کے مثل سہی اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو جنت کی طلب کا امر درجہ مقصودیت میں نہیں بلکہ اسکا امر بھی طلب رضا ہی کے لیے ہے کہ جنت چونکہ محل رضا ہے اور رضا مقصود ہے اس لیے محل کو بھی طلب کرنا چاہیے۔ پس محل رضا کی طلب حقیقت میں رضا ہی کی طلب ہے اور اس کی دلیل یہ حدیث ہے: "**اللھم انی اسئلک رضاک والجنة واعوذبک من سخطک والنار**" (اے اللہ میں آپ سے آپ کی رضا اور جنت کا سوال کرتا ہوں اور میں آپ سے آپ کی ناراضگی اور دوزخ کی پناہ مانگتا ہوں) اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اول رضا کو طلب کیا پھر جنت کو کیونکہ وہ محل رضا ہے اور اول غضب الٰہی سے پناہ مانگی ہے پھر جہنم سے کیونکہ وہ محل غضب ہے اس حدیث نے مطلع صاف کر دیا کہ اصل مقصود رضا ہے اور جنت مقصود بالذات نہیں بلکہ محل رضا ہونے کی وجہ سے مطلوب ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں:

بے تو جنت دوزخ است اے دلربا　　　با تو دوزخ جنت است اے جانفزا

(اے محبوب تیرے بغیر جنت بھی مجھ کو دوزخ ہے اور اگر تو ساتھ رہے تو دوزخ بھی مجھے جنت ہے)

جنت لوازم رضا سے ہے

غرض جنت مقصود بالذات تو نہیں سمجھا جاتا بخلاف کیفیات کے کہ اکثر ذاکرین ان کو مقصود بالذات سمجھتے ہیں چنانچہ جی نہ لگنے کے وقت عمل کو چھوڑ دینا یا ذکر میں کمی کرنا اس کی علامت ہے اس پر مجھے انکار ہے باقی میں کیفیات کو بیکار تو نہیں کہتا ان سے عمل میں سہولت ضرورت ہو جاتی ہے لیکن اگر وہ نہ ہوں تو عمل کیوں چھوڑا جائے، سہولت سے نہیں صعوبت ہی سے کر لے۔ سو ایک فرق تو طلب جنت و طلب کیفیت میں یہ ہوا۔ دوسرے خود جنت و کیفیات میں ایک فرق ہے اس لیے ان کو متماثل نہیں کہہ سکتے وہ یہ کہ جنت لوازم رضا سے ہے اسی لیے موعود ہے اور کیفیات لوازم رضا سے نہیں اس لیے موعود بھی نہیں تو اسکی مقصودیت سے بھی گھٹی ہوئی ہے اسی لیے اکابر نے فرمایا ہے کہ کیفیات محمود ہیں مقصود نہیں البتہ محمود یا معین مقصود ہونے کے سبب اگر اس کے لیے دعا کی جاوے تو اس کی طلب یعنی دعا کا حرج نہیں تو اعانت طاعت میں اس کا درجہ صرف اس قدر ہے کہ اس سے مقصود یعنی عمل میں قدرے سہولت ہو جاتی ہے جیسے چٹنی سے کھانا آسان ہو جاتا ہے لیکن ایسا کبھی نہ دیکھا ہوگا کہ دستر خوان پر چٹنی نہ ہو تو ضروری کھانا ہی چھوڑ دیا جاوے کیونکہ اصل مقصود تو غذا ہے چٹنی اس کے ہضم کے لیے معین ہے اس کو غذا کا موقوف علیہ نہیں بنایا جاتا بلکہ گاہے گاہے اگر دستر خوان پر چٹنی نہ آئے تو

اچھا ہے تا کہ معدہ اس کا عادی ہوکر کمزور نہ ہو جائے اسی طرح گاہے گاہے کیفیات کا نہ ہونا بھی اچھا ہے تا کہ نفس ان کا عادی نہ ہو جائے پھر ان کے بغیر کام ہی نہ کرے گا حالانکہ طالب کی شان یہ ہونی چاہیے کہ کیفیات کا نہ ہونا تو کیا اگر غیب سے یہ بھی آواز آ جائے کہ تیرا عمل کچھ قبول نہیں تو مردود ہے اور یقین ہو جاوے کہ یہ ندا غیبی ہے جب بھی اپنے کام میں لگا رہے اور ہر گز عمل کو ترک نہ کرے۔

ایک بزرگ کی حکایت

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک شخص کا قصہ لکھا ہے کہ وہ مجاہدات بہت کرتا تھا، راتوں کو تہجد پڑھتا تھا مگر اس کو کیفیات تو کیا ہوتیں ایک دن غیب سے اس کو ایسا فضیحت کیا گیا کہ رات کو جب وہ تہجد کے لیے اٹھا تو ہاتف نے آواز دی کہ جو چاہے کر یہاں کچھ قبول نہیں اور یہ آواز اس زور سے آئی کہ اس کے ایک مرید نے بھی سن لی مگر وہ اللہ کا بندہ اس پر بھی اپنا کام پورا کر کے ہٹا، اگلی رات ہوئی تو پھر لوٹا بدھنا لیکر تہجد کو اٹھے مرید نے کہا اجی غیرت بھی کوئی چیز ہے جب وہ کچھ بھی قبول نہیں کرتے تو پھر کاہے کے لیے مصیبت جھیلتے ہو پڑ کے سو بھی رہو، مرید کی اصلی رائے یہ نہ تھی کہ شیخ کام چھوڑ دے لیکن اپنے محسن کی حالت پر اس کا جی کڑھا اس لیے یہ بات منہ سے نکل گئی اس کو اپنے شیخ کی حالت پر رنج تھا اب شیخ کا جواب سنئے، واقعی طالب ایسے ہوتے ہیں کہ نہ آج کل جیسے کہ ایک دن نماز میں جی نہ لگا تو نہ تہجد ہے نہ ذکر ہے اس نے کہا بیٹا یہ تو معلوم ہے کہ وہ کچھ قبول نہیں کرتے مگر ان کے سوا میرے لیے کوئی دوسرا دروازہ بھی تو نہیں کہ ان کو چھوڑ کر وہاں چلا جاؤں، میرے لیے تو یہی ایک در ہے اسی پر جان دیدوں گا چاہے وہ قبول کریں یا رد کریں۔

تو انی ازاں دل پرداختن   که دانی که بے اوتواں ساختن

(اللہ تعالیٰ کے دروازہ سے بھاگ کر میں کہاں جاؤں بغیر اس دروازہ کے ہمارا کہاں اور ٹھکانا ہے)

بس اس پر رحمت الٰہی کو جوش آ گیا اور دوبارہ ندا آئی۔

قبول ست گرچہ ہنر نیستت   که جز ماپناہے دگر نیستت

(سب قبول ہے اگر چہ ہنر نہیں ہے کہ ہمارے سوا تیرا اور کوئی ٹھکانہ بھی تو نہیں ہے)

اب بھی ایک چرکہ لگا دیا کہ ہنر تو کچھ نہیں مگر اس کے لیے قبول کر لیا کہ ہمارے سوا تیرے لیے پناہ کوئی نہیں مگر اس چرکہ کا مزا عشاق کے دل سے پوچھو ان کو اس پر وجد آتا ہے اور یوں کہتے ہیں:

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی   جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

(آپ نے برا کہا اور میں خوش ہوں اللہ تعالیٰ آپ کو معاف کرے بہت اچھا کہا یہ تلخ جواب محبوب کے شیریں لبوں سے بہت ہی زیب دیتا ہے)

دشنام محبت

ایک بزرگ کا قصہ لکھا ہے کہ وہ جب ذکر کے لیے بیٹھتے تو یہ آواز آتی کہ تو کچھ ہی کر مگر کافر ہو کر مرے گا' بڑے پریشان ہوئے' شیخ بڑی نعمت ہے ان کے شیخ زندہ تھے جا کر حال عرض کیا' شیخ نے فرمایا کہ اس آواز پر کچھ خیال نہ کرو یہ دشنام محبت ہے ان کی عادت ہے کہ عاشقوں کو یونہی پریشان کیا کرتے ہیں تم کام کئے جاؤ مگر وہ دشنام غلط نہیں ہوتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مزاح کے متعلق فرماتے ہیں: "انی لامازح ولکن لا اقول الا حقاً"[1] کہ میں مزاح کرتا ہوں مگر مزاح میں بھی سچی ہی بات کہتا ہوں تو پھر حق تعالیٰ کی دشنام تو غلط کیونکر ہو سکتی ہے۔ بات یہ ہے کہ یہاں کافر سے معنی مشہور کافر باللہ مراد نہ تھے اور ان بزرگ نے معنی مشہور سمجھ کر ہی پریشانی ظاہر کی بلکہ یہاں کافر سے کافر بالطاغوت مراد تھا۔ چنانچہ یہ اطلاق قرآن شریف میں بھی وارد ہے: "وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ" اور یہ معنی اچھے ہیں مگر گول مول لفظ تھا اس لیے وہ بیچارے پریشان ہو گئے اور ایسی باتیں اس لیے فرمادیا کرتے ہیں کہ اس سے طالب کا امتحان ہوتا ہے کہ دیکھیں اب بھی کام میں لگا رہتا ہے یا چھوڑ کر الگ ہو جاتا ہے مگر یہ امتحان اپنے دیکھنے کے لیے نہیں ان کو تو سب کچھ معلوم ہے بلکہ دکھلاتے ہیں کن کو ان کو جنہوں نے انسان کے متعلق کہا تھا: "اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ" کہ آپ زمین میں ایسے لوگوں کو خلیفہ بناتے ہیں جو اس میں فساد اور خونریزی کریں گے۔ ان کو دکھلاتے ہیں کہ دیکھ لو یہ مفسد کس شان کے ہیں یہ ہمارے کیسے طالب ہیں اور اسی لیے تبدیل ملائکہ کا وقت نماز کا وقت رکھا گیا۔ حدیث میں آتا کہ ملائکہ کی تبدیلی صبح اور عصر کی نماز کے وقت ہوتی ہے تاکہ ہر دن جا کر عرض کریں "ربنا اتیناھم وھم یصلون وفارتناھم وھم یصلون" یعنی اے پروردگار ہم نے جا کر بھی تیرے بندوں کو نماز میں مشغول پایا اور آتے ہوئے بھی نماز میں چھوڑا وہ بیچارے گواہی دیتے دیتے تھک بھی گئے ہوں گے مگر پیچھا نہیں چھوڑا گیا' روزانہ ان سے سوال ہوتا ہے کہ ہمارے بندوں کو کس حال میں چھوڑا پھر عید اور عرفات کے موقع پر حق تعالیٰ مسلمانوں کے اجتماعی عبادت پر فرشتوں کے سامنے مباہات فرماتے ہیں کہ دیکھو میرے بندے جوق جوق کیسے چلے آتے ہیں اور جب مجالس وعظ میں جمع ہوتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ دیکھو یہ مجھے کیسا پکار رہے ہیں یہ کیا چاہتے ہیں فرشتے عرض کرتے ہیں کہ یہ آپ کی رضا و مغفرت اور جنت کو طلب کرتے ہیں اور آپ کے غصہ و غضب

---

[1] (مجمع الزوائد ۹: ۱۷' المعجم الکبیر للطبرانی ۱۲: ۳۹۱)

اور جہنم سے پناہ مانگتے ہیں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں گواہ رہو میں نے ان سب کو بخشا اور جو یہ مانگتے ہیں میں نے عطا کیا۔ اللہ ہماری ذراسی بات کی وہاں کیسی قدر ہوتی ہے اور فرشتوں کے سامنے کس طرح اس کو پیش کیا جاتا ہے تاکہ ہر دن ان کو اپنے اس قول کا جواب ملتا رہے۔ ''اَتَجۡعَلُ فِیۡهَا مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡهَا'' (کیا آپ پیدا کریں گے زمین میں ایسے لوگوں کو جو فساد کریں گے) الغرض کبھی کیفیات میں اس لیے کمی کر دی جاتی ہے تاکہ طالب کا امتحان ہو اور اس امتحان سے اس کے اندر پستی پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ اس کو مشاہدہ ہو جاتا ہے کہ میرے اختیار میں کوئی چیز نہیں سب کچھ حق تعالیٰ کے اختیار میں ہے اور پستی وہ چیز ہے جس سے معیت الٰہی بہت جلد حاصل ہوتی ہے۔

کیفیات کے مزے میں پڑنے کی نشانی

حدیث قدسی میں ارشاد ہے: ''انا عند المنکسرة قلوبھم''[1] میں ان لوگوں کے پاس ہوں جن کے دل ٹوٹے ہوئے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح کیفیات کا ہونا نعمت ہے اسی طرح کسی وقت ان کا بند ہو جانا بھی رحمت ہے کیونکہ سلب کیفیات سے شکستگی قلب حاصل ہوتی ہے اور یہ شکستگی ترقی کا سبب ہے پس سالک کو کیفیات کے ہونے یا نہ ہونے کی پرواہ نہ کرنا چاہیے جو شخص کیفیات ہی کے مزے میں پڑ جاتا ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص سفر کر رہا ہو اور کسی خاص منزل پر پہنچنا چاہتا ہو راستہ میں گرمی دوپہر کے وقت اسے ایک دریا ملا یہ اس میں گھسا تو وہاں ٹھنڈک پہنچی اب یہ اس میں سے نکلنا نہیں چاہتا' ٹھنڈک کی وجہ سے اسی میں رہنا چاہتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں راستہ طے نہیں ہو سکتا اور نہ یہ شخص منزل پر پہنچ سکتا ہے اس کے ساتھ ایک رفیق بھی تھا وہ دریا سے پار ہو گیا اور اس کو پکار رہا ہے کہ جلدی آ یہ کہتا ہے کہ میں تو دریا ہی میں رہوں گا اس نے آ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر نکال دیا اب خشکی میں آ کر اسے پھر پیاس اور گرمی معلوم ہوئی تو دریا کو یاد کر کے روتا ہے کہ ہائے میں وہاں سے کیوں نکال دیا گیا۔ رفیق کہتا ہے کہ کمبخت تو دریا میں سے نکل کر مقصود کے قریب ہو گیا اگر وہیں رہتا تو منزل پر کبھی نہ پہنچتا۔ اسی طرح سالک کے لیے گاہے گاہے کیفیات کا پیش آنا اس لیے ہے تاکہ کسی قدر کلفت سفر کم ہو جائے اور شدت کے بعد راحت مل جائے تاکہ آئندہ کے لیے ہمت تازہ ہو جائے لیکن اگر وہ اسی راحت میں رہنا چاہے تو یقیناً راستہ ہی میں رہ جائے گا اور مقصود تک نہ پہنچے گا تو تم کو کیفیات دے کر پھر سلب اس واسطے کر لیں تاکہ تم کو آگے بڑھا دیں نہ اس لیے کہ نیچے گرا دیں مگر تم رو

[1] (اتحاف السادة المتقین ٦: ٢٩٠)

رہے ہو کہ ہائے میری کیفیات کیا ہوئیں میں تو انہیں میں رہتا اس شخص کا وہ حال ہے جیسے کسی نے گدھے کو دیا تھا نمک' اس نے کہا میری آنکھیں ہی پھوڑ دیں' حق تعالیٰ تو تم کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں مگر تم کیفیات میں پڑ کر راستہ ہی میں رہنا چاہتے ہو۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو کہ مجتہد فن اور مجدد وقت تھے' فرمایا کرتے تھے کہ یہ انوار و کیفیات حجاب نورانی ہیں اور حجاب نورانی حجاب ظلمانی سے اشد ہے۔ سالک کو یہ سب حجابات پس پشت ڈالنا چاہیں ان کی طرف ہرگز التفات نہ کرے کیونکہ جس شخص کو بادشاہ سے ملنا ہے وہ نہ بھنگیوں کے مکان پر ٹھہرتا ہے نہ عطاروں کی دُکان پر ٹھہرتا ہے بلکہ سیدھا تخت شاہی پر پہنچنا چاہتا ہے تو حجاب ظلمانی تو بھنگیوں کے مکانات ہیں اور حجاب نورانی عطاروں کی دوکانات ہیں۔ سالک کو کسی پر توقف نہ کرنا چاہیے اس کو آگے چلتا رہنا چاہیے۔ مقصود وراء الوراء ہے۔

اے برادر بے نہایت درگہیست   انچہ بروے میرسی بروے مایست

(اے بھائی اللہ تعالیٰ کا راستہ غیر متناہی ہے پس اس راستے میں جس مقام پر پہنچ جاؤ اس پر ٹھہرنا مت' آگے بڑھ جانا تا کہ ترقی جاری رہے)

سوز و درد بھی قاصد ہے

اس بلا میں ہر زمانہ میں لوگ مبتلا ہوئے ہیں کہ کیفیات کو مقصود سمجھ کر عمل کو ان کے تابع کرتے تھے کہ ذرا کیفیات میں کمی آئی' عمل کو ترک کر دیا' مثنوی میں بھی مولانا نے ایک شخص کا قصہ لکھا ہے کہ وہ ذاکر شاغل تھا مگر اسے کچھ کیفیات وغیرہ حاصل نہ تھیں۔ شیطان نے اسے بہکایا کہ اندھیری کوٹھری میں ٹکریں مارتا ہے ادھر سے نہ کچھ پیام نہ سلام نہ کیفیات نہ واردات یہ عقلمند تہجد اور ذکر وغیرہ سب چھوڑ چھاڑ کر بیٹھ گیا کہ واقعی اتنے دن کام کرتے ہو گئے ادھر سے کچھ جواب ہی نہیں' رسید ہی نہیں ملتی' یہ شخص مراد کا مقام رکھتا تھا' اس لیے حق تعالیٰ کی طرف سے اس کو تنبیہ کی گئی۔ مرید اور مراد میں فرق یہ ہے کہ مرید ابھی تک عاشق ہی ہے محبوب نہیں بنا اور مراد عاشق بھی ہے محبوب بھی۔ مرید اعراض کرے تو یہ کہہ کر دھکے دیدیئے جاتے ہیں:

ہر کہ خواہد گو بیاؤ ہر کہ خواہد گو برو   دار و گیر حاجب و دربا دریں درگاہ نیست

(جو شخص آنا چاہے تو کہہ دو آ جائے اور جو جانا چاہے تو کہہ دو وہ چلا جائے)

اور مراد اعراض کرے تو اس کو پکڑ کر بلواتے ہیں کیونکہ وہ محبوب بھی ہے جیسے خوبصورت مرغ وحشی کہ وہ بھاگتا ہے مگر دانہ دکھلا کر اس کو جذب کرتے ہیں ایسے ہی محبوب کا قول ہے:

مرغ باغ ملکوتیم دریں دیر خراب   میشود نور تجلائے خدا دانہ ما

(میں باغ ملکوت کی چڑیا ہوں اس دنیا میں ہمارا دانہ اللہ تعالیٰ کی تجلیات کے انوار ہیں)

توجب یہ شخص سب کام چھوڑ کر سورہا تو حق تعالیٰ کی طرف سے حضرت خضر علیہ السلام کو یا کسی فرشتہ کو حکم ہوا کہ اس احمق کو سمجھاؤ کہ وہ نماز وذکر وغیرہ کو چھوڑ کر کیوں بیٹھ رہا وہ خواب میں آئے اور پوچھا کہ بھائی تو آج کیوں سورہا اس نے وہی شکایت کی کہ اتنے دن کام کرتے کرتے ہوگئے وہاں سے کوئی رسید ہی نہیں ملتی۔ نہ سوال ہے نہ جواب اس لیے میں نے سب چھوڑ دیا۔ جواب ارشاد ہوا:

گفت آں اللہ تو لبیک ماست   ویں نیاز وسوز ودردت پیک ماست

(فرمایا کہ اے بندہ تیرا اللہ کہنا ہمارا لبیک ہے اگر تیرا پہلا اللہ قبول نہ ہوتا تو دوسری بار توفیق دوسرے اللہ کی نہ ہوتی یہ نیازمندی اور سوز وگداز کی توفیق ہماری طرف سے قاصد ہیں)

یہ تیرا اللہ اللہ کرنا ہی ہمارا جواب ہے اگر ہم کو تیرا ذکر پسند نہ ہوتا تو ہم تیری زبان سے اپنا نام نکلنے نہ دیتے بلکہ زبان پکڑ لیتے جس سے ایک دفعہ بھی اللہ نہ نکل سکتا بس ایک بار اللہ کہہ کر جب دوبارہ اس کے نام کی توفیق ہوئی تو سمجھ لو کہ پہلا قبول ہوگیا اور یہی دوسرا ہماری طرف سے جواب ہے علیٰ ہذا تمہارے دل میں جو سوز ودرد ہے یہ ہماری طرف سے قاصد ہے اگر ہم کو تعلق نہ ہوتا تو اپنا قاصد تیرے پاس نہ بھیجتے کیونکہ ہمارا قاصد ہر شخص کے پاس نہیں جایا کرتا بلکہ جہاں ہم بھیجنا چاہتے وہیں جاتا ہے اور یہ کیا ضرور ہے کہ قاصد عربی ہی بولتا آوے یہ سوز ودرد بھی قاصد ہے یہ وہ سکینہ ہے جس کے متعلق ارشاد ہے: "هُوَ الَّذِیٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ" (وہی (باری تعالیٰ) جس نے مؤمنین کے قلوب میں سکینہ نازل فرمائی) اور ذکر کے وقت یہ سکینہ ضرور نازل ہوتا ہے۔ یقیناً ذکر سے پہلے قلب کی جو حالت تھی ذکر کرنے کے بعد وہ حالت نہ ہوگی بلکہ کچھ اور حالت ہوگی یہ اسی سکینہ کا اثر ہے جس سے ذکر کے بعد دل میں کبھی ایک ٹھنڈک سی معلوم ہوتی ہے کبھی درد وسوزش محسوس ہوتی ہے یہ سب خدائی قاصد ہیں ان کو بیکار نہ سمجھو۔ اسی کو فرماتے ہیں:

گفت آں اللہ تو لبیک ماست   ویں نیاز وسوز ودردت پیک ماست

(فرمایا کہ اے بندہ تیرا اللہ کہنا ہمارا لبیک ہے اگر تیرا پہلا اللہ قبول نہ ہوتا تو دوسری بار توفیق دوسرے اللہ کی نہ ہوتی یہ نیازمندی اور سوز وگداز کی توفیق ہماری طرف سے قاصد ہیں)

عبادات کے مقبول ہونے کی علامت

اس مضمون کو ہمارے حضرت حاجی صاحب نے ایک بار اس طرح بیان فرمایا کہ اگر ایک آدمی تمہارے گھر پر روزانہ آتا ہو اور تم کو اس کے روک دینے کی قدرت ہو تو اگر تم کو اس کا آنا ناگوار ہوگا تو تم اس کو صاف صاف روک دو گے کہ آپ یہاں نہ آیا کریں مجھے تکلیف ہوتی ہے اور اگر باوجود قدرت کے تم اس کو نہ روکو تو یہ اس کی علامت ہے کہ اس کا آنا تم کو ناگوار نہیں بلکہ تم اس کا آنا چاہتے ہو اسی طرح اگر حق تعالیٰ کو تمہارے مسجد میں آنا اور نماز پڑھنا پسند نہ ہوتا وہ تم کو خود روک دیتے مگر جب پانچ وقت مسجد میں آنے کی اور نماز میں اپنے سے بات چیت کرنے کی تم کو توفیق دے رکھی ہے تو سمجھ لو کہ تمہارا آنا ان کو ناگوار نہیں ہے اور تمہاری عبادات خدا کے یہاں مقبول ہیں' رہا یہ کہ حق تعالیٰ اگر روکنا چاہیں تو کس طرح روکیں گے کیا وہاں سے کوئی سپاہی آئے گا ہاں وہ اس طرح روک دیں گے کہ تم کو نماز کی توفیق ہی نہ ہوگی' وہ سپاہی یہی ہے جیسے ایک آقا اور غلام کا قصہ ہے کہ غلام آقا کے ساتھ بازار میں گیا راستہ میں نماز کا وقت آ گیا' غلام نمازی تھا وہ آقا سے اجازت لے کر مسجد میں نماز کے لیے گیا اور آقا صاحب مسجد کے باہر بیٹھ گئے' اب تمام نمازی نماز پڑھ کر مسجد سے جا رہے ہیں مگر غلام باہر ہی نہیں آتا' اس نے اطمینان سے فرض پڑھے' پھر نفلیں شروع کر دیں پھر وظیفہ میں لگ گیا جب بہت دیر ہوگئی تو آقا نے آواز دی کہ میاں اتنی دیر کہاں لگا دی' باہر کیوں نہیں آتے' غلام نے کہا کہ آنے نہیں دیتے کہا کون نہیں آنے دیتے' کہا جو تم کو اندر نہیں آنے دیتا وہ مجھ کو باہر نہیں آنے دیتا۔ واقعی جب ان کو کسی کا مسجد میں آنا ناگوار ہوتا ہے تو اس کو مسجد میں قدم رکھنے کی بھی توفیق نہیں ہوتی' بہت لوگ برسوں مسجد کے دروازے پر کباب بنا کر بیچتے ہیں مگر ایک دن بھی مسجد کے اندر جانے کی توفیق نہیں ہوتی یہ ہے ان کا روکنا وہ اس طرح روکا کرتے ہیں پس جن کو پانچوں وقت نماز کی توفیق ہو رہی ہے وہ امید رکھیں کہ انشاء اللہ تعالیٰ ان کی عبادات مقبول ہو رہی ہیں۔ گو ہماری عبادات اس قابل تو نہیں ہیں مگر محض رحمت سے قبول ہو جاتی ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں:

ایں قبول ذکر تو از رحمت است　　　چوں نماز مستحاضہ رخصت است

(تمہارے ذکر کا قبول ہونا محض اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہے جس طرح استحاضہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی اجازت ہے اور شریعت کے احکام نے اس کو پاک قرار دیا ہے)

کیا غضب کی مثال ہے کہ جس طرح مستحاضہ عورت حقیقت میں ناپاک ہے مگر شریعت اسی حالت میں اس کو نماز کی اجازت دیتی ہے اور احکام میں اس کو پاک شمار کر لیتی ہے اسی طرح ہماری

عبادات گوحقیقت میں ناقص ہیں مگرحق تعالیٰ اپنی رحمت سے ان کو قابل بنا کر قبول فرما لیتے ہیں اگر قبول نہ فرماتے تو اس کی توفیق ہی نہ دیتے' ہمارے حضرت حاجی صاحب کے پاس ایک ذاکر شخص آئے اور آ کر عرض کیا کہ حضرت میں نے طائف میں چلہ کیا تھا' روزانہ سوالاکھ مرتبہ ذکر کرتا تھا مگر نفع نہیں ہوا شاید حضرت مجھ سے کچھ ناراض تھے جو نفع نہ ہوا۔ حضرت کو جوش آیا اور فرمایا کہ میاں اگر ہم ناراض ہوتے تو سوالاکھ مرتبہ ذکر کی توفیق ہی نہ ہوتی اور تم جو نفع کی شکایت کرتے ہو تو کیا یہ نفع نہیں ہے کہ زبان سے سوالاکھ دفعہ اللہ اللہ نکلتا تھا۔

اہل اللہ کے خذلان سے توفیق سلب ہو جاتی ہے

صاحبو! جب اہل اللہ کے خذلان سے توفیق سلب ہو جاتی ہے تو خدا تعالیٰ کے خذلان کے بعد تو ہم کیا کر سکتے ہیں' کچھ بھی نہیں حضرت نے سچ فرمایا کہ اگر حق تعالیٰ نہ چاہیں تو ایک مرتبہ بھی زبان سے اللہ نکل سکتا' مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ ایک مقام پر دعا کے بارے میں فرماتے ہیں:

ہم دعا از تو اجابت ہم زتو　　ایمنی از تو مہابت ہم زتو

(دعا کی توفیق بھی اے خدا آپ ہی کی طرف سے ہے اور قبولیت بھی آپ ہی کی طرف سے ہے امن اور سکون کا احساس بھی آپ کی طرف سے ہے اور خوف و ہیبت بھی آپ کی طرف سے ہے)

واقعی دعا کی توفیق بھی حق تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے اگر وہ توفیق نہ دیں تو ہماری زبان سے دعا بھی نہیں نکل سکتی یہ ساری گفتگو اس ذاکر کے قصہ پر چل پڑی تھی کہ اس کو شیطان نے بہکایا تھا کہ جب نہ کیفیات ہیں نہ واردات ہیں نہ خطاب ہے نہ جواب ہے تو اندھیری کوٹھری میں ٹکریں مارنے سے کیا فائدہ اور اس نے اس وسوسہ کی وجہ سے تہجد و ذکر چھوڑ دیا تھا' یہ قصہ اس پر نقل کیا تھا کہ کیفیات کو مقصود سمجھنے کی غلطی میں ہر زمانہ میں لوگ مبتلا ہوئے ہیں ایک مفسدہ کیفیات کے مقصود سمجھنے میں پہلے کا عکس ہے یعنی بعض لوگ کیفیات کے حصول کے بعد عمل کو چھوڑ دیتے ہیں جب تک کیفیت حاصل ہے اس وقت تک عمل کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ یہ مطلب نہیں کہ فرائض کو بھی چھوڑ دیتے ہیں یہ تو ملحدین کرتے ہیں ان سے اس وقت بحث نہیں جو لوگ اہل حق ہیں وہ فرائض تو ترک نہیں کرتے مگر حصول کیفیات کے بعد ذکر و نوافل و تلاوت قرآن وغیرہ کو چھوڑ بیٹھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مقصود تو حاصل ہی ہے پھر اتنی مشقت کی کیا ضرورت ہے کہ چھ ہزار دفعہ ذکر اسم ذات کریں یا تہجد کے لیے اٹھیں اب تو ملکہ یادداشت حاصل ہو گیا ہے اب تو ہمارا سونا بھی ذکر ہے سو جب تک کیفیت ہے اس وقت تک عمل ہی نہیں کرتے اور جب کیفیت

نہ رہی اب پھر ذکر و شغل اور تہجد وغیرہ شروع کر دیتے ہیں غرض ان لوگوں کے دل میں عجیب عجیب موجیں اٹھتی ہیں کوئی تو کیفیت کے نہ ہونے سے عمل میں کمی کرتا ہے اور کوئی اس کے ہونے سے عمل میں کوتاہی کرتا ہے اور نہ ہو تو پھر کوشش کرتا ہے یہ شخص بھی کیفیت ہی کو مقصود سمجھتا ہے چونکہ وہ عمل ہی سے پیدا ہوئی تھی اس لیے سلب کیفیت یا قلب کیفیت کے وقت عمل کا اہتمام کرتا ہے یہ بھی غلطی پر ہے، بس راستہ پر وہ شخص ہے جو عمل ہی کو مقصود سمجھتا ہے اور کیفیت ہو یا نہ ہو ہر حال میں عمل پر دوام رکھتا ہے۔ یہ مسئلہ میں نے اس لیے بھی ظاہر کیا ہے تاکہ مزدوری پیشہ اور کھیتی کرنے والے یہ نہ سمجھیں کہ ہم بھلا کیا ذکر کریں ہمیں یہ حالات کیا پیش آئیں گے سو خوب سمجھ لو کہ واللہ مقصود تم کو بھی حاصل ہو سکتا ہے کیونکہ مقصود سب طرق سے خلوص ہے جو بدون ان کیفیات وحالات کے بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مقصود ان گردن جھکانے والے صوفیوں کو یکسوئی کے سبب سہولت کے ساتھ حاصل ہو جاتا ہے اور تم کو ذرا دقت سے اور دیر میں حاصل ہوگا اور سہولت کا وعدہ کیسے کر لوں اتنا تو میں نے تم سے اناج بھی وصول نہیں کیا جو تمہاری خاطر صحیح بات کو غلط کر دوں اور یہ کہہ دوں کہ تم کو بھی اسی سہولت سے مقصود حاصل ہو جائے گا جس صورت سے خانقاہ میں پڑ مرنے والوں کو حاصل ہوتا ہے نہ بھائی ان کی برابر تو سہولت نہ ہو گی مگر ایسی دقت بھی نہ ہو گی جس کو تم برداشت نہ کر سکو، بس اتنا ہی فرق ہوگا کہ اگر ان کو سال بھر میں مقصود حاصل ہو جاتا ہے تو تم کو دو سال تین سال میں حاصل ہوگا اور ان کو دو سال میں ہوگا تو تم کو چار سال میں ہوگا۔ اور یہ بات ہے کہ ہر شخص اپنے بچھڑے کے دانت خوب جانتا ہے اسی طرح حق تعالیٰ اپنے بندوں کو خوب جانتے ہیں انہوں نے ہر شخص کے مناسب اس کے اندر استعداد رکھی ہے چنانچہ اسی بناء پر خدا تعالیٰ نے تم کو ظاہری رزق بھی مشقت سے دیا ہے کہ جو ہل جوتتے ہو کھیت میں پانی دیتے ہو زمین کو درست کرتے ہو گرمی اور بارش کی تکلیف اٹھاتے ہو تب روٹی ملتی ہے۔ اسی طرح باطنی رزق بھی تم کو مشقت سے ملے گا یہاں بھی تم کو خانقاہ والوں سے زیادہ محنت کرنی پڑے گی، جب مقصود حاصل ہوگا تمہارے لئے اسی میں مصلحت ہے۔ حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب رحمہ اللہ نے تفسیر مظہری میں ایک حدیث قدسی نقل کی ہے جس کی تخریج مجھ کو یاد نہیں رہی اور وہ تو اگر تخریج بھی نہ کرتے تب بھی وہ بیہقی وقت ہیں۔ حدیث پر ان کی بہت نظر ہے بدون ثبوت کے حدیث نہیں لکھتے اس لیے ہمیں ان کی محض نقل پر بھی اعتماد ہوتا ہے۔ حدیث کا مضمون یہ ہے کہ میرے بعضے بندے بیماری میں مومن رہتے ہیں اگر میں ان کو تندرست کر دوں بغوا فی الارض تو وہ زمین میں فساد برپا کر دیں، میرے بعضے بندے تکلیف و مشقت میں مومن

رہتے ہیں اگر میں ان کو راحت دیدوں تو وہ کافر ہو جائیں' میرے بعض بندے راحت ہی میں مومن رہتے ہیں اگر میں تکلیف میں رکھوں گا تو کافر ہو جائیں تو گاؤں والوں کے لیے خدائے تعالیٰ نے مشقت ہی کی استعداد رکھی ہے کہ ان کو رزق ظاہر ورزق باطن دونوں مشقت سے ملتے ہیں باقی یہ سب استعدادیں انہیں کی پیدا کی ہوئی ہیں کسی کو ان کی لم دریافت کرنے کا حق نہیں کہ فلاں میں یہ استعداد کیوں رکھی فلاں میں کیوں نہیں رکھی۔

بلبل چہ گفت وگل چہ شنید وصبا چہ کرد　　اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں

(یہ کس کا دماغ ہے کہ باغبان سے پوچھے کہ بلبل نے کیا کہا اور گل نے کیا سنا اور صبا نے کیا کام کیا)

اس میں حق تعالیٰ کی حکمتیں ہیں کہ ہر شخص میں مختلف استعداد رکھی ہے یہ مسئلہ قدر کے متعلق ہے اور عارفین نے فرمایا ہے کہ دو چیزیں ایسی ہیں جن کی حقیقت جنت میں بھی منکشف نہ ہوگی ایک مسئلہ قدر دوسرے کنہ ذات اور اصل میں مسئلہ قدر کا انکشاف بھی وہاں نہ ہوگا اور یہ مسئلہ عدم ادراک کنہ ذات حدیث میں بھی مذکور ہے مگر ملاحسن کی اصطلاحات میں مذکور نہیں اسی لیے طلبہ کی نظر وہاں تک نہیں پہنچتی کیونکہ یہ تو ہر بات کو اصطلاحات معقول میں سمجھنا چاہتے ہیں مگر حدیث کی اصطلاحات ملاحسن کی اصطلاحات سے جدا ہیں۔ سنئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تجلی جنت کے باب میں فرماتے ہیں "لا یبقی علی وجهه الا رداء الکبریاء" اس کا بھی وہی مطلب ہے کہ بجز کنہ ذات مخفی ہونے کے وہاں اور کوئی حجاب نہ رہے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کنہ ذات کو کبریا سے تعبیر فرمایا کہ کیونکہ کبریاء وعظمت اس کے لیے لازم ذات ہے اور کنہ ذات کا مخفی رہنا یہ اعلیٰ درجہ کی عظمت ہے تو یہ لازم اس سے منفک نہ ہوگا اس لیے وہاں دیدار تو ہوگا اور حق تعالیٰ بے پردہ اس طرح ظاہر ہوں گے جیسے چاند کھلا ہوا ہو مگر ایک پردہ جلال وکبریا کا باقی رہ جائے گا جس کی وجہ سے ہم احاطہ حسن الٰہی کا نہ کر سکیں گے کیونکہ وہ غیر محدود ہے اور ہم محدود ہیں اور محدود غیر محدود کا احاطہ نہیں کر سکتا اس لیے یہ حجاب باقی رہے گا اور یہ راز تو تحقیقی ہے اور ایک راز عاشقانہ ہے وہ یہ کہ اگر کوئی حجاب باقی نہ رہتا اور خدا کا حسن بھی محبوبان دنیا کے حسن کی طرح محدود ہوتا تو چند روز میں جی بھر جاتا جیسا کہ محبوبان دنیا سے جی بھر جاتا ہے کیونکہ ان کا حسن محدود ہوتا ہے اور ہمارا تمتع بھی محدود ہوتا ہے۔ اگر خدا کا حسن بھی ایسا ہی ہوتا ہے اور غیر محدود نہ ہوتا تو کچھ مدت کے بعد لوگ جنت سے گھبرا کر وہاں سے نکلنے کی تمنا کرتے جیسے ایک اندھے حافظ جی کا قصہ ہے کہ ان کو حوروں کی بہت تمنا تھی' روز دعا کرتے تھے کہ اے اللہ حور کو بھیج دے' پڑوس میں چند فاحشہ عورتیں رہتی تھیں انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اندھا روز حور کی دعا کرتا ہے لاؤ آج اس سے مذاق کریں اور

حوروں کا مزہ چکھائیں، ہم میں سے ایک ایک اس کے پاس جائے کہ حافظ جی میں حور ہوں، مجھے خدا نے بھیجا ہے، چنانچہ پہلے ایک آئی اور کہا حافظ جی میں حور ہوں مجھے خدا نے بھیجا ہے، آپ کی دعا قبول ہوگئی، حافظ جی بڑے خوش ہوئے اور اس سے منہ کالا کیا، وہ نکلی تو دوسری پہنچی خیر حافظ جی اس سے بھی مشغول ہوئے، پھر تیسری پہنچی پھر بھی کچھ ہمت کی، اب چوتھی پہنچی پھر پانچویں پہنچی تو حافظ جی حوروں کو گالی دے کر گھبرا کر کہتے ہیں کہ کیا ساری حوریں میرے ہی حصہ میں آ گئیں، جاؤ اب کسی اور کے پاس جاؤ مجھے حور نہیں چاہیے، میں حوروں سے باز آیا، حافظ جی کی اس بات پر کہ مجھے حور نہیں چاہیے ایک اور حکایت یاد آئی۔

استعداد کا اختلاف مسئلہ قدر کی طرف راجع ہے

ایک شخص کی عادت تھی کہ وہ جنگل میں ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر روز دعا کرتا تھا کہ اے اللہ مجھے کھینچ، ایک مسخرے نے سن لیا اس نے اس کی اصلاح کرنی چاہی، ایک دن درخت کے اوپر ایک مضبوط رسی لے کر بیٹھ گیا، جب اس شخص نے دعا کی کہ اے اللہ مجھے کھینچ تو اس نے رسی میں پھندا بنا کر لٹکا دیا اور آواز بنا کر کہا کہ میرے بندے یہ رسی گلے میں ڈال لے میں کھینچ لوں گا، یہ بڑا خوش ہوا کہ میری دعا قبول ہوگئی، اس نے رسی کا پھندا گلے میں ڈال لیا اور مسخرے نے کھینچنا شروع کیا اب جو گلا گھٹا اور سانس رکا تو وہ کہتا ہے کہ اے اللہ مجھے چھوڑ میں نہیں کھنچتا پھر اس درخت کے پاس بھی نہیں پھٹکا۔ غرض اگر حق تعالیٰ کے حسن کا نعوذ باللہ احاطہ ہوجاتا اور کوئی حجاب باقی نہ رہتا تو جنت وبال جان ہوجاتی مگر چونکہ ان کا حسن غیر محدود ہے اس لیے کبھی جی نہ بھرے گا بس وہ حال ہوگا:

یزیدک وجھہ حسنا اذا مازدتہ نظرا

(جتنی دفعہ تو اس محبوب کو دیکھے گا اس کا حسن تجھ کو زیادہ ہی معلوم ہوگا)

جتنی دفعہ دیدار ہوگا نیا ہی حسن معلوم ہوگا تو جیسی کنہ ذات جنت میں مکشوف نہ ہوگی آج مسئلہ قدر بھی اور استعداد کا اختلاف مسئلہ قدر کی طرف راجع ہے جب اس کی حقیقت آخرت میں بھی منکشف نہ ہوگی تو دنیا میں کیا امید ہے ہاں بعضوں کو کچھ کچھ اسرار ذوقی طور پر بتلا دیئے گئے ہیں مگر وہ ان کو ظاہر نہیں کر سکتے اگر تقدیر کے اسرار ظاہر ہوجائیں تو بد نفس لوگ اپنے کو معذور قرار دے کر شورش برپا کردیں اور تمام عالم درہم برہم ہوجائے۔ اسی مثال کو مولانا فرماتے ہیں:

سر پنہان است اندر زیر و بم فاش اگر گویم جہاں برہم زنم

(زیر و بم کے اندر اسرار پوشیدہ ہیں اگر فاش کردوں تو جہاں کو درہم برہم کردوں)

شاید اس پر کوئی کہتا ناتمام ہی کہہ دو صاف صاف نہ کہو تو جواب دیتے ہیں:

بالب دمساز خود گر جفتمے ہمچو نے من گفتنیہا گفتمے

(ہاں اہل اور مناسب والا مل جاوے تو خود تقاضا ہوگا کہ اس سے راز دل کو کہا جائے)

یعنی ناتمام بھی ہر شخص سے نہیں کہہ سکتے بلکہ دمساز سے سے کہہ سکتے ہیں یعنی اہل سے کہ وہی ہمراز ہے نااہل سے تو ناتمام اسرار بھی بیان نہیں کر سکتے اور بعض دفعہ جو مخاطب کو اہل دیکھ کر بیان کا تقاضا بھی ہوا ہے تب بھی عذر فرمایا ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر فرمایا ہے:

لاتکلفنے فانی فی الفنا کلت افہامی فلا احصی ثنا

کل شیئ قالہ غیر المفیق ان تکلف اوتصلف لایلیق

(میں مقام فنا میں ہوں حق تعالیٰ کے غیر محدود صفات کا میرے افہام احاطہ نہیں کر سکتے۔ ایک بیہوش جو کچھ بھی کہے گا وہ نامناسب رہے گا اگر چہ بات صحیح ہو لیکن تکلف سے بات بے مزہ ہوتی ہے انشراح قلب نہ ہونے سے خاموشی مناسب ہے)

اللہ تعالیٰ کے اسرار

غرض یہ خدا تعالیٰ کے اسرار ہیں کہ کسی میں کیسی استعداد رکھ دی کسی میں کیسی اس لیے اس دال کا کسی کو حق نہیں کہ فلاں کو مقصود سہولت سے کیوں دیا اور ہم کو مشقت سے کیوں دیا وہ یہی چاہتے ہیں کہ ایک کو ہنسائیں ایک کو رلائیں کسی کا ہنستے کھیلتے گھر بس جاتا ہے کسی کو برسوں رونے سے بھی جلا حاصل نہیں ہوتا۔

بگوش گل چہ سخن گفتہ کے خندان ست بعندلیب چہ فرمودہ کہ نالان ست

(گل کے کان میں کیا کہہ دیا ہے کہ وہ ہنس رہا ہے (شگفتہ ہے) اور بلبل کے کان میں آپ نے کیا راز کہہ دیا کہ وہ ہر وقت نالاں ہے)

اور جب سر قدر کا احاطہ نہ ہو سکتا تھا اور حصول اس کی کنہ کا ممتنع تھا تو یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت ہے کہ آپ نے ہم کو سوال قدر سے منع ہی فرما دیا اور ارشاد فرمایا کہ جو شخص اس میں بحث کرے گا قیامت میں اس سے پوچھا جاوے گا اور اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس عمل کا ثواب ہوگا کیونکہ اس میں سب اعمال متساوی ہیں اس کی تخصیص کیا بلکہ محققین کے نزدیک مراد یہ ہے کہ جو شخص تقدیر میں گفتگو کرے گا اس سے قیامت میں یہ پوچھا جائے گا کہ بتلاؤ تقدیر کی حقیقت کیا تحقیق کی اور حقیقت میں معلوم ہوگی نہیں تو یہ شخص جواب سے عاجز ہو کر سزا میں گرفتار ہوگا اور جو اس میں گفتگو نہ کرے گا وہ بے کھٹکے ناجی رہے گا، نیز تقدیر کا مسئلہ گفتگو سے حل بھی نہیں ہو سکتا، اس میں اطمینان و

شرح صدر صرف نور باطن سے ہوتا ہے اور جن پر یہ راز خود بخود منکشف ہو گیا ہے کچھ نہ پوچھو ان پر کیا گزرتی ہے اس سے معرفت و معیت حق کا تو مزا ہوتا ہے کیونکہ اس سے معرفت بڑھتی ہے اور حق تعالیٰ کی معیت میں ترقی ہوتی ہے مگر ساتھ ہی بدمزگی بھی ایک خاص قسم کی ہوتی ہے کہ دوسرا شخص اس کا تحمل بھی نہیں کر سکتا وہ یہ کہ ہر وقت دل پر ایک حیرت سے غالب رہتی ہے کبھی جبر کی طرف چلتا ہے کبھی اختیار کی طرف پھر گو محقق نہ جبر پر جمتا ہے نہ اختیار پر بلکہ بین بین رہتا ہے لیکن دل تو حیرت میں ہوتا ہے کبھی ادھر جاتا ہے کبھی ادھر' مولانا عملاً اس معیت کو تو یوں فرماتے ہیں:

گر بعلم آئیم ما ایوان اوست　　　وز بجہل آئیم ماز ندان اوست

گر بخواب آئیم مستان ویلیم　　　ور بہ بیداری بدستان ویلیم

(اگر صفت علم کی تجلی ہوتی ہے تو ہم اس کے حضوری کے محل میں ہوتے ہیں اور جب وہ تجلی مستور ہو جاتی ہے تو ظلمت جہل کے سبب اگر نیند میں ہوتے ہیں تو غایت تعلق مع اللہ سے ہم انہیں کے مست ہوتے ہیں اور بیداری میں انہیں کے دست قدرت کے تحت رہتا ہوں)

اور کنیات متعارضہ میں معیت کی نسبت فرماتے ہیں:

در تردد ہر کہ او آشفتہ است　　　حق بگوش او معمہ گفتہ است

(جو شخص تردد سے پریشان ہے کہ یہ کروں یا وہ کروں تو اس کو مولانا فرماتے ہیں کہ یہ حق تعالیٰ نے اس کے کان میں معمہ کہہ دیا ہے کہ اس کو حل کرو)

اور عملاً معیت کو یوں فرماتے ہیں:

رشتہ درگرد نم افگندہ دوست　　　می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

(میرے دوست نے میری گردن میں ایک رسی ڈال رکھی ہے اور جدھر اسکا دل چاہتا ہے مجھے لے جاتا ہے)

اور حیرت کی نسبت یوں فرماتے ہیں:

گہ چنیں بنماید وگہ ضد ایں　　　جز کہ حیرانی نباشد کار دیں

(کبھی اسی طرح دکھاتا ہے کبھی اس کے خلاف دکھاتا ہے بس اس طرح مجھے محبت کے راستے میں محو حیرت رکھتے ہیں)

اہل اللہ نعیم دنیا بلا مشقت ملتی ہیں

غرض تقدیر کے باب میں نہ گفتگو کرنا چاہیے اور نہ اس کی لم دریافت کرنا چاہیے کہ ہر شخص میں استعداد مختلف کیوں رکھی ہے یہ حق تعالیٰ کے اسرار ہیں خدا نے استعداد و مقادیر مختلف بنا کر اپنے

بعض بندوں کو یہ دولت عطا کی ہے کہ جہاں انہوں نے نماز شروع کی اور خدا تعالیٰ کی طرف فوراً دل کا رخ ہو گیا، حضور میں غرق ہو گئے پھر اس کے ساتھ روٹی بھی بے مشقت دی ہے ان کا مرغ اور گھی اور حلوے بھی بے تکلف دے رکھے ہیں اور یہ باطنی مٹھائی بھی ہے بے تکلف دیدی اور تم کو دنیا کی نعمتیں بھی مشقت سے ملتی ہیں اور دین کی نعمت بھی مشقت سے ملے گی۔ چنانچہ بعضوں کی حالت یہ ہے کہ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو ان کا دل خدا کی طرف متوجہ نہیں ہوتا بلکہ اس ادھیڑ بن میں رہتا ہے کہ کل کو کہاں سے کھاؤں گا آج تو گھر میں آٹا بھی نہیں کل کو قرض خواہ تقاضا کرنے آئے گا اسے کہاں سے دوں گا، آج تو جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں یہاں تک کہ انہیں خرافات میں نماز ختم ہو جاتی ہے۔ شیخ سعدی ایسے ہی لوگوں کا حال بیان فرماتے ہیں کہ:

شب چو عقد نماز بربندم　　　چہ خورد بامداد فرزندم

(رات کو جب نماز کی نیت باندھتا ہوں تو فوراً یہ خیال ستاتا ہے کہ کل میرے بچے کیا کھائیں گے)

کہ رات کو جب یہ لوگ نماز کی نیت باندھتے ہیں تو یہ سوچتے ہیں کہ کل کو بچے کیا کھاویں گے۔ ایک اہل زبان نے اس شعر کی عجیب تفسیر کی

''شب چو عقید نماز بربندم چناں در فکر عیال مستغرق باشم کہ بجائے تکبیر تحریمہ میگویم چہ خورد بلداد فرزندم''

واقعی اہل زبان اپنی زبان کو خوب سمجھتے ہیں ہمارا ذہن تو اس طرف نہ جاتا مگر وہ صاحب زبان تھا خوب سمجھا اس پر ایک حکایت یاد آئی۔

اہل زبان کی برابری کا دعویٰ غلط ہے

دہلی سے ایک ہندوستانی ایران گیا اور وہاں برسوں رہ کر فارسی سیکھی، پھر ہندوستان واپس آ کر دعویٰ کیا کہ مجھے اہل زبان کی برابر فارسی آتی ہے۔ ایک ایرانی کو سن کر جوش آیا کہ ہندوستانی آدمی اہل فارس کی برابری کا دعویٰ کرتا ہے جھوٹا ہے میں اس کا امتحان کروں گا۔ چنانچہ امتحان کے لیے آیا اور کہا کوئی شعر بالبدیہہ فارسی کا سناؤ، اس نے اسی وقت ایک شعر لطیف پڑھا:

سیہ چوری بدست آں نگارے نازنیں دیدم　　　بشاخ صندلیں پیچیدہ مارے آتشیں دیدم

(سیاہ چوڑی اس معشوق کی کلائی میں ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے صندل کی کسی شاخ میں سانپ لپٹا ہوا ہو)

بظاہر شعر نہایت نفیس مگر ایرانی نے یہ سنتے ہی کا تف تف یہ نازنیں دیدم آتشیں دیدم کیا بلا ہے بس اتنا کافی ہے:

سیہ چوری بدست آن نگارے بشاخ صندلیں پیچیدہ مارے

(سیاہ چوڑی اس معشوق کے ہاتھ میں اس طرح معلوم ہوئی ایسے شاخ صندلیں پر سانپ لپٹا ہوا ہو)

ارے اس تشبیہ کا مدار تیرے دیکھنے پر تھوڑا ہی موقوف ہے جو تو نے دیدم دیدم دونوں جگہ بڑھایا ہے۔ واقعی اس اصلاح سے یہ شعر کہیں سے کہیں پہنچ گیا اور معلوم ہوگیا کہ غیر اہل زبان چاہے کتنا ہی ماہر ہو جائے اہل زبان کی برابر نہیں ہوسکتا۔ دیوبند میں ایک ایرانی طالب علم گلستاں کے اس جملے پر وجد کرتا تھا۔

درعنفوان جوانی چنانہ افندانی نظر داشتم برروئے وگذرداشتم درکوئے اور کہتا تھا کہ یہ جملہ نہایت ہی بلیغ ہے۔ اس میں فصاحت و بلاغت کوٹ کوٹ کر بھری ہے مگر ہم لوگوں نے بارہا اس کو پڑھا پڑھایا ہے ایک دن بھی وجد نہ ہوا تو اپنی زبان کو زبان داں ہی سمجھ سکتا ہے جیسا کہ اس ایرانی نے اس شعر کا مطلب سمجھا۔

شب چو عقد نماز بر بندم چہ خورد با مداد فرزندم

(شب کو جب نماز کی نیت باندھی تو خیال آیا کہ کل بچے کیا کھائیں گے)

گاؤں والوں کو خلوص مشکل سے حاصل ہوتا ہے

یعنی تکبیر تحریمہ کے بجائے منہ سے یہ نکلتا ہے "چہ خورد بامداد فرزندم" (میرے بال بچے کیا کھائیں گے) اور پریشانی کے وقت نماز میں منہ سے ایسی بات کا نکل جانا مستبعد نہیں ہوسکتا کہ یہ لفظ ہی زبان پر جاری ہو جائے جیسے ہمارے ایک دوست حافظ اکبر کا قصہ ہے کہ وہ ایک امام کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے دو مقتدی اور تھے امام کو حدث ہوا تو اس نے ان کو سمجھ دار واقف مسائل خیال کر کے خلیفہ بنادیا' یہ مصلے پر جا پہنچے تو ان دو مقتدیوں میں سے ایک دوسرے سے کہتا ہے کہ ارے یہ کیا ہوا دوسرے نے کہا چپ رہ یوں بھی ہوا کرتا ہے دونوں مقتدیوں کی نماز تو فاسد ہوئی اب حافظ اکبر صاحب مصلے پر کھڑے فرماتے ہیں کہ میں کس کو نماز پڑھاؤں ان کی بھی گئی یہ سب سے بڑھ کر عقلمند نکلے کہ میں کسے نماز پڑھاؤں' بندہ خدا اپنے ہی کو پڑھائی ہوتی مگر اس وقت بے ساختہ ان کی زبان سے یہ جملہ نکل ہی گیا۔ اسی طرح بے ساختگی میں مفلس پریشان کی زبان سے بجائے اللہ اکبر کے "چہ خورد بامداد فرزندم" نکل سکتا ہے۔ الغرض اس میں بھی حکمت الٰہی ہے کہ بعضوں کو خلوص بسہولت حاصل

ہو جاتا ہے اور گاؤں والوں کو دقت سے حاصل ہوتا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ گاؤں والے خصوص کے مکلّف ہی نہ ہوں، مکلّف ضرور ہیں اس پر بظاہر ایک اشکال بھی ہوتا ہے وہ یہ کہ اگر گاؤں والوں کو ایسی حالت میں تو خلوص حاصل نہیں ہو سکتا پھر ان کو اس کا مکلّف کرنا تکلیف مالا یطاق ہے اور بہت لوگوں کا یہی خیال ہے کہ ان کو یہ دولت حاصل نہیں ہو سکتی ہے اسی واسطے بعض لوگ ان کو بہائم سمجھتے ہیں مگر یہ خیال غلط ہے گاؤں والوں کو مکلّف بہ تحصیل خلوص ہونا تکلیف مالا یطاق کو ہرگز مستلزم نہیں کیونکہ خلوص کی تحصیل ان کی قدرت میں داخل ہے خارج از طاقت نہیں اگر وہ ارادہ اور کوشش کریں تو مقصود میں کامیاب ہو سکتے ہیں اور اس کے لیے ان کو اپنی کھیتی کے کام بھی چھوڑنا نہ پڑیں گے بلکہ اپنے کام میں مشغول ہو کر بھی مقصود حاصل کر سکتے ہیں۔ چنانچہ کر کے دیکھ لیں ہوتا ہے یا نہیں اب شبہ یہ ہوتا ہے کہ پھر طریق بیکار رہے کیونکہ جب گاؤں والوں کو بھی مقصود حاصل ہو سکتا ہے گو اپنے کام ہی میں لگے رہیں اور باقاعدہ سلوک طے نہ کرے تو پھر طریق سلوک سے کیا نفع ہوا' جواب یہ ہے کہ نفس حصول خلوص تو طریق پر موقوف نہیں لیکن سہولت حصول خلوص ضرور طریق پر موقوف ہے جس شخص نے طریق کو حاصل نہیں کیا وہ بھی خلوص میں کامیاب ہو سکتا ہے مگر دقت اور دشواری سے اور جس نے طریق کو طے کر لیا ہے وہ نہایت سہولت سے اس میں کامیاب ہوتا ہے اور ان دونوں کی ایسی مثال ہے جیسے پکا حافظ اور کچا حافظ' تراویح میں قرآن دونوں سنا سکتے ہیں مگر دونوں میں جو فرق ہے ظاہر ہے پکا حافظ تو اللہ اکبر کہتے ہی بے تکلف رواں پڑھتا چلا جائے گا اسے کہیں متشابہ نہ لگے گا اور کچا حافظ بیسیوں جگہ اٹکے گا اور متشابہ کی وجہ سے کہیں سے کہیں پہنچ جائے گا پھر لوٹ کر اوپر سے پڑھے گا اور سوچ سوچ کر متشابہ کو نکالے گا۔ اسی طرح جو لوگ طریق کو حاصل کئے ہوئے ہیں ان کی تو یہ حالت ہے کہ جہاں انہوں نے نماز کی نیت کی اور فوراً ذکر میں غرق ہو گئے ان کے خیالات ادھر ادھر پریشان نہیں پھرتے کیوں انہوں نے مجاہدے کئے ہیں ریا و کبر وغیرہ کا علاج کیا ہے مشقتیں جھیلیں ہیں۔ اب ان کے دل میں غیر خدا کا خیال بھی نہیں آتا اور اگر آیا بھی تو ذرا سی توجہ سے دفع ہو گیا اور جن لوگوں نے طریق طے نہیں کیا اور یہ مشقتیں نہیں جھیلیں نہ مجاہدات و ریاضت کئے ہیں ان کے لیے یہ مشکل ہے کہ نیت باندھتے ہی دل کا رخ حق تعالیٰ کی طرف ہو جائے ان کو چاہیے کہ اپنی طرف سے کوشش کر کے نفس کو پنجرے میں بند کریں اور اپنے ارادہ سے کوئی خیال نہ لاویں اور نفس کو گھیر گھار کر مقید کریں جیسے مرغی کو گھیر گھار کر کھڈے میں بند کیا کرتے ہیں اگر اس نے اس کا اہتمام کر لیا تو دونوں کی نمازیں ایک میزان میں ہوں گی بلکہ جس نے نفس کو مشقت سے گھیر گھار کر مقید کیا ہے اور مصیبت کے ساتھ خیالات کی آمد کو روکا ہے اس کے لیے مشقت کا اجر زیادہ ہوگا۔

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ کی حکایت

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ کو کسی نے خواب میں دیکھا' پوچھا حضرت آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا' فرمایا کہ خدا تعالیٰ نے مجھے بخش دیا اور نہایت چین میں ہوں مگر ہمارا پڑوسی ہم سے بھی بڑھ گیا حالانکہ نہ اس نے وہ مجاہدات کئے جو ہم نے کئے تھے نہ طریق سلوک طے کیا' وہ بیچارا اہل وعیال والا تھا' سوائے ضروریات واجبات وفرائض کے کچھ نہ کرتا تھا' دن بھر اہل وعیال کے لیے کسب معاش کرتا تھا لیکن ہر وقت اس میں رہتا تھا کہ کاش میرے لیے بھی کبھی وہ دن آئے کہ ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ کی طرح مطمئن ہو کر اللہ کا نام لوں اور یہ حال ہو۔

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روئے   بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہامی وہوی

(فراغ قلب سے ایک نظر معشوق کے چہرہ پر ڈالنا اسی شاہی چھتری سے بہتر ہے کہ سلطنت کی پائے ہوئے کا شور وغوغا ہو)

اور یہ حال ہو:

چہ خوش است با تو بزمے بنھفتہ ساز کردن   درخانہ بند کردن سر شیشہ باز کردن

(کیا ہی اچھا ہو کہ تیرے ساتھ ایک خفیہ مجلس اور گھر کا دروازہ بند کر کے جام شراب کی مہر کھولی جائے)

ساری عمر وہ اسی تمنا میں رہا مگر ایک دن بھی اسے فراغ نصیب نہ ہوا لیکن آج جو اس کو درجات ملے ہیں ابراہیم ان کو ترس رہا ہے۔

نیت کا اجر

اور حق تعالیٰ نے اس کی نیت پر نظر فرمائی گو عمل قلیل تھا مگر اس کا ارادہ تو ہر وقت یہی تھا کہ ذرا فراغ نصیب ہو تو یوں ذکر کروں اس طرح نمازیں پڑھوں اور اس طرح مجاہدات کروں۔ بس اس کی یہ نیت قبول ہو گئی اب کیا حقیر سمجھتے ہو اے صوفیو! تم ان گاؤں والوں کو ممکن ہے کہ یہ تصوف میں بھی تم سے افضل ہوں کیونکہ تصوف نام خلوص فی الاعمال کا ہے تو ممکن ہے کہ بعضے گاؤں والے خلوص میں تم سے بڑھے ہوئے ہوں پھر جس مشقت سے وہ اپنی اہل وعیال کے لیے کسب معاش کرتے ہیں اور اس کے ساتھ خلوص میں جو ان کو دقت پیش آتی ہے اس کی وجہ سے ان کے درجات آخرت میں تم سے بڑھ جائیں۔ یہ حق تعالیٰ کا راستہ ہے جو ہر شخص کے لیے مختلف ہے کسی کو کھیتی اور ہل جوتنے ہی میں مقصود تک پہنچا دیا' کسی کو خانقاہ میں رکھ کر پہنچا دیا' کسی کو سہولت سے پہنچایا' کسی کو مشقت سے کسی کو بسط کی راہ سے لے گئے کسی کو قبض کی راہ سے۔ ایک ایسے عاشق ہیں کہ

ڈھول پیٹتے ناچتے کودتے مقصود تک پہنچتے ہیں جیسے چشتیہ ہیں کہ یہ اپنے کو بھی بدنام کرتے ہیں اور محبوب کا بھی پردہ کھول دیتے ہیں۔

عشق معشوقاں نہاں است دستیر　　　عشق عاشق بادو صد طبل و نفیر

(معشوقوں کا عشق پوشیدہ اور پنہاں ہوتا ہے اور عاشقوں کا عشق ہو اور سینکڑوں ڈھول اور نفیر کی طرح شور وغوغا کرتا ہے)

ایک نقشبندیہ ہیں جو چپ چاپ راستہ طے کرتے ہیں نہ اپنے عشق کو ظاہر کریں نہ محبوب کا راز فاش کریں۔ مولانا جامی فرماتے ہیں:

نقشبندیہ عجب قافلہ سالار انند　　　کہ برنداز رہ پنہاں بحرم قافلہ را

(نقشبندی سلسلے کے لوگ عجیب سالار قافلہ ہیں کہ مخفی راہ سے مراقبہ کئے ہوئے کعبہ شریف (حرم) تک قافلہ طالباں کو پہنچادیتے ہیں، یعنی سلوک طے کرادیتے ہیں)

ایک کو مسہل دے دیا ہے وہ بھڑ بھڑ کر رہا ہے ایک کو نخلخہ سونگھا دیا وہ خراٹے لے رہا ہے ایک کو ایسی نفیس دوا دی کہ آواز بھی نہیں نکلتی کسی کو کسی پر اعتراض کا حق نہیں، طبیب نے جس کے مناسب جو دوا دیکھی وہی اس کو دیدی اس میں مریض پر کیا اعتراض ہے۔ ایک شخص کو تو پھول دیدیئے وہ تو اس کی خوشبو میں مست ہے اور ایک سے پھول خرچ کرا کر اس کے دل میں ایک باغ لگا دیا۔

خود کہ باید ایں چنیں بازار را　　　کہ بیک گل میخری گلزار را

(ایسے کریم کا بازار لطف وکرم کون پا سکتا ہے کہ ایک گل کے عوض میں گلزار خرید سکتے ہو)

نیم جاں بستاند وصد جاں دہد　　　آنچہ در وہمت نیاید آں دہد

(یہ وہی جان لیتے ہیں مجاہدات میں اور اس کے انعام میں سینکڑوں جانیں عطا فرماتے ہیں بلکہ ایسی نعمتیں بھی عطا فرماتے ہیں جو تیرے وہم وگمان میں بھی نہیں ہیں)

یہ روتا ہے کہ ہائے مجھ سے پھول چھین لیے، وہ تسلی دیتے ہیں کہ بے وقوف تجھے ہم باغ دیں گے جس میں ہزاروں پھول دار درخت ہوں گے، یہ پھول تو چند روز میں کملا جائیں گے اور درخت لگنے کے بعد ہمیشہ تازہ بہ تازہ نو بہ نو پھول لگیں گے۔ یہی حال اس شخص کا جس سے کیفیات چھین لی جاتی ہیں وہ روتا ہے کہ ہائے کیفیات جاتی رہیں اور یہ نہیں جانتا کہ اس کے بعد مقامات عطا ہوں گے جو بمنزلہ باغ کے ہیں حصول مقامات کے بعد سب کیفیات تمہارے قبضہ میں ہو جائیں گی کہ جس وقت جس کیفیت کو چاہا اپنے اوپر وارد کر لو اب تو گھر میں درخت موجود ہیں اب

کیا غم ہے غرض یہ حق تعالیٰ کا راستہ ہے جو صوفیوں ہی کے لیے مخصوص نہیں۔ گاؤں والے بھی اس کو طے کر سکتے ہیں گو مشقت ہی سے طے کریں سو مشقت والوں کو حقیر مت سمجھو ان پر ہنسو نہیں کہ یہ کس مصیبت سے چل رہا ہے اور ہم کیسے ہلکے پھلکے چل رہے ہیں تم کو کیا خبر ہے کہ عند اللہ کون بڑھا ہوا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ جب قیامت میں اہل مصیبت کو نعمتیں دی جائیں گی تو اہل نعمت کہیں گے کہ کاش دنیا میں ہماری کھال قینچی سے کتری گئی ہوتی اور آج ہم کو بھی یہ درجے ملتے تو تم کو کیا قدر ہے ان مصیبت والوں کی' لکھنؤ والوں کو مرچوں کی کیا قدر وہ ہم پر ہنستے ہیں کہ یہ کھانا کیا کھاتے ہیں' آگ کھاتے ہیں اور ہم ان پر ہنستے ہیں کہ تم کھانا کیا کھاتے ہو خاک کھاتے ہو واقعی جس کھانے میں مرچیں نہ ہوں وہ تو مٹی ہے۔ بعض لوگ کریلے کی تلخی دور کر کے پکاتے ہیں میں کہا کرتا ہوں کہ وہ کریلا ہی کیا جو کڑوا نہ ہو۔

ملا جیون کی حکایت

ملا جیون کا قصہ ہے کہ شاہ عالمگیر نے ان کی دعوت کی اور عرض کیا کہ آپ کچھ فرمائش کیجئے انہوں نے گلگلوں کی فرمائش کی۔ باورچی نے نہایت اعلیٰ درجہ کے گلگلے تیار کیے مگر ان کو پسند نہ آئے۔ بادشاہ کو محسوس ہوا حکم دیا اور اچھے پکائے جاویں' پہلے سے بھی اعلیٰ درجہ کے پکائے وہ بھی پسند نہ آئے' باورچی سمجھ گیا' تیسرے دن اس نے گڑ اور تیل کے پکائے' بہت خوش ہوئے کہ ہاں آج پکے ہیں۔

امور دین میں ہمت سے کام لینے کی ضرورت

تو اے صاحبو! جب دنیا کی بعض چیزیں ایسی ہیں جو تلخی کے ساتھ ہی لذیذ ہیں پھر دین کے کاموں میں کیوں تعجب ہوتا ہے اگر وہ باوجود تلخی کے کسی کو لذیذ معلوم ہوتے ہوں پھر دین کے واسطے ذرا سی تلخی کیوں گوارا نہیں ہوتی مجھے اس کی دو زندہ مثالیں یاد ہیں۔ ایک مرچ ایک تمباکو کہ ان کی لذت سوزش اور تلخی ہی کے ساتھ ہے' تمباکو جتنا تیز اور کڑوا ہوتا اتنا ہی تمباکو کھانے والوں کے نزدیک عزیز ہے پھر حیرت ہے کہ دین کے لیے ذرا سی سوزش اور تلخی گوارا نہ ہو۔ اسی طرح مرچ جتنی تیز اور تلخ ہو' میں سچ کہتا ہوں کہ اگر آج تم کو دین کا کوئی کام گراں اور ناگوار معلوم ہوتا ہے تو تم اس پر عمل کر کے دیکھو' چند دن میں اس کی تلخی لذیذ معلوم ہوگی۔ پس گاؤں والوں کو ہمت نہ ہارنا چاہیے اور گو ان کو دین کے کاموں میں مشقت معلوم ہو مگر ہمت کر کے عمل کرنا چاہیے پھر جس طرح ان کو ہل جوتنا آسان ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ دین کے کام آسان ہو جائیں گے۔ چند روزے جہد کن باقی بخند (چند روز کوشش کرو بقیہ میں آرام سے ہنسنا) اسی طرح جس شخص کو پہلے

کیفیات حاصل تھیں جن سے کام آسانی سے ہورہا تھا اور اب کیفیات حاصل نہیں جس کی وجہ سے کام میں جی نہیں لگتا وہ بھی پریشان نہ ہو ہمت کرکے تلخی برداشت کرکے کام میں لگا رہے۔ اس طریق میں قبض وبسط کا پیش آنا ناگزیر ہے بلکہ قبض اگر نہ ہو تو عشاق کو لذت نہیں آتی۔ مزا اس میں ہے کہ آج بسط ہے کل قبض ہے۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں:

از دست ہجر یار شکایت نمی کنم   گر نیست غیبتے نہ دہد لذتے حضور

(محبوب کی طرف سے جدائی کا غم آنے پر شکایت نہیں کرتا ہوں کیونکہ اگر غیبت نہ ہو حضوری کی لذت بھی نہ آئے یعنی لذت وصال کی قدر تکلیف فراق کے بعد ہی ہوتی ہے)

عاشق اگر واقعی عاشق ہے تو اس کو یہ خواہش ہوگی کہ محبوب کبھی عتاب بھی کرے، منہ بھی چڑھا دے ہاں فاسق یہ چاہا کرتا ہے کہ معشوق ہر وقت اس کا مطیع ہی رہے، عاشق ہمیشہ خود مطیع ہونا چاہتا ہے، معشوق کو مطیع کرنا نہیں چاہتا۔ حاجی صاحب کا ارشاد ہے کہ آدم علیہ السلام نے جنت میں صرف لطف کی شان دیکھی تھی اس وقت تک تفصیلی معرفت کامل نہ تھی جب ان سے لغزش کا صدور ہوا تو اس میں ان کو شان جلال دکھلائی گئی اس سے ان کی تفصیلی معرفت کامل ہوگئی، تجلی جلال وتجلی جمال دونوں سے واقف ہوگئے، واقعی یہ عجیب راستہ ہے جس میں عقل کام نہیں دیتی بس یہاں تو حیرت ہی حیرت ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

گہ چنیں بنماید وگہ ضد ایں   جز کہ حیرانی نباشد کار دیں

(کبھی اس طرح دکھاتے ہیں کبھی اس کے ضد کو دکھاتے ہیں، دین کے کام میں حیرانی ہی حیرانی ہے)

مگر یہ حیرت جہل کی نہیں بلکہ کمال معرفت کی وجہ سے حیرانی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

نے چنیں حیراں کہ پشتش سوی دوست   بل چنیں حیراں کہ رویش روی دوست

(لیکن یہ حیرانی ایسی نہیں ہے کہ دوست کی پیٹھ دوست کی طرف ہو بلکہ ایسی حیرانی ہے محبوب کا چہرہ عاشق کے چہرہ کی طرف ہے)

یعنی ایک حیرت تو اس شخص کی ہے جس کو محبوب کا پتہ نہیں ملا، غلط راستہ پر چل رہا ہے یہ تو حیرت مذمومہ ہے اور ایک حیرت اس شخص کی ہے جو محبوب کا جمال دیکھ کر حیران ہو رہا ہے، محبوب کی طرف رخ کئے ہوئے ہے اور اپنے سے بے خبر اس کی حیرت حیرت محمودہ ہے تو عارف کو قبض میں بھی ترقی ہوتی ہے۔ آدم علیہ السلام کے لیے یہ حالت حالت قبض ہی تھی جس میں ان کو پہلے سے زیادہ ترقی ہوئی۔

سیر زاہد در مہے یک روزہ راہ   سیر عارف ہر دمے تا تخت شاہ

(زاہد کی سیر ایک ماہ میں ایک دن کا راستہ ہے اور عارف ہر سانس میں شاہ حقیقی کے تخت تک پہنچتا ہے)

عارف کی کوئی حالت ترقی سے خالی نہیں ہوتی اس کی سیر ہر دم عرش تک ہوتی ہے پس جس طرح بسط میں ایک حیات ہے قبض میں بھی ایک حیات ہے اس لیے محقق کبھی کیفیات کی قلت سے پریشان نہیں ہوتا وہ ہر حال میں اپنا کام کیے جاتا ہے باقی غیر محقق چونکہ کیفیات ہی کو مقصود سمجھتا ہے وہ دو مفسدوں میں مبتلا ہو جاتا ہے بعضے تو کیفیت کے نہ ہونے سے عمل میں کمی کر دیتے ہیں اور بعضے کیفیت کے ہونے سے عمل میں کمی کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر مفصلاً بیان کیا گیا ہے یہ دونوں حالتیں اچھی نہیں اس لیے اس خیال کو دل سے نکال دینا چاہیے اور کیفیات کو مقصود نہ سمجھنا چاہیے۔

یہ تتمہ تھا پہلے بیان کا اور اتنی لمبی تقریر کا قصد نہ تھا ارادہ مختصر تقریر کا تھا مگر بلا قصد کے اتنی لمبی ہو گئی۔ خیر حرج ہی کیا ہے ہر چیز کا لمبا ہونا برا نہیں' قد کا لمبا ہونا تو برا ہے مگر زلف کا دراز ہونا محبوب ہے ایک مرتبہ ناسخ اور ایک اور شاعر کسی مجلس رقص میں جمع ہو گئے' رقاصہ لمبی بے ڈول تھی تو ان میں سے ایک نے کہا' طول شب فرقت سے بھی دو ہاتھ بڑی ہے۔

رقاصہ نے ہنس کر بغرض جواب دینے کے کہا کیا' دوسرے نے فوراً کہا وہ زلف مسلسل جو تیرے رخ پہ پڑی ہے۔ اس مصرع نے اس طول کو حسین بنا دیا جو پہلے مصرع سے مذموم معلوم ہوا تھا کیونکہ اس نے اس طول کو زلف کی طرف راجع کر دیا اور زلف کا دراز ہونا عیب نہیں بلکہ مدح ہے۔ ایک تتمہ تو مضمون سابق کا یہ تھا اور دوسرا تتمہ یہ ہے کہ میں نے بیان گزشتہ سے پہلے بیان کیا تھا کہ تقلیل طعام کو تو شریعت نے مجاہدہ قرار دیا ہے مگر ترک وقاع یا تقلیل وقاع کو مجاہدہ قرار نہیں دیا اس وقت میں اس مضمون کی کسی قدر تفصیل کرنا چاہتا ہوں۔

زہد کے لیے ترک لذات کافی نہیں

اور شاید میں نے پہلے یہ بھی کہا تھا یا نہیں کہ زہد کے لیے تقلیل لذات کافی ہے' ترک لذات زہد میں ضروری نہیں کیونکہ سب سے بڑھ کر الذ الاشیاء وقاع ہے اگر ترک لذات لازم ہوتا تو کم از کم حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو اس سے رکتے جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے نکاح نہیں کیا جس کی وجہ سے آج عیسائی فخر کرتے ہیں کہ ہمارے نبی تارک لذات تھے اور مسلمانوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ تمہارے نبی تارک لذات نہ تھے متبع شہوت تھے کہ نو نکاح کیے جس سے ناواقف مسلمان ان کے سامنے جھپتے ہیں سو اگر ترک لذات لازم زہد ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نکاح کو ضرور ترک کرتے تا کہ مخالفین کو مسلمانوں پر اعتراض کا موقع نہ ہوتا جس اعتراض کا یہ نتیجہ ہوا کہ

حضرت عیسیٰ و حضرت یحییٰ علیہما السلام کی قوت مردانگی

ایک بے ادب گنوارے ایک بے ادب عیسائی کے جواب میں بک دیا کہ پہلے تم یہ تو ثابت کردو کہ عیسیٰ علیہ السلام میں قوت مردانگی بھی تھی اسی وقت ان کے ترک نکاح پر فخر کرنا۔ مگر یہ بھی سخت بے ادبی ہے عیسیٰ علیہ السلام پر اس ضعف کا شبہ ہرگز نہیں ہوسکتا کیونکہ حدیث بخاری میں ہرقل کا قول مذکور ہے جس پر اجلہ صحابہ رضی اللہ عنہ نے سکوت کیا جس سے اس کی تقریر ہوگئی۔ "**کذالک الرسل تبعث فی احساب قومها**" کہ انبیاء علیہم السلام ہمیشہ اعلے حسب میں مبعوث ہوتے ہیں کمالات ذاتیہ کو جس سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام تمام کمالات سے اعلیٰ وجہ الکمال موصوف ہوتے ہیں تا کہ کسی کو ان کے اتباع سے عار نہ ہو اور ظاہر ہے کہ اگر آپ کسی شخص کی نسبت یہ سن لیں کہ وہ عنین ہے تو طبیعت کو اس سے معار کاوٹ ہوجاتی ہے اور وہ شخص فوراً نگاہوں سے گر جاتا ہے حالانکہ اس وقت زیادہ معتقد ہونا چاہیے تھا کیونکہ معلوم ہوا کہ فرشتہ ہے مگر کچھ قاعدہ ہے کہ انسان کے ساتھ اعتقاد جب ہی ہوتا ہے جبکہ اس میں مواد تو سب موجود ہوں پھر اس کے روکنے میں فرشتہ ہو اور اگر خالص فرشتہ ہو تو اعتقاد کم ہوتا ہے۔ اسی واسطے یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں جو حضورا وارد ہے اس کے معنی مفسرین نے صبورا لکھے ہیں اور عنین کے ساتھ تفسیر کو منکر کہا ہے (کذا فی الشفاء معللا بان ہذہ نقیصۃ و عیب ولا تلیق بالانبیاء علیہم السلام) بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کو روکنے والے ہیں چنانچہ سیر سے معلوم ہوتا ہے کہ یحییٰ علیہ السلام نے اخیر عمر میں نکاح کیا تھا (کذا فی الشفاء) جس سے ان کے عنین ہونے کا شبہ بالکل زائل ہوگیا۔ بلکہ معلوم ہوا کہ ایسے قوی مرد تھے کہ ان کی قوت مردانگی بڑھاپے میں باقی رہی اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اخیر زمانہ میں نازل ہوکر نکاح کریں گے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ویولدلہ کہ ان کے اولاد بھی ہوگی جس سے ان کے ضعیف ہونے کا شبہ ہو ہی نہیں سکتا بلکہ معلوم ہوا کہ ان کی قوت اتنی زیادہ تھی کہ ہزاروں برس فرشتوں میں رہ کر بھی طاقت کم نہ ہوئی بلکہ اس سے تو بظاہر نظر ان کی یہ قوت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

تمام کمالات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم جملہ انبیاء علیہم السلام سے افضل ہیں

مگر نصوص سے ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام کمالات میں انبیاء علیہم السلام سے اکمل ہیں اس لیے یہ شبہ نہیں ہوسکتا الغرض ترک لذات لازم زہد نہیں ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نکاح کرتے بلکہ تقلیل لذات زہد کے لیے کافی ہے سو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنے نکاح کیے ہیں آپ کی اصلی قوت کے اعتبار سے وہ تقلیل لذات ہی میں داخل ہیں کیونکہ احادیث میں وارد ہے کہ صحابہ رضی اللہ

عنہم آپ کے اندر تیس مردوں اور بعض روایات میں ہے کہ چالیس مردوں کی قوت کا اندازہ کرتے تھے اور ایک مرد کی قوت چار عورتوں کے لیے کافی ہے۔ اسی لیے شریعت نے چار نکاح تک کی اجازت دی ہے۔ اس اعتبار سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں اتنی قوت تھی جو ایک سو بیس عورتوں کو اور دوسری روایت کے موافق ایک سو ساٹھ عورتوں کے لیے کافی تھی بلکہ شرح شفاء میں ابونعیم سے مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ یہ چالیس مرد جنت کے مردوں میں سے ہیں اور ان میں ہر مرد کی قوت حسب روایت ترمذی ستر مردوں کے برابر ہوگی اور ایک روایت میں سو مردوں کی برابر آیا ہے تو ایک حساب سے آپ میں قریب تین ہزار مرد کے برابر اور ایک حساب سے چار ہزار مرد کے برابر قوت ہوئی۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کمال زہد

پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نو پر صبر کرنا یہ کمال زہد تھا اور آپ اس پر بھی قادر تھے کہ بالکل صبر کر لیتے چنانچہ جوانی میں آپ نے پورا صبر کیا کہ پچیس سال کی عمر میں چالیس سال کی بیوہ عورت سے نکاح کیا' بھلا کنوارا مرد ایسی عورت سے نکاح کر سکتا ہے جو اس کی ماں بن سکے' ہرگز نہیں۔ پس جوانی میں آپ کا چالیس سالہ عورت سے نکاح کرنا اور ساری جوانی اسی کے ساتھ تیر کر دینا اس کی کافی دلیل ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم متبع شہوات ہرگز نہ تھے بلکہ آپ اعلیٰ درجہ کے زاہد تھے مگر بوڑھاپے میں آپ نے نو نکاح کئے تو ضرور آپ کے ان نکاحوں میں کوئی حکمت تھی۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نکاحوں میں حکمت

چنانچہ ایک حکمت تو وہ تھی جو بعض عارفین نے بیان کی ہے کہ منشاء تکوین عالم محبت ہے جیسا کہ "**کنت کنزا مخفیا فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق**"[1] (میں مخفی خزانہ تھا میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں پس (اس لیے) میں نے مخلوق کو پیدا کیا) سے معلوم ہوتا ہے کہ گو یہ حدیث ان الفاظ سے محدثین کے نزدیک ثابت نہیں مگر مضمون صحیح ہے جو حدیث "**ان اللہ جمیل یحب الجمال**"[2] (بے شک اللہ تعالیٰ جمیل ہیں جمال کو پسند کرتے ہیں) سے ثابت ہے جس کی تقریر نکت دقیقہ کے مضمون ہشد ہم میں اور کلید مثنوی دفتر اول قبول کردن خلیفہ ہدیہ را تحت شعر گنج مخفی بدز پیری جوش کرد میں احقر نے کی ہے ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ اس محبت تکوین کا مظہر سب سے زیادہ وقاع ہے کہ اس میں بھی محض محبت بواسطہ وقاع کے سبب ہو جاتا ہے تکون ولد

---

[1] (الدر المنتثرہ: ۱۲۶' الاسرار المرفوعۃ: ۲۷۳)

[2] (الصحیح لمسلم' کتاب الایمان: ۱۴۷' مسند احمد ۴: ۱۳۳)

کا بدون کسی تدبیر خاص کے جیسے تکوین عالم میں محض محبت بواسطہ کلمہ کن کے سبب ہو گیا تکون عالم بدون کسی خاص تدبیر کے پس عارف کو عورت کے تلبس میں یعنی جماع میں محبت تکوین کی تجلی کا مشاہدہ ہوتا ہے اس لیے وہ نکاح کرتا ہے اور اسی لیے جماع کی اس کو دوسروں سے زیادہ رغبت ہوتی ہے اور حدیث "حبب الی من دنیا کم النساء"[1] کا مبنی اسی راز کو بعض عارفین نے فرمایا ہے۔ دوسری حکمت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاحوں میں یہ تھی کہ امت کو عورتوں کے ساتھ برتاؤ کرنے کا طریقہ معلوم ہوا اگر آپ نکاح نہ کرتے اور پھر عورتوں کے حقوق کی تعلیم دیتے تو اس کا زیادہ اثر نہ ہوتا۔ کسی کو شبہ ہو سکتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تو نکاح کیا نہیں اس لیے بلا تامل عورتوں کے اتنے حقوق بیان فرما دیے، نکاح کرتے تو شاید ان حقوق کا ادا کرنا مشکل ہوتا اور اب کسی کو یہ کہنے کا منہ نہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت سے زیادہ نکاح کر کے دکھا دیئے اور سب کے حقوق اس خوبی سے ادا فرمائے کہ اس کی نظیر کوئی پیش نہیں کر سکتا۔ حقیقت میں بیبیوں کے حقوق ادا کرنا بڑے عقلمند کا کام ہے۔

بیبیوں کے دو قسم کے تعلقات

کیونکہ بی بی سے دو قسم کے تعلق ہیں ایک علاقہ حاکمیت و محکومیت کا کہ مرد حاکم ہوتا ہے اور عورت محکوم، دوسرا علاقہ محبت و محبوبیت کا کہ مرد محب اور عورت محبوب ہوتی ہے۔ علاقہ حکومت کے ساتھ علاقہ محبت کی رعایت کرنا بڑا دشوار ہے۔ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ اگر محبت کے حقوق ادا کرتے ہیں تو حکومت کے حقوق فوت ہو جاتے ہیں چنانچہ جو لوگ بیبیوں کے عاشق مشہور ہیں وہ اکثر ان کی غلامی ہی کرنے لگتے ہیں ان کی خاک حکومت نہیں ہوتی، بیوی پر نہ کچھ رعب ہوتا ہے اور جو لوگ حکومت کے حقوق ادا کرتے ہیں ان سے محبت کے حقوق فوت ہو جاتے ہیں، دونوں کو جمع کرنا اور ہر ایک کے پورے پورے حقوق ادا کرنا بی بی پر رعب بھی ہو حکومت بھی ہو اور اس کے ساتھ اس کا دل بھی شوہر سے کھلا ہوا ہو کہ بے تکلف ہنس بھی لے بول بھی لے اور مذاق بھی کر لے اور اس پر ناز بھی کر لے، یہ انسان کامل کا کام ہے۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کر سکتے تھے یا وہ شخص کر سکتا ہے جو آپ کا کامل متبع ہو۔

ناز برداری کے ساتھ رعب کا جمع کرنا سرسری بات نہیں

چنانچہ احادیث میں وارد ہے کہ ایک بار حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو یاد فرمایا تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کیا کہ آپ ان بڑھیا کو کیا یاد فرمایا

---

[1] (مستدرک حاکم ۲: ۱۶۰، کنز العمال: ۱۸۹۱۳)

کرتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے ان سے اچھی آپ کو دیدی۔ حدیث میں ہے: **"فغضب حتیٰ قلت والذی بعثک بالحق لاذکرھا بعد ھذا الا بخیر"** یعنی آپ کو غصہ آ گیا جس سے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ڈر گئیں اور بقسم عرض کیا کہ اب سے جب کبھی ان کا ذکر کروں گی بھلائی سے کروں گی۔ یہ حالت رعب کی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر تھی جن کو سب سے زیادہ ناز تھا تو دوسرے ازواج کی تو کیا حالت ہوگی تو ناز برداری کے ساتھ رعب کا جمع کرنا سرسری بات نہیں۔

تیسرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چند نکاح کر کے یہ بھی بتلا دیا کہ جس کے چند بیبیاں ہوں اسے سب کے ساتھ کس طرح عدل کرنا چاہیے۔ خصوصاً اگر ایک کے ساتھ محبت زیادہ ہو اور دوسریوں سے کم ہو تو اس وقت اپنی طرف سے کوئی بات ایسی نہ کرے جس سے ایک کی ترجیح ظاہر ہو بلکہ امور اختیاریہ میں برابری کا پورا خیال رکھے۔ چنانچہ آپ نے یہ بھی کر کے دکھا دیا کہ باوجودیکہ آپ کو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے سب سے زیادہ محبت تھی مگر عدل میں کبھی آپ نے فرق نہیں کیا' ان میں اور دوسری بیبیوں میں بلکہ ہمیشہ سب میں عدل کی پوری رعایت فرماتے تھے' باقی دل کا ایک طرف زیادہ مائل ہونا یہ آپ کے اختیار سے باہر تھا۔ اس میں برابری کیسے کرتے اس لیے آپ فرمایا کرتے تھے **"اللھم ھذا قسمی فی ما املک فلا تلمنی فیما تملک ولا املک"**[1] اے اللہ یہ میری برابری ہے اس چیز میں جس پر مجھے قدرت ہے پس مجھ سے اس بات میں مواخذہ نہ کیا جائے جس چیز پر مجھے قدرت نہیں' اس میں میلان قلب ہی کی طرف اشارہ ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی طرف زیادہ تھا۔ اور یہ بات آپ کی طرف سے نہ تھی بلکہ غیب سے ایسے سامان کئے گئے کہ خواہ مخواہ آپ کے دل کو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی طرف زیادہ میلان ہو چنانچہ نکاح سے پہلے حق تعالیٰ نے خود ایک حریر کے کپڑے میں فرشتہ کے ذریعے سے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی تصویر بھیجی تھی کہ یہ آپ کی بی بی ہیں جب آپ نے اس کو کھولا تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی تصویر پر نظر پڑی اور وہاں یعنی عالم آخرت میں تصویر جائز ہے۔ اگر تم وہاں اپنا فوٹو کھنچواؤ گے تو ہم منع نہ کریں گے یہ معاملہ حق تعالیٰ نے کسی اور بی بی کے ساتھ نہیں کیا۔ دوسری وحی میں یہ معاملہ تھا کہ کسی بیوی کے لحاف میں آپ پر وحی نہ آتی تھی بجز حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے کہ ان کے لحاف میں بھی آپ ہوتے تو بے تکلف وحی آتی تھی تو یہ باتیں تھیں جن کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ ہی نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی جانب زیادہ مائل فرما دیا' پھر اس پر ان کی قدرتی ذہانت وفقاہت اور حسن سیرت سونے پر سہاگہ تھا۔ اصل وجوہ آپ کی محبت کے وہی تھے جو پہلے مذکور ہوئے۔

---

[1] (سنن النسائی ۷: ۶۴' سنن الترمذی: ۱۱۴۰)

سب ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ظاہری برتاؤ

حق تعالیٰ کو بھی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ سب بیبیوں سے زیادہ محبت تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پھر کیوں محبت نہ ہوتی مگر بایں ہمہ سوائے محبت قلبی کے ظاہری برتاؤ آپ کا سب کے ساتھ برابر تھا۔

اور اس واقعہ سے یہ شبہ نہ ہو جو صحاح میں وارد ہے کہ ایک مرتبہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے مجتمع ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت ام سلمہ کو اور ان کے بعد حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو بھیجا تھا "**فقالت ان ازواجک ینشدنک العدل فی بنت ابی قحافة**" کہ آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے متعلق آپ سے عدل کی درخواست کرتی ہیں۔ بات یہ ہے کہ اس واقعہ میں ازواج مطہرات کی درخواست یہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمادیں کہ وہ اپنے ہدایا میں عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی باری کا انتظار نہ کیا کریں بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جس بیوی کے یہاں بھی ہوں وہیں ہدایا بھیجا کریں اس کی کیا وجہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے یہاں ہوتے ہیں اسی وقت ہدایا بھیجے جاتے ہیں اور دوسری بیبیوں کی باری میں نہیں بھیجتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم انکار فرماتے تھے کہ میں صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے ایسا نہ کہوں گا۔ بس آپ کے اس انکار کو ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرفداری پر محمول فرمالیا حالانکہ یہ ان کی غلطی اجتہادی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ رضی اللہ عنہم سے ایسی بات کہنے سے غیرت مانع تھی کیونکہ ہدیہ تو دینے والے کی خوشی پر ہے اب آپ ان سے یہ فرمائیں کہ تم مجھے ایک دن نہ دیا کرو بلکہ ہر دن دیا کرو۔ اس میں اول تو ایک قسم کا سوال ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غیور طبیعت کے بالکل خلاف تھا۔ دوسرے ہدیہ دینے والوں کی خوشی کو فوت کرنا ہے جو روح ہے ہدیہ کی ان وجوہ سے آپ انکار فرماتے تھے کہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم سے ہدیہ کے متعلق کچھ نہ کہوں گا۔ بتلایئے اس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی کیا طرفداری ہے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قدرتی طور پر اس بات سے غیرت تھی کہ کس لیے کہنے سے رکتے تھے مگر ازواج نے اس کو بلاوجہ طرفداری پر محمول فرمالیا پھر بعد میں وہ بھی سمجھ گئیں کہ آپ کے انکار کا منشا طبعی غیرت ہے کسی کی طرفداری نہیں خوب سمجھ لو ۱۲ جامع)

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حضرت عائشہؓ سے نکاح میں حکمت

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نکاح کیا ہے اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر پچاس سال سے زیادہ تھی اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی نو

سال کی تھی وہ بالکل بچی تھیں اور بجز ان کے کوئی بی بی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کنواری نہ تھی۔ اس میں حکمت یہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو امت کو یہ دکھلانا تھا کہ جس شخص کی عمر زیادہ ہو اس کو کنواری بچی کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہیے' عموماً عادت یہ ہے کہ ایسی صورت میں مرد کا برتاؤ اپنی عمر کے تقاضے کے موافق ہوا کرتا ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جو ان کی بچپن کی عمر کا تقاضا تھا' ان کے بچپن کی آپ پوری رعایت فرماتے تھے' چنانچہ ایک مرتبہ مسجد کے قرب میں حبشی لڑکے عید کے دن کھیل کود رہے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے پوچھا کہ حبشیوں کا کھیل کود دیکھو گی انہوں نے خواہش ظاہر کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پردہ کر کے دیر تک ان کو کھیل دکھلایا اور جب تک وہ خود ہی نہ ہٹ گئیں اس وقت تک آپ برابر کھڑے ہو کر ان کو کھیل دکھلاتے رہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو بچپن کی وجہ سے گڑیوں کے کھیل کا بہت شوق تھا اور محلّہ کی لڑکیاں بھی ان کے پاس کھیلنے کے لیے آتی تھیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لاتے تو وہ لڑکیاں متفرق ہو جاتیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو جمع کر کے پھر لاتے کہ آ گو بھاگتی کیوں ہو جس طرح کھیلتی تھیں کھیلتی رہو۔ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ مسابقت بھی کی کہ دیکھیں کون آگے نکلتا ہے۔ اس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہلکی پھلکی تھیں وہ آگے نکل گئیں۔ کچھ عرصہ کے بعد دوبارہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر مسابقت کی' اس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا بدن بھاری ہو چلا تھا اس مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آگے نکل گئے' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ اس کا بدلہ ہے۔

بتلایئے کنواری بچی کی دلجوئی اور دل داری اور اس کے جذبات عمر کی رعایت بڑھاپے میں کوئی مرد اس طرح کر سکتا ہے جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کی۔ حاشا وکلا بوڑھوں سے یہ بہت دشوار ہے مگر ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بڑھاپے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جو جوان شوہر کو جوان بی بی کے ساتھ کرنا چاہیے بلکہ کوئی جوان بھی اتنا نہیں کر سکتا جتنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ کیا۔ آج کل جو لوگ وقار وقار پکارتے ہیں یہ وقار تکبر کا پوٹلہ ہے ان لوگوں نے تکبر کا نام وقار رکھ لیا ہے۔ یاد رکھو وقار کے خلاف کام وہ ہے جس میں دین پر بات آتی اور جس میں دین کی مصلحت پر کوئی اثر نہ پہنچے محض اپنی عرفی سبکی ہوتی ہو تو ایسا کام کرنا عین تواضع ہے' آج کل جو لوگ وقار کا پوٹلہ بغل میں دبائے ہوئے ہیں وہ بیوی کے ساتھ دوڑنے کو خلاف وقار سمجھیں گے مگر وہ ذرا زبان سنبھالیں اور آنکھیں کھول کر دیکھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ مسابقت کی ہے تو کیا معاذ اللہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کو بھی خلاف وقار سمجھتے ہیں ہرگز نہیں اور اگر کوئی ایسا کہے تو اس کے ایمان کی خیر نہیں یقیناً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل خلاف وقار نہ تھا ہاں تکبر کے خلاف ضرور تھا۔ پس اگر آج کل مدعیان وقار متکبر نہیں ہیں تو ذرا وہ ہم کو بیوی کے ساتھ دوڑ کر کے دکھلائیں مگر ان سے قیامت تک ایسا نہ ہو سکے گا ہاں جو شخص متکبر نہ ہوگا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا متبع ہوگا وہ ایسا ضرور کر سکتا ہے اور بحمد اللہ ہم نے بھی اس سنت پر عمل کیا ہے۔ ایک حکمت یہ تھی کہ عورتوں کے متعلق جو خاص احکام ہیں ان میں عورت کا واسطہ ہونا زیادہ نافع اور موجب سہولت ہو سکتا ہے۔

ترک لذات زہد کے لیے لازمی نہیں

دوسری عورتوں کے لیے پھر وہ احکام جن امور کے متعلق ہیں ان میں عادات عورتوں کی مختلف ہوتی ہیں تو یہ نہایت مصلحت کی بات ہے کہ وہ وسائط متعدد ہوں تاکہ ہر قسم کے احکام سہولت سے ظاہر ہو سکیں اور ظاہر ہے کہ منکوحہ کی برابر کوئی بے تکلف واسطہ نہیں ہو سکتا۔ غرض یہ حکمتیں تھیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد نکاحوں میں اور یہ بھی نمونہ کے طور پر چند بیان کر دی گئی ہیں ورنہ اور بہت سی حکمتیں ہیں جن کے بیان کو عمر طویل چاہیے ان وجوہ سے آپ نے متعدد نکاح کئے ہیں ورنہ اگر آپ چاہتے تو بالکل صبر کر لیتے اور جس طرح ساری جوانی ایک چالیس سالہ بیوہ کے ساتھ آپ نے گزار دی بوڑھاپے کو بھی ایک بیوی کے ساتھ گزار سکتے تھے۔ مگر آپ نے ان حکمتوں کی وجہ سے جن کا ابھی ذکر ہوا ہے متعدد نکاح کیے جس سے یہ ہو گیا کہ ترک لذات زہد کے لیے لازم نہیں بلکہ صرف تقلیل لذات کافی ہے ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ترک نکاح ضرور کرتے۔ دوسرے یہ کہ مجاہدات و ریاضات سے مقصود کسر قوت بہیمیہ ہے اور وقاع سے یہ کسر زیادہ حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے:

من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج فانہ اغض للبصر واحصن للفرج ومن لا فلیصم فانہ لہ وجاء۔[1]

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح صوم سے کسر قوت بہیمیہ ہوتی ہے اسی طرح نکاح سے بھی یہ قوت منکسر ہوتی ہے بلکہ نکاح کو اس میں زیادہ دخل ہے اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مقدم فرمایا۔

---

[1] (الصحیح للبخاری ۳:۳۴، الصحیح لمسلم کتاب النکاح: ۱)

شکم سیر ہو کر کھانے سے روح صوم باطل نہیں ہوتی

غرض ثابت ہوا کہ ترک وقاع مجاہدہ نہیں ہے ایک تتمہ سابق کا اور بھی ہے وہ یہ کہ میں نے پہلے بیان میں یہ بھی کہا تھا کہ تقلیل طعام کے لیے غذا کم کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ فصل بین الاکلتین مجاہدہ کے لیے کافی ہے اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس وقت رمضان کا اخیر ہے سب دیکھ لیں تو صرف اس فصل ہی کی وجہ سے مجاہدہ کے آثار سب پر نمایاں ہو رہے ہیں۔ چنانچہ اس وقت سب کی قوت میں کمی معلوم ہو رہی ہے۔ سب لوگ ڈھیلے ڈھیلے ہو رہے ہیں باوجودیکہ افطار وسحر میں خوب کھاتے پیتے تھے مگر پھر بھی روزہ نے اپنا اثر دکھا دیا۔ ابتداء رمضان میں شبع بھی زیادہ تھا اور اب وہ بھی بہت کم ہے پس جن فلسفی مذاق صوفیاء نے یہ لکھا ہے کہ جو شخص رمضان میں بھی اور دنوں کی طرح پیٹ بھر کر کھاتا رہے اس نے روح صوم کو باطل کر دیا یہ ان کی اجتہادی غلطی ہے جس کا منشا صرف یہ ہے کہ انہوں نے یہ سمجھا کہ مقصود صوم سے کسرت قوت بہیمیہ ہے سو جب رات کو خوب پیٹ بھر کر کھایا تو یہ کسر کہاں حاصل ہوا۔ سو اول تو خود یہ حکمت اجتہادی ہے اس کے انتفاء سے روح صوم کو باطل کہہ دینا رائے محض ہے اور اس رائے سے ابہام ہوتا ہے کہ اگر رات کو شبع کے ساتھ غذا ہو تو صوم ہی کا ثواب نہ ملے گا کیونکہ بدون روح کے محض صورت بیکار ہے اور یقیناً غلط ہے کہ جس شخص سے کوئی معصیت سرزد نہ ہو اس کا ثواب کم ہو جاوے دوسرے بعد تسلیم کسر اس صورت میں بھی حاصل ہے اور یہ غیر مسلم ہے کہ کسر کے لیے شب کا شبع بھی مضر ہے اس لیے یقیناً کہا جاوے گا کہ پیٹ بھر کر کھانے سے روح صوم ہرگز باطل نہیں ہوتی۔ چنانچہ مشاہدہ ہمارے سامنے ہے کہ باوجود شب کے شبع کے سب کی قوت بہیمیہ منکسر ہو رہی ہے۔ خصوصاً جبکہ شریعت میں اس قول کی کوئی اصل نہیں ملتی۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس کی تصریح کی ہے باقی احادیث میں جو جوع کی فضیلت آتی ہے وہ ایسی ہے جیسے مرض کی فضیلت آئی ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ قصداً بیمار ہوا کریں اسی طرح یہ لازم نہیں کہ قصداً بھوکے رہا کریں اسی طرح جو شبع کی مذمت وارد ہے اس سے مراد شبع مفرط ہے جس کو فقہاء نے بھی منع کیا ہے۔ مطلق شبع مراد نہیں ورنہ اگر مطلق شبع منکسر ہوتا تو حدیث میں صائم کو شکم سیر کرنے کی فضیلت وارد نہ ہوتی کیونکہ منکر پر اعانت کرنا فضیلت کیسے ہو سکتا ہے اس پر شاید کوئی یہ شبہ کرے کہ یہ کیسا مجاہدہ ہے کہ ایک ماہ کو تو دن میں کھانا پینا بند کر دیا پھر سال بھر کے لیے چھوڑ دیا کہ اب گیارہ مہینے رات دن کھاؤ پیو۔

ایک ماہ کا مجاہدہ اصلاح نفس کے لیے کافی ہے

میں کہتا ہوں کہ یہ تو میرے اس قول کی تائید ہے کہ مجاہدہ خود مقصود نہیں بلکہ مقصود عمل ہے اسی واسطے شریعت نے سال بھر میں ایک مہینہ مجاہدہ کے لیے مخصوص کیا ہے باقی ایام میں مجاہدہ مقرر نہیں کیا بلکہ وہ اس عمل کا زمانہ ہے جس کے لیے مہینہ بھر مجاہدہ کیا اور میں بقسم کہتا ہوں کہ یہ ایک مہینہ کا مجاہدہ ہی اصلاح نفس کے لیے کافی ہے اس کا اثر سال بھر رہتا ہے بشرطیکہ رمضان کو اس کے حقوق کے ساتھ پورا کیا جائے۔ تجربہ ہے کہ جن کاموں کی عادت رمضان میں کر لی جاتی ہے سال بھر کے لیے وہ کام آسان ہو جاتا ہے پس جو شخص رمضان میں تقلیل کلام تقلیل منام تقلیل اختلاط کا عادی ہو جائے گا سال بھر اس کو یہ کام آسان رہیں گے بشرطیکہ اس کا ارادہ بھی کرتا رہے اور نفس کی نگہداشت سے غافل نہ ہو ورنہ قصداً گناہ کرنے کا تو کچھ علاج ہی نہیں۔ غرض اگر رمضان کو اچھی طرح گزارا جائے تو واللہ سال بھر معاصی سے بچنا آسان ہو جاتا ہے۔ بشرطیکہ گناہ سے بچنا بھی چاہیے اور جو بچنا ہی نہ چاہے تو اس نے مجاہدہ کا قصد ہی نہیں کیا۔ پس تم رمضان میں مجاہدہ کا قصد کرو اور اصلاح نفس کا اہتمام کرو پھر اگر تم گناہوں سے بچنا چاہو گے تو دیکھ لینا کتنی آسانی ہوتی ہے۔ غرض مجاہدہ خود مقصود نہیں بلکہ اصل مقصود عمل ہے اور مجاہدہ تسہیل عمل کے لیے مشروع ہوا ہے جیسے مسہل معدہ کو نرم کرنے کے لیے دیا جاتا ہے تاکہ مادہ متعفنہ نکل کر معاہدہ کی اصلاح ہو جائے اور ظاہر ہے کہ مسہل روز روز نہیں ہوا کرتا' سال بھر میں ایک دفعہ ہوتا ہے کہ معدہ درست ہو جائے تو سال بھر غذا کھائی جائے اور اس کے ہضم سے قوت حاصل کی جائے۔ اسی طرح شریعت نے مجاہدہ کا زمانہ ایک ماہ رکھا ہے اور اس کو بھی عمل سے خالی نہیں رکھا بلکہ ہر مجاہدہ کے ساتھ ایک عمل ضرور رکھا ہے باقی مہینے خالص عمل کے لیے رکھے تاکہ معلوم ہوا کہ اصل مقصود عمل ہی ہے یہ علوم جواہرات ہیں ان کی قدر کرو' واللہ ان سے بہت سی مشکلات وعقبات حل ہو جاتے ہیں سب اصول ہیں فن کے یہ سب بیان اس پر چلا تھا کہ وقاع میں خود کسر قوت بہیمیہ ہے اس لیے اس کے ترک کو مجاہدہ میں شمار نہیں کیا گیا اور جب ترک وقاع مجاہدہ نہیں حالانکہ وہ الذ الاشیاء ہے تو اس سے ثابت ہوا کہ ترک لذات کوئی مجاہدہ نہیں اور نہ ترک لذات کا نام زہد ہے اور جن لوگوں نے ترک لذات کو زہد کے لیے ضروری سمجھا ہے وہ محقق نہیں ہیں۔

ٹھنڈا پانی پینے میں حکمت

چنانچہ ایک بزرگ نے سنا کہ فلاں صوفی شوربے میں پانی ملا کر کھاتا ہے فرمایا وہ طفل مکتب ہے وہ اس تجلی کو معطل کرتا ہے جو شوربے کی لذت میں ظاہر ہے ہمارے حاجی صاحب رحمہ اللہ کا

ارشاد جو خود مجھ سے فرمایا میاں اشرف علی پانی جب پیو خوب ٹھنڈا پیناہر بن مو سے الحمد للہ نکلے گا اور گرم پانی پیو گے تو زبان تو الحمد للہ کہے گی مگر دل اس کا ساتھ نہ دے گا۔ یہ ہیں حقائق جن کو محقق ہی سمجھتا ہے۔ اب بتلایئے اگر کوئی شخص ٹھنڈے پانی میں گرم پانی ملا کر پئے تو اس نے اس نعمت کو باطل کیا یا نہیں جو ٹھنڈے پانی میں رکھی ہوئی یقیناً اس نے نعمت کی ناقدری کی اسی طرح لذیذ شوربا کھا کر جیسا دل خوش ہوتا ہے اور خوش ہو کر نعمت الٰہی کا شکر کرتا ہے پانی ملانے کے بعد وہ بات کہاں حاصل ہو سکتی ہے ہرگز نہیں' عارف ہر چیز کے حقوق ادا کرتا ہے' ٹھنڈے پانی کے بھی اور لذیذ شوربے کے بھی اور نفیس کپڑے کے بھی اور ناقص ان کے حقوق کو ضائع کرتا ہے۔ ایک بزرگ کا ارشاد ہے کہ ہم تو عطر اس واسطے ملتے ہیں تاکہ خدا تعالیٰ کو اچھے لگیں' عمدہ کپڑے اس واسطے پہنتے ہیں تاکہ خدا کو اچھے لگیں کیا کہنا ہے ان بزرگوں کی حالت اور نیت کا یہ ہر کام میں رضائے محبوب ہی کا قصد کرتے ہیں عام لوگ ان کی حالت کو کیا پہچانیں۔

در نیابد حال پختہ ہیچ خام پس سخن کوتاہ باید والسلام

(خام شخص کاملین کے حالات کو نہیں سمجھ سکتے' پس کلام مختصر کرو اور ایسے نادان اور خام سے سلام کرلو' کلام نہ کرو)

فکر موت کے ساتھ ایک بزرگ دین کی قوت کی گولی کا استعمال

مگر تم ان کی ریس مت کرنے لگنا کہ لگو آج ہی سے عمدہ عمدہ کپڑوں کا اہتمام کرنے کیونکہ اول تو وہ حضرت فناء نفس سے مشرف ہو چکے تھے دوسرے ان کاموں کے لیے اہتمام نہ کرتے تھے' ہاں جب خدا نے عمدہ کھانے' عمدہ پہننے کو دیا تو اس کو اچھی نیت سے استعمال کرتے تھے' ہر شخص کو ان کی ریس نہ کرنی چاہیے ورنہ وہی حال ہوگا جو ایک بادشاہ کا ہوا تھا۔ ایک بادشاہ نے ایک بزرگ کو دیکھا کہ وہ روزانہ دو گولی کھایا کرتے ہیں' بادشاہ نے پوچھا کہ یہ گولیاں کیسی ہیں' فرمایا قوت کے لیے ہیں۔ اس نے کہا مجھے بھی ایک عنایت کر دیجئے' آپ نے ایک گولی اس کو بھی دیدی' تھوڑی دیر کے بعد جو اس نے اپنا اثر کیا تو بادشاہ سے ضبط نہ ہو سکا' محل سرا میں گیا اور اپنی بی بی اور باندیوں سے رات بھر مشغول رہا مگر کسی طرح خواہش اور قوت کم نہ ہوتی تھی۔ اب اسے خطرہ پیدا ہوا کہ ایک گولی میں تو میرا یہ حال ہوا اور یہ بزرگ مدت سے دو گولیاں روز کھاتے ہیں ان سے کیونکر ضبط ہوتا ہے ان کی حالت کا تجسس کرنا چاہیے' کہیں یہ کسی سے خراب و خستہ نہ ہوتے ہوں گو بوجہ عقیدت قدیم کے اس خطرہ کو دفع کر دیا مگر اس خطرہ کا ان بزرگ کو کشف ہو گیا اور چاہا کہ اس کو بالکل صاف کر دیا

جاوے۔ بادشاہ اگلے دن حاضر خدمت ہوا تو انہوں نے افسوس کے ساتھ فرمایا کہ مجھ کو معلوم ہوا کہ تمہاری زندگی کے تھوڑے روز باقی رہ گئے ہیں' چالیس دن کے بعد تم مرجاؤ گے مگر چونکہ عبادت کے لیے قوت کی ضرورت ہے اس لیے یہ گولیاں پاس رکھو' روزانہ کھالیا کرو تاکہ عبادت آسانی سے ہوسکے چونکہ بادشاہ کو ان سے اعتقاد تھا اس لیے یقین آگیا کہ بس میری زندگی کے چالیس دن باقی ہیں' پھر تو حالت یہ ہوئی کہ دو گولیاں روزانہ کھا کر بھی نفس کو مطلق ہیجان نہیں ہوتا' موت کے خیال نے نفس کو پژمردہ کردیا اب نہ بیوی کی طرف التفات ہے نہ باندیوں کا خیال ہے' ہر وقت موت کا فکر ہے' سب کام چھوڑ چھاڑ کر گوشہ نشین ہوکر خدا کی یاد میں لگ رہا ہے۔ جب چالیس دن پورے ہوگئے اور موت نہ آئی تو بزرگ کی خدمت میں پھر حاضر ہوا اور کہا حضور چالیس دن تو گزر گئے مگر آپ کا کشف پورا نہ ہوا' فرمایا وہ گولیاں بھی کھائی تھیں کہا ہاں' فرمایا کیا ویسا ہی اثر ہوا کہا حضور خاک بھی اثر نہیں ہوا' مجھے تو ہر وقت موت کا فکر لگا ہوا تھا' فرمایا میرا مقصود تمہارے خطرہ کا جواب دینا تھا۔ دیکھو کہ تم کو تو چالیس دن کی مہلت کا بھی یقین تھا' مگر پھر بھی موت کے فکر نے تمہارا یہ حال کردیا اور جس کو چالیس منٹ کی مہلت کا بھی یقین نہ ہوا اور ہر وقت موت ہی کا دھیان لگا رہتا ہو کہ دیکھئے کب بلاوا آجاوے تو اس کا کیا حال ہوگا۔ اب بادشاہ سمجھا کہ واقعی میرے خطرے کا جواب ہوگیا' واقعی جس کو موت کا ہر دم فکر لگا ہوا سے ان گولیوں سے کیا ہیجان ہوتا۔

علوم قلبی

صاحبو! تم تو یہ دیکھتے ہو کہ بزرگ عمدہ کھاتے' عمدہ پہنتے ہیں مگر ان کے دل پر جو آرے چلتے ہیں ان کی تمہیں کیا خبر' تم ان کو ظاہر میں خوش حال دیکھ کر اپنے اوپر قیاس کرتے ہو کہ بس یہ بھی ہر وقت تنعم میں رہتے ہیں مگر ان کے دل کی کیا خبر کہ اس پر کیا گزر رہی ہے اس لیے تم ان کی ریس نہ کرو' تمہاری سلامتی اسی میں ہے کہ عبادات میں تو ان کی تقلید کرو' احوال میں تقلید نہ کرو کیونکہ تم ان احوال کے حقوق ادا نہیں کرسکتے اور جب اس قابل ہو جاؤ گے پھر تقلید احوال کا بھی مضائقہ نہیں' میں یہ کہہ رہا تھا کہ ترک وقاع مجاہدہ نہیں ہے نہ ترک لذات کا نام زہد ہے اس پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ اگر ترک وقاع مجاہدہ نہیں تو پھر روزے میں ترک اکل و شرب کے ساتھ ترک وقاع کیوں مشروع ہوا' خوب سمجھ لو کہ روزہ میں ترک وقاع کے ضروری ہونے سے اس کا مجاہدہ ہونا لازم نہیں آتا بلکہ روزہ میں ترک وقاع کے مشروع ہونے کا دوسرا سبب ہے میرے یہ علوم نقلی نہیں ہیں کیونکہ میری نظر کتابوں پر بہت کم ہے اسی لیے بعض لوگ مجھے کم ہمت بھی کہتے ہیں بلکہ یہ علوم

میرے قلب پر خود بخود چلے آتے ہیں جیسے ایک ڈوم کی آنکھوں میں چاند گھسا آتا تھا اس نے کہیں سن لیا تھا کہ چاند دیکھنے سے روزہ فرض ہوتا ہے اس نے کہا کہ ہم چاند ہی نہ دیکھیں گے جو روزہ فرض ہو۔ ایک دفعہ وہ تالاب کے کنارہ پر آب دست لے رہا تھا کہ پانی میں چاند کا عکس نظر آیا تو کہنے لگا گھس جا آنکھوں میں کر دے روزہ فرض تو جیسے اس کی آنکھوں میں چاند خود بخود گھسا آتا تھا ایسے ہی میرے دل پر یہ علوم خود بخود چلے آتے ہیں مگر اتنا فرق ہے کہ وہ آنکھیں بند کر لیتا تھا میں کھلی رکھتا ہوں۔ تو بات یہ ہے کہ گو واقع بھی مانع مشاہدہ نہیں ہے کہ اس کے ترک کو مجاہدہ کہا جاوے بلکہ مشاہدہ پر معین ہے جیسا میں اوپر بتا چکا ہوں کہ عارفین کو اس میں بھی ایک تجلی ظاہر ہوتی ہے اور اس کا مقتضا واقع میں یہی تھا کہ ترک وقاع صوم کے لیے ضروری نہ ہوتا مگر یہ مشاہدہ بواسطہ ہے اور ترک وقاع میں مشاہدہ بلا واسطہ دوسرے وقاع میں مشاہدہ ہونا یہ حالت عارفین کے ساتھ مخصوص ہے غیر عارف کو تو اس وقت حضور بھی مشکل ہے کیونکہ اکثر لوگ تو اس وقت نفسانی لذات میں ایسے مشغول ہوتے ہیں کہ ان کو حضور حق کی طرف التفات بھی نہیں ہوسکتا۔

حدیث انہ لیغان علی قلبی کا مفہوم

اور عارف کو گو اس وقت حضور ہوسکتا ہے مگر اس میں شک نہیں کہ اس کے لیے بھی یہ حضور بواسطہ ہے باقی حضور بلا واسطہ وہ ترک وقاع ہی میں ہے جیسا کہ عارف کو خلوت میں حضور بلا واسطہ ہوتا ہے اور اختلاط مع الخلق میں بواسطہ اور یہی تفسیر ہے۔ حدیث ''انہ لیغان علی قلبی''[1] کی (کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میرے دل پر بھی بعض دفعہ ابر سا چھا جاتا ہے ۱۲) کیونکہ انبیاء علیہم السلام کو تو خلوت میں توجہ الی الحق بلا واسطہ حاصل تھی پھر ان کو تبلیغ کے لیے مخلوق سے ملنے ملانے کا حکم ہوا تو اس میں بھی توجہ الی الحق محفوظ ہے مگر یہ توجہ بواسطہ ہے اور توجہ بلا واسطہ یقیناً الذ ہے توجہ بواسطہ سے جیسے ایک تو معشوق کو بلا واسطہ آئینہ کے دیکھا جائے اس طرح کہ وہ بالکل تمہارے سامنے ہو اور ایک یہ کہ محبوب کے سامنے آئینہ رکھا ہو اور اس میں سے محبوب کی صورت دیکھی جائے گو دونوں صورتوں میں آپ محبوب ہی کو دیکھ رہے ہیں مگر یقیناً دونوں میں فرق ہے۔

اسی طرح گو انبیاء کے حق میں تمام مخلوق مراۃ جمال حق ہے اور وہ مخلوق سے ملنے ملانے میں بھی توجہ الی الحق ہی رکھتے ہیں مگر یہ توجہ بواسطہ ہے جس میں وہ لذت نہیں جو خلوت میں بلا واسطہ توجہ الی الحق میں ہوتی ہے اسی تفاوت کو حضور عین سے تعبیر فرماتے ہیں۔ غرض حالت وقاع میں اول تو

---

[1] (الصحیح لمسلم، الذکر: ۴۱، سنن ابی داؤد: ۱۵۱۵)

مشاہدہ بلا واسطہ نہیں صرف بواسطہ ہے پھر وہ بھی ہر ایک کو نہیں صرف عارف کو ہوتا ہے اس لیے روزہ میں ترک وقاع مشروع ہوا تا کہ روزہ میں حق تعالیٰ کی طرف توجہ اعلیٰ درجہ کی علیٰ وجہ الکمال پائی جاوے۔ یہ راز ہے ترک وقاع کے ضروری ہونے کا صوم میں نہ یہ کہ ترک وقاع مجاہدہ ہے۔

روزہ میں شان تنزیہ کا ظہور ہے

دوسری بات یہ ہے کہ بزرگوں کے کلام میں تصریح ہے کہ روزہ میں شان تنزیہ کا ظہور ہے یعنی روزہ فی الجملہ تخلق باخلاق اللہ ہوتا ہے اس کھانے پینے کے ساتھ جماع سے بھی روک دیا گیا کیونکہ حق تعالیٰ ان افعال سے منزہ ہیں اور اس کا مقتضا یہ ہی تھا کہ پیشاب و پاخانہ سے بھی منع کر دیا جاتا مگر اس کی ممانعت اس لیے نہیں کی گئی کہ یہ تکلف مالا یطاق تھی انسان پیشاب پاخانہ کے تقاضے کو نہیں روک سکتا اگر اس سے بھی ممانعت ہو جاتی تو اینٹھ کے ایک پورانے مولوی صاحب کی مریدنیوں کا سا روزہ ہو جاتا اور ان کا خدا جانے کہاں سے یہ اعتقاد تھا کہ روزہ پاخانہ پیشاب کرنے سے بھی ٹوٹ جاتا ہے تو یہ مریدنیاں دن بھر ان کاموں سے رکی رہتی تھیں مگر برا حال ہوتا تھا' پھر افطار کے وقت دوسرے تو کھانے پینے پر گرتے تھے اور وہ مریدنیاں لوٹا لے کر پاخانہ کو بھاگتی تھیں ان کا روزہ پیشاب کرنے سے انکار ہوتا تھا اس وجہ سے استنجے کی ممانعت نہ ہوئی اکل وشرب و وقاع سے ممانعت ہوگئی نیز روزہ میں ایک اور نکتہ بھی ہے وہ یہ کہ دن بھر تو شان تنزیہ و استغناء کا ظہور ہوتا ہے اور افطار کے وقت شان عبدیت و افتقاء کا کامل ظہور ہوتا ہے اذان ہوتے ہی کیسے کھانے پینے پر گرتے ہیں اس سے بندہ کو اپنا محتاج ہونا معلوم ہو جاتا ہے پھر احتیاج کے ساتھ بندہ کے ایک نقص کا ظہور ہوتا ہے اس طرح کہ اکل و شرب کے لیے عادۃً لازم بول و براز پس ملزوم سے لازم کی طرف ذہن منتقل ہو کر عبدیت کے اس نقص کا استحضار ہو جاتا ہے جیسے بعض مفسرین نے اسی استلزام و انتقال ذہن کی بناء پر **کانا یا کلان الطعام** کی تفسیر میں کہا ہے اسے و **کانا یبو لان ویبرزان** ایضاً یعنی نصاریٰ نے جو عیسیٰ علیہ السلام و مریم علیہا السلام کو خدا کا بیٹا و خدا کی بیوی بنا رکھا ہے حق تعالیٰ اس کا رد فرماتے ہیں کہ وہ دونوں تو خدا کے مقبول بندے تھے' خدا ہرگز نہ تھے' چنانچہ دونوں کھایا پیا کرتے تھے۔ یہ مفسرین کہتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ ہگتے موتتے بھی تھے اور جو شخص ہگتا موتتا ہو اس سے زیادہ محتاج کون ہوگا لیکن حق تعالیٰ نے تہذیب کی پوری رعایت فرمائی ہے کہ ملزوم پر اکتفا کر کے لازم کی طرف اشارہ فرما دیا کیونکہ اس کو تو عقلاً خود ہی سمجھ جاویں گے کیونکہ جو کھائے پئے گا وہ ہگے موتے گا بھی ضرور اس لیے **کانا یبولان ویبرزان** صراحۃً نہیں فرمایا تا کہ کلام میں تہذیب کی رعایت رہے اور بعض لوگوں نے **کانا یا کلان الطعام** کی دوسری تفسیر کی وہ بے تکلف ہے اس کا حاصل وہی ہے جو اس قطعہ کا ہے۔

ابرو باد و مہ و خورشید فلک در کارند　　　　تا تو نانے بکف آری وبغلفت نخوری

(بادل اور ہوا اور آفتاب و آسمان سب اپنے کام میں لگے ہیں تا کہ تو جب روٹی ہاتھ میں لیوے تو غفلت سے نہ کھالیوے بلکہ سوچے کہ اس روٹی کے انتظام میں بادل اور ہوا اور سورج اور آسمان کی خدمات بھی شامل ہیں)

یعنی جو شخص کھانے کا محتاج ہے وہ سینکڑوں ہزاروں چیزوں کا محتاج ہے کیونکہ طعام کے لیے زمین کی ضرورت' بیلوں کی ضرورت' بیج کی ضرورت' کیروں بالدیوں کی ضرورت' پھر آفتاب اور چاند کی ضرورت کیونکہ پیداوار بدون تمازت آفتاب و نور قمر کے نہیں ہو سکتی پھر بارش کی ضرورت پھر کھیتی پکنے کے لیے دھوپ کی ضرورت' پھر کھیتی کٹنے کے بعد جب غلہ گاہتے ہیں تو بھوسہ اور غلہ کو الگ کرنے کے لیے ہوا کی ضرورت' پھر جب غلہ گھر میں آ گیا تو پیسنے والے اور پکانے والے کی ضرورت' غرض ایک روٹی کے لیے سینکڑوں ہی سامان کی احتیاج ہے تو جو شخص کھانے کا محتاج ہے حقیقت میں اس سے زیادہ محتاج کوئی نہیں اور عیسیٰ اور مریم علیہما السلام دونوں کھانے کے محتاج تھے تو پھر ایسے سراپا احتیاج خدا یا خدا کے بیٹے اور بیوی کیونکر ہو سکتے ہیں خدا میں اور ان میں مناسبت ہی کیا وہ سراپا غنا یہ سراپا احتیاج اور اولاد کو باپ سے اور بیوی کو شوہر سے مناسبت ہونا ضروری ہے یہاں کچھ بھی مناسبت نہیں۔ پھر نصاریٰ کی حماقت ہی نہیں جو ان کو عبدیت سے بڑھا کر الوہیت تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ یہ حاصل ہے دوسری تفسیر کا واللہ علم۔

غرض روزہ میں شان تنزیہ کا کامل ظہور ہے اس لیے جن چیزوں کے ترک کو تنزیہ میں دخل تھا ان سے روزہ میں روک دیا گیا جس سے روکنا ہوا اسی واسطے جماعت سے بھی روک دیا گیا کہ ترک جماع کو بھی تنزیہ میں دخل ہے۔ اب یہاں ایک سوال ہو سکتا ہے وہ یہ کہ معاصی کا ارتکاب بھی تو تنزیہ کے خلاف ہے تو چاہیے کہ ان سے بھی روزہ فاسد ہو جاوے کیونکہ ان سے شان تنزیہ فوت ہو گئی حالانکہ بجز اکل و شرب و وقاع کے اور کسی فعل کو مفسد صوم نہیں کہا جاتا اس کا جواب یہ ہے کہ تنزیہ کا حال استغناء ہے اس کے خلاف وہ افعال ہوں گے جن میں احتیاج کی شان ظاہر ہے اور وہ انہی افعال ثلاثہ میں ہے اور دوسری معاصی گو قبح میں اشد ہوں مگر ان میں احتیاج کی شان اتنی زیادہ نہیں بلکہ اگر ہے تو کبر کی شان ہے۔ چنانچہ احکام خداوندی کی سرکشی سے بڑھ کر کیا کبر ہو گا اس لیے جن گناہوں میں اکل و شرب و جماع نہ پایا جائے ان سے بچنا روزہ کا جزو اور رکن نہیں یعنی ان سے روزہ باطل بھی نہیں ہوتا گو عذاب سخت ہو کیونکہ ان سے بچنے کو تنزیہ میں (جو کہ تخلق باخلاق

اللہ ہے) کوئی دخل نہیں اور روزہ نام ہے تخلق باخلاق اللہ کا اور یہی معنے ہیں حدیث "**الصوم لی وانا اجزی به**[1]" کے کہ روزہ میرے لیے ہے اور اس کی جزا میں خود دوں گا اہل ظاہر نے اس کی شرح میں یہ کہا ہے کہ روزہ میں خلوص زیادہ ہے' اس میں ریا نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کی حقیقت ترک ہے جو کہ عدمی ہے اور ریاء وجودی میں ہوا کرتی ہے اس لیے اس کو لی فرمایا ہے یعنی اس کو میرے ساتھ خاص خصوصیت ہے بوجہ اس کے کہ اس میں غیر اللہ کے دکھلانے کی گنجائش نہیں مگر عارفین نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ روزہ میں شان تنزیہ ہے اس میں تشبہ بحق و تخلق باخلاق اللہ ہوتا ہے اس سے خدا تعالیٰ کے ساتھ مناسبت ہو جاتی ہے لِیُ کی یہ تفسیر کی ہے اور یہاں سے تفسیر ہوگئی میرے ایک خواب کی بچپن کا خواب ہے۔

نماز میں شان عبدیت کا کامل ظہور ہے

میں نے خواب دیکھا کہ کسی نے مجھ سے سوال کیا کہ اس کے کیا معنے ہیں کہ روزہ اللہ کا اور نماز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ میں نے جواب دیا کہ روزہ میں تنزیہ کے سبب حق تعالیٰ کے ساتھ زیادہ تشبہ ہے اس لیے اس کو اللہ کہا جاتا ہے اور نماز میں شان عبدیت کا ظہور ہے اور عبدیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام ہے اس لیے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تشبہ ہے۔ اس جواب کی تصدیق کی گئی غرض یہ اشکال بھی رفع ہو گیا کہ روزہ میں ترک وقاع کے مشروع ہونے سے اس کا مجاہدہ ہونا معلوم ہوتا ہے میں نے بتلا دیا کہ اس کا سبب مجاہدہ ہونا نہیں ہے بلکہ روزہ میں ترک وقاع کے مشروع ہونے کا سبب اور ہے یہ سب تتمہ تھا سابق کا جو مقصود سے بھی غالباً لمبا ہے جیسے مور کی دم مور سے لمبی ہوتی ہے مگر بدنما نہیں ہوتی اس کی یہاں تک قدر ہوتی ہے کہ اس کے پر قرآن میں رکھے جاتے ہیں۔ اسی طرح یہ تتمہ بھی گو لمبا ہے مگر بدنما نہیں بلکہ خوشنما ہے اب میں مقصود کی طرف رجوع کرتا ہوں وہ یہ کہ تیسرا رکن مجاہدہ کا تقلیل کلام ہے اور یہ تقلیل طعام و تقلیل منام سے بھی زیادہ دشوار ہے کیونکہ کھانے میں کچھ اہتمام تو کرنا پڑتا ہے' طعام کو تیار کرنا پڑتا ہے پھر منہ چلانا پڑتا ہے' پھر ہضم کی فکر ہوتی ہے کبھی کچھ چورن وغیرہ کھانا بھی پڑتا ہے' تقلیل میں ان سب امور کی تخفیف ہے پھر کیا دشوار ہے ایک دو دفعہ زیادہ کھا لے گا پھر کہاں تک کھائے گا جب ہضم نہ ہوگا تو خود ہی تقلیل طعام ہو جائے گا بخلاف بولنے کے کہ اس میں کچھ اہتمام ہی کرنا نہیں پڑتا نہ زیادہ بولنے سے بدہضمی ہوتی ہے اس لیے اس کی تقلیل کا کوئی قوی داعی

---

[1] (مسند احمد ۲: ۲۳۴' مشکل الآثار ۴: ۱۱۶)

نہیں اسی طرح سونا ہے تو اس میں کبھی تقلیل ہوگی' آخر کہاں تک سوئے گا کبھی تو جاگے گا۔ بخلاف اس زبان کے چرخہ کے کہ اس کی کہیں انتہا ہی نہیں یہ چرخہ چلنے سے تھکتا ہی نہیں کیونکہ اس کے لیے کچھ اہتمام کرنا ہی نہیں پڑتا نہ زبان چلانے سے کچھ تعب ہوتا ہے دوسرا راز یہ ہے کہ انسان جس قدر حظوظ اختیار کرتا ہے لذت کے لیے اختیار کرتا ہے سو کلام کے سوا دوسرے جس قدر حظوظ ہیں ان میں کرنے سے لذت کم ہو جاتی ہے' پیٹ بھرنے کے بعد پھر کھانے میں مزا نہیں آتا' نیند بھر جانے کے بعد پھر سونے میں لذت نہیں آتی بلکہ سونے سے جی گھبرا جاتا ہے مگر بولنے کی لذت ختم نہیں ہوتی بلکہ جتنا بولتے جاؤ اتنی ہی لذت بڑھتی جاتی ہے اس لیے تقلیل کلام سب سے زیادہ دشوار ہے مگر باوجود دشواری کے اس میں آزادی اس لیے نہیں دی گئی کہ زیادہ بولنے میں آفات بہت ہیں اور اس سے گناہوں میں ابتلاء بکثرت ہو جاتا ہے۔

تقلیل کلام کا مطلب

اس لیے اس کی تقلیل کو مجاہدہ کا ایک رکن قرار دیا گیا لیکن تقلیل کلام کا یہ مطلب نہیں کہ ضروری باتوں کو بھی کم کر دے بلکہ مطلب یہ ہے کہ فضول کلام چھوڑ دے گو مباح ہی ہو باقی جو باتیں حرام ہیں جیسے جھوٹ اور غیبت و بہتان وغیرہ وہ تو اس سے خود ہی چھوٹ جائیں گے کیونکہ وہ تو مجاہدہ حقیقیہ ہے جو شخص مجاہدہ حکمیہ کرے گا وہ مجاہدہ حقیقیہ کو کیسے ترک کر سکتا ہے رہا ضروری کلام سو اس کا ترک کرنا جائز نہیں کیونکہ اس سے یا ضروریات میں حرج یا مخاطب کو تکلیف ہوگی بعض لوگ غلو کے سبب ضروری کلام میں بھی تقلیل کرتے ہیں کوئی بات پوچھے تو پورا جواب ہی نہیں دیتے۔ بس آدھی بات منہ میں ہوتی ہے اور آدھی پیٹ میں اور وظیفے کے اندر تو بولنا حرام ہی سمجھتے ہیں خواہ کوئی کیسی ہی ضروری بات ہو مگر یہ ایسی چپ سادھ کر بیٹھتے ہیں کہ جواب ہی نہیں دیتے بس ہوں ہوں کئے جاتے ہیں نہ معلوم اس سے کیا مراد ہے ہمارے علم میں تو چھوٹے بچے مگنے موتنے کو بتلانے کے واسطے ہوں ہوں کیا کرتے ہیں جب ان کو پیشاب یا پاخانہ کا تقاضا ہوتا ہے اس وقت ایسے اشارے کرتے ہیں شریعت مقدسہ نے ضروری کلام کے واسطے نماز تک قطع کرنے کا حکم دیا ہے مثلاً کوئی اندھا جا رہا ہو اور اس کے سامنے گڑھا ہو جس میں اس کے گرنے کا اندیشہ ہے تو اگر تم نماز بھی پڑھ رہے ہو' تب بھی واجب ہے کہ اندھے کو گرنے سے بچاؤ نماز کو توڑو اور اس سے کہو کہ ذرا بچ کر چلے آگے گڑھا ہے۔

اگر بینم کہ نا بینا وچاہست   اگر خاموش نشینم گناہ است

(اگر دیکھوں کہ نابینا کے سامنے کنواں ہے پھر بھی خاموش رہوں اور نہ بتاؤں تو گناہ ہے)

ایسے وقت میں خاموشی گناہ ہے بلکہ نماز توڑ کر نابینا کو گڑھے میں گرنے سے بچانا واجب ہے مگر آج کل کے وظیفے نماز کو تو چاہے توڑ دیں مگر وظیفے کو نہیں توڑ سکتے۔اس میں بات کرنے کی مجال نہیں چاہے کسی پر کچھ ہی آ بنے' اللہ بچائے ایسے وظیفوں سے آج کل وظیفوں کے ساتھ قرآن سے بھی زیادہ ادب کا معاملہ کیا جاتا ہے کہ قرآن پڑھتے ہوئے تو دنیا کی ہزار باتیں کرلیں اور وظیفہ پڑھتے ہوئے دین کی بھی ضروری بات نہ کریں۔شریعت نے ضرورت کی یہاں تک رعایت کی ہے کہ اگر بلی کتے سے تمہارا نقصان چار آنے سے زیادہ کا ہوتا ہے تو نماز کو توڑ کر اپنے مال کی حفاظت کرلو شریعت پر چلنے والا کہیں نہیں اٹک سکتا اس کو قدم قدم پر شریعت کی وسعت کا اندازہ ہوتا رہتا ہے اور کیوں نہ ہو شریعت کا دعویٰ ہے "مَاجَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ" کہ خدا نے تمہارے اوپر دین میں کچھ بھی تنگی نہیں کی' نفی الحرج میرا ایک وعظ ہے جو الہ آباد میں ہوا تھا اور پہلے اس کے تمام ہونے کے لیے دعا بھی کرائی تھی اب وہ پورا ہو چلا ہے اور مطبع والے کہتے ہیں کہ جلدی طبع ہو جائے گا وہ اس مضمون میں بہت ہی کافی ہے۔امید ہے کہ اب وہ جلدی طبع ہو جائے گا۔یہ وعظ مولوی سعید احمد مرحوم کا ضبط کیا ہوا ہے مگر تسوید تفصیلی کا ان کو موقع نہیں ملا' دوسرے لوگوں نے صاف کیا ہے مرحوم کے اشارے بھی بہت کافی ہوتے ہیں اس لیے کام چل گیا ورنہ صاف کرنے والے نے تو محض پنسل پر سیاہی پھیر دی ہے۔تفصیل کچھ نہیں کی غرض شریعت میں تنگی بالکل نہیں ہے اسی لیے ضروری کلام کا ترک کرنا ممنوع ہے کیونکہ اس سے دوسرے لوگوں کو ایذا اور پریشانی ہوتی ہے اور شریعت مخلوق کو تکلیف سے بچانا چاہتی ہے اس لیے حکم ہے کہ اگر بیٹا نفل نماز پڑھ رہا ہو اور والدین میں سے کوئی پکارے تو دیکھے کہ ان کو اس کا نماز میں ہونا معلوم ہے یا نہیں اگر انہیں معلوم ہے کہ بیٹا نماز پڑھ رہا ہے اور پھر بھی پکار رہے ہیں تو نہ بولے کیونکہ جان کر پکارنا ان کی شرارت ہے اور اگر ان کو معلوم نہیں کہ بیٹا نماز پڑھ رہا ہے تو بول پڑے اور نماز کا بعد میں اعادہ کرلے یہ مسئلہ فقہاء نے حدیث سے سمجھا ہے۔واقعی دو فرقے اُمت کے لیے رحمت ہیں ایک فقہاء دوسرے صوفیاء۔

جریج عابد کی حکایت

فقہاء نے اس مسئلہ کو حدیث جریج سے مستنبط کیا ہے جریج بنی اسرائیل کا ایک عابد تھا۔ایک دفعہ یہ اپنے صومعہ میں نماز پڑھ رہا تھا کہ اس کی ماں کسی ضرورت سے آئی اور اس نے صومعہ کے نیچے کھڑے ہو کر آواز دی' جریج جریج' یہ نماز پڑھ رہا تھا اس نے دل میں حق تعالیٰ سے عرض کیا کہ اے اللہ میں نماز میں ہوں اور میری ماں پکار رہی ہے یعنی جواب دینے سے معذور ہوں' غرض نماز میں مشغول رہا۔اس نے پھر آواز دی جریج نے پھر وہی کیا اللھم امی و صلاتی اور بدستور نماز میں مشغول رہا۔حضور صلی

اللہ علیہ وسلم اس واقعہ کو بیان فرما کر ارشاد فرماتے ہیں: "لو کان فقیھا لا جاب امه" اگر جریج فقیہ ہوتا تو اپنی ماں کے پکارنے کا جواب دے دیتا اس لیے فقہاء نے سمجھا کہ والدین کے پکارنے پر نماز میں بول پڑنا جائز ہے۔ بشرطیکہ ان کو اس کا نماز میں ہونا معلوم نہ ہو یہ قید دوسرے دلائل کی وجہ سے بڑھائی گئی۔ جریج کی ماں نے اس موقع پر اپنے بیٹے کو کوسا بھی تھا' جب اس نے کئی آوازیں دیں یہ نہ بولا تو اس نے بددعا دی "اللھم لا تمت حتیٰ تریه وجوہ المومسات" یعنی خداوندا سے اس وقت تک موت نہ دیجیو جب تک یہ کسی فاحشہ کا منہ نہ دیکھ لے' معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں دینداری بہت ہی زیادہ تھی کہ رنڈی کا منہ دیکھنا اس زمانہ میں بددعا اور کوسنے میں بیان کیا جاتا تھا گویا غیر عورت کا منہ دیکھنا مردوں کے لیے بہت ہی بڑا عیب سمجھا جاتا تھا' جبھی تو اس کو کوسنے میں بیان کیا اور آج کل منہ دیکھنا تو کیا اس سے منہ کالا کرنا بھی عیب نہیں سمجھا جاتا۔

اسی لیے عورتوں میں مشہور ہے کہ مرد تانبہ ہے اور عورت موتی ہے۔ تانبہ تو دس مرتبہ سیاہ ہو جائے تو قلعی سے پھر ویسا کا ویسا ہی ہو جاتا ہے اور موتی کی ایک دفعہ آب جاتی رہے تو پھر کسی طرح اسی میں آب پیدا نہیں ہو سکتی۔ مطلب یہ ہے کہ مرد تو غیر عورت سے چاہے کتنی دفعہ منہ کالا کرلے چند دن کے بعد جب بات رفع دفع ہو جاتی ہے پھر ویسا کا ویسا ہی ہو جاتا ہے اور عورت اگر غیر مرد کے سامنے ایک دفعہ آ جائے تو ساری عمر کو اس کی آبرو برباد ہو جاتی ہے عمر بھر منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتی مگر حقیقت کے اعتبار سے یہ کلام غلط ہے۔ آج کل بے حیائی بڑھ گئی ہے اس لیے مردوں میں غیر عورت کے پاس جانا کوئی عیب نہیں رہا اگر حیا ہوتی تو مرد بھی عورت کے طرح ایک دفعہ بے حیائی کا کام کر کے عمر بھر کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔ پس حقیقت میں مرد و عورت دونوں کی آبرو موتی ہی جیسی ہے مگر بے حیائی کے غلبہ نے مردوں کو تانبہ بنا دیا ہے اور اگر یہی حال بے حیائی کا رہا تو چند دنوں میں عورتیں بھی موتی نہ رہیں گی وہ بھی مردوں کی طرح تانبہ ہو جائیں گی۔ چنانچہ ایسے قصے ہونے لگے ہیں کہ مرد نے بیوی کو تین طلاق کے بعد پھر گھر میں ڈال لیا اور وہ خوشی خوشی اس کے گھر میں رہتی ہے اور بے حیائی کو گوارا کرتی ہے اور پھر خاصہ منہ لے کر برادری کے سامنے آتی ہے اور برادری کی عورتیں اس سے اسی طرح ملتی ہیں جس طرح تین طلاق سے پہلے ملتی تھیں' کچھ ٹھکانا ہے اس بے حیائی کا (اگر یہی حال رہا تو کچھ دنوں میں کھلم کھلا بدکاری کرنے کے بعد بھی عورت مرد کے گھر میں خاصی طرح رہا کرے گی اور کوئی بھی اس کی بدکاری پر التفات نہ کرے گا کیونکہ تین طلاق کے بعد شوہر کے پاس رہنے میں اور بدکاری میں فرق ہی کیا ہے اللہ بچائے اس فتنہ سے ۱۲ جامع) غرض جریج کی ماں نے اس کو یہ کوسا دیا کہ خدا اسے موت

سے پہلے فاحشہ عورت سے پالا ڈالے، بددعا قبول ہوگئی اور ایک فاحشہ عورت جریج کے پیچھے پڑی اور اس کے صومعہ میں آ کر بدکاری پر اسے برانگیختہ کرنا چاہا یہ شخص متقی تھا اس نے دھکا کر اسے نکال دیا اس نے کہا کہ میں تجھ کو بدنام کر کے رہوں گی بڑا متقی بنا ہے۔ چنانچہ جنگل کے کسی چرواہے سے اس نے منہ کالا کیا جس سے حمل رہ گیا، جب بچہ پیدا ہوا تو لوگوں نے پوچھا یہ بچہ کس کے زنا سے ہوا اس نے جریج کا نام لے دیا۔ بس اب لوگ کہاں تھے بلا تحقیق گمان پکا لیا اور جریج کے صومعہ پر جا چڑھے اور لگے اسکو ڈھانے، جریج اندر سے نکلا اور لوگوں سے کہا کہ میرے صومعہ کو کیوں گراتے ہو کہا کمبخت تو اس قابل نہیں کہ صومعہ میں رہے تو زنا کار بدکار ہے اور ظاہر میں متقی بنا ہوا ہے اس نے پوچھا کہ آخر تم سے کس نے کہا کہ میں زانی ہوں، لوگوں نے اس عورت کومعہ بچہ کے پیش کیا کہ دیکھ یہ عورت کیا کہتی ہے کہ تو نے اس سے زنا کیا اور یہ بچہ تیرے زنا کا ہے، جریج نے کہا کہ ذرا ٹھہرو ابھی معلوم ہوا جاتا ہے اس کے بعد اس نے وضو کیا اور دو رکعت نماز پڑھی، پھر اس بچہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا اے بچہ خدا کے حکم سے بول اور بتلا کہ تیرا باپ کون ہے خدا تعالیٰ نے بچہ کو گویائی عطا فرمائی اس نے کہا میرا باپ فلاں چرواہا ہے، اب تو سب کو یقین ہو گیا کہ یہ عورت جھوٹی ہے اور اس نے چرواہے سے منہ کالا کر کے جھوٹ موٹ جریج کا نام لیا ہے، اتنی بڑی کرامت کے بعد کیا شبہ ہوسکتا تھا بس سب کے سب جریج کے قدموں پر گر پڑے کہ ہماری خطا معاف کرو ہم نے بلا تحقیق تم کو متہم کیا اور اب ہم تمہارا صومعہ سونے کی اینٹوں سے بنا دیں گے۔ اس نے کہا نہیں جیسا پہلے تھا تم ویسا ہی بنا دو، غنیمت ہوا کہ جریج کی ماں نے اتنی ہی بددعا کی تھی کہ خدا اسے رنڈی کا منہ دکھا دے آ گے اور کچھ نہ کہا تو جریج نے رنڈی کا منہ ہی دیکھا اور کچھ نہ ہوا اس لیے والدین کی بددعا سے ڈرنا چاہیے مگر ناحق کی بددعا نہیں لگتی اور یہاں جوام جریج کی بددعا لگ گئی تو وہ ناحق بددعا نہ تھی بلکہ جریج کے نہ بولنے سے اس کو ایذا ہوئی اور اس ایذا میں جریج کے فعل کو بھی دخل تھا کہ اس نے بے موقع سکوت کیا گو وہ بوجہ جہل کے اس سکوت میں معذور ہو مگر نفس جہل خود ایک جرم ہے اس لیے بددعا لگ گئی اور اس کی معذوری کا یہ اثر ظاہر ہوا کہ جلدی ہی برأت ہوگئی اور جن کو سوء عقیدت ہوئی تھی ان کو پھر حسن عقیدت ہوگئی۔

عوام کے اعتقاد کا کچھ اعتبار نہیں

اور یہاں سے ایک بات بھی ثابت ہوگئی جس کو ہمارے استاد مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ عوام کے اعتقاد کا کچھ اعتبار نہیں بیوقوف آدمی خواہ مخواہ لوگوں کے اعتقاد سے خوش ہوتا ہے کہ میرے اتنے معتقد ہیں ان عوام کے اعتقاد کی ایسی مثال ہے جیسے

گدھے کا خاص عضو کہ کبھی تو اتنا بڑھتا ہے جس کی حد نہیں اور کبھی ایسا غائب ہوتا ہے کہ پتہ بھی نہیں چلتا کہ یہ گدھا ہے یا گدھی۔ چنانچہ عوام نے محض ایک فاحشہ کے قول پر بلا دلیل جریج کے صومعہ کو ڈھانا شروع کر دیا۔ مدت دراز کا اعتقاد ذرا سی بات میں بالکل غائب ہو گیا اور جب اس کی کرامت سے بچہ بول پڑا تو پھر ایسے معتقد ہوئے کہ اس کا صومعہ سونے کی اینٹوں سے بنانے پر تیار ہو گئے اس لیے عوام کے اعتقاد کا کبھی اعتبار نہ کرنا چاہیے بلکہ معیار کسی کی حقیقت کمال کا یہ ہے کہ اہل نظر اس کے کمال کے معتقد ہوں۔ صائب نے خوب کہا ہے:

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خود را　　　عیسیٰ نتواں گشت بتصدیق خرے چند

(اے شخص اپنے موتی کو کسی اہل نظر کو دکھا چند گدھوں کی تصدیق سے کوئی عیسیٰ نہیں ہو سکتا)

غرض شریعت نے ضرورت کی اتنی رعایت کی ہے کہ ضرورت کے وقت نفل نماز توڑنے کی توسع کے ساتھ اجازت ہے اور بعض شرائط کے ساتھ فرض نماز توڑنے کی بھی اجازت ہے جیسے اندھے کے گرنے کا اندیشہ ہو اس لیے تقلیل کلام کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی ضروری باتیں بھی نہ کیا کرے لیکن ضرورت کی تفسیر سمجھ لینی چاہیے کہیں آپ سب باتوں کو ضرورت ہی میں نہ داخل کر لیں، بعضے ایسے وہمی بھی ہیں جن کو یہ سن کر کہ یہ ضروری باتوں کو ترک نہ کرنا چاہیے بات بات میں ضرورت کا وہم پیدا ہو گا کہ یہ بات بھی ضروری معلوم ہوتی ہے پھر ان کے نزدیک غیر ضروری بات کوئی بھی نہ رہے گی تو ضرورت کی تفسیر سنئے (اور یہ جواہرات کا ٹکڑا ہے اس کی قدر کرو کتابوں میں سر مارنے سے یہ جواہرات نہ ملیں گے)۔

ضروری باتوں کی تفسیر

ضرورت کی تفسیر یہ ہے **لولاہ لتضرر** یعنی جس کے نہ ہونے سے ضرر ہو پس جس بات کے ترک سے دنیا کا یا دین کا ضرر ہو وہ بات ضروری ہے۔ مثلاً ایک شخص تاجر ہے اس کے پاس کوئی خریدار آئے اور گھنٹہ بھر تک چیزوں کی قیمت دریافت کرتا رہے اور تاجر کو امید ہے کہ یہ ضرور کچھ خریدے گا تو جب تک یہ امید ہو اس وقت تک خریدار سے باتیں کرنا ضرورت میں داخل ہے کیونکہ اس صورت میں خریدار سے باتیں نہ کرنے میں دنیا کا ضرر ہے، تجارت کو نقصان پہنچے گا اس لیے شریعت اجازت دیتی ہے کہ وہ دو گھنٹے بھی تجارت کی باتیں کرے تو تم اس سے باتیں کرتے رہو ہاں سچی باتیں کرو جھوٹ اور مبالغہ سے کام نہ لو کہ خواہ مخواہ اپنے مال کی حد سے زیادہ تعریف کرو تو یہ سب باتیں ضرورت میں داخل ہیں اس سے قلب میں ذرا برابر ظلمت نہیں ہوتی یا کوئی شخص آپ سے ملنے آیا اس سے باتیں کرنا مزاج پوچھنا اور یہ دریافت کرنا کہ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں

مکان سے کب چلے تھے یہاں کب تک قیام رہے گا یہ بھی ضرورت میں داخل ہے۔ بعض خشک زاہدان باتوں کو فضول سمجھتے ہیں مگر یہ لوگ فقیہ نہیں یہاں سے معلوم ہوا کہ اس بات کا سمجھنا کہ کس بات کے ترک سے ضرر ہوتا ہے اور کس کے ترک سے ضرر نہیں ہوتا یہ بھی فقہاء ہی کا کام ہے فقیہ کہتا ہے کہ اس صورت میں مہمان سے اس قسم کی باتیں کرنا ضروری ہے کیونکہ یہ سوال نہ کرنے سے اس کی دل شکنی ہوگی، دل ٹوٹے گا کہ میری بات بھی نہ پوچھی اور مسلمان کا دل سنبھالنا بھی شرع میں مقصود ہے۔ غرض ضرر کے مواقع فقہاء کے طرز پر میں کہاں تک بیان کروں اس کے لیے تو بڑے وسیع وقت کی ضرورت ہے اور پھر بھی جزئیات کا احاطہ نہ ہو سکے گا' کلیات میں نے بیان کر دیئے ہیں جزئیات کو تم خود نکال لو اور جن میں اس کا مادہ بالکل نہیں وہ علماء سے مل کر پوچھتے رہیں اور بھی کچھ نہ کر سکیں تو کم از کم ان گناہوں سے تو بچتے رہیں جو زبان کے متعلق ہیں چاہے دقائق کی رعایت نہ کریں اور دقائق کی رعایت عوام تو کیا کریں گے علماء بھی خاص خاص ہی ان باتوں کو سمجھتے ہیں کہ کہاں ترک کلام سے ضرر ہوتا ہے کہاں ضرر نہیں ہوتا مگر جو باتیں گناہ کی ہیں وہ تو سب کو معلوم ہو سکتی ہیں ان کا ترک تو سب پر ضروری ہے اس لیے ذرا سی جبیا میں (جیب یعنی زبان کی تصغیر ۱۲) بیس آفات ہیں جن کو امام غزالی رحمہ اللہ نے احیاء میں بیان کیا ہے اور آج کل احیاء کا ترجمہ بھی ہو گیا ہے' اس کا مطالعہ کرنا چاہیے اگر اس کو طویل سمجھا جاوے تو کیمیائے سعادت کا ترجمہ اکسیر ہدایت بہت اچھی کتاب ہے اسی کا مطالعہ کر لو تو زبان کی آفات معلوم ہوں گی بس عوام کے لیے تو تقلیل کلام میں یہ درجہ کافی ہے کہ وہ زبان کے گناہوں سے بچتے رہیں اور جو خواص ہیں ان کو ضرورت و بے ضرورت کا لحاظ بھی کرنا چاہیے کیونکہ مجاہدہ بدون اس کے کامل نہیں ہو سکتا یہ تو تقلیل کلام کی حقیقت پر گفتگو تھی۔ اب میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ روزہ میں تقلیل کلام کی کس طرح رعایت کی گئی ہے۔

روزہ میں تقلیل کلام کی صورت

تقلیل کلام کی ایک صورت تو یہ ہے کہ زبان کو بند کر لیا جائے روزہ میں کسی سے بات ہی نہ کی جائے یہ طریقہ ہماری شریعت میں نہیں ہے۔ پہلی شریعتوں میں صوم سکوت مشروع تھا جیسا کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے:"فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا فَقُوْلِیْٓ اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا" (پھر اگر تم آدمیوں میں سے کسی کو اعتراض کرتا ہوا دیکھو تو کہہ دینا کہ میں نے اللہ تعالیٰ کے واسطے روزہ کی بات مان رکھی ہے سو آج میں کسی آدمی سے نہیں بولوں گی) مگر شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منسوخ کر دیا اب روزے میں بالکل بات نہ کرنا مکروہ ہے بلکہ ضرورت کے موقع پر بات کرنی چاہیے کیونکہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ ضرورت کے وقت بات نہ کرنے سے حرج یا لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے اس لیے شریعت اسلامیہ نے صوم سکوت کو مشروع نہیں کیا کیونکہ روزے کا

وقت ممتد ہے اتنے طویل سکوت سے دنیوی کاروبار بھی بند ہوجاویں گے اور بہت سے ضروری کاموں میں خلل پڑے گا' دین کے کام بھی مثل وعظ و تبلیغ وغیرہ کے بند ہوجائیں گے۔ ہاں نماز میں سکوت مشروع ہے مگر نماز تھوڑی دیر کی عبادت ہے فرض نمازیں تو پانچ منٹ میں ختم ہوجاتی ہیں اور نوافل میں بھی کچھ زیادہ دیر نہیں لگتی پھر نوافل ہمارے اختیار میں ہیں جس کو ضرر کا اندیشہ ہو وہ نوافل میں مشغول نہ ہو۔ غرض نماز میں تھوڑی دیر کا سکوت ہے اس سے ضرر نہیں ہوسکتا' اتنی دیر تو آدمی ویسی بھی خاموش رہا کرتا ہے البتہ روزے میں سکوت مشروع ہوتا تو اس سے دنیوی کاروبار میں بہت حرج واقع ہوتا اس لیے شریعت نے ہمارے حال پر رحم کر کے صوم سکوت کو منسوخ کر دیا مگر ایک دوسرے طریقے سے روزے میں تقلیل کلام کی رعایت کی گئی ہے اس لیے پہلے ایک مقدمہ سمجھ لینا چاہیے وہ یہ کہ قاعدہ ہے کہ نفس ایک آن میں دو طرف متوجہ نہیں ہوسکتا اسی طرح زبان بھی ایک وقت میں دو قسم کی باتیں نہیں کر سکتی۔ مثلاً جو شخص کتاب پڑھ رہا ہو وہ کتاب پڑھتے ہوئے بات نہیں کر سکتا اگر بات کرے گا تو اس وقت کتاب نہ پڑھے گا تو شریعت نے روزے میں کلام کو تو ممنوع نہیں کیا لیکن نفس اور زبان کو دوسرے کام کی طرف متوجہ کر دیا۔ اس طرح کہ روزے میں تلاوت قرآن کا اور ایام سے زیادہ اہتمام کیا گیا ہے چنانچہ تراویح میں ایک قرآن ختم کرنا جبکہ کوئی عذر نہ ہو حسب قول مشہور سنت مؤکدہ کر دیا گیا جس کی وجہ سے حفاظ کو خواہ مخواہ دن میں کئی مرتبہ سپارہ پڑھنا پڑتا ہے اور دور بھی کرنا پڑتا ہے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان میں خود تلاوت قرآن کا اور دنوں سے زیادہ اہتمام فرما کر چنانچہ حدیثوں میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ بالالتزام دور فرمانا مصرح ہے سب مسلمانوں کو عملاً اس کی ترغیب دی ہے کہ رمضان میں تلاوت قرآن زیادہ کریں خواہ وہ حافظ ہوں یا نہ ہوں تراویح میں قرآن سناویں یا نہ سناویں پھر آپ کا ارشاد ہے کہ قرآن کے ایک حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں اور یہ بھی ارشاد ہے کہ رمضان میں نفل طاعت کا ثواب فرض کے برابر ملتا ہے تو اب رمضان میں تلاوت قرآن کرنے سے ایک ایک حرف پر جو دس نیکیاں ملیں گی ان میں ہر نیکی پر فرض کام کے برابر ثواب ملے گا۔ اللہ اکبر کچھ ٹھکانا ہے اس ثواب کا اس سے بھی لوگوں کو خواہ مخواہ تلاوت کی رغبت زیادہ ہوگی۔

رمضان میں ترغیب تلاوت کا راز

غرض رمضان میں تلاوت قرآن کا شریعت نے بہت ہی اہتمام کیا ہے اور اس میں راز یہ ہے کہ نزول قرآن آسمان اول پر رمضان ہی کے مہینے میں ہوا ہے پھر وہاں سے تدریجاً تیئس سال میں نازل ہوا تو اس ماہ کو قرآن کے ساتھ خاص تعلق ہے جو دوسرے ایام کو نہیں یہی وجہ ہے کہ رمضان میں تلاوت قرآن بالمشاہدہ اور دنوں سے زیادہ آسان بھی ہے اور ظاہر ہے کہ جب انسان تلاوت قرآن

میں مشغول ہوگا تو لامحالہ دنیوی باتوں میں تقلیل ہوگی کیونکہ نفس ایک آن میں دو طرف متوجہ نہیں ہوسکتا تو تلاوت قرآن کے وقت اگر توجہ کے ساتھ تلاوت ہو۔ دوسری باتوں کا خیال بھی نہ آئے گا ورنہ زبان تو جب تک اس میں مشغول رہے گی۔ اس وقت تک دنیوی باتوں سے رکی رہے گی اس طرح سے تلاوت قرآن کے ضمن میں تقلیل کلام ہو جائے گی۔ پھر محض یہی نہیں کہ تقلیل کلام کا مجاہدہ حاصل ہو گیا اور کوئی نفع حاصل نہ ہو بلکہ اس میں ثواب بھی اتنا ہوتا ہے کہ کسی طاعت میں اتنا ثواب نہیں کہ ہر حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں اور رمضان میں وہ دس نیکیاں دس فرض کے برابر ہوتی ہیں یہ تو عام ثواب ہے اور جو کوئی زیادہ مخلص ہو تو اس کو ایک حرف پر سات سو نیکیاں تک ملتی ہیں بلکہ "وَاللّٰهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ" یعنی سات سو پر بھی انتہا نہیں بلکہ خدا تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اس سے بھی زیادہ دیتے ہیں۔ اب بتلائیے اگر شریعت میں تقلیل کلام کی وہی صورت تجویز کرتی جو اہل ریاضت میں مستعمل ہے کہ بس زبان کو گوند لگا دیا جائے اور بالکل خاموش بیٹھے رہا کریں تو یہ دولت بے شمار کیونکر حاصل ہو سکتی ہے۔ شریعت کے قربان جائیے کہ اس نے مجاہدہ تقلیل کلام کی وہ صورت تجویز کی جس سے اس مجاہدہ کا فائدہ بھی حاصل ہو جائے کہ زبان گناہوں سے بچی رہے، فضول باتیں کرنے کی عادت کم ہو جائے اور اس کے ساتھ ثواب بھی بے شمار ملتا رہے اور ثواب ہی پر بس نہیں بلکہ تلاوت قرآن میں بندے کو حق تعالیٰ کا ایک خاص قرب بھی حاصل ہوتا ہے جو خاموش رہنے میں کبھی حاصل نہیں ہوسکتا کیونکہ قرآن میں ایک خاص تجلی ہے جب اس کا ظہور قلب پر ہوتا ہے تو دل میں حق سبحانہ کے سوا کسی کی گنجائش نہیں رہتی، قلب عظمت حق سے پر ہو جاتا ہے۔ بس وہ حال ہوتا ہے:

چو سلطان عزت علم بر کشد   جہاں سر بجیب عدم در کشد

(جب وہ سلطان عزت جھنڈا بلند کرتا ہے تو یہ کائنات تمام عدم کے جیب میں سر ڈال دیتی ہے)

پھر ان باطنی دولتوں کے ساتھ قرآن میں ایک ظاہری لذت بھی ہے جس کی وجہ سے کثرت تلاوت قرآن آسان ہوگئی اگر ذرا سا بھی ذوق ہو تو قرآن سے زیادہ کوئی کلام لذیذ نہیں اس میں وہ لذت ہے کہ جتنا پڑھتے جاؤ لذت بڑھتی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کثرت تلاوت سے جی نہیں گھبراتا، بعض خدا کے بندے روزانہ ایک ختم کرتے ہیں اگر قرآن میں یہ لذت نہ ہوتی تو بھلا روزانہ ایک ختم ہو سکتا تھا، ہرگز نہیں بعضے دو دن میں ایک ختم کرتے ہیں بعضے دس سپارے روزانہ پڑھ کر تین دن میں ختم کر لیتے ہیں اور ایسے تو اللہ کے بندے بہت ہیں جو رمضان میں تین دفعہ قرآن شریف ختم کر لیتے ہیں۔

آخر قرآن میں کوئی تو لذت ہے جو اس کی بار بار تلاوت کرنا آسان ہے بعض کلاموں میں یہ کمال

ہوتا ہے کہ ان میں بدون سمجھے بھی لطف آتا ہے قرآن میں یہ صفت سب سے زیادہ ہے اور اگر خدا نے فہم معانی کی بھی توفیق دی ہے پھر تو اس لذت کا پوچھنا ہی کیا، بعض لوگ جن کو معانی قرآن کا ذوق ہے ایک ایک آیت پر گھنٹوں وجد کرتے ہیں بعض اللہ کے بندوں نے ایک ہی آیت کے تکرار میں رات سے صبح کر دی ہے روتے جاتے ہیں اور ایک ہی آیت کو بار بار پڑھتے جاتے ہیں پھر بھی لذت ختم نہیں ہوتی اگر کوئی صحیح قرآن پڑھنے والا ہو اور اس کے ساتھ خوش آواز بھی ہو اس کا قرآن سنئے، واللہ بدون سمجھے بھی وہ لطف آئے گا جو کسی کلام میں نہ آئے گا قرآن کو صحت کے ساتھ پڑھا جائے تو ہر لہجہ میں مزہ آتا ہے ہاں موسیقی کے قواعد پر نہ پڑھنا چاہیے اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔

مثنوی مولانا روم رحمہ اللہ کی شوکت اور حلاوت

قرآن کے مثنوی میں یہ بھی صفت ہے کہ اس کے اشعار سننے میں ہر شخص کو مزا آتا ہے چاہے مطلب کچھ بھی نہ سمجھتا ہو اسی لیے مولانا جامی رحمہ اللہ نے کہا ہے:

مثنوی مولوی معنوی ہست قرآن در زبان پہلوی

(یہ مثنوی مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کی فارسی زبان میں الہامی کتاب ہے)

بظاہر اس میں شبہ ہوتا ہے کہ پوری مثنوی میں تو قرآن کے مضامین نہیں ہیں پھر اس کو قرآن در زبان پہلوی کیسے کہہ دیا۔ حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ نے اس کا مطلب اور بیان فرمایا ہے کہ اس جگہ قرآن کے معنے مطلق کلام الہامی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ مولانا رومی پر غیبی واردات کا غلبہ ہوتا تھا اس وقت مثنوی کے اشعار آپ کی زبان پر جاری ہوتے تھے اور مولانا حسام الدین رحمہ اللہ ان کو لکھ لیتے تھے جب حالت فرو ہو جاتی تو اشعار کی آمد بند بھی ہو جاتی تھی۔ اسی طرح اس کی تصنیف تمام ہوئی ہے تو یہ ساری کتاب غلبہ حال میں لکھی گئی ہے اس وقت بطور الہام کے یہ کلام مولانا کی زبان سے نکلتا تھا۔ اسی لیے مثنوی میں ایک شوکت اور حلاوت ایسی ہے جو دوسروں کے کلام میں نہیں پائی جاتی یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ قرآن میں ایک لذت ہے جو بے سمجھے پڑھنے میں بھی ہر شخص کو حاصل ہوتی ہے۔

تلاوت قرآن کی صورت میں تقلیل کلام

قرآن میں ایک بات یہ ہے "لایخلق من کثرۃ الرد" کہ یہ کلام بار بار پڑھنے سے پرانا نہیں ہوتا ہر دفعہ تازہ کلام معلوم ہوتا ہے کوئی غزل کیسی ہی عمدہ ہو دس مرتبہ سن لو تو پھر اس کے سننے میں مزا نہیں آتا بلکہ جی گھبرانے لگتا ہے اور قرآن کو نہ معلوم کتنی مرتبہ سنا ہوگا اور کتنی مرتبہ پڑھا ہوگا یہ پرانا نہیں ہوتا، ہر دفعہ نیا لطف آتا ہے بلکہ بار بار ختم کر کے پھر شروع کرنے کو جی چاہتا ہے۔ چنانچہ

جولوگ تلاوت قرآن کے عادی ہیں ان سے پوچھ لیجئے اور تم عادت کرکے دیکھ لو پھر خود ہی تجربہ ہو جائے گا جولوگ تلاوت قرآن کے عادی ہیں اگر کسی دن ان کا معمول پورا نہ ہو اور تلاوت کا موقع نہ ملے تو دن بھران کا دل برا رہتا ہے جیسے بھوکے پیاسے کو روٹی اور پانی کی طلب ہوتی ہے اس طرح ان کا دل تلاوت کو ترستا رہتا ہے جب قرآن پڑھ لیتے ہیں اس وقت تسلی ہوتی ہے جیسے بھوکے کو غذا مل گئی' پیاسے کو پانی مل گیا ورنہ ماہی بے آب کی طرح تڑپتے رہتے ہیں اگر کثرت تلاوت سے قرآن پرانا ہو جایا کرتا تو یہ طلب اور یہ بے چینی کبھی نہ ہوتی خصوصاً ان لوگوں کو جو مہینہ میں کئی بار ختم کرتے ہیں مگر یہاں یہ حالت ہے کہ جو جتنا زیادہ تلاوت کا عادی ہے وہ اتنا ہی اس کے لیے بے چین ہے تو شریعت نے عجیب مجاہدہ تجویز کیا ہے جس میں تقلیل کلام کے ساتھ ظاہری لذت بھی ہے جس کی کثرت قلب پر گراں بھی نہیں ہوتی پھر اس میں قرب بھی بے انتہا ہے ثواب بھی بے شمار ہے بھلا تقلیل کلام کی ایسی صورت کوئی بتلا سکتا ہے۔ پھر جو صورت مجاہدہ تقلیل کلام کی اہل ریاضت نے تجویز کی ہے کہ زبان کو بند کرلیا جائے اس میں ایک نقص یہ بھی ہے کہ اس طرح قوت گویائی کم ہو جاتی ہے اگر ایسا شخص کسی وقت تقریر کرنا چاہے تو اس کے کلام میں شوکت وقوت نہ ہوگی۔

قوت نطق بڑا جوہر ہے

قوت نطق انسان میں بڑا جوہر ہے زبان سے بعض دفعہ وہ کام لیے گئے ہیں جو تلوار سے نہ ہو سکتے تھے تو اس قوت کا معطل و بیکار ہو جانا بہت بڑا نقص ہے مگر شریعت نے تقلیل کلام کی جو صورت تجویز کی ہے اس سے قوت کلام بڑھتی ہے تجربہ ہے کہ کثرت تلاوت قرآن سے کلام میں بلاغت وفصاحت پیدا ہوتی ہے اور گویائی میں قوت پیدا ہوتی ہے۔

تلاوت قرآن اور قوت گویائی

تو سبحان اللہ کیا عجیب مجاہدہ ہے کہ تقلیل کلام کے ساتھ تقویت کلام مجتمع کردی بھلا ضدین کو کوئی اس طرح جمع کر سکتا ہے ہرگز نہیں یہ بات تلاوت قرآن ہی میں ہے کہ اس کی مشغولی میں تقلیل کلام بھی ہے اور ساتھ ساتھ گویائی کی قوت بھی حاصل ہوتی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ جو شخص اپنے کلام میں بلاغت پیدا کرنا چاہے وہ تلاوت قرآن کثرت سے کیا کرے ۱۲ جامع) اب میں ایک مسئلہ تصوف کا مقام کے متعلق بیان کرکے شاید بیان کو ختم کردوں خدا نے آج وعظ کی لاج رکھ لی کہ پہلے بیانات کے تتموں سے وعظ طویل ہو گیا ورنہ تقلیل کلام کے متعلق زیادہ مضمون ذہن میں نہیں ہے یا یوں کہئے کہ تنگی وقت کی وجہ سے مضمون آتا نہیں کیونکہ اب دیر بہت ہوگئی ہے۔

تحلیہ اور تخلیہ

وہ مسئلہ یہ ہے کہ سلوک طریق کے دو جز ہیں ایک تحلیہ (بالحاء المہملہ) دوسرے تخلیہ (بالخاء المعجمہ) تحلیہ کے معنے لغت میں آراستہ کرنا اور اصطلاح صوفیاء میں تحلیہ یہ ہے کہ سالک اپنے کو اخلاق حمیدہ و تعلق مع اللہ سے آراستہ کرے جس کا طریقہ طاعات وذکر میں مشغول ہونا ہے اور تخلیہ کے معنے لغت میں خالی کرنے کے ہیں اور اصطلاح میں سالک کا اپنے کو اخلاق رذیلہ سے پاک کرنا اور غیر سے تعلق منقطع کرنا ہے اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ سلوک کے تحلیہ اور تخلیہ دونوں کی ضرورت ہے لیکن اس میں اختلاف ہے کہ تحلیہ کو مقدم کیا جاوے یا تخلیہ کو مشائخ میں دونوں طریقے مستعمل ہیں۔ بعض تحلیہ کو مقدم کرتے ہیں اس کے بعد تخلیہ کرتے ہیں بعض تخلیہ کو مقدم کرتے ہیں اس کے بعد تحلیہ کرتے ہیں اور ہر دونوں طریق سے کامیابی ہوتی ہے جیسے معالجات امراض جسمانیہ میں بھی یہ دونوں طریقے مستعمل ہیں حکماء یونان تخلیہ کو مقدم کرتے ہیں یعنی پہلے مادہ فاسد کو نکالتے ہیں بعد میں تقویت طبع کا اہتمام کرتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ جب تک مادہ فاسد کا اخراج نہ ہو اور مرض زائل نہ ہو اس وقت تک تقویت کی تمام تدبیریں بے کار ہیں۔ اس صورت میں اگر تم طبیعت کو قوت پہنچاؤ گے تو اس سے ممکن ہے کہ مرض کو قوت پہنچے۔ اس لیے طب یونانی میں بحالت مرض تقویت کی تدبیریں نہیں کی جاتی۔ ہاں صحت کے بعد کوئی خمیرہ یا معجون وغیرہ قوت کے لیے کھلاتے ہیں یعنی تخلیہ کے بعد تحلیہ کرتے ہیں۔

حکماء یورپ اور حکماء یونان کا طریق علاج

اور حکماء یورپ کی رائے یہ ہے کہ مرض کی حالت میں سب سے پہلے تقویت طبع کا اہتمام کرنا چاہیے اگر اس میں دیر کی گئی اور ازالہ سبب مرض ہی پر صرف توجہ کی گئی اور تقویت طبع کا خیال نہ کیا گیا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ازالہ سبب مرض تک طبیعت نہایت کمزور ہو جائے گی اور جب تک تم سبب کا ازالہ کرو گے اس وقت تک مریض ضعف طبع سے کہیں سے کہیں پہنچ جائے گا' پھر غایت ضعف کی حالت میں سنبھال دشوار ہو جائے گی اس لیے حکماء یورپ اول تقویت طبع کا اہتمام کرتے ہیں یعنی تحلیہ کو مقدم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تحلیہ سے تخلیہ خود ہو جاتا ہے یعنی جب طبیعت قوی ہو جاتی ہے تو وہ مرض کو خود زائل کر دیتی ہے۔ حکماء یونان اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ضعف طبع کا سبب تو مرض ہی ہوا ہے اور اگر مرض اور سبب مرض کا ازالہ ہو گیا تو طبیعت خود قوی ہو جائے گی اور جب تک سبب ضعف موجود ہے اس وقت تک طبیعت کو قوت حاصل نہیں ہو سکتی اور اگر کسی تیز دوا سے قوت پہنچا بھی دی گئی تو وہ عارضی قوت ہوگی دیرپا نہ ہوگی قابل اعتبار وہی قوت ہے جو مانع کے ارتفاع کے بعد پیدا ہو۔ غرض

طرفین سے دلائل بیان کیے جاتے ہیں اور دونوں طریقوں سے کامیابی ہوتی ہے۔ اجسام طبعیہ کے خواص میں نظر کرنے سے بھی دونوں کی تائید ہوتی ہے بعض خواص سے حکماء یونان کے قول کی تائید ہوتی ہے اور بعض خواص سے حکماء یورپ کے قول کی۔

مثلاً جس بوتل میں پانی بھرا ہوا ہے اس میں اگر آپ ہوا بھرنا چاہیں تو جب تک پانی بھرا ہوا ہے اس وقت تک ہوا اس کے اندر نہیں پہنچ سکتی، پانی گرا دو تو ہوا خود بخود بھر جائے گی۔ اس میں حکماء یونان کے قول کی تائید ہوتی ہے کہ تخلیہ کے بعد تحلیہ آسان ہو جاتا ہے جہاں ظرف کو غیر سے خالی کیا پھر اصلی حالت خود بخود عود کر آتی ہے اور اگر کسی بوتل میں ہوا بھری ہو اور آپ اس کو نکال کر پانی بھرنا چاہیں تو ہوا کو پہلے نکالنے کی ضرورت نہیں بلکہ بوتل میں پانی بھرنا شروع کرو بس ہوا ساتھ کے ساتھ خود نکلتی رہے گی۔ چنانچہ جس وقت بوتل منہ تک پانی سے بھر جائے گی اس وقت ہوا بالکل نہ رہے گی اس خاصیت سے حکماء حال کی تائید ہوتی ہے کہ تحلیہ سے تخلیہ خود بخود ہو جاتا ہے تخلیہ کو مقدم کرنے کی ضرورت نہیں تم تحلیہ شروع کرو طبیعت عوارض سے خود ہی خالی ہوتی چلی جائے گی۔ اسی طرح صوفیہ کی بھی رائے مختلف ہوگئی بعض کے یہاں صفات حمیدہ اور تعلق مع اللہ پہلے پیدا کیا جاتا ہے پھر ذمائم کی اصلاح کی جاتی ہے اور بعض کے یہاں صفات رذیلہ اور تعلق غیر کو اول قطع کیا جاتا ہے پھر صفات حمیدہ اور تعلق مع اللہ پیدا کیا جاتا ہے اور ہر فریق نے اپنی تائید کے لیے قرآن سے بھی استنباط کیا ہے۔ فریق اول اس آیت کو اپنی تائید میں پیش کرتا ہے "واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ" (اور صبر اور نماز سے سہارا حاصل کرو) کہ اس آیت میں استعانت بالصبر کو مقدم کیا گیا ہے اور صبر کے معنے ہیں کف النفس عن المعاصی یعنی نفس کو معاصی سے روکنا اور یہی حاصل ہے تخلیہ کا اور استعانت بالصلوٰۃ کو مؤخر کیا گیا ہے جو کہ تحلیہ کی قسم میں سے ہے تو اس آیت کو تخلیہ کو تحلیہ پر مقدم کیا گیا ہے۔

تحلیہ اور تخلیہ کی ساتھ ساتھ ضرورت

مگر اس میں قول فیصل یہ ہے کہ نہ تحلیہ کو مطلقاً مقدم کیا جائے نہ تخلیہ کو بلکہ دونوں کو دوش بدوش لے چلنا چاہیے کہ ساتھ ساتھ تحلیہ و تخلیہ دونوں ہوتے رہیں اگر تحلیہ کو مطلقاً مقدم کیا گیا تو بعض دفعہ رذائل ایسے قوی ہوتے ہیں کہ سارا تحلیہ بیکار ہو جاتا ہے مثلاً کوئی شخص سر سے پیر تک پاخانہ میں بھرا ہو تو اس کے بدن پر عطر ملنا بے کار ہے وہ عطر کو بھی لے ڈوبے گا اسی طرح اگر تخلیہ کو مقدم کیا گیا تو اتنا زمانہ تحلیہ کی برکات سے خالی جائے گا پھر ممکن ہے کہ تخلیہ میں دیر لگ جائے اور کوتاہی عمر کی وجہ سے تحلیہ کی نوبت ہی نہ آئے تو یہ شخص تعلق مع اللہ سے بالکل ہی کورا ہو جائے گا۔ اس لیے محققین کی رائے اب یہ ہے کہ تحلیہ اور تخلیہ ساتھ ساتھ ہونا چاہیے۔ چشتیہ کے یہاں پہلے تخلیہ مقدم تھا اور اب بھی ان کو تحلیہ کے ساتھ تخلیہ کا اہتمام زیادہ ہوتا ہے مگر پہلے یہ حالت تھی کہ برسوں مجاہدات کراتے تھے پھر مدت

کے بعد بارہ تسبیح وغیرہ تعلیم کرتے اور نقشبندیہ پہلے ہی دن ذکر تعلیم کردیتے تھے ان کے یہاں تحلیہ مقدم تھا بعد میں تخلیہ کراتے تھے اور اب گو دونوں سلسلے کے محققین کی رائے بدل گئی مگر مذاق پر چشتیہ کے تخلیہ غالب ہے اور نقشبندیہ کے مذاق پر تحلیہ غالب ہے مگر باوجود اس کے اہل تربیت جو محقق ہیں اس میں طالب کے مذاق پر زیادہ مدار رکھتے ہیں جس کو وہ اپنی خداداد بصیرت سے تشخیص کر لیتے ہیں۔

حضرات نقشبندیہ و چشتیہ کا مذاق اختلاف

چنانچہ مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بیعت کے متعلق مشورہ لیا کہ میں چشتیہ سلسلہ میں داخل ہوں یا نقشبندیہ میں حضرت حاجی صاحب نے ان سے فرمایا اچھا یہ بتلاؤ کہ اگر ایک زمین میں جھاڑ جھنکاڑ بکثرت کھڑے ہوں اور کوئی شخص اس میں تخم پاشی کرنا چاہے تو اس کی بہتر صورت کیا ہے آیا اس کو اول جھاڑ جھنکاڑ صاف کرنا چاہیے اور بعد میں تخم پاشی کرے یا پہلے تخم پاشی کرے اور بعد میں جھاڑ جھنکاڑ کو صاف کرتا رہے۔ مولانا محمد منیر صاحب نے کہا کہ حضرت میری رائے میں تو تخم پاشی پہلے کر دینا چاہیے کچھ تو پیدا ہو جائے گا پھر جھاڑ جھنکاڑ کو بھی صاف کرتا رہے اگر اول جھاڑ جھنکاڑ وغیرہ کی صفائی میں لگ گیا تو ایسا نہ ہو کہ عمر اسی میں تمام ہو جائے اور تخم پاشی کی نوبت ہی نہ آئے۔ حاجی صاحب نے ہنس کر فرمایا کہ بس نقشبندیوں میں جاؤ تمہاری طبیعت کو اسی طریق ہی سے مناسبت ہے۔ یہ مذاق نقشبندیہ ہی کا ہے کہ جھاڑ جھنکاڑ کو بعد میں صاف کرے تخم پاشی پہلے کر دے، چشتیہ کا مذاق یہ ہے کہ وہ پہلے جھاڑوں کو صاف کرتے ہیں بعد میں تخم پاشی کرتے ہیں تو چشتیہ کا اصلی مذاق تو یہی ہے مگر اب زمانہ کی حالت اور عمر کی کوتاہی اور فراغ کی قلت پر نظر کر کے دونوں طریق کے محقق نے فیصلہ کر دیا ہے کہ دونوں کو دوش بدوش لے چلو یعنی زمین کو بھی تھوڑا تھوڑا صاف کرتے جاؤ اور جتنی زمین صاف ہوتی جائے اس میں تخم پاشی بھی کرتے جاؤ۔ ساری زمین کی صفائی کا انتظار نہ کرو تو اب الحمدللہ جو محقق ہیں وہ تخلیہ اور تحلیہ ساتھ ساتھ کرتے ہیں، چشتی اور نقشبندی دونوں طریقوں کو ملا دیا بس وہ حال ہو گیا، مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیَانِ دونوں دریاؤں کو ساتھ ساتھ لے جا رہے ہیں اب جس دن یہ شخص فارغ ہوگا نقشبندی ہوگا اور چشتی بھی دونوں طریق کا فاضل ہوگا اور یہ فیصلہ ایسا ہے جیسا مدرسین کے طرز میں پہلا اختلاف تھا کہ منقولات کو تعلیم میں مقدم کرنا چاہیے یا معقولات کو بعض کی رائے یہ تھی کہ منقولات کو مقدم کرا چاہیے کیونکہ وہ مقاصد ہیں اگر معقولات کو مقدم کیا گیا تو ایسا نہ ہو کہ پھر یہ شخص قلت فراغ یا قصر عمر کی وجہ سے منقولات سے محروم ہی رہ جائے تو یہ سارا زمانہ تعلیم کا بے کار ہی گیا کیونکہ یہ تو غیر مقصود کی تحصیل میں گزرا بعض کی رائے یہ تھی کہ معقولات کو مقدم کرنا چاہیے کیونکہ وہ مقدمات میں سے ہے اور اس سے عقل میں تیزی پیدا ہوتی ہے اور اس کی ضرورت مقاصد سے پہلے ہے جب اول عقل

روشن ہو جائے گی تب مقاصد کا فہم آسان ہوگا' دوسرے اگر معقولات کو موخر کیا گیا تو اس میں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ اس شخص پر رنگ معقول ہی کا غالب ہوگا کیونکہ جو رنگ اخیر میں چڑھتا ہے وہی غالب رہتا ہے اور اسی کا اثر طبیعت پر رہ جاتا ہے اور اگر منقول کو موخر کیا گیا تو اخیر میں اسی کا رنگ طبیعت پر غالب رہے گا۔ یہ تو ہر فریق کے دلائل تھے مگر علماء محققین نے اب فیصلہ کر دیا ہے کہ یہ معقول کو علی الاطلاق مقدم کرو نہ منقول کو بلکہ دونوں کو دوش بدوش لے چلو اور معقول بقدر ضرورت پڑھاؤ منقول زیادہ پڑھاؤ اخیر میں اس شخص پر منقول ہی کا اثر غالب رہے گا اور ساتھ ساتھ معقولات پڑھنے سے فہم منقول میں مدد بھی ملے گی۔ چنانچہ اب مدارس میں اسی طریق پر عمل ہے یہ تو مسئلہ تھا۔

شریعت مقدسہ میں تمام مجاہدات کی رعایت

اب میں بتلانا چاہتا ہوں کہ جو بات محققین نے عرصہ دراز کے بعد طے کی ہے شریعت مقدسہ نے اس کو پہلے ہی طے کر دیا ہے مگر اس پر کسی کی نظر نہیں پہنچی وہ یہ کہ شریعت نے تمام مجاہدات میں اس کی رعایت کی ہے کہ محض تخلیہ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مجاہدہ کی صورت وہ تجویز کی جس میں تخلیہ اور تحلیہ ساتھ ساتھ ہوتا رہے۔ مثلاً تقلیل منام کی یہ صورت تجویز نہیں کی کہ رات کو خالی بیٹھے جاگا کرو بلکہ اس کو تراویح اور تہجد کی صورت میں تجویز کیا جس میں جاگنا بھی ہو گیا جو ترک راحت ہونے کی وجہ سے تخلیہ ہے اور ساتھ ساتھ عمل بھی ہوتا رہا جو تحلیہ ہے۔ اسی طرح تقلیل کلام کی یہ صورت تجویز نہیں کی کہ زبان کو بند کر کے بیٹھ جاؤ بلکہ اس کی یہ صورت تجویز کی کہ تلاوت قرآن میں مشغول رہو اس میں زبان رذائل و ذمائم سے بھی محفوظ ہو گئی۔ یہ تو تخلیہ تھا اور ساتھ ساتھ ذکر بھی ہو رہا ہے یہ تحلیہ ہے اور اس میں ایک بڑا راز ہے جس کے معلوم ہو جانے کے بعد ایک بہت بڑا خطرہ رفع ہو جائے گا جو سالکین کو پیش آتا ہے وہ خطرہ یہ ہے کہ بعض سالکین کو ترک تعلقات کا بے حد اہتمام ہوتا ہے اور اسی کے دقائق میں غور و فکر اور عمل کو لگائے رکھتا ہے مثلاً کسی نے اپنے ذمے بہت سے فضول کام لے رکھے تھے انہیں کم کر دیا' بازار کے کام کم کر دیئے' معاملات و تعلقات میل جول وغیرہ کو اس مصلحت سے گھٹا دیا کہ ان تعلقات کے کم ہونے سے تعلق مع اللہ پیدا ہو پھر قلب کو خالی کر کے متوجہ بحق ہو یہ نیت اچھی ہے اور مذاق چشتیہ کے موافق ہے مگر اس کے استعمال میں بعض دفعہ غلطی ہو جاتی ہے وہ یہ کہ تخلیہ اور تحلیہ دونوں ساتھ ساتھ تو تھے نہیں یعنی جس زمانہ میں یہ شخص تقلیل تعلقات غیر میں مشغول ہوتا ہے اس وقت تکثیر تعلق مع اللہ میں مشغول نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک وقت اس پر ایسا گزرتا ہے کہ اس کا دل بالکل خالی ہو جاتا ہے کہ نہ اس میں تعلق مع الخلق ہے نہ تعلق مع اللہ کیونکہ تعلق مع اللہ سے تو قلب کو بھرنے کا

اس نے قصد ہی نہیں کیا یا قصد کیا ہو مگر اس کے لیے عمل تھوڑا کیا جو کافی نہیں ہوا اور تعلق مع اللہ چونکہ تعلق مع الغائب ہے اس لیے وہ ابھی ایسا قوی نہیں ہوا کہ دوسرے تعلقات کو دل سے نکال کر خود اس میں بھر جائے تو اس نے اپنے نزدیک مخلوق سے اپنے دل کو خالی کیا لیکن وہ اس وقت تعلق مع الحق سے بھی خالی ہے تو شیطان نے میدان خالی پا کر اپنا قبضہ جما لیا کیونکہ خالی میدان پر دشمن کا قبضہ آسانی سے ہو جاتا ہے اس کی ایسی مثال ہے کہ تم نے سپاہیوں کے واسطے ایک گاڑی خالی کرائی جس میں چمار بیٹھے تھے لیکن غلطی یہ کی کہ چماروں کے اترنے کے ساتھ سپاہیوں کو بھرنا شروع نہ کیا بلکہ گاڑی کے خالی ہونے کا انتظار کیا اب جس وقت گاڑی چماروں سے خالی ہو گئی اور سپاہیوں سے بھی خالی تھی دشمن نے خالی دیکھ کر وہاں بستر جما لیا تم کو چاہیے تھا کہ جو چمار اترتا جاتا اس کی جگہ ایک سپاہی کو بٹھاتے جاتے تاکہ گاڑی خالی نہ ہوتی اور دشمن کو سہولت سے قبضہ کرنے کا موقع نہ ملتا اسی لیے بزرگوں نے لکھا ہے کہ بعض دفعہ تعلقات مباحہ بھی دل کے واسطے شیطان سے پہرہ دار ہوتے ہیں کیونکہ دل بھرا ہوا تو ہے گو تعلق مع اللہ سے نہ سہی تعلقات مباحہ ہی سے بھرا ہوا سہی مگر میدان خالی تو نہیں تو دشمن وہاں نہیں آ سکتا اسی لیے وہ طالب کو نوکری چھوڑنے کی جلدی اجازت نہیں دیتے کیونکہ وہ دیکھتے ہیں کہ تعلق مع اللہ بھی ایسا قوی نہیں ہوا جو دل کو پر کر دے اگر نوکری کا جائز تعلق بھی قلب سے نکل گیا تو دل بالکل خالی رہ جائے گا اور اس میں تشویشات پیدا ہوں گی جن کو ضعیف تعلق مع اللہ جو اس حالت میں ہے رفع نہیں کر سکتا۔ اسی لیے قلب کا بالکل خالی رہنا اچھا نہیں اس میں کچھ نہ کچھ ہونا چاہیے جبھی شیطان سے حفاظت ہو سکتی ہے جب تک تعلق مع اللہ سے قلب پر نہیں ہوا ہو تو تعلق مع الخلق ہی سے پر رہے بشرطیکہ وہ تعلق مباح ہو۔

قلب کا بالکل خالی ہونا اچھا نہیں

حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہی تحقیق ہے کہ جب تک تعلق مع اللہ قوی نہ ہو اس وقت تک تعلقات مباح کو ترک نہ کرو ایسا نہ ہو کہ زمین کو موروثی سے چھڑا لو اور خود بھی کھیتی نہ کر سکو تو زمین خالی دیکھ کر کوئی دشمن قبضہ کر کے دعویدار ہو جائے پہلے کسی کو کاشت کے واسطے مقرر کر لو پھر موروثی کو الگ کرنا۔ خلاصہ یہ کہ قلب کا بالکل خالی ہونا اچھا نہیں اب سمجھو کہ شریعت نے جو مجاہدات میں محض ترک پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ساتھ ساتھ عمل بھی مشروع کیا اس میں راز یہی ہے کہ اگر مجاہدہ میں صرف ترک پر اکتفا کیا جائے اور اس کے ساتھ کوئی عمل تعلق مع اللہ کے بڑھانے والا نہ کیا جائے تو نتیجہ مجاہدہ کا یہ ہوگا کہ قلب تعلقات غیر سے خالی ہونے کے ساتھ تعلق مع اللہ سے بھی خالی ہوگا اور اس صورت میں شیطان کا قلب پر قبضہ جما لینا آسان ہو جائے گا۔ اسی واسطے شریعت نے ہر مجاہدہ میں

اس کی رعایت کی ہے کہ تعلقات مباحہ کو ترک کر کے اعمال میں مشغول کر دیا ہے تا کہ قلب خالی نہ ہو یہ مسئلہ شیخ ابن قیم رحمہ اللہ کی تقریر سے اول حل ہوا تھا حق تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے (انہوں نے اپنے کتاب الدواء الکافی میں یہ مضمون لکھا ہے) اس سے معلوم ہوا کہ ابن القیم رحمہ اللہ صوفی محقق تھے' خشک زاہد نہ تھے حق تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے عجیب بات لکھی۔

خلاصہ وعظ

اسی اصل پر میں کہتا ہوں کہ شریعت نے تقلیل کلام کی جو صورت تجویز کی ہے اس میں بھی اس راز کی رعایت ہے یعنی شریعت نے یہ نہیں کیا کہ روزے میں زبان بند کر لیا کرو کیونکہ اس سے صرف تعلق مع الخلق میں کمی ہوگی تعلق مع الحق میں کیا زیادتی ہوئی تو نتیجہ وہی ہوگا کہ دل دونوں سے خالی ہو جائے گا بلکہ یہ صورت تجویز کی کہ قرآن کی تلاوت میں مشغول رہو اس سے تعلق مع الخلق کی کمی کے ساتھ تعلق مع الحق بڑھتا رہے گا۔ اب دل خالی نہ ہوگا ایک چیز نکلے گی اور اس کی جگہ تعلق مع اللہ بھرے گا تو دل شیطان سے بالکل محفوظ رہے گا۔ بحمداللہ ہر پہلو سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ شریعت نے مجاہدہ تقلیل کلام کی جو صورت نہیں ہو سکتی اس میں کوئی خطر کچھ بھی نہیں اور منافع بے شمار ہیں اور مجاہدہ عرفیہ جو تقلیل کلام کے لیے اہل ریاضت میں مستعمل ہے خطرہ سے خالی نہیں اور اس میں اتنے منافع بھی نہیں۔ اب میں ختم کرتا ہوں اور اس بیان کا نام ''تقلیل الکلام بصورۃ تلاوۃ کلام الملک العلام'' تجویز کرتا ہوں۔

دعا

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو رمضان میں تلاوت قرآن
کی توفیق دیں اور تقلیل کلام کے ثمرات سے کامیاب
فرماویں اور فہم سلیم عطا ہو آمین

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا محمد وعلیٰ الہ
واصحابہ اجمعین. واخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین.

بحمداللہ تمّت